کرن
اگست 2014
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
MEMBER APNS CPNE

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37 - اردو بازار کراچی

اگست 2014

جلد 37 شمارہ 5

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

اگست کا کرن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

14 اگست 1947ء اور ستائیس رمضان المبارک کی بابرکت رات دنیا کے نقشے پر ایک ملک اُبھرا اور برصغیر کے مسلمانوں کو آزادی نصیب ہوئی۔

آزادی کی اس روشن صبح کے لیے ان گنت قیمتی جانوں کی قربانی دی گئی۔ ہجرت کے باب میں مصائب و قربانیوں کی دلخراش داستانیں رقم ہوئیں۔ اس لیے آزادی اتنی ہی بے مثل اور بے نظیر نعمت ہے جس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور ہمارے آباؤ اجداد نے اس کی قیمت ادا کی ہے۔

ہمارا پاکستان ہماری سرزمین جس کی بنیادوں میں ہمارے آباؤ اجداد کا لہو، ان کی عظمتوں کے نشان پنہاں ہیں۔ بلاشبہ یہ ہمارا فخر اور ہمارا مان ہے۔ آئیے یوم آزادی کے اس پُرمسرت موقع پر اللہ رب العزت سے پاکستان کی بقائے دوام اور خوش حالی کے لیے دعا کریں اور عہد کریں کہ ہم اپنی اس آزادی کی حفاظت کریں گے۔ آپس کی نفرتوں، کدورتوں سے پاک سچے پاکستانی بنیں کہ یہ حب الوطنی کا تقاضا ہے۔

قارئین کرام کو یوم آزادی مبارک۔

محمود خاور،

کچھ لوگ دُنیا میں محبتیں بانٹنے اور سمیٹنے کے لیے آتے ہیں۔ محمود خاور ایسی ہی ہستی تھے۔ بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول۔ سب سے محبت کرنے والے، سب کا احترام کرنے والے۔ ایسے لوگ دُنیا سے چلے بھی جائیں تو ان کی یادیں، ان کا کام انہیں زندہ رکھتے ہیں۔ بچوں کے ممتاز ادیب اور کالم نویس محمود خاور کو ہم سے بچھڑے پندرہ سال گزر گئے لیکن آج بھی وہ ہمارے اور اپنے چاہنے والوں کے دل میں زندہ ہیں۔ 20 اگست کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں کو درگزر کرے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- عیدالفطر کے موقع پر بیرون ملک مقیم کرن کے قارئین سے شاہین رشید کا دلچسپ سروے "پردیس میں نکلا ہوگا چاند"،
- اداکار طیفور خان سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ نیلم منیر کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- اس ماہ عنیزہ مظفر کے مقابل ہے آئینہ"،
- نفیسہ سعید کا سلسلے وار ناول، فرحانہ ناز ملک کا سلسلے وار ناول،
- دل اک شہر ملال" عفیفہ ملک کے مکمل ناول کا دوسرا حصہ،
- "میں گلیاں دا روڑا، کوڑا"، اگست کے حوالے سے فائزہ گل کی خصوصی تحریر،
- "میرے دل میرے مسافر" رفاقت جاوید کا ناولٹ دلچسپ موڑ پر،
- "اناہیل" مہ جبیں عزادجیل راؤ کا مکمل ناول،
- حنا یاسمین اور قندیل فاطمہ کے ناولٹ،
- سیما بنت عاصم، راشدہ رفعت، طوبیٰ احسن اور رابعہ افتخار کے افسانے اور مستقل سلسلے،

تحفت،

کرن کتاب "خود کو جانیں، دوسروں کو پہچانیں" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

حلقۂ مہر میں بھی پردۂ مہتاب میں بھی
کیا عجب حسن ہے جو گم ہے میرے خواب میں بھی

جب سفینہ کوئی ہوتا ہے رواں اُس کی طرف
لہر اُٹھتی ہے اچانک مرے اعصاب میں بھی

وہ کہ رکھتا ہی نہیں کوئی خدوخال اپنے
میں نے اوروں میں دیکھا اُسے احباب میں بھی

میں خریدار ہوا بھی تو بھلا کس کا ہوا
وہ جو ارزاں میں بھی موجود ہے نایاب میں بھی

رنگِ افسردۂ کشکول بھی وہ دست بدست
طوق در طوق دمکتا ہے زرِ ناب میں بھی

سُننے والوں نے سُنا ہے اُسے عاصم اکثر
شورِ منبر میں بھی خاموشیِ محراب میں بھی

لیاقت علی عاصم

نام در نام مٹی جاتی ہے اُمت مدد ے
اے قریشی لقب و ہاشمی نسبت مدد ے

دُھوپ ہے اور بہت بے سروسامانی ہے
آیۂ حق مدد دے سایۂ رحمت مدد ے

آسمانوں سے مسلسل یہ بلاؤں کا نزول
کوئی نیکی مدد ے، کوئی عبادت مدد ے

چشم و مژگاں بھی دُھواں سینہ و دل بھی تاریک
مطلعِ نورِ خدا، مہرِ نبوت مدد ے

اپنے ہی رنگ سے بے عکس ہیں چہروں کا ہجوم
مرجعِ خوش نظراں آئینۂ صورت مدد ے

اب کوئی غیر نہیں اپنے مقابل ہم ہیں
اے صف آرائے اُحد حسن قیادت مدد ے

آپؐ کا درسِ مواخات مٹا جاتا ہے
حامیِ رسمِ سفر صاحبِ ہجرت مدد ے

لیاقت علی عاصم

طیفور خان سے ملاقات

شاہین رشید

طیفور خان اس فیلڈ کا نیا نام۔ کم عرصے میں بڑے پروجیکٹ کرکے نام کمایا۔ اچھے انسان ہیں' بااخلاق' صحافیوں کے ساتھ تعاون کرنے والے طیفور خان کا ایک تعارف یہ بھی ہے کہ یہ معروف آرٹسٹ "سمیع خان" کے بھائی بھی ہیں۔ مگر بھائی کے نام کے سہارے سے آگے نہیں بڑھے' بلکہ اپنے ٹیلنٹ سے جگہ بنائی ہے۔ آج کل آپ انہیں سوپ "کھلا ہے دل کا دروازہ" میں شہباز کے رول میں دیکھ رہے ہیں۔

☆ "کیسے ہیں آپ؟ کافی ڈرامے آپ کرچکے ہیں۔ بہت اچھے پرفارمر ہیں۔ آج کل آپ کو "دل کا دروازہ" میں دیکھ رہے ہیں۔ مزید کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

○ "جی الحمد للہ بالکل ٹھیک۔ "کھلا ہے دل کا دروازہ" تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں۔ ایک اور سوپ تھا "چھوٹی" جو ایک نجی چینل سے آن ایر ہوا ہے' مگر چونکہ وہ چینل بند ہے تو لوگ وہ دیکھ نہیں پا رہے ہیں۔ ورنہ "چھوٹی" ایک لاجواب سیریل ہے اور عنقریب مجھے تھائی لینڈ جانا ہے' بلکہ اس انٹرویو کے آنے تک میں جا چکا ہوں گا۔ تھائی لینڈ مجھے ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں جانا ہے اور وہ بہت اچھا پروجیکٹس ہے۔ جس کے لیے میں بہت ایکسائٹڈ ہوں' بہت اچھا کردار ہے اس میں اور ان شاء اللہ سب کو پسند بھی آئے گا۔"

☆ "آپ بہت اچھے پرفارمر ہیں، مگر کیا بات ہے کہ آپ کو ابھی تک کوئی ایسا کردار نہیں ملا کہ جس نے آپ کو شہرت کی بلندیوں پہ پہنچا دیا ہو؟"

○ "سچ بات کہوں کہ دو' تین ادارے ایسے ہیں کہ جنہیں شروع سے ہی میں زیادہ پسند نہیں آیا' وجہ معلوم نہیں۔ شاید لابی بنانا یا لابی میں گھل مل کر رہنا اس معاملے میں 'میں اتنا اسٹرونگ نہیں ہوں۔ لیکن الحمدللہ میں نے جتنا بھی کام کیا ہے وہ لوگوں کو یاد ہے اور میں ہر رول قبول بھی نہیں کرتا۔ اس معاملے میں بھی تھوڑا سا چوزی ہوں۔ بعض لوگ اس لحاظ سے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ پہلا ڈرامہ کرتے ہیں اور راتوں رات کلک کر جاتے ہیں۔ جبکہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو بہت محنت کر کے یہاں تک آنا پڑا ہے۔ دیکھا جائے تو میں ہر طرح کے رول کر چکا ہوں۔ میں نے نگیٹو رول بھی کیے ہیں۔ سپورٹنگ رول بھی کیے ہیں لیڈ بھی کیے ہیں۔"

☆ "اچھا کیا لگتا ہے' ہر طرح کے رول کرنا یا صرف لیڈ رول کرنا؟"

○ "مجھے ہر طرح کے رول کرنا اچھا لگتا ہے۔ میں خالی "لیڈ" کو مانتا بھی نہیں۔ میرا آئیڈیلز ایسے فنکار ہیں جنہوں نے زندگی میں بہت عجیب و غریب کردار کیے ہیں اور ایسے ہی فنکار طویل عرصے تک چلتے ہیں یعنی زندگی کے اینڈ تک چلتے رہتے ہیں جو صرف لیڈ کو لے کر چلتا ہے۔ ان کی لائف چار' پانچ سال یا بہت ہوا تو دس سال ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ میں نے "سوالی" کا رول بھی کیا ہے اور جو اداکاری کو سمجھنے والے لوگ ہیں۔ جب وہ تعریف کرتے ہیں تو پھر رول کا مزا آجاتا ہے کیونکہ فینز تو آپ کو دیکھ کر آپ کے کردار کو دیکھ کر تعریف کرتے ہیں۔ لیکن جب کوئی کام کو سمجھنے والا کوئی صحیح معنوں میں نقاد تعریف کرتا ہے تو محنت وصول ہو جاتی ہے۔"

☆ "کھلا ہے دل کا دروازہ" میں آپ کا ینگ ٹو اولڈ رول ہے۔ کہیں کوئی پرابلم ہوگی؟"

○ "کھلا ہے دل کا دروازہ" نے مجھے بہت عزت دی ہے۔ اب تک میں نے جتنے بھی کردار کیے ہیں ان میں سے یہ ایک ایسا رول تھا جو بہت کلک کیا ہے۔ ایسا نہیں کہ کوئی بہت مشکل یا کوئی بہت نیا رول تھا۔ بلکہ صحیح وقت پہ اور صحیح چینل اور صحیح طریقے سے پریزنٹ کیا گیا تو اس کا فیڈ بیک بہت اچھا ملا اور اس میں ینگ ٹو اولڈ رول کیا جو کہ میرے لیے ایک اچھا تجربہ تھا اور کوئی پرابلم نہیں ہوا' کیونکہ مجھے ہر طرح کے رول کرنا پسند ہے۔"

☆ "آپ نے اپنے کیریر کا آغاز کس ڈرامے سے کیا؟"

○ "میں نے اپنا کیریر شروع کیا' اتنا سوپ "تیرے پہلو میں" اور اس کے آخری کی ساڑھے تین سو اقساط ہیں 100 میں' میں نے کام کیا۔ پھر ہم ٹی وی کے لیے ایک کھیل "ندامت" کیا۔ اس میں میرا ایک نفسیاتی انسان کا رول تھا اور میرا رول لوگوں کو بہت زیادہ پسند آیا تھا اور آپ ابھی بات کر رہی تھیں۔ ینگ ٹو اولڈ رول کی تو آپ کو بتاؤں کہ کردار کو حقیقت کا

رنگ دینے کے لیے میں نے اپنا تھوڑا سا وزن بھی بڑھایا اور اپنی داڑھی بھی بڑھائی اور بالوں کا اسٹائل بھی تھوڑا تبدیل کیا اور اس کے لیے میں نے پورا ایک مہینہ کسی شوٹ میں حصہ نہیں لیا۔"

☆ "کسی کردار کی پیش کش ہوتی ہے تو کہانی پڑھتے ہیں یا اپنا کردار اور اپنے ساتھی فنکاروں کے بارے میں بھی...."

○ "ہمیں پوری کہانی نہیں ملتی' مگر کہانی ہے کیا یہ ہمیں ضرور بتا دیا جاتا ہے۔ پھر ہمارے کردار کے بارے میں' تو کردار ہمیں لکھا ہوا مل جاتا ہے اور میں یہ دیکھتا ہوں کہ اسکرین پہ یہ کردار کتنے فیصد نظر آئے گا اور میں اس کو کس طرح کر سکوں گا اور یہ بھی ضرور دیکھتا ہوں کہ میرے ساتھ کون کون کیا کردار کر رہا ہے یا کر رہی ہے اور ابھی تک میں نے جن لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے ان میں مجھے "ثرالے سرحدی" کے ساتھ کام کرکے بہت مزا آیا۔ بہت ہی بریلنٹ اور سپورٹر ہیں۔ اسی طرح "چھوٹی" میں مجھے یا سرور رضوی کے ساتھ کام کرکے بہت اچھا لگا۔ یہ ایسی فنکارائیں ہیں جو آپ کو مجبور کر دیتی ہیں کہ آپ اچھا کام کریں۔ اسی طرح مدیحہ افتخار' نیلم منیر اور "دل کا دروازہ" میں اسماء جہانگیر کے ساتھ بہت اچھی کیمسٹری بنی۔ بہت مزا آیا کام کرنے کا۔"

☆ "کن کرداروں میں ایزی فیل کرتے ہیں۔ نگیٹو میں یا پوزیٹو میں یا پھر رومانٹک رول میں؟"

○ "مجھے مزا آتا ہے اس کردار کو کرنے میں جو میں اپنے اوپر طاری کر لیتا ہوں۔ ایک ایسا سین جس میں آپ نے ایک نارمل سی بات کرنی ہے۔ وہ سین کرنے میں مشکل لگتا ہے یا یوں کہیں کہ مزا نہیں آتا۔ ایسا رول جس میں آپ کچھ کیری کر رہے ہوتے ہو وہ کرنے میں مزا آتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک ڈرامہ سیریل "میری دلاری" میں میرا کردار بہت اچھا اور پاور فل تھا اور مشکل بھی تھا۔ اس کردار کو کرنے کے بعد مجھے ایسے ہی رولز کی آفر ہوتی ہے جو کرنے میں مشکل ہوتے ہیں۔ مجھے ایک اور سیریل میں بڑا اچھا رول آفر ہوا تھا' مگر کچھ وجوہات کی بنا میں کر نہیں سکا تھا۔ وہ کردار یہ تھا کہ ایک لڑکا کسی کو پسند کرتا ہے اور جب اس کی شادی نہیں ہوتی تو لڑکا ابنارمل ہو جاتا ہے اور سیریل کے اختتام سے چند اقساط پہلے وہ ٹھیک ہو جاتا ہے اور پھر وہ اس لڑکی سے بدلہ لیتا ہے۔"

☆ "رومانٹک رولز میں آپ کی کیا خواہش ہوتی ہے میرے سامنے کون سی فنکارہ ہو یا ہر ایک کے ساتھ کر لیتے ہیں؟"

○ "دیکھیں جی کرنا تو ہوتا ہے' مجبوری ہوتی ہے اور جن فنکاروں کا میں نے نام دیا وہ اپنے سین میں اسی طرح ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ جس طرح آپ چاہتے ہو اور وہ آپ کو کمفرٹ ایبل رہتے ہیں تو ایسے ہی لوگوں کے ساتھ چاہے رومنٹک سین ہو' چاہے ڈرامیٹک سین ہو' چاہے رونے کا سین ہو' کرنے کا مزا آتا ہے' کیونکہ سین اچھا ہو جاتا ہے۔ کچھ نئی فنکارائیں ایسی ہیں جو اپنی لائن بول کر کمرے میں جا کر بیٹھ جاتی ہیں اور جب ریہرسل ہوتی ہے تو لائن بھی پوری طرح نہیں بولتیں۔ ادھر ادھر دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ اگر ایک فنکار یہ آپ سے چاہ رہا ہو کہ اس میں' میں اچھا لگ جاؤں اور اگلا پرفارم کرے نہ کرے وہ میرے خیال سے ایک بے وقوف ایکٹر ہوتا ہے۔ کیونکہ میں اگر ایک سین کر رہا ہوں اور چاہے میں کتنا ہی اچھا پرفارم کر لوں' لیکن اگر سامنے والا اچھا رسپانس نہیں دے گا تو میری پرفارمنس بھی ماند پڑ جائے گی۔"

☆ "کچھ اپنے بارے میں بتایئے' پھر مزید سوال کرتے ہیں۔ آپ کا نام طیفور رخان ہے۔ بڑا یونیک سب سے علیحدہ۔ مطلب کیا ہے؟"

○ "جی میرا پورا نام طیفور رخان ہے۔ Taifoor Khan بغداد کے ایک بزرگ گزرے ہیں "بایزید بسطامی" ان کا اصل نام طیفور تھا اور میرے

والد صاحب کو بڑا پسند آیا تھا اور وہ میری پیدائش سے پہلے کہا کرتے تھے کہ میرا بیٹا ہوگا تو میں اس کا یہ نام رکھوں گا اور میں اس نام کی وجہ سے بڑا پریشان بھی رہا ہوں۔ کیونکہ کوئی تیمور کہتا تھا کوئی غفور کہتا تھا۔ خیر آہستہ آہستہ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ ہی گیا۔ مجھے اس نام کا یہ فائدہ ہوا کہ شوبز میں اس نام کا کوئی اور بندہ نہیں ہے۔ اس لیے لوگوں کو پہچاننے میں مشکل پیش نہیں آئی۔ اب اس کے مطلب پہ آتے ہیں۔ اس کے تین مطلب ہیں۔ ایک ہے "اونچی اڑان والا پرندہ" دوسرا مطلب ہے "بارعب" اور تیسرا مطلب ہے۔ "اچھا خواب۔"

☆ "نام کا اثر ہوتا ہے شخصیت پہ؟ پیار سے کیا کہتے ہیں اور مزید بھی بتائیے۔"

○ "میرا خیال ہے ہوتا ہے۔ کیونکہ تھوڑا سا بارعب ہوں۔ غصہ بھی آتا ہے۔ کم آتا ہے۔ مگر آتا ضرور ہے۔ اونچا بھی اڑنا چاہتا ہوں۔ بہت آگے تک جانا چاہتا ہوں اور پیار سے طلحی کہتے ہیں اور میں لاہور میں پیدا ہوا۔ 19 مارچ 1979ء کو اور اس لحاظ سے Pisces اسٹار ہے اور میری ہائٹ چھ فٹ ہے اور ہم تین بھائی اور ایک بہن ہے اور میرا نمبر دوسرا ہے اور سمیع خان سب سے چھوٹا ہے۔"

☆ "سمیع خان سے آپ کی خاصی شکل ملتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں آپ کو؟"

"ہاں جی کہتے ہیں کیونکہ بھائی ہے مشابہت تو ہے۔ اور جناب میں نے ایم بی اے کیا ہے مارکیٹنگ میں اور اس کے بعد ایم بی اے سے ماسٹرز کیا ہے ملٹی میڈیا میں۔"

☆ "کیا بننا تھا پڑھ کر یا میڈیا میں ہی آنا تھا؟"

○ "میرا تعلق آرٹ سے تھا اور اس فیلڈ میں آنا حادثاتی تھا اور آپ کو بڑی عجیب سی بات لگے گی کہ میں میوزک کمپوز کرتا تھا اور میں نے آٹھ، دس سال میوزک انڈسٹری میں کام کیا۔ میں کمپوزر اور میوزیشن تھا۔ پڑھائی بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی اور پڑھائی کے ساتھ جاب بھی کی بینک کی مگر بینک کی جاب مجھے سمجھ میں نہیں آئی، اسے چھوڑ دیا۔ پھر ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں آگیا۔ وہاں کچھ عرصہ کام کیا، پھر چینلز کی طرف آگیا اور جیو میں بہ حیثیت ایڈیٹر کے جاب کی۔ جیو جب لانچ ہوا تھا تو میں اس کی ٹیم کا حصہ تھا۔ پھر میں پروڈیوسر ہوا اور ایک دوسرے چینل میں سینئر پروڈیوسر بن گیا اور جو لاسٹ جاب میں نے چھوڑی اس وقت

میں منیجر پروڈکشن تھا۔"

☆ کیمرے کے پیچھے رہ کر کام کرنے کا مزا نہیں آیا جو کیمرے کے آگے آگئے آپ؟

○ "مجھے کیمرے کے پیچھے کام کرکے بہت مزا آیا اور مجھے چیزیں کری ایٹ کرنے میں زیادہ مزا آتا ہے۔ بہ نسبت ایکٹ کرنے کے۔۔۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ملک میں ریوارڈ نہیں ہے' ہمارے ملک میں صرف فیس ویلیو ہے اور کچھ نہیں اور اس فیس ویلیو سے آپ چھوٹے سے چھوٹا منجن بھی آسانی سے بیچ لیتے ہو' ورنہ آپ کچھ نہیں بیچ سکتے۔ آپ یقین کریں کہ طالب علمی کے دور میں مجھے فلمیں بھی آفر ہوئی ہیں۔ کمرشلز اور ڈرامے بھی آفر ہوئے ہیں اور پاکستان کی تاریخ کا جو پہلا سوپ تھا۔ وہ بھی آفر ہوا' مگر میں نے سب کے لیے انکار کیا۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ میری شکل اور میری پرسنالٹی کی وجہ سے یہ آفرز آتی ہیں اور میں سمجھتا تھا کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے تو میرا دل چاہتا تھا کہ بہ حیثیت آرٹسٹ کے میں کچھ کری ایٹ کرکے دکھاؤں۔

☆ "بھائی کی وجہ سے شوبز میں آئے؟ اور پہلا پروگرام کیا تھا؟"

○ "میرے ایک دوست ہیں کاشف نثار' جو کہ بہت اچھے ڈائریکٹر بھی ہیں' تو جس چینل پہ میں کام کرتا تھا وہ بند ہوگیا۔ سلمان تاثیر صاحب "اون" کرتے تھے۔ یہ بات ہے 07_2008ء کی۔ اس دور میں چار' پانچ چینلز بند ہوگئے تھے' تو ان دنوں میرے پاس کوئی جاب نہیں تھی اور میں بالکل فارغ تھا تو ان دنوں میرا یہ دوست ایک پروڈکشن کررہا تھا۔ "خدا زمین سے گیا نہیں ہے" بہت بڑا پروجیکٹ تھا۔ جس میں آرمی بھی انوالو تھی' تو انہیں ایک ایسے بندے کی ضرورت تھی جس کو ایسی مشکل پروڈکشن کا تجربہ ہو۔ تو میرے پاس چونکہ انٹرنیشنل پروڈکشن کا بھی تجربہ تھا۔ تو اس کام کے لیے انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ تین مہینے کا پروجیکٹ ہے۔ آپ نے اس کو سنبھالنا ہے اور سب کچھ کرنا ہے۔ اگرچہ یہ بہت مشکل کام تھا' مگر میں نے کام کی ہامی بھرلی۔۔۔ اور کیا۔ اس دوران اس سیریل سے ایک آرٹسٹ اسکپ کرگئے تو سب بہت پریشان کہ یہ سارا پروجیکٹ رہ جائے گا۔ اسے رول نہیں کرسکتے تو جون' جولائی کی گرمی تھی اور ہم جہلم سے بھی آگے شوٹ کررہے تھے۔ تو مجھے کہا گیا کہ اب اس آرٹسٹ کا رول آپ کرو گے۔۔۔ میں نے کہا کہ میں کیسے کروں گا تو ہمارے ڈائریکٹر نے کہا کہ کروانا میرا کام ہے۔ میں نے کہا پے کریں گے' کہنے لگے ہاں کریں گے اور جو پیسے انہوں نے بتائے وہ میری پوری پروڈکشن سے بھی زیادہ تھے اور سات دن کا کام تھا۔ میں نے کرلیا۔۔۔ وہ سیریل پی ٹی وی اور ہم ٹی وی سے ایک ساتھ چلا تھا۔ میرے اس کردار کا مجھے اتنا اچھا فیڈ بیک آیا کہ جیسے لوگ انتظار کررہے تھے کہ ایک اچھا آرٹسٹ ملے۔۔۔ رومانٹک رول تھا۔ پورا ڈرامہ آرمی اور طالبان پہ بیس کرتا تھا۔ خیر پھر جب میں لاہور واپس آیا تو مجھے ڈراموں میں کام کی آفرز آنی شروع ہوگئیں اور پھر میں نے سوچ لیا کہ کام اچھا ہے' کوئی برائی نہیں ہے' کرلینا چاہیے اور پھر مجھے اندازا ہوا کہ پروڈکشن کے کام سے کہیں زیادہ آسان کام اداکاری کرنا ہے۔"

☆ "کام تو آپ نے کافی کیا ہے' ہٹ کون سے کردار گئے؟"

○ "میرا پہلا سوپ تھا "تیرے پہلو میں" اس میں سنی کے نام سے ایک رول کیا تھا جو کہ بہت ہٹ گیا تھا اور راہ چلتے لوگ مجھے سنی کے نام سے بلانے لگے تھے۔ وہ کردار اتنا ہٹ گیا تھا پھر "دو نیناں" چلا تھا ایکسپریس سے "تھائی لینڈ میں شوٹ کیا تھا اور ایک سیریل تھا "تیرا پیار نہیں بھولے" یہ پی ٹی وی سے چلا تھا اور اب "کھلا ہے دل کا دروازہ" کا شہباز بہت ہٹ جارہا ہے۔"

☆ "ڈرامے کے کسی کردار کو دیکھ کر ایسا لگا کہ یہ فنکار صحیح پرفارم نہیں کررہا' اگر میں ہوتا تو زیادہ اچھا کرتا؟"

○ "بہت سے ایسے کردار ہیں جن کے لیے مجھے لگا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اب کسی کو برا نہ لگے تو ایک کردار کے بارے میں کہنا چاہوں گا کہ ایک سیریل آیا

تھا "جنتی آئی لو یو" اس میں ایک کردار ایسا تھا جس کو دیکھ کر ایسا لگا کہ وہ بندہ اس کردار کو سمجھ نہیں پایا یا اس سے ٹھیک طرح سے کروایا نہیں گیا۔ حالانکہ خلیل الرحمن قمر کی لائنیں ہوں۔ صبا قمر آپ کے سامنے ہوں اور عابد علی جیسے آرٹسٹ آپ کے ساتھ ہوں تو وہ تو بہت اچھا کردار بن سکتا تھا۔ اگر اسے کوئی اچھا آرٹسٹ کرتا تو وہ کردار اور بھی زیادہ ہٹ جاتا۔"

☆ "ڈرامے انقلاب لاسکتے ہیں؟"

○ "نہیں لاسکتے۔ اب آپ خود سوچیں کہ جس ملک کا لیڈر بلٹ پروف جیکٹ اور گاڑیاں منگوائے اپنی حفاظت کے لیے اور پھر کہے کہ میں نے انقلاب لانا ہے تو وہ کیا انقلاب لائے گا؟ انقلاب اپنے خون سے آتا ہے۔ لوگوں کے خون سے نہیں آتا۔ اور جہاں تک ڈراموں کی بات ہے تو مجھے لگتا ہے کہ ڈراموں کا ایک نگیٹو پوائنٹ آگیا ہے کہ بدقسمتی سے اب ڈرامہ مخصوص ہوگیا ہے خواتین کے لیے۔ کچھ چینلز اور میکرز مجبور ہوگئے ہیں عورتوں کے لیے ڈرامہ بنانے پر۔ تو ڈراموں سے کیا انقلاب آئے گا کہ جہاں آپ نے سوچ کر محدود کردیا اور جہاں سوچ سے ذرا ہٹ کر کام کیا تو خواتین ڈرامہ دیکھنا چھوڑ دیں گی' جبکہ اب ریٹنگ خواتین کی وجہ سے ہی آتی ہے۔"

☆ "اچھا تنقید نگار کون ہوتا ہے گھر والے یا باہر والے؟"

○ "گھر والے کیا تنقید کریں گے وہ تو خوش ہی ہو رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا کہیں گے آپ اچھے نہیں لگ رہے یا آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ باہر کے لوگ جو ڈرامے کو سمجھتے ہیں' وہ صحیح معنوں میں تعریف بھی کرتے ہیں اور تنقید بھی کرتے ہیں۔"

☆ "کوئی ایسا سین جس کو کرنے کے بعد گھر والوں کی ناراضی مول لینی پڑی ہو؟"

○ "جی میرا ڈرامہ سیریل تھا۔ "میری دلاری" اس میں مرنے کا سین کیا تھا تو گھر والے رونے لگے تھے اور ہم دونوں بھائی اس میں بھائی کا ہی رول بھی کر رہے تھے اور جب میری ڈیتھ باڈی دکھائی گئی تھی تو امی نے چینل چینج کر دیا تھا۔"

☆ "مرزا جا" کیسے ہیں آپ؟ اور شادی ہوگئی؟"

○ "الحمد للہ شادی ہوگئی ہے۔ دو بچے بھی ہیں۔ مزاج میں' میں موڈی ہوں۔ جب میں اچھے موڈ میں ہوتا ہوں تو میرے ساتھی بہت انجوائے کرتے ہیں اور میری غیر موجودگی کو محسوس کیا جاتا ہے۔"

☆ "کھانے پینے کے کتنے شوقین ہیں آپ؟"

○ "میں کھانے پینے کا شوقین تھا اور "تھا" اس لیے استعمال کیا کہ اس فیلڈ میں اگر آپ کھانے پینے کے شوقین رہ نہیں سکتے۔ کیونکہ روٹین بہت بدل جاتی ہیں اور سب سے بڑی بات کہ آپ کو اپنے ویٹ کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ کیمرہ عموماً انسان کو دس یا پندرہ kg زیادہ دکھاتا ہے تو وہ آپ کو دس' پندرہ پاؤنڈ پیچھے میں رہنا پڑتا ہے۔ میں تو نہاری' پلاؤ اور کڑاہیوں کا بڑا شوقین تھا' لیکن اب رہ گیا ہوں ہر چیز سے۔"

☆ "اکثر فنکار کہتے ہیں کہ اس فیلڈ میں آئے تو زندگی بدل گئی۔ ایسا ہوتا ہے کیا؟"

○ "جی بالکل بدلتی ہے۔ آپ فیمس تو ہوتے ہی ہیں' آپ کی سوچ بھی بدل جاتی ہے۔ آپ چینج ہوجاتے ہیں۔ آپ خود غرض ہوجاتے ہیں۔"

☆ "خود غرض۔۔۔ کس سے گھر والوں سے یا باہر والوں سے؟"

○ "گھر والوں سے نہیں' گھر والوں کو تو شکوہ ہوتا ہے کہ میں ان کو ٹائم نہیں دیتا اور میری فیملی چونکہ لاہور میں ہوتی ہے اور میرا زیادہ کام کراچی میں ہوتا ہے تو گھر والوں کی شکایت تو بجا ہے۔۔۔ اور باہر والوں کے لیے بندہ تھوڑا خود غرض ہوجاتا ہے۔ خیر۔۔۔ کچھ بھی زندگی بدل جاتی ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے طیفور خان سے اجازت چاہی' اس شکریے کے ساتھ کہ انھوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

☆ ☆

میری بھی سنیے

نیلم منیر

شاہین رشید
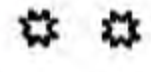
1 "پورا نام؟"
"نیلم منیر۔"
2 "نک نیم؟"
"نیلی۔۔۔یہ میرا اپنا نام ہے۔ نیلی وہ نہیں جو بہت شہرت رکھتی تھی۔"
3 "جنم دن؟"
"20 مارچ۔"
4 "ستارہ؟"
"Piscos۔"
5 "تعلیم؟"
"گریجویشن۔"
6 "بہن بھائی؟"
"ہم چار بہنیں ہیں۔ میرا نمبر تیسرا ہے۔"
7 "شادی؟"
"ابھی نہیں کرنی۔۔۔ویسے بھی یہ نصیب کے کھیل ہیں۔۔۔جب نصیب کھل جائیں گے کرلوں گی۔"
8 "شوبز میں آنے کے لیے کس کا ہاتھ پکڑا؟"
"کسی کا نہیں۔ خالصتاً" اپنی صلاحیتوں سے آئی ہوں۔ بے شک جگہ بنانے میں تھوڑی مشکل پیش آئی مگر اللہ نے ہاتھ پکڑ لیا اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔"
9 "شہرت ملی؟"

مت دی ہی ـــــ سوچا بھی نہیں تھا مگر خدا نے کہاں تک سے کہاں پہنچا دیا۔"

10 "وہ ڈرامہ جو میری پہچان بنا؟"

"دو کا نام لوں گی۔ دونوں ہی شروع کے ڈرامے تھے بلکہ سیریل تھے اور ان کے آن ایر آنے کے بعد ہی آفرز کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ ان دو سیریلز میں "دیا جلے" بہترین سیریل تھا اور "تھوڑا سا آسمان" یہ بھی بہت پاپولر ہوا تھا۔

11 "میری خوش بختی کی علامت؟"

"ہونٹوں پہ میرا تل ـــــ مجھے وہم ہے کہ اگر اس کو کٹواؤں گی تو آفرز آنا بند ہو جائیں گی۔"

12 "زندگی کی ایک بات حیران کرتی ہے؟"

"کہ لوگ شادی کرتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد یا بہت ٹائم کے بعد بریک اپ ہو جاتا ہے۔ مگر پھر انہیں نیا بندہ یا بندی مل بھی جاتے ہیں ـــــ کیا یہ سب کچھ اتنا آسان ہوتا ہے۔"

13 "اپنے گھر والوں کو کیا ایوارڈ دینا چاہتی ہوں؟"

"میں اپنی ماں کو دنیا جہاں کی خوشیاں دینا چاہتی ہوں۔"

14 "لوگ اکثر میری تعریف کرتے ہیں کہ ـــــ؟"

"کہ میں نیچر کی بہت اچھی ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسا ہی رکھے۔"

15 "شوبز میں آکر کس بات نے مایوس کیا؟"

"کہ یہاں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مخلص نہیں، جب موقع ملتا ہے ایک دوسرے کی برائیاں شروع کر دیتے ہیں۔ اور یہی بات مجھے سخت ناگوار گزرتی ہے۔"

16 "میری پسندیدہ فضول خرچی؟"

"موبائل فون ـــــ ہر اچھا ماڈل لینے کی خواہش ہر وقت دل میں جنم لیتی رہتی ہے۔"

17 "محبت کس عمر میں کرنی چاہیے؟"

"ویسے اس کے لیے کوئی عمر مقرر نہیں محبت کسی بھی وقت اور کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ بس دعا یہ ہے کہ محبت اس وقت ہو جب تھوڑی عقل آچکی ہو، تھوڑی میچورٹی آچکی ہو۔ ویسی کم عمری کا پیار حماقت بھی ہوتی ہے اور یہ خطرناک بھی ہوتا ہے۔"

18 "میں اکثر اداس ہو جاتی ہوں؟"

"اپنے والد کو یاد کر کے۔"

19 "برے لگتے ہیں وہ مرد؟"

"جو نہ صرف خواتین سے بلکہ ہر ایک سے بد تمیزی کرتے ہیں۔"

20 "مجھے ہنسی آتی ہے؟"

"ایک ہی جگہ سے ہمارا تقریباً" روز ہی گزر ہوتا ہے۔ تو میں اس وقت بہت حیران ہوتی ہوں ان فقیروں کو دیکھ کر جو کبھی اندھے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ کبھی لنگڑے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر پندرہ بیس دن کے بعد وہ ایک نئے روپ میں نظر آرہے ہوتے ہیں۔"

21 "اچھا اداکار کون ہوتا ہے لڑکا یا لڑکی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ لیکن ہم سے اچھے اداکار

سگنل پہ کھڑے ہوئے فقیر ہوتے ہیں جو اس مہارت سے مانگتے ہیں کہ ہمیں ان پر رحم آ ہی جاتا ہے۔"

22 "لوگوں کی ایک بات جو برداشت نہیں ہوتی؟"

"لوگوں کا ایک دوسرے کو نصیحت کرنا اور اور خاص طور پر مجھے نصیحت کرنا کہ یہ نہ کرو... یوں نہ کرو... ایسا نہ کرو... یہ "نہ کرو" لفظ مجھے بہت برا لگتا ہے... بھئی اب میں بڑی ہو گئی ہوں... اچھا بھلا اپنے بارے میں سوچ سکتی ہوں۔"

23 "کس ملک میں مستقل رہنا چاہتی ہوں؟"

"صرف اور صرف اپنے ملک میں پاکستان سے بہتر کوئی ملک نہیں۔"

24 "کیا وہ چیزیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہوں؟"

"ایک چھوٹا مرر (آئینہ) اور پانی کی بوتل... یہ دونوں میرے لیے لازمی ہیں۔"

25 "اپنی کمائی سے میں نے خریدا؟"

"مجھے گولڈ لینے کا بہت شوق ہے تو اپنی بچت سے یا تو گولڈ لیتی ہوں یا پھر موبائل لے لیتی ہوں۔"

26 "آج کے دور کی بہترین ایجاد؟"

"کمپیوٹر' انٹرنیٹ میرے خیال سے بہترین ایجاد ہے۔"

27 "لوگ ملتے ہی پہلا جملہ بولتے ہیں؟"

"ارے آپ تو بہت چھوٹی ہیں۔ اسکرین پہ تو کافی بڑی نظر آتی ہیں۔"

28 "تہواروں میں پسندیدہ تہوار؟"

"مجھے سارے ہی تہوار اچھے لگتے خواہ 14 اگست ہو عید ہو یا پھر ویلنٹائن ڈے۔"

29 "چاہنا اور چاہے جانا... کیا پسند ہے؟"

"دونوں کا اپنا مزا ہے... چاہنا بھی اچھا لگتا ہے اور کوئی چاہے تو کیا ہی بات ہے۔"

30 "نیند کب نہیں آتی؟"

"جب کوئی نیند سے اٹھا دے تب... تب مجھے غصہ آتا ہے کہ جب پتا ہے کہ میں ایک بار اٹھ جاؤں تو نیند نہیں آتی۔ تو پھر کیوں اٹھایا تھا۔"

31 "فریش کب ہوتی ہوں؟"

"جب شوٹ سے گھر آتی ہوں۔ گھر کو دیکھتے ہی تازگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔"

32 "آئینے میں کس بات کا جائزہ لیتی ہوں؟"

"کہ میں کیسی لگ رہی ہوں اور میرے بال کب لمبے ہوں گے۔"

33 "میری صبح کب ہوتی ہے؟"

"جب شوٹ پہ جانا ہو تو جلدی ' ورنہ میں ہوتی ہوں اور میرا بیڈ ہوتا ہے۔"

34 "چھٹی کیسے گزارتی ہوں؟"

"بہت مزے میں... صبح جب اٹھتی ہوں خواہ کتنے ہی بجے کیوں نہ اٹھوں پہلے شاندار ناشتا کرتی ہوں۔ پھر کہیں نہ کہیں اپنی دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے چلی جاتی ہوں۔"

35 "چڑچڑی ہو جاتی ہوں؟"

"جب غصہ آتا ہے... کبھی کبھار تو چڑچڑی ہونے کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔"

36 "میری اچھی اور بری عادت؟"
"اچھی تو یہ ہے کہ ہر ایک سے جلدی فری نہیں ہوتی اور میرے خیال میں لڑکیوں کو جلدی فری ہونا بھی نہیں چاہیے اور بری عادت یہ ہے کہ ہر ایک پہ بڑی آسانی سے بھروسہ کرلیتی ہوں۔ جیسے اس جیسا سچا اور کھرا انسان کوئی ہے ہی نہیں۔"

37 "24 گھنٹوں میں پسندیدہ وقت؟"
"مجھے ہر وقت ہر گھنٹہ، ہر لمحہ اچھا لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسا ہی اچھا رکھے۔"

38 "بھوک میں کھانا نہ ملے تو؟"
"تو پاگل ہو جاتی ہوں۔ گھر آتے ہی دل چاہتا ہے کہ کھانا مل جائے۔"

39 "شہرت پاکر کیا محسوس ہوا؟"
"اچھا تو محسوس ہوا۔ مگر سچ بتاؤں شہرت کبھی کبھی زحمت بن جاتی ہے۔ کہیں جاؤ اپنی مرضی سے کچھ کر نہیں سکتے۔ بس یہی تھوڑی سی پریشانی ہے۔ ویسے شکر کرتی ہوں کہ اس نے مجھے شہرت سے نوازا۔"

40 "میری ایک عادت جو گھر والوں کو پسند نہیں؟"
"شوٹ سے آتی ہوں تو دماغ گھوما ہوا ہوتا ہے۔ ہر ایک سے لڑنے کو دل چاہتا ہے۔ بس یہی عادت پسند نہیں۔"

41 "وقت سے پہلے کیا ملا؟"
"بہت کچھ۔۔۔ سب سے بڑھ کر تو پیسہ ملا ہے۔"

42 "کس بات کا ہمیشہ خیال رکھتی ہوں؟"
"کہ میری وجہ سے کسی کا دل نہ دکھے۔ کسی کو غصے میں برا بھلا نہ کہہ دوں۔ اپنے لباس کا، اپنی وضع قطع کا۔"

43 "تقریبات جو مجھے پسند نہیں؟"
"شادی کی تقریبات۔ حالانکہ لڑکیاں خوش ہوتی ہیں ایسی تقریبات میں جاکر جبکہ مجھے پسند نہیں۔"

44 "چھٹی حس جاگتی ہے؟"
"بہت مرتبہ جاگ جاتی ہے۔ اور یہ خطرناک بھی ہوتی ہے۔۔۔ کیونکہ وقت سے پہلے بری باتوں کا علم ہو جائے تو زندگی بہت تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ بہتر ہے اللہ رازوں کو پوشیدہ ہی رکھے۔"

45 "چیزیں لے جانا بھول جاتی ہوں؟"
"کبھی نہیں۔۔۔ اپنی ساری چیزیں جو لے جانی ہوتی ہیں وہ پہلے سے ہی تیار کر کے رکھ دیتی ہوں۔ اور

سارے سازو سامان سے لیس ہو کر گھر سے نکلتی ہوں۔"

46 "پسندیدہ میوزک؟"
"فاسٹ بہت مزا آتا ہے خاص طور پر ڈرائیونگ کے وقت۔"
47 "گھر کا ایک کمرہ جہاں سکون ملتا ہے؟"
"صرف اور صرف اپنا کمرہ۔۔۔ اپنے کمرے کے بغیر نیند نہیں آتی۔"
48 "غصے میں کیفیت؟"
"ارے مت پوچھیے کھانا پینا تو چھوڑتی ہی ہوں۔ ساتھ میں غصہ زیادہ ہو تو کبھی کبھی کپڑے بھی پھاڑ دیتی ہوں۔ ہاہاہا۔۔۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔۔۔ مگر ہوتا ہے۔"
49 "غصہ رفو چکر کب ہوتا ہے؟"
"خود ہی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے تو ندامت سی ہونے لگتی ہے۔"
50 "کھانا کھانے کا مزا کہاں آتا ہے؟ چٹائی، بیڈ یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"ماحول پر منحصر ہے۔۔۔ ویسے عموماً چٹائی پر ہی مزا آتا ہے۔"
51 "مستقبل کیسا دیکھتی ہوں؟"
"اچھا ہی دیکھتی ہوں۔۔۔ یقیناً بہت کامیابیاں ملیں گی مجھے۔"
52 "دوسروں میں کیا change لانا چاہتی ہوں؟"
"دوسروں کو change کرنا اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی اختیار مل جائے تو لوگوں کا مائنڈ change کردوں تاکہ وہ ہر ایک کے لیے اچھا اچھا سوچیں۔"
53 "بیگ میں کیا کیا چیزیں رکھتی ہوں؟"
"سب سے پہلے ٹوتھ برش۔۔۔ کیونکہ مجھے کھانا کھانے کے بعد ٹوتھ برش کرنے کی عادت ہے۔ پرفیوم ضرور رکھتی ہوں کہ اس کے بغیر میرا گزارہ نہیں۔ باقی کچھ ضرورت کی چیزیں رکھ لیتی ہوں۔ جیسے ہیر برش بھی۔"

54 "اپنے میں change لانا چاہتی ہوں؟"
"غصے کی تیز ہوں۔ اسے کم کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ غصے سے بہت نقصان ہوتے ہیں اور مزاج کو بھی نرم کرنا چاہتی ہوں۔"
55 "پسندیدہ ناشتا؟"
"انڈا پراٹھا یا چائے پراٹھا۔"
56 "اگر خوشیاں خریدنی پڑیں تو؟"
"تو عزت و احترام خریدوں گی۔ یہ بہت ضروری ہے آج کے دور میں۔"
57 "میری خاطر کون جان دے سکتا ہے؟"
قہقہہ۔۔۔ "جان۔۔۔ کوئی نہیں دے سکتا۔ ویسے سب جان جان کہتے ہیں مگر جان کوئی نہیں دے گا۔"
58 "گھر آتے ہی کسے دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے؟"
"صرف اور صرف امی کو۔"
59 "جھوٹ بولتی ہوں؟"
"جب شوٹ پہ دیر سے پہنچوں تو پھر جھوٹ بولنا پڑتا ہے یا پھر جب کوئی بہت زیادہ مجبوری ہو تب بولتی ۔۔۔ ورنہ جھوٹ کو برا سمجھتی ہوں۔"
60 "کن کھانوں کو دیکھ کر کھانے کے لیے بے چین ہو جاتی ہوں؟"
"مجھے کھانے پینے سے بہت لگاؤ ہے۔ ہر اچھا کھانا دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہوں۔"
61 "اگر موبائل فون نہ ہوتا تو؟"
"تو زندگی بے رنگ و نور ہوتی۔۔۔ آج کل موبائل فون کے بغیر گزارا ممکن نہیں ہے۔"
62 "کون سا لفظ میری لغت میں نہیں؟"
"تھکن کا لفظ۔۔۔ مجھے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔"
63 "ایک سوال جو بہت برا لگتا ہے؟"
"آپ ایک مہینے میں کتنا کما لیتی ہیں۔"

☼ ☼

بہترین روزگار کے لیے لوگ ملک سے باہر تو چلے جاتے ہیں لیکن ان کی روح ان کا دھیان اپنے ملک اور اپنی فیملی کی طرف ہی لگا رہتا ہے۔ ہر خوشی و پریشانی ہر تہوار پر اپنے شدت سے یاد آتے ہیں۔ رمضان المبارک اور عید کے موقع پر ہمارے پردیسی بہن بھائی کس طرح اپنا وقت گزارتے ہیں کس طرح تہوار مناتے ہیں۔ کتنا پاکستان کو اور کتنا اپنوں کو مس کرتے ہیں یہ جاننے کے لیے اس بار عید کا سروے انہی لوگوں سے کیا ہے جو عرصہ دراز سے پردیس میں قیام پذیر ہیں۔

- سوال کچھ یوں تھے کہ۔

1 - کتنا عرصہ ہو گیا اپنوں سے دور رہتے ہوئے؟ کیسا محسوس کرتے/کرتی ہیں؟

2 - عید کے دن کیا احساسات و جذبات ہوتے ہیں؟ کس کو بہت مس کرتے ہیں؟

3 - سحر و افطار میں کیا اہتمام ہوتا ہے؟

4 - مذہبی تہوار منانے کی آزادی ہوتی ہے؟

دیس میں نکلا ہوگا چاند

شاہین رشید

نداحسن : کینیڈا

1 - پردیس میں رہتے ہوئے یا اپنوں سے دور رہتے ہوئے اب تو لگتا ہے کہ جیسے صدیاں بیت گئی ہوں' میرا تعلق ایک بروکن فیملی سے تھا' ماما اور پاپا میں اس وقت علیحدگی ہوئی جب میری بڑی بہن شہزا صرف پانچ سال کی تھی اور میں صرف تین سال کی تھی۔ ہم دو بہنوں کو شٹل کاک کی طرح کبھی ماما اور کبھی پاپا کے کورٹ میں پھینک دیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے کم سے کم کہیں بھی اپنائیت اور ملکیت کا احساس نہیں ہوا۔ ماما کراچی میں اور پاپا ویسے تو اسلام آباد میں تھے لیکن پاک آرمی میں ہونے کی وجہ سے ان کی پوسٹنگ ہوتی رہتی تھی۔ میرا زیادہ وقت دبئی میں گرینڈ مدر کے ساتھ گزرا' ماما نے دوسری شادی کر لی' جبکہ پاپا کی شادی تو لگتا تھا کہ پاک فوج کے ساتھ ہو چکی ہے۔ پہلے تلخ تجربے کے بعد انہوں نے دوبارہ ایسا قدم اٹھانے کی ہمت نہیں کی۔ میری بے شمار عیدیں دبئی میں گزریں وہاں اجنبیت کا احساس ذرا کم ہوتا تھا لیکن میں چونکہ کینیڈین نیشنلٹی ہولڈر ہوں اور اب کچھ عرصے سے کینیڈا کے شہر کیلگری میں ہوں یہاں پاکستانی کمیونٹی تو کافی ہے لیکن عید کے موقعوں پر ویسا مزا بالکل نہیں آتا جیسا پاکستان میں آتا تھا۔

2 - میرا تو عید کا دن بہت بور اور اداس گزرتا ہے۔ سارا دن اسکائپ پر اپنی بڑی بہن سے بات کرتی ہوں جو شادی کے بعد سڈنی آسٹریلیا میں ہوتی ہے۔ اس موقع پر شدت سے احساس ہوتا ہے کہ کاش ماما اور پاپا اکٹھے ہوتے اور ہم سب مل کر عید مناتے میرے لیے یہ تہوار ہمیشہ اداسی کا سبب ہی بنتا ہے۔

3 - جب تک دادو زندہ تھیں سحری و افطار میں خوب اہتمام کرتی تھیں۔ آلو اور قیمے والے پراٹھوں کے ساتھ دہی کی لسی بہت لطف دیتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد سحری میں اہتمام کرنے والا کوئی نہیں رہا' بس جو بھی ہاتھ لگتا ہے کھا پی کر اللہ کا شکر کر کے روزہ رکھ لیتے ہیں ہاں کبھی پاکستان میں ہوں تو ماما ہم دونوں بہنوں کی آمد پر خصوصی اہتمام کرتی ہیں' یہاں کینیڈا میں تو افطاری بھی بس نارمل ہی کر لی جاتی ہے۔ ہاں ایک خاص بات یہ کہ ہمارے پڑوس میں ایک انڈیا سے

تعلق رکھنے والی ایک ہندو فیملی رہتی ہے۔ جس کے ساتھ میرے بہت اچھے تعلقات ہیں وہ لوگ ہمارے اس بابرکت مہینے کے احترام میں اکثر افطاری کے وقت کچھ نہ کچھ بنا کر ضرور بھیجتے ہیں بلکہ ایک دفعہ تو انہوں نے روزہ بھی افطار کروایا میرے لیے وہ لمحات بہت خوشی کے ہوتے ہیں جب بھی وہ اپنے بچے کو نظر نہ لگ جانے کے خدشے کے تحت ہماری خاندانی ملازمہ بوا جنتے سے دم کروانے آتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ ان کے دم سے ان کا بیٹا بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے۔

4 - الحمد للہ یہاں کینیڈا میں ہمیں اپنے مذہبی تہوار منانے کی مکمل آزادی ہے۔ بے شمار ممالک میں جا چکی ہوں اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ پردیس میں اپنے ہم وطن لوگ ضرورت سے زیادہ حساس ہو جاتے ہیں' اسی وجہ سے ان موقعوں پر ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں تقریب میں ایک دوسرے کو مدعو کیا جاتا ہے اور گفٹس بھی دیے جاتے ہیں۔

عثمان بوڑانچ : دبئی

1 - پردیس میں آئے ہوئے یعنی "دبئی" آئے ہوئے تقریباً" ڈیڑھ سال ہو گیا ہے۔ اور جب آیا تھا تو بہت عجیب سا لگتا تھا اور دل چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح واپس چلا جاؤں اور سوچتا تھا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔۔۔ مگر اب۔۔۔ اب ایسا لگتا ہے کہ یہیں رہتا تھا اور اب یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں اتنا لیٹ کیوں آیا۔ مجھے تو بہت پہلے آ جانا چاہیے تھا۔ اچھا روزگار' سکون' امن و امان سب کچھ ہے اس ملک میں۔ بس اپنے دور ہیں۔

2 - ایک عید میں نے یہاں دبئی میں گزاری ہے اور مت پوچھیں کہ کیا احساسات و جذبات ہوتے ہیں سب گھر والے بہت یاد آتے ہیں۔ صرف پورے سال میں ایک عید کا دن گھر والوں کے بغیر گزارنا بہت مشکل لگتا ہے۔

3 - یہاں سحر و افطار میں جیسا اہتمام ہوتا ہے میرے خیال میں شاید پوری دنیا میں ایسا اہتمام و انتظام نہیں ہوتا ہو گا۔ بہت زبردست سحر و افطار ہوتا ہے زیادہ تر گھر سے باہر ہی سحری بھی ہوتی ہے اور افطار بھی۔

4 - دبئی ایک اسلامی ملک ہے' یہاں ہر طرح کی مذہبی آزادی ہے۔ بلکہ یہاں تو ہر طرح کی آزادی ہے۔

صبا خان : یو کے لندن

1 - پردیس میں آئے ہوئے تقریباً" 20 سال ہو گئے ہیں کافی چھوٹی تھی جب لندن آئی تھی۔ اس وقت احساس نہیں تھا کہ اپنا ملک اور پرایا ملک کیا ہوتا ہے' لیکن جب ایک بار پاکستان جانا ہوا تو احساس ہوا کہ اپنا ملک کیا ہوتا ہے مجھے پاکستان آ کر بہت اچھا لگا تھا۔ کیونکہ یہ خالصتاً" ہمارا ملک ہے اور ہم چاہے کسی بھی ملک میں چلے جائیں' کتنے ہی مزے سے کیوں نہ رہیں لیکن اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے اور عید کا اور رمضان المبارک کا اصل مزا تو ہے ہی پاکستان میں۔

2 - یہاں عید کا اتنا مزا نہیں آتا جتنا سنا ہے کہ پاکستان میں آتا ہے۔ بہت ہوا تو یہاں جو چند ایک رشتے دار ہیں ان کے گھر چلے جاتے ہیں یا پھر وہ ہمارے گھر آ جاتے ہیں تو احساسات و جذبات تو بس نارمل ہی ہوتے ہیں اور کسی ایک کو نہیں بلکہ جتنے بھی اپنے پاکستان میں رہتے ہیں سب کو بہت مس کرتی ہوں۔

3 - سحر و افطار میں کافی اہتمام ہوتا ہے۔ سحری سے زیادہ افطاری میں مزا آتا ہے سحری میں ہلکا پھلکا کھانا کھاتے ہیں۔۔۔ کیونکہ آدھی رات کو کھانا کھانے کا مزا نہیں آتا البتہ افطاری میں کافی ہیوی ڈنر جیسا ہوتا ہے اور بہت مزا آتا ہے۔

4 - بالکل جی۔۔۔ مذہبی تہوار منانے کی مکمل آزادی ہے اور ہم کافی جوش و خروش کے ساتھ اپنے مذہبی تہوار مناتے ہیں۔ عید کی نماز کے لیے تو خواتین بھی مسجد جاتی ہیں خطبہ ہوتا ہے اور سب بہت غور سے سنتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ دوسرے ملک میں رہنے والے اپنے مذہب کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

آر جے عمیر : یو کے مانچسٹر

1 - اپنوں سے دور رہتے ہوئے اب تقریباً چار سال ہوگئے ہیں اور جب آیا تھا تو تھوڑا سا خوف تھا کہ پتا نہیں وہاں پہ دل لگے گا یا نہیں یا ایڈجسٹ کرپاؤں گا یا نہیں پر اللہ کا بہت شکر گزار ہوں کہ ایڈجسٹ ہو ہی گیا ہوں اور اب تو کافی دل بھی لگ گیا ہے۔

2 - عید کے دن خاص طور پر پاکستان کی عید یاد آتی ہے کیونکہ یہاں کی عید بہت بورنگ ہوتی ہے۔ اور اس وقت دل چاہتا ہے کہ کاش میں بھی پاکستان میں ہوتا اور اپنوں کے ساتھ انجوائے کرتا "اور کس کو زیادہ مس کرتا ہوں" تو سچ پوچھیں کہ نہ صرف عید میں بلکہ عام دنوں میں بھی اپنی فیملی کو بہت زیادہ مس کرتا ہوں۔ بھائی بہن' ڈیڈ اور خاص ممّا کو بہت زیادہ مس کرتا ہوں کیونکہ میری ماں صرف میری ماں ہی نہیں میری بہترین دوست بھی ہیں۔

3 - سحر و افطار میں زیادہ کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ مگر پھر بھی سحری میں چپاتی مکھن کے ساتھ اچھی لگتی ہے۔ انڈے ہوتے ہیں' تھوڑی دہی اور پھر چائے یہ لازمی ہوتے ہیں کبھی کبھار ورائٹی کے طور پر کچھ اور بھی بنا لیتے ہیں اور افطار میں مینگو کی لسی' پکوڑے' کباب اور کھجور ضرور ہوتی ہیں اور فروٹ بھی اور افطار میں چاول بھی بنا لیتا ہوں کہ وہ جلدی بن بھی جاتے ہیں اور ہضم بھی جلدی ہو جاتے ہیں اور ہم سحری میں دوبارہ کچھ کھا بھی سکتے ہیں۔ یو کے میں روزہ 18 سے 19 گھنٹے کا ہوتا ہے اور بہت لمبا ہوتا ہے پاکستان کے مقابلے میں۔

4 - اور جناب مذہبی تہوار منانے کی پوری آزادی ہے' لیکن گھر میں یا مسجد کے اندر ہمیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ ہم دوسروں کو ڈسٹرب کریں اور لاؤڈ اسپیکر سے بھی ہم بغیر اجازت کے کچھ نہیں لگا سکتے ہمیں ہر بات کی یعنی اسپیکر لگانے کی اجازت لینی پڑتی ہے۔۔۔ باقی سب کچھ سیٹ ہے۔

اریبہ عمر : امریکہ (نیویارک)

1 - پانچ سال ہوگئے ہیں اپنوں سے دور رہتے

ہوئے جب گئی تھی تو احساس ہوتا تھا کہ اپنوں سے دور کیسے رہ پاؤں گی۔۔۔ تھوڑا مشکل تھا۔ مگر جب آپ کی روٹین لائف سیٹ ہو جاتی ہے اور شروع ہو جاتی ہے تو پھر دل لگ ہی جاتا ہے۔ یاد تو ہر وقت آتی رہتی ہے۔ اپنے دوستوں کی 'اپنے رشتے داروں کی اپنے گھر والوں کی لیکن پھر یہاں کی سہولتیں دیکھ کر اپنا دل مارنا پڑتا ہے۔

2 ۔ رمضان المبارک اور عید کے دنوں میں سب سے زیادہ یاد اپنے ملک کی آتی ہے یہاں تو عید کے دن بھی جاب پر ہی ہوتے ہیں۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ عید کا دن ہے جب تک آپ خود عید کے دن کسی رشتے دار کے گھر نہ چلے جائیں اور یہ بھی اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کس ایریا میں رہتے ہیں اور جن کے یہاں آپ کو جانا ہے وہ کس ایریا میں رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ وہاں کتنے مسلمان رہتے ہیں۔ آپ صرف جاب کرتے ہیں یا آپ کی کوئی سوشل ایکٹویٹی بھی ہے۔ جو آپ نے مسلمانوں کے ساتھ رکھی ہوئی ہے۔ عید کے دن سب سے زیادہ اپنی دادی اور عیدی کو یاد کرتی ہوں اور مس کرتی ہوں۔ یہاں والدین کے علاوہ کوئی اور ایسا رشتے دار نہیں کہ جو ہمیں عیدی دے۔

3 ۔ سحر و افطار میں اچھا اہتمام ہوتا ہے اور چونکہ میں یہاں اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہوں اس لیے افطاری کا اہتمام پاکستان کی طرح ہی ہوتا ہے۔ ہم یہاں مسجد نہیں جاتے اور نہ ہی یہاں ہم کسی اور مسلم کو جانتے ہیں سحری میں ہم پھینیاں' قیمہ پراٹھا کھاتے ہیں اور کبھی کبھار دودھ کا ایک گلاس بھی پی لیتے ہیں۔

4 ۔ جی یہاں نیویارک میں مذہبی تہوار منانے کی پوری آزادی ہے۔ بسنت ہو۔ یوم آزادی کی پریڈ ہو۔ عید کی نماز' عید میلہ' چاند رات' سب ہائی اسکولز کے گراؤنڈ میں ہوتے ہیں۔ مگر ہم سب اتنے زیادہ معصوف رہتے ہیں کہ ان سب کو انجوائے کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔

انیل رشید : دبئی

1 ۔ دبئی میں آئے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں۔ شروع شروع میں مشکل ہوئی اور دل لگانا مشکل تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ سیٹنگ ہو گئی۔ مگر پھر بھی اپنوں کا ساتھ بہت ستاتا رہا اور ستاتا ہے' اپنا شہر اپنا گھر آپ کے دل کے بہت قریب ہوتا ہے۔

2 ۔ عید کا دن بہت سمپل گزرتا ہے، بہت اداسی میں گزرتا ہے۔ ماں باپ' بہت یاد آتے ہیں اور دبئی میں سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا اپنے ملک میں ہوتا ہے اپنے شہر میں ہوتا ہے۔ اپنے ملک اور شہر کی کیا ہی بات ہے۔

3 ۔ اہتمام کی کوشش ہوتی ہے مگر اہتمام نہیں ہے کیونکہ جو میری ماں میرے لیے بناتی ہے وہ دنیا میں اور کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔ سچ میں۔

4 ۔ دبئی اسلامی ملک ہے یہاں مذہبی آزادی تو ہوتا ہی ہے۔ البتہ یہاں وہ رونق نہیں ہوتی جو پاکستان میں ہوتی ہے اور شاید ہو بھی نہیں سکتی۔

زنیرو سیلوڈز (selod) : امریکہ ٹیکساس

1 ۔ 3 سال ہو گئے ہیں اپنوں سے دور رہتے ہوئے جب آئی تھی تو بہت نئی جگہ لگتی تھی سوچتی تھی کہ

کیسے رہ پاؤں گی اب رہ تو رہی ہوں مگر جگہ ابھی بھی نئی لگتی ہے' سب کچھ ہے' مگر اپنا ملک نہیں ہے۔ اپنے لوگ نہیں ہیں۔

2 - عید کا دن صرف ایک دعوت کا سا سماں ہی لگتا ہے' صبح ہوئی اور شام کو ختم کراچی کی شاپنگ کو بہت مس کرتی ہوں۔

3 - سحرو افطار میں بہت اچھا اہتمام ہوتا ہے۔ کبھی گھر میں تو کبھی مسجد میں' روایتی کھانے بنتے ہیں۔ جیسے چنا چاٹ' فروٹ چاٹ' پکوڑے' سموسے اور دہی بڑے وغیرہ۔

4 - مذہبی تہوار منانے کی آزادی ہے اگر عید ویک اینڈ پر ہو تو چھٹی کرنا مشکل ہوتا ہے۔

آر جے R-J حسن صہیب (Sohaib)

دبئی

1 - اپنوں سے دور رہتے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں اور میں یہاں ہوسٹل میں رہتا ہوں اور جب پاکستان سے آیا تھا تو بہت ہی خوشی ہوئی تھی اور بہت ہی زیادہ ریلیکس ہو گیا تھا۔ مگر اس وقت بھی اور اب بھی گھر والوں کی بہت یاد آتی ہے۔

2 - سچ بات تو یہ ہے کہ سارا سال میں عید کا دن میرے لیے انتہائی بور دن ہوتا ہے کیونکہ میں فیملی سے دور ہوتا ہوں۔ ویسے ہم سب دوست بہت ہلا گلا کرتے ہیں۔ بہت انجوائے کرتے ہیں خاص طور پر اپنے بہترین دوست عماد حسن کیانی کے ساتھ بہت موج مستی کرتا ہوں۔

3 - سحری میں تو عموماً "پاکستانی اسٹائل سے پراٹھا' دہی' سالن اور دودھ کا اہتمام ہوتا ہے اور کبھی کبھی روزہ بند ہونے سے پہلے چائے کا ایک کپ بھی پی لیتے ہیں۔ اس بار سحری میں کچھ نیا کرنے کا ارادہ ہے اور افطاری میں سموسے' فروٹ' جوسز' کھجور اور روز مرہ کی مختلف چیزیں۔ کبھی کبھی عریبک اسٹائل کے چاول بھی بنا لیتے ہیں اور کبھی کبھی برگر اور روٹی سالن کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔

4 - یہاں مذہبی آزادی کا کوئی ایشو نہیں ہے اپنا اسلامی ملک ہے یہاں کی چاند رات ہم اپنے دوستوں کے ساتھ خوب انجوائے کرتے ہیں۔ آؤٹنگ پہ جاتے ہیں۔ شاپنگ کرتے ہیں۔ ڈنر کرتے ہیں۔ فل ٹائم مستی ہو رہی ہوتی ہے۔ خوب گھومتے پھرتے ہیں اپنے بہت ہی عزیز دوست عماد حسن کیانی کے ساتھ.... جیتے رہو عماد حسن مجھے تمہاری دوستی پہ ناز ہے۔

ابرار احمد : بریڈ فورڈ

1 ۔ وطن سے دور اپنوں سے دور یہاں پردیس میں رہتے ہوئے تقریباً" 8 سال ہو گئے ہیں۔ میں یہاں پڑھنے آیا تھا اور اللہ کا شکر ہے کہ اپنی پڑھائی مکمل کر کے بہت اچھی جاب کر رہا ہوں۔ میں جب یہاں آیا تو دل چاہا کہ جس فلائیٹ سے آیا ہوں اسی سے واپس چلا جاؤں مگر ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ مجھے ویزہ کے حصول میں بھی کافی مشکل پیش آئی تھی' پھر یہاں کی اجنبیت نے بہت دل کو اداس کر دیا تھا۔ مگر اب تو طویل عرصہ ہو گیا ہے اب سب کچھ اپنا اپنا سا لگتا ہے۔

2 ۔ عید کے دن اپنوں کو بہت مس کرتا ہوں اور عید ہی کیا ہر تہوار خواہ وہ ذاتی نوعیت کا ہو۔ مذہبی یا قومی سب بہت یاد آتے ہیں۔ غمی خوشی ہو کسی بھی موقع پر بروقت پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے اچھے روزگار کے لیے اپنا ملک چھوڑنا پڑتا ہے ورنہ اپنے ملک سے اچھی جگہ کوئی نہیں کیونکہ اپنے تو پاس ہوتے ہیں۔

3 ۔ یہاں کا روزہ بہت لمبا ہوتا ہے یہی کوئی انیس بیس گھنٹے کا۔ ادھر سحری کے لیے اٹھے۔ بلکہ افطار کرتے ہیں اور دو تین گھنٹے کے بعد سحری ہو جاتی ہے تو بس پھر کھانی کے سو جاتے ہیں صبح جاب اور لیٹ نائٹ افطار۔۔۔۔ یہاں افطاری کا مزا پاکستان جیسا نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ اہتمام کر ہی لیتے ہیں۔ وہی پکوڑے سموسے جو افطاری کی پہچان ہیں۔

4 ۔ مذہبی آزادی ہے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ عید سے پہلے چھٹی لے لیتے ہیں ہم لوگ یعنی دوست وغیرہ اور پھر عید کے دن ایک جگہ اکٹھے ہو کر گپیں مارتے ہیں۔ گھومنے جاتے ہیں اور ایک ساتھ ڈنر کرتے ہیں۔

وسیم خان : اٹلی روم

1 ۔ اپنوں سے دور اور پردیس میں آئے ہوئے چھ سال ہو گئے ہیں' مجھے یاد ہے کہ جب یہاں آیا تو بہت

پریشان اور اپ سیٹ تھا اور جب یہاں یعنی روم سے پہلی بار اپنے گھر اسلام آباد میں اترا تو ایسا لگا جیسے 5 سال کی سزا کاٹنے کے بعد آج گھر آنے کی آزادی ملی ہے اور اب پھر وہی حال ہے۔ جیسے ہی دوبارہ روم کے ایئرپورٹ پر اترا ذہنی ٹینشن شروع ہو گئی ہے۔۔۔۔ بہت مشکل ہے اپنوں کے بغیر رہنا۔

2 ۔ احساسات و جذبات کا نہ پوچھیں۔ عید کے دن تو دل چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں دھنس جاؤں اور میں بہت زیادہ مس کرتا ہوں اپنی فیملی کو اور اپنے دوستوں کو۔

3 ۔ سحری عموماً" گھر پر ہی کرتا ہوں اور کچھ خاص اہتمام نہیں کرتا اور افطار کا تو یہ حال ہے کہ کبھی پانی سے تو کبھی کھجور سے کھول لیتا ہوں مشکل سے ایک منٹ کا وقفہ ملتا ہے۔۔۔۔ بہت بے رنگ ہیں یہاں کے سحر و افطار۔

4 ۔ ہاں جی مذہبی آزادی ہے۔ تہوار منانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

✲ ✲

مقابل ہے آئینہ

عفیرہ مظفر

ادارہ

★ "آپ کا پورا نام، گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"

○ "عفیرہ مظفر۔ امی جب کبھی موڈ میں ہوں تو "عفیرے" اقراء کبھی کبھار "تمانی" اور فریحہ "فری" کہہ لیتی ہے۔ وہ بھی تب جب پس پردہ کوئی کام نکلوانا مقصود ہو۔ (ہائے ری قسمت) عمر مظفر (چھوٹو) مجھے "گڑیا" جبکہ مس خنساء نے مجھے پیار کا نام "پری وش" دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرے پیارے کے بہت سے نام ہیں۔"

☆ "کبھی آپ نے آئینے سے یا آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟"

○ "ہاں ایک دفعہ آئینے نے کہا تھا۔ "ضدی لڑکی ہر وقت غصے کو اپنی چھوٹی سی ناک پہ بٹھائے رکھتی ہو، کبھی ہنس بھی لیا کرو۔"

☆ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

○ "دادا ابو کے ساتھ بیتے خوش گوار دن، بچپن میں ان کے ساتھ بیٹھ کر کرکٹ دیکھنا۔ "بوم بوم" کے چوکے چھکے پہ دادا ابو کی بے پایاں خوشی اور اس کے زیرو پہ آؤٹ ہونے پہ دادا ابو کا ٹی وی آف کر کے واک آؤٹ کر جانا۔

☆ "اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟"

○ "دادا ابو کی اچانک وفات۔۔۔ عزیز از جان بہنا وجیہہ کی بیماری، پھر وفات اور بھائی عمر نعیم کی روڈ ایکسیڈنٹ میں وفات نے ایک عرصہ ٹینس رکھا۔"

☆ "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

○ "ہم۔۔۔ م۔۔۔ م۔۔۔ م۔۔۔ محبت، واہ واہ کیسا شیریں ٹپکاتا لفظ ہے۔ ٹھنڈا میٹھا سا احساس رگ و پے میں سرایت کر جائے۔ کیا نورانی جذبہ ہے۔

☆ "مستقبل قریب کا منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟"

○ "فسوشیالوجی میں ایم اے کرنا ہے۔ منصوبے تو بہت سارے ہیں۔ مگر ایک پلاننگ اوپر والا کر رہا ہوتا ہے کہ جس کے سامنے ہماری ساری پلاننگز دھول چاٹتی رہ جاتی ہیں۔ سو جو جیسا ہوتا جائے وہی میری ترجیح ہوگی۔"

☆ "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور کیا؟"

○ "گھر بیٹھ کے تیاری کر کے ایگزیمز دیے اور الحمد للہ مارکس ان کزنز سے بھی زیادہ آئے جو ریگولر کالج جاتی تھیں۔ یہ وہ کامیابی تھی جس نے دلوں خوش کیا۔"

☆ "آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

○ "گزرا کل (پریشانی) آج (پرامید) اور مستقبل ان شاء اللہ شاندار۔"

☆ "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟"

○ "عمر بھائی کے ایکسیڈنٹ نے ابھی تک خوف زدہ کر رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ سعد کو ہر دفعہ احتیاط سے بائیک چلانے کی تلقین کرتی ہوں۔"

☆ "آپ کی کمزوری اور طاقت؟"

○ "کمزوری چائے اور طاقت پیارے اللہ تبارک تعالیٰ۔"

☆ "آپ خوش گوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

○ "خوش گوار لمحات کوئی خاص نہیں ہیں۔ بس نارمل سی زندگی ہے۔ کوئی خوشی کی خبر مل جائے تو مسرت سے کہتی ہوں۔ "ہیں واقعی" اور بس اگلے ہی لمحے نارمل۔۔۔ تو خوش گوار لمحات کو انجوائے کرنے کا

سوال تو بس رہنے ہی دیں۔"

☆ "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

○ "اللہ! کیا سوال پوچھ ڈالا۔ اس مہنگائی نامی عفریت نے تو اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیے ہیں۔ ایسے میں دولت نامی خوشنما دیوی کی اہمیت سے کون کافر انکار کرے گا۔ بس ضرورت اس امر کی ہے کہ اس خوشنما دیوی کو اپنا خدا نہ بنایا جائے۔

☆ "گھر آپ کی نظر میں؟"

○ "گھر۔" یہ لفظ عجیب سکون و طمانیت اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ محفوظ پناہ گاہ ہے۔ دنیا کی سرد' کٹھلی اور غلیظ نظروں سے آپ کو محفوظ رکھتا ہے۔

☆ "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کردیتی ہیں؟"

○ "کوئی آپ کی پشت میں چھرا گھونپے۔ آپ کے بارے میں زہر اگلتا پھرے اور پھر کل کو آپ سے یہ توقع کرے کہ اس کے کیے کو بھول کے آپ اسے معاف کردیں گے تو میرے خیال میں یہ غلط ہے۔ وہ دوسروں سے توقعات باندھتے ہوئے یہ ضرور دیکھیے کہ مقابل انسان ہے' فرشتہ نہیں کہ اس کے ساتھ آپ جیسا بھی فعل روا رکھو گے اور وہ بھول جائے گا۔ آپ کو معاف کردے گا تو میں بھی اتنی جلدی بھولتی نہیں ہوں۔ بھئی عام سی خطا کار بندی ہوں۔ میرا اتنا ظرف ہی نہیں کیا کروں؟"

☆ "اپنی کامیابیوں میں کسے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟"

○ "بہت سی قارئین کی طرح میرا بھی یہی جواب ہے کہ ابھی کوئی خاص کامیابی ملی نہیں۔"

☆ "کامیابی کیا ہے آپ کے لیے؟"

○ "آگے بڑھنے کی لگن۔۔۔ ہمت و حوصلہ کی بڑھوتری میں معاون۔۔۔ خدا سے تعلق مضبوط کرتی ہے۔ اس کا شکر ادا کرنے اس کا شکر گزار بندہ بننے میں مدد کرتی ہے اور کچھ کر دکھانے کا جوش و جنون بھی پیدا

☆ "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

○ نمو احمد سے ملاقات۔۔۔ بظاہر یہ خواہش عجیب نہیں ہے۔ مگر ایک دور دراز گاؤں کی لڑکی کے لیے یہ عجیب خواب یا خواہش ہے۔

☆ "برکھارت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

○ "برکھارت کو دور سے ہی سلام کرتی ہوں کیونکہ یہ مجھے فلو کا تحفہ دے دیتی ہے۔ اس لیے کمرے میں کھڑے ہو کر کھڑکی سے ہی نظارہ کرکے محظوظ ہوتی ہوں۔"

☆ "آپ جو ہیں وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

○ "میں ابھی جو ہوں اسی پہ صابرو شاکر ہوں۔ ہاں اس معاشرے میں لڑکوں کی اہمیت دیکھ دیکھ کے کبھی کبھی یہ حسرت دل سے اٹھتی ہے کہ "کاش!!! میں بھی منڈا ہوتی۔" ہی ہی ہی۔۔۔"

☆ "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

○ "اخلاق۔۔۔ ویسے آپس کی بات ہے آج کل لوگوں نے خوش اخلاقی کی ملمع کاری کر رکھی ہوتی ہے۔ حقیقت میں وہ میٹھی چھری ہوتے ہیں' بڑے میٹھے انداز میں آپ کی گردن پہ چھری پھیرتے ہیں اور اف کا موقع بھی نہیں دیتے۔"

☆ "کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب کچھ پالیا جو آپ پانا چاہتی تھیں؟"

○ "ہزاروں خواہشیں ایسی۔۔۔ کے مصداق بہت سی خواہشات میری بھی تھیں' لیکن تب۔۔۔

"جب بہت چھوٹی تھی۔ اب ذرا سمجھ آگئی ہے کہ جو میرا نصیب ہے وہ مجھے مل کر رہے گا' چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہوجائے' تو بس زندگی سے کوئی شکوہ نہیں۔ ان شاء اللہ اپنا حصہ وصول کرکے ہی اس دنیا سے جاؤں گی۔"

○ "اپنی ایک خوبی اور خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"

☆ "خامیوں سے بذات ہوں۔ خوبیاں ڈھونڈنی پڑیں گی۔ ویسے میں کچی کھری بندی ہوں۔ (دوسرے لفظوں میں منہ پھٹ' یہ اقراء کا کہنا ہے) خامی یہ ہے کہ برداشت کا فقدان ہے۔ غصے میں آؤٹ آف کنٹرول ہوجاتی ہوں۔"

○ "کوئی ایسا واقعہ جو آپ کو آج بھی شرمندہ کردیتا

ہے؟"

☆ "اسکول لائف بھی کیا ہی مزے کی لائف تھی۔ ہمارے اسکول کے سر عبدالمالک المعروف "بڑے سر" کے بھاری تھپڑ بہت مشہور تھے۔ ذہین سے ذہین اسٹوڈنٹس بھی ان کا ذائقہ چکھنے سے محروم نہ رہتے تھے۔ میں بھی اپنی کلاس کی ذہین طالبہ مانی جاتی تھی۔ ایکسٹرا کوالٹی معصومیت اور مسکینیت تھی۔ میتھس مجھے بڑا ٹف لگتا تھا اور ہر دفعہ ٹیسٹ میں ایک، دو سوال میں غلط کردیتی تھی۔ مگر خوش قسمتی، اپنی شرافت اور مسکینیت کے باعث میں بچ جاتی تھی۔ ورنہ تو سر کا اصول یہ تھا کہ ایک غلطی پر ایک تھپڑ۔ ایک دفعہ میرا سارا ٹیسٹ غلط تھا۔ سر کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ ان کا ہاتھ اٹھا۔ میں نے سر نیچے کرکے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ "ہائے اللہ جی عزت رکھ لیں" اور اللہ تعالیٰ نے عزت رکھ لی۔ ——— بچ ڈھیلے ہیں، کس دوں گا" آئندہ غلطی نہیں ہونی چاہیے۔" وہ ہاتھ میرے سر پر پڑنے کے لیے نہیں اٹھا تھا۔ دراصل انہوں نے ہاتھ سے بچ کسنے کا اشارہ دیا تھا۔ سچ آج بھی بہت ہنسی آتی ہے اور شرمندگی کا تو رہنے ہی دیں۔"

☆ "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہوجاتی ہیں؟"

○ "انجوائے کرتی ہوں۔ ڈٹ جاتی ہوں اور جیتنے کے لیے خوب اسٹرگل کرتی ہوں۔"

☆ "متاثر کن کتاب، مصنف، مووی؟"

○ "قرآن پاک اور میں نے کامل بستے دیکھا ہے۔ نمرہ احمد، Arahan kungfu Hustle "

☆ "آپ کا غرور؟"

○ "الحمد للہ غرور نہیں کرتی ہوں۔"

☆ "کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو اداس کردیتی ہے؟"

○ "بچپن میں سعد اور فریحہ کے ساتھ خوب میچ کھیلا اور خوب ہی شکست حاصل ہوئی۔ بس یہی شکست اداس کرتی ہے۔"

☆ "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا؟"

○ "اونہوں۔۔۔! کسی کی کامیابی حسد میں نہیں رشک میں مبتلا کرتی ہے۔ کسی نے اتنی محنت کی ہے جب ہی وہ اس مقام تک پہنچا ہے نا۔"

☆ "مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟"

○ "بہت زیادہ ہے۔ اسی بات سے اندازا لگالیں کہ مطالعے کے جنون نے آنکھوں پہ گلاسز لگا دیے ہیں۔"

☆ "آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی، جو آپ اپنے علم، تجربہ اور مہارت میں استعمال کرتے ہیں؟"

○ "خدا کا دیا ایک انمول تحفہ۔ اس کی قدر کریں اور ایک مقصد سامنے رکھ کر زندگی جئیں، وہ مقصد جس کے لیے زندگی عطا کی گئی۔ یعنی۔۔۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

☆ "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

○ "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔۔۔ مولانا طارق جمیل صاحب، مولانا مسعود اظہر، سر عبدالمالک صاحب (بھوتہ)"

☆ "ہمارا پیارا پاکستان سارا کا سارا خوب صورت ہے، آپ کا کوئی خاص پسندیدہ مقام؟"

○ "زیادہ گھومی پھری نہیں ہوں۔ ویسے ہمارے گھر کے بالکل سامنے قبرستان ہے، چھوکر خورد کا قبرستان میرا پسندیدہ مقام ہے۔"

☆ ☆

نفیسہ سعید

ملک صاحب اپنے گھر والوں کو بے خبر رکھ کر اپنے کم سن بیٹے ایشال کا نکاح کر دیتے ہیں جبکہ ایشال کی دلچسپی اپنی کزن عریشہ میں ہے۔

حبیبہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے حیدر آباد سے کراچی آئی ہے۔ شاہ زین کے والد نے اسے اپنے آفس میں اپائنٹ کر لیا

شاہ زین حبیبہ میں دلچسپی لینے لگا۔

فرہاد تین بھائی ہیں۔ فرہاد کے دونوں بھائی معاشی طور پر مستحکم ہیں اور دونوں اپنی بیوی بچوں کی ضروریات کو دل کھول کر پورا کرتے ہیں جبکہ فرہاد اپنی بیوی زینب اور بچیوں کی ضروریات پوری کرنے میں بے حد کنجوسی سے کام لیتا ہے جو زینب کو بالکل پسند نہیں۔

فرہاد کے بڑے بھائی کی بیوی فضہ زینب کی خوب صورتی سے حسد کرتی ہیں اور آئے دن اس حسد کا اظہار کرتی ہوتی ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

۲
دوسری قسط

"میں چاہ رہا تھا اس دفعہ آفس کی میٹنگ تم اٹینڈ کرو۔"
پاپا پر سوچ نگاہوں سے اس کی جانب تکتے ہوئے بولے۔
"میں۔۔۔" وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔
"آپ کیوں نہیں؟" شروع سے آفس کی تمام میٹنگ پاپا ہی اٹینڈ کرتے تھے۔
"اس کی دو وجوہات ہیں۔" پاپا اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے کھنکارے۔
"ایک تو یہ کہ میں چاہتا ہوں اب تم اس سلسلے میں کچھ تجربہ حاصل کرو تمہیں پبلک ڈیلنگ کرنی آئے دوسرا تم جانتے ہو میرا ڈاکٹر زیدی سے اپائنمنٹ ہے اور پھر اسی ہفتے وہ لندن بھی جا رہے ہیں لہٰذا دوبارہ وہ میرا چیک اپ ایک ماہ سے قبل نہیں کر سکتے۔"
"اوہ۔" ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔
"ٹھیک ہے آپ میری سیٹ بک کروا دیں تب تک میں اپنے تمام کام سمیٹ لوں" وہ کرسی پیچھے کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"بیٹا اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں حبیبہ کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دوں؟"
پاپا کا جھجکتے ہوئے کیا جانے والا یہ سوال اس کے من کو شانت کر گیا۔
"نہیں پاپا بھلا مجھے کیا اعتراض ہو گا مگر وہ میرے ساتھ جا کر وہاں کیا کرے گی میں یہ نہیں سمجھ پایا۔"
"اسے اپنی کچھ پریزنٹیشن کی تیاری کے حوالے سے یہ میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے اس کے علاوہ بھی اسے وہاں کچھ ضروری کام ہیں اب جب تک تم فارغ ہو گے وہ بھی اپنے کام نمٹا کر تمہارے ساتھ ہی واپس بھی آ جائے گی۔"
وہ وہاں کیوں جانا چاہتی تھی یا میٹنگ میں اس کا کیا کام تھا اس سے شاہ زین کو کچھ سروکار نہ تھا اس کی اصلی خوشی تو حبیبہ کا ساتھ تھا جو بے شک عارضی اور چند روزہ تھا مگر شاہ زین کے لیے فی الحال اتنا ہی کافی تھا اس عارضی ساتھ کو مستقل کیسے کرنا ہے یہ وہ کئی عرصہ پہلے سوچ چکا تھا۔
"ویسے آپ نے اس سلسلے میں حبیبہ سے بات کر لی ہے۔"
حبیبہ اس کے ساتھ اکیلی جانے میں شاید کبھی آمادہ نہ ہو اسی خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے پاپا سے سوال کیا۔
"ہاں دراصل حبیبہ کو اپنی کچھ اسناد کی وصولی کے لیے وہاں جانا از حد ضروری تھا اور وہ تنہا جانا نہ چاہ رہی تھی اس لیے میں نے اسے آفر کی کہ وہ تمہارے ساتھ چلی جائے اس کی رضامندی کے بعد ہی میں نے تم سے بات کی ہے۔"
پاپا کی بتائی جانے والی تفصیل کے دوران اس نے شیشے کی دیوار کے اس پار موجود حبیبہ کی ٹیبل پر ایک نظر ڈالی جو اس کے وجود سے خالی تھی۔
"وہ اپنے گاؤں گئی ہے کل صبح تک آ جائے گی تمہاری میٹنگ رات میں ہے میں تیمور کو فون کر دیتا ہوں وہ کل شام کی سیٹ بک کروا دے۔"
فون اپنے قریب کر کے وہ تیمور کا نمبر ملانے لگے۔ شاہ زین کمرے سے باہر نکل آیا حبیبہ کے گاؤں جانے کا سن کر اس کا آفس میں مزید جی نہ لگا اور کچھ ہی دیر بعد وہ گھر جانے کے لیے پارکنگ کی جانب آ گیا۔

✲ ✲ ✲

وہ جب سے گھر آئی تھی کچھ گم سم سی تھی اس کی اس کیفیت کو فرہاد نے محسوس ضرور کیا مگر بولا کچھ نہیں۔

زینب نے خاموشی سے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور سادیہ کا سوٹ لپیٹ کر شاپر میں ڈال کر رکھ دیا' مریم اور جگنو دونوں سوگئی تھیں وہ ہمیشہ کہیں سے آنے کے بعد رات میں چائے ضرور پیتی تھی مگر آج ایسا نہ ہوا کپڑے تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھو کر وہ خاموشی سے بستر پر آکر لیٹ گئی۔

"زینب"

فرہاد سے اس کی یہ خاموشی برداشت نہ ہوئی۔

"جی۔" وہ چیت لیٹی جانے چھت پر کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ کیا تمہیں وہاں کسی نے کچھ کہا ہے؟"

وہ اس کی خاموشی سے یہی نتیجہ اخذ کر سکا۔

"نہیں مجھے کوئی کیوں کچھ کہے گا۔" وہ اپنے خیالوں سے چونکی' فرہاد کی جانب دیکھا۔

"کہیں اسے فضہ بھابھی نے کچھ نہیں جتا دیا میرا سالار سے بات کرنا انہیں خاصا ناگوار لگ رہا تھا۔" یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ بے چین سی ہو گئی۔

"نہیں تو ویسے بھی عادت ایک کی چار بنانے کی۔" اسی خوف نے اس کے دل میں پنجہ گاڑا ہوا تھا۔

"جب سے تم واپس آئی ہو اس قدر خاموش کیوں ہو؟"

"ویسے ہی تھک گئی ہوں۔" اس نے اپنی آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کی۔

"آج تمہارا سوٹ بہت اچھا لگ رہا تھا۔" دیر سے فرہاد کے دل میں ٹکی بات اس کی زبان پر آگئی۔

"میرا نہیں سادیہ کا سوٹ۔" وہ جتاتے ہوئے بولی۔

"ہاں مگر پہنا تو تم نے ہی تھا نہ اسی لیے تمہارا ہی کہوں گا۔" فرہاد اس کا طنز سمجھ نہ پایا۔

"اچھا۔"

وہ کروٹ لے کر سوتی بن گئی کیوں کہ اس کا دل اب مزید اس موضوع پر بات کرنے کو بالکل نہ چاہ رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی بنا سوچے سالار کا سراپا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"آپ کو کبھی کسی نے بتایا نہیں کہ آپ بہت خوب صورت ہیں۔" اس کی آواز زینب کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں تعریف تو آج اس کی فرہاد نے بھی کی تھی مگر کس قدر فرق تھا دونوں کی تعریف میں' فرہاد کی تعریف ڈھکے چھپے لفظوں میں تھی اور سالار کی کھلے الفاظ میں بنا کسی جھجک کے' وہ لبوں ہی لبوں میں مسکرا دی کسی نے سچ کہا ہے عورت ہمیشہ اپنی تعریف کی بھوکی ہوتی ہے' جھوٹے الفاظ میں کی جانے والی تعریف بھی کسی سخت دل عورت کے دل کو نرمانے کے لیے کافی ہے' ابھی بھی زینب کا دل چاہا کہ فرہاد اس کے حسن کی تعریف کرے ایسی تعریف جس میں سادیہ کے کپڑوں کا ذکر نہ ہو اس خیال کے آتے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا' فرہاد کی بند آنکھیں دیکھ کر وہ اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ وہ گہری نیند کی وادیوں میں اتر چکا تھا جس کا ثبوت اس کے حلق سے برآمد ہونے والے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بھائی اب آپ بھی شادی کرلو۔" کئی دنوں سے رابعہ اس سے یہ بات کرنا چاہ رہی تھی اور آج اسے قدرت نے خود موقع فراہم کردیا ورنہ تو وجاہت جب بھی کبھی کھانا کھانے اس کے گھر آتا اتنی افراتفری میں ہوتا کہ وہ چاہ کر بھی بات نہ کرپاتی' مگر آج شاید وہ کچھ فرصت میں تھا اس لیے اطمینان سے چھوٹی ٹیبل اپنے سامنے رکھے رابعہ کے روٹی پکنے کا انتظار کررہا تھا۔ رابعہ نے جلدی جلدی سالن پلیٹ میں نکالا گرم روٹی کپڑے میں لپیٹی اور کھانا اس کے سامنے لاکر رکھا اور ساتھ ہی اپنے دل میں آیا مدعا بیان کردیا۔

"کیوں کیا تمہیں میری دو روٹیاں پکانی مشکل لگتی ہیں؟" ٹرے اپنے سامنے کھسکاتے ہوئے وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھلا آپ جیسے بھائی کی دو روٹیاں بھی کسی بہن پر بھاری ہوسکتی ہیں آپ کے لیے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔" وہ قدرے برا مانتے ہوئے بولی۔

"جانتا ہوں پاگل لڑکی یہ تم لوگوں کی محبت ہی تو ہے جو۔۔۔ زندگی میں یہ سب کچھ کیا ورنہ تو تنہا میں کچھ بھی نہ تھا۔"

"آپ میری بات کو گھمائیں مت' جو میں نے کہا ہے مجھے اس کا جواب دیں۔"

"کس بات کا جواب؟" وجاہت جان بوجھ کر انجان بنا۔

"اچھا بتاؤ تم نے مچھلی فائزہ کے گھر بھیج دی تھی۔" فائزہ ان کی سب سے چھوٹی بہن تھی جس کی شادی کے فرض سے تین سال قبل ہی وجاہت فارغ ہوا تھا اور وہ رابعہ کے گھر سے دو اسٹاپ دور رہتی تھی۔

"ہاں بھیج دی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ آپ شکار کرکے لائے ہو۔ رستم کا حصہ فریز کرکے رکھ دیا ہے جب آپ حیدر آباد جاؤ تو لے جانا اور کچھ پوچھنا ہے آپ کو تو وہ بھی ابھی پوچھ لیں۔"

وہ غصہ سے منہ بناتے ہوئے بولی۔ کھانا کھاتے وجاہت نے اپنی چھوٹی بہن کے پھولے ہوئے منہ کو دیکھا تو ہنس دیا جانتا تھا کہ اس کی بہنیں اس سے کس قدر پیار کرتی ہیں۔

"چلو تم ناراض مت ہو اور مجھے یہ بتاؤ کہ اس عمر میں کون بے وقوف لڑکی ہوگی جو مجھ سے شادی کرے گی۔"

وہ خاصا حقیقت پسند شخص تھا اور ہر بات کو گہرائی سے جانچنے کا عادی تھا۔

"کیا مطلب اس عمر میں' اللہ خیر کرے ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے بمشکل پینتالیس سال اور دیکھنے میں تو آپ چالیس سے بھی زیادہ کے نہیں لگتے ویسے بھی بھائی آپ کس طرح ساری زندگی تنہا گزاریں گے' ساری دنیا جانتی ہے کہ کیسے آپ نے ہم تینوں بہن بھائیوں کے فرض نبھائے ہیں اسی میں آپ کا بچپن اور جوانی گزر گئی تو کیا اب ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم بھی کچھ ایسا سوچیں جو آپ کی زندگی کو سہل کر دے کم از کم آپ کو گھر میں دو وقت پکی ہوئی روٹی تو ملے اب یہ مت کہہ دینا کہ ہمیں آپ کی روٹی بھاری ہے۔"

وجاہت کی کہی ہوئی بات کو اس نے پھر سے جتلایا۔

"میرا خیال ہے کہ میرے لیے تم لوگ کافی ہو اب میرے دل میں شادی بیاہ کی کوئی خواہش باقی نہیں رہی اور نہ ہی یہ عمر ایسے چونچلے کرنے کی ہے۔"

وہ اپنا کھانا ختم کر چکا تھا' اسی لیے کرسی کھسکاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا "بہرحال آپ کچھ بھی کہو میں نے خالدہ خالہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ آپ کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی دکھائے اور اب جو لڑکی مجھے پسند آئے گی آپ کو اس سے شادی بھی کرنا پڑے گی۔"

وہ باقاعدہ دھونس جماتے ہوئے بولی' وجاہت نے کوئی جواب نہ دیا صحن میں لگا نلکا کھول کر اچھی طرح منہ دھویا اور قریبی تار پر پھیلے تولیے سے صاف کیا تولیہ تار پر واپس ڈالا رابعہ کی بات کو قطعی نظرانداز کر تا وہ خاموشی سے باہر نکل گیا وہ سائٹ پر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر کھانا کھانے گھر آیا تھا اب اسے واپس جا کر پھر سے کام شروع کروانا تھا اور ویسے بھی اپنے باپ کی وفات کے بعد بہت ہی چھوٹی عمر سے وہ اپنے گھر کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے خود سے قطعی غافل ہو چکا تھا وہ عمر جس میں عشق و عاشقی کے خواب دیکھے جاتے ہیں اس عمر میں اس نے اپنی ماں کے ساتھ مل کر محنت مزدوری کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بہن بھائی پالے اپنی حیثیت کے مطابق انہیں تعلیم دلا کر اچھی جگہ ان کی شادیاں کیں' جب تک اس کی ماں زندہ رہی اسے کبھی کسی بہن کے گھر کھانا کھانے بھی نہ جانا پڑا مگر اب ماں کی وفات کے بعد وہ اکثر رابعہ کے گھر سے ہی کھانا کھاتا کیونکہ باہر کا کھانا اس کا معدہ ہضم نہ کرتا تھا اس کے بدلے وہ ہمیشہ رابعہ کو کچھ نہ کچھ دیتا رہتا باوجود اس کے منع کرنے کے' اس کا چھوٹا بھائی رستم حیدر آباد میں رہتا تھا وہیں کسی میڈیسن کمپنی میں اس کی اچھی جاب تھی جبکہ اس کی بیوی کا تعلق بھی حیدر آباد سے ہی تھا وجاہت مہینے ایک بار' ایک ہی دن کے لیے سہی پر حیدر آباد کا چکر ضرور لگاتا کیونکہ جب تک وہ رستم کو دیکھ نہ لیتا اسے سکون بھی نہ ملتا۔

☼ ☼ ☼

وہ عریشہ کی سنگت میں بڑی خوشی خوشی گھر کے اندر داخل ہوا مگر سامنے موجود اپنے پاپا کو دیکھتے ہی کچھ عجیب سا ہو گیا حالانکہ اس کے پاپا نے کبھی بھی عریشہ اور اس کی دوستی پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا ویسے بھی وہ اس کے اکلوتے ماموں کی بیٹی تھی مگر پھر بھی جانے کیوں اسے اکثر ایسا محسوس ہوتا جیسے پاپا کو ان دونوں کا ساتھ بالکل پسند نہیں ہے یہی وجہ تھی جو اس وقت پاپا کو اچانک گھر میں موجود دیکھ کر وہ کچھ پزل سا ہو گیا اور گھبرا کر عریشہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"السلام علیکم انکل۔" انشال کے اشارہ کرکے متوجہ کرنے پر اس نے ملک صاحب کو سلام کیا ورنہ عام طور پر وہ ایسی فارمیلٹی نبھانے کی قطعی قائل نہ تھی ملک صاحب نے اپنے سامنے پھیلے اخبار سے نظریں اٹھا کر ذرا کی ذرا اس پر ایک نظر ڈالی جینز کے ساتھ چھوٹی سی سلیولیس ٹاپ کندھوں تک آتے سلکی کالے بال دھوپ سے اندر آنے کے باعث اس کے گورے رنگ میں ہلکی سی سرخی گھل گئی تھی ان کے تصور میں وہ سیدھی سادی گندمی رنگت والی لڑکی آگئی' جس کا نام وہ اپنے بیٹے کے نام کے ساتھ جوڑ چکے تھے بنا یہ جانے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور شاید ایسا انہوں نے صرف اپنے بھائی کی محبت میں کیا تھا مگر جب وہ انشال اور عریشہ کو ایک ساتھ دیکھتے انہیں اپنے

فیصلے کی غلطی کا احساس ہوتا انہیں لگتا انہوں نے کوئی بھی قدم اٹھانے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔
"وعلیکم السلام۔ کہاں سے آرہے ہو تم لوگ۔" بظاہر ان کا سوال بڑا سرسری سا تھا مگر جانے کیوں اس سوال میں ایشال کو کچھ ایسا نظر آیا کہ وہ تھوڑا سا گڑبڑا گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔
"ہم کچ کرنے گئے تھے انکل۔"
تھوڑی دیر ایشال کی طرف سے جواب کا انتظار کرنے کے بعد عریشہ نے خود ہی جواب دینا بہتر جانا ویسے بھی وہ خاصی پراعتماد سی لڑکی تھی۔
"دراصل میں آپ کو شاید علم نہیں میرا یو کے میں ایڈمیشن ہوگیا ہے اور میں جلد ہی وہاں جانے والی ہوں اسی سلسلے میں آج میں نے ایشال کو ٹریٹ دی تھی۔"
خوشی خوشی اس نے ساری تفصیل سے انہیں آگاہ کیا۔
"او گڈ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ بہت بہت مبارک ہو تمہیں بیسٹ آف لک۔"
عریشہ کے جانے کی خبر سن کر انہیں دلی طور پر خوشی ہوئی وہ ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھے جب ایشال کو عریشہ سے تھوڑا دور کر کے اس کی منکوحہ سے ملنے کے موقع فراہم کیا جائے ان کا خیال تھا کہ شاید اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آسکیں گے مگر عریشہ کی اگلی بات نے انہیں پل بھر کے لیے سن کردیا۔
"دراصل میں انکل ایشال نے بھی ایڈمیشن کے لیے میرے ساتھ ہی اپلائی کیا تھا مگر پتا نہیں کیوں اسے انٹرویو کے لیے لیٹ کال کیا گیا ہے میرا خیال ہے کہ دو دن بعد اس کا بھی انٹرویو ہے کیوں ایشال تم نے انکل کو بتایا نہیں۔"
اپنے بال کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے اس نے ایشال سے پوچھا ملک صاحب کے چہرے پر چھائی حیرانی بھانپ کر وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ اس اطلاع سے بے خبر ہیں جب کہ ایشال، عریشہ کے اس بے موقع کچ پر تھوڑا سا بوکھلا گیا اس کے اس عمل کی اطلاع صرف ماما کو تھی بلکہ یہ قدم ہی اس نے ان ہی کی ایما پر اٹھایا تھا ان کا خیال تھا کہ ملک صاحب کی گلے ڈالی جانے والی بلا سے بچنے کا اس سے بہتر حل کوئی اور نہ تھا اور وہ سارا پروسیس مکمل ہونے کے بعد اس کی اطلاع گھر کے دیگر افراد کو دینا چاہتی تھیں۔ بشمول پاپا مگر عریشہ نے ایک سیکنڈ میں پٹر پٹر بول کر سارا بھانڈا پھوڑ دیا اب اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔
"تم نے ایڈمیشن کے لیے کب اور کہاں اپلائی کیا ہے۔"
پاپا نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے ایسے ظاہر کیا جیسے یہ اطلاع ان کے لیے کسی خاص اہمیت کی حامل نہ ہو ان کے دل میں کیا تھا اس کا اندازہ چہرے سے لگانا فی الحال مشکل ہی نہیں اس کی عمر کے حساب سے ناممکن بھی تھا۔
"میں نے بھی اسی یونی میں اپلائی کیا ہے۔ جس میں عریشہ کا ایڈمیشن ہوا ہے اور یہ یو کے کی ایک اچھی یونی ورسٹی ہے۔"
"اچھا۔"
اس کی ساری وضاحت کے جواب میں وہ فقط اتنا ہی بولے اور پھر سے اخبار پڑھنے میں مصروف ہوگئے ایشال نے عریشہ کو اشارہ کیا اور دونوں ان کے پاس سے گزرتے ہوئے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

☆ ☆ ☆
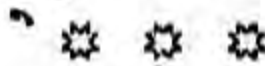
زینب کے گھر کے اوپر پورشن کی تیاری کا کام تکمیل کے آخری مراحل میں تھا اوپر والا حصہ اتنی جلدی مکمل ہوا کہ کبھی کبھی زینب بھی حیران رہ جاتی اور یہ صرف فرہاد ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا ان چھ ماہ میں اس نے اس گھر کی تیاری کے لیے دن رات ایک کردیے تھے وہ اسٹور کے بعد جتنا ٹائم بچتا مزدوروں کے سر پر کھڑا رہتا اس کے

علاوہ اس نے گھر کے اخراجات سے بھی مزید ہاتھ کھینچ لیا تھا اس امر میں کی جانے والی زینب کی ہر شکایت کا اس کے پاس ایک ہی جواب ہوتا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ان ہی کے لیے کر رہا ہے اور یہ کہ اسے کچھ بھی اپنے ساتھ لے کر قبر میں نہیں جانا ہے۔ پھر کو زینب کا دل چاہتا کہ پوچھے جب جوانی ہی دو کپڑوں میں مکمل سڑ کر گزر گئی تو پھر کیا فائدہ سینت سینت کر جمع کیے گئے ان تمام پیسوں یا کسی بھی جائیداد کا۔

”دیکھو زینب تمہاری تمام شکایات بجا مگر یہ بھی تو سوچو کہ ہماری دو دو بیٹیاں ہیں کل کو ان کی شادیاں کرنی ہیں اور پھر میں ساری زندگی اتنی محنت نہ کر سکوں گا تو بہتر نہیں ہے کہ بڑھاپے کے لیے کچھ بچا لیا جائے۔“

عید کی تیاری کے حوالے سے اس نے جو شاپنگ زینب کو کروائی تھی وہ اسے لے کر ابھی تک ناراض تھی‘ فرہاد نے ہر چیز کم سے کم پیسوں میں خریدنے کی کوشش کی تھی اس کا کہنا تھا کہ ابھی مکان میں رنگ و روغن ’فرش کی تیاری اور دیگر چھوٹے چھوٹے کاموں کی مد میں خاصی رقم چاہیے وہ مکان کرائے پر چڑھاتے ہی ایڈوانس کی رقم سے اس کی کچھ مزید خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔“

مگر وہ جانتی تھی کہ یہ فرہاد کا وہ وعدہ ہے جو ساری عمر وفا نہیں ہونا اب اس سے مزید کچھ کہنا بے کار تھا‘ سارا سامان اسی طرح چارپائی پر ہی چھوڑ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اگلے چند دنوں میں اوپر والا پورشن مکمل طور پر تیار ہو گیا اس دن فرہاد کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی وہ زینب کو پورشن دکھانے کے لیے اوپر لے گیا چھ ماہ میں پہلی بار وہ اوپر آئی تھی دن میں وہاں کوئی نہ کوئی مزدور کام کر رہا ہوتا اور شام کے بعد چھا جانے والے اندھیرے کے باعث وہ کبھی بھی اوپر نہ آئی آج جو اوپر آئی تو پورا پورشن دیکھ کر حیران رہ گئی فرہاد کا دل کھول کر لگایا گیا پیسہ نظر آ رہا تھا چپس کا دانے دار رنگین فرش بالکل ویسا جیسا فضہ بھابھی کے گھر کا تھا‘ کمروں کے ساتھ ملحق اٹیچ باتھ جو اس کے باتھ روم سے لاکھ درجے اچھے تھے۔

”میرا خیال ہے تم نیچے والا پورشن کرایہ پر دے دو ہم اوپر شفٹ ہو جاتے ہیں۔“

پورے گھر کا ایک چکر لگانے کے بعد وہ پورے استحقاق سے بولی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔“

فرہاد نے گیلری کا دروازہ کھولتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”جانتی ہو نیچے والے گھر میں کتنا کام ہے کون اس کا اتنا کرایہ دے گا جتنا میں نے اس حصہ کی ڈیمانڈ کی ہے اور دو پارٹیاں تو تیار بھی ہو گئی ہیں انہیں صرف ایڈوانس کا تھوڑا مسئلہ ہے جیسے ہی وہ طے ہو گیا مکان کرائے پر چڑھ جائے گا۔“

فرہاد کے اتنے روکھے جواب نے زینب کو بالکل خاموش کر دیا۔ ”ویسے بھی نیچے والا حصہ ٹھنڈا ہے اوپر چادروں کی چھت کے باعث گرمی زیادہ ہے اور اتنی گرمی بچیاں برداشت نہیں کر سکتیں۔“

اپنے دو ٹوک جواب کے نتیجے میں وہ زینب کی خاموشی غالباً بھانپ چکا تھا اسی لیے اپنی بات کو دوسرا رخ دیتے ہوئے بولا۔

”کاش یہ بچیوں کے بجائے گرمی کے حوالے سے میرا بھی کچھ احساس کر لیتا۔“

ایک منفی سوچ اس کے دماغ میں آ کر دل میں اتر گئی مگر بولی وہ اب بھی کچھ نہیں اور پھر جب تک وہ اوپر رہی بالکل خاموش رہی اس دن کے بعد سے اس نے اس حوالے سے دوبارہ فرہاد سے کوئی بات نہ کی‘ مکان کرائے پر چڑھ گیا اس کا کرایہ آنا شروع ہو گیا مگر اس اضافی آمدنی سے بھی فرہاد کے رد عمل میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی گھر اور زینب کے اخراجات کے حوالے سے جیسا وہ شروع دن سے تھا ویسا ہی ابھی بھی تھا دانتوں سے پکڑ کر پیسہ خرچ کرنے والا۔

٭ ٭ ٭

"ایشال نے یو کے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کیا اور تم نے مجھ سے اس بات کا ذکر کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔"

وہ جب کمرے میں آئے تو سامنے ڈریسنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھی اپنی نصف بہتر سے شکایت کیے بنا نہ رہ سکے۔

"آپ کو پتا تو تھا کہ اس کا اے لیول مکمل ہو چکا ہے اور ظاہر ہے کہ اسے آگے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کسی نہ کسی یونی ورسٹی میں اپلائی تو کرنا ہی تھا پھر اس میں اتنی حیرت والی کیا بات ہے اور ویسے بھی ملک صاحب آج کل کے بچے اپنے سب کام خود کرنے کے بعد والدین کو اطلاع دیتے ہیں، بھائی صاحب کو بھی اسی دن پتا چلا تھا جس دن عریشہ اپنے انٹرویو میں کامیاب ہوئی تھی۔"

اب اس میں کتنا سچ تھا کتنا جھوٹ وہ جانچ نہ سکے۔

"پاکستان میں دنیا بھر کی بہترین یونیورسٹیاں موجود ہیں پھر کیا ضرورت ہے اسے ملک سے باہر جانے کی، اپنی تعلیم وہ یہاں کی کسی اچھی یونیورسٹی میں مکمل کر سکتا ہے۔"

"آپ نے پاکستان کے حالات دیکھے ہیں۔"

ہاتھوں پر لوشن ملتے ہوئے انہوں نے ڈریسنگ کے شیشے میں نظر ڈالی انہیں اپنے بالکل عقب میں ملک صاحب کا عکس دکھائی دیا ایک عجیب سی بے چینی ان کے چہرے پر واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی اس پریشانی کے پس منظر میں کیا تھا وہ بنا پوچھے جان چکی تھیں مگر اس وقت اس حوالے سے کوئی بات کر کے وہ ماحول خراب نہ کرنا چاہتی تھیں۔

"تو کیا ان حالات کے باعث پاکستان کے بچوں نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے؟"

انہوں نے ذرا سا رک کر سانس لیا۔

"اللہ کا شکر ادا کرو ہمارے بچے بہترین گاڑیوں میں سفر کر کے، یہاں کے بہترین اسکول میں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔ ان حالات میں تو وہ بچے بھی پڑھ جاتے ہیں جو بسوں میں دھکے کھاتے ہیں ان کی رہائش بھی ان علاقوں میں ہے جہاں کے حالات ہم سے بھی زیادہ سنگین ہیں ہم جیسے پوش ایریا میں رہنے والے اپر کلاس کے لوگوں کو ان حالات سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور جنہیں فرق پڑتا ہے وہ ان حالات سے گھبرائے بنا اپنی ہر طرح کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔"

"کل اس کا انٹرویو ہے دعا کریں کہ وہ کامیاب ہو جائے۔"

ملک صاحب کی ساری باتوں کا مختصر سا جواب دے کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں ملک صاحب کا دل چاہا وہ پوچھیں ایشال کے اس طرح ابروڈ چلے جانے کے بعد اس لڑکی کا کیا ہو گا جو اس کے نکاح میں ہے مگر پچھلے تین سالوں سے جس طرح وہ اس مسئلہ پر خاموش تھے ابھی بھی خاموش ہو گئے فی الحال خاموشی ہی ان کے حق میں بہتر تھی۔

٭ ٭ ٭

وہ میٹنگ اٹینڈ کرنے کے لیے ایئرپورٹ سے ہی سیدھے ہوٹل پہنچے آفس کی گاڑی بمعہ ڈرائیور ان کے ساتھ تھی، میٹنگ کے بعد ڈنر سے فارغ ہوتے ہوتے گیارہ بج گئے شاہ زین نے محسوس کیا کہ اس پہلی بزنس میٹنگ میں شاید غیر ارادی طور پر حبیبہ نے اس کی کافی مدد کی ہے حبیبہ کی خود اعتمادی اور دیگر معلومات نے اسے جگہ جگہ چونکایا گاؤں کی رہائشی ایک لڑکی اتنی قابل اور پر اعتماد بھی ہو سکتی تھی وہ حیرت زدہ تھا حبیبہ کی اس مدد کے بدلے اس نے دل سے اس کا شکریہ ادا کیا جسے قبول کرتے ہوئے وہ کافی خوش دکھائی دی ڈنر کے بعد اسے قریبی ایک ہوٹل جانا تھا

جہاں اگلے اٹھارہ گھنٹوں کے لیے اس کا روم بک تھا کیونکہ کل کا سارا دن حبیبہ نے یہاں رہ کر اپنے کچھ کام مکمل کرنے تھے اور پھر اسی دن رات میں ان کی واپسی تھی اسے اپنے روم کی بکنگ کا پتا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ حبیبہ نے رات کہاں گزارنی ہے اس کشمکش میں وہ ڈائننگ ہال سے نکل کر پارکنگ کی جانب آگیا جہاں اس کی گاڑی کے قریب ہی ایک دوسری گاڑی بھی موجود تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک باریش شخص سر پر ٹوپی لیے موجود تھا۔

"سلام چاچا جی۔"

گاڑی میں بیٹھے شخص کو دیکھتے ہی حبیبہ اس کی جانب لپکی۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔"

جواب کے ساتھ ہی اس نے پیچھے کا لاک کھول دیا۔

"سر میری گاڑی آگئی ہے میں اپنی آنٹی کے گھر جا رہی ہوں جہاں سے اپنے تمام کام ختم کرتے ہی میں ان شاء اللہ کل شام تک آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی ویسے آپ کا موبائل نمبر میرے پاس ہے اگر ضرورت پڑی تو میں آپ سے خود ہی رابطہ کرلوں گی اللہ حافظ۔"

اپنی بات ختم کرکے وہ شاہ زین کا کوئی بھی جواب سنے بغیر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی اگلے ایک سیکنڈ میں گاڑی ریورس ہو کر نہایت تیزی سے اس کے قریب سے گزر گئی اندر بیٹھی حبیبہ کا چہرہ اتنا بے تاثر تھا جیسے وہ باہر کھڑے شاہ زین کو بالکل جانتی ہی نہ ہو اس کے اس رویہ نے شاہ زیب کو تھوڑا سا حیران کردیا۔

"بندہ پاس سے گزرتے ہوئے ہاتھ ہلا کر اسمائیل ہی پاس کر دیتا ہے حد ہے ایسے پاس سے گزر گئی جیسے جانتی ہی نہ ہو۔"

دھیرے دھیرے آگے بڑھتی حبیبہ کی گاڑی کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے دل میں سوچا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا دوسرے ہی پل گاڑی میں بیٹھا وہ اپنی مطلوبہ منزل کی جانب رواں دواں تھا۔

☼ ☼ ☼

پیسے جمع کرکے فرہاد نے ایک چھوٹی سی سیکنڈ ہینڈ گاڑی خریدلی جسے دیکھ کر پہلی بار زینب کو تھوڑی سی خوشی کا احساس ہوا بے شک یہ گاڑی اسفند اور صمد بھائی کی گاڑیوں جیسی عالیشان نہ تھی مگر پھر بھی کسی لگژری کی جانب رکھا جانے والا وہ پہلا قدم تھا جس نے زینب کے دل میں کئی امیدیں جگادی تھیں جب شام میں وہ فرہاد اور اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ سی ویو گئی تو خاصی خوش تھی مریم اور فرہاد سارا ٹائم پانی میں رہے جبکہ وہ جگنو کو گود میں لیے باہر بینچ پر بیٹھی رہی اسے پانی میں جانا کچھ خاص پسند نہ تھا اسی لیے وہ مریم اور فرہاد کو انجوائے کرتا دیکھ کر خوش ہوتی رہی گان دونوں کے پانی سے باہر نکلتے ہی وہ گھر جانے کے لیے سامنے پارک کی ہوئی گاڑی کے قریب آگئے۔

"تم یہاں رکو میں کچھ کھانے کے لیے لاتا ہوں۔"

مریم کی انگلی پکڑے وہ سامنے کھڑے برگر کے ٹھیلے کی جانب بڑھ گیا' زینب نے جگنو کو گاڑی میں بٹھادیا اور خود گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی جب جانے کہاں سے یک دم ہی سالار اس کے سامنے آن کھڑا ہوا زینب کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آگئی جبکہ زینب ایسے ہوگئی جیسے اسے جانتی ہی نہ ہو۔

"ارے آپ یہاں اکیلی کیا کررہی ہیں۔"

وہ ایسے بولا جیسے دونوں کے درمیان صدیوں کی جان پہچان ہو۔

"میں اکیلی نہیں اپنی فیملی کے ساتھ ہوں۔" زینب کا جواب خاصا روکھا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔" اس کی آنکھوں میں اپنے لیے موجود اجنبیت کا احساس ہوتے ہی سالار نے پوچھا اس کی توقع کے برعکس زینب کے چہرے پر پہچان کی کوئی رمق تک نہ تھی۔

"جی آپ کا خیال بالکل درست ہے۔" وہی پرانا سپاٹ لہجہ' سالار تھوڑا شرمندہ سا ہو گیا۔

"میں سالار ہوں مسز صمد کا فرسٹ کزن' میرا خیال ہے کہ نگین کی شادی کے موقع پر ہماری ملاقات ہو چکی ہے اینی وے ایک منٹ رکیں میں آپ کو اپنی مسز سے ملواتا ہوں۔"

اس کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی وہ واپس پلٹ گیا۔

"مسز۔" زینب نے دل ہی دل میں دوہرایا سالار کے منہ سے اسے یہ لفظ بالکل بھی اچھا نہ لگا اب تک وہ اسے کنوارا ہی سمجھ رہی تھی اور پھر فوری طور پر سالار کی واپسی ایک دبلی پتلی لڑکی کے ساتھ ہوئی جو اپنی سانولی سلونی رنگت کے ساتھ سر پر لیے بلیک اسکارف میں زینب کے سامنے بالکل ماند دکھائی دے رہی تھی۔

"جانے اللہ تعالیٰ بندوں کے جوڑ کیا سوچ کر بناتا ہے۔" اس لڑکی کے پاس سے آتی قیمتی پرفیوم کی خوشبو اور مہنگے ترین لباس کو دیکھتے ہی وہ بے اختیار اللہ سے شکوہ کر بیٹھی۔

"سچ ہے نصیب کا تعلق خوبصورتی سے نہیں ہوتا ورنہ شاید آج وہ دنیا کی بانصیب عورتوں میں سے ایک ہوتی۔" شاید وہ لوگوں کے ظاہر سے متاثر ہونے کی عادی ہو چکی تھی۔

"السلام علیکم۔" لڑکی قریب آکر اس سے بڑے تپاک سے ملی۔

"وعلیکم السلام۔" اس کے انداز میں گرم جوشی کا فقدان تھا اس لڑکی کا کیا نام تھا وہ جاننا نہ چاہتی تھی وہ مسز سالار تھی بس اس کا اتنا تعارف ہی زینب کے لیے کافی تھا۔

"سالار نے آپ کی جتنی تعریف کی تھی آپ اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔"

زینب نے حیرت سے اسے تکا' کسی قسم کا کوئی حسد اس کے لہجہ میں نہ تھا زینب کو دیکھ کر وہ واقعی خوش ہوئی تھی جس کا احساس اس کے چہرے کو دیکھ کر لگایا جا سکتا تھا ورنہ عام طور پر کوئی عورت اپنے میاں کے منہ سے کسی دوسری عورت کی تعریف سننا پسند نہیں کرتی' جانے یہ کیسی لڑکی تھی' زینب ابھی تک حیران تھی۔

"اوہو یہ سالار صاحب یہاں کیسے آ گئے۔"

وہ اس لڑکی کا جائزہ لینے میں اتنی مگن تھی کہ فرہاد کب واپس آیا اسے پتا ہی نہ چلا اب جو پلٹ کر دیکھا تو فرہاد کے ہاتھ میں پکڑا برگر کا تھیلا دیکھ کر عجیب شرمندہ سی ہو گئی۔

"میں ابھی کچھ دیر قبل جب آپ سامنے ٹھیلے پر کھڑے تھے۔" سالار نے بھی فرہاد ہی کے انداز میں ہنستے ہوئے جواب دیا مگر جانے کیوں اسے محسوس ہوا جیسے اس نے ٹھیلے کا ذکر جان بوجھ کر کیا ہے۔

فرہاد نے ہاتھ میں پکڑا تھیلا ان کی جانب بڑھایا' زینب شرمندگی سے وہیں زمین میں گڑ گئی سالار کی موجودگی میں اسے خود بھی ٹھیلے سے خریدے گئے یہ برگر کچھ عجیب سے لگ رہے تھے اوپر سے ستم ظریفی کہ فرہاد انہیں بھی آفر کر بیٹھا۔

"نہیں شکریہ فرہاد بھائی اصل میں ہم سامنے ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے جا رہے ہیں بلکہ میں تو آپ سے یہ کہوں گا کہ آپ لوگ بھی آجائیں مل کر انجوائے کریں گے۔"

سہولت سے فرہاد کو انکار کرتے ہوئے اس نے خود اپنی آفر دے دی۔

"نہیں یار پھر کس ٹائم اکٹھے انجوائے کریں گے ابھی تو ہم گھر جا کر آرام کریں گے بچے کافی تھک گئے ہیں۔"

سالار سے گلے مل کر وہ گاڑی میں آ بیٹھا گاڑی کے آگے بڑھتے ہی غیر ارادی طور پر زینب نے سائیڈ کے شیشے سے پیچھے اس جگہ دیکھا جہاں سالار اپنی بیوی کے ساتھ کھڑا تھا وہ کچھ دیر زینب کی گاڑی کو جاتا دیکھتا رہا اور پھر

قریب موجود اپنی بڑی سی سلور کار میں بیٹھ گیا اور جب فرہاد نے اگلے روڈ سے موڑ کاٹ کر گاڑی دوسری سڑک پر ڈالی تو سڑک کے دوسری جانب بنے ریسٹورنٹ کے دروازے سے سالار اور اس کی بیوی اندر داخل ہو رہے تھے۔
زینب نے جوس ختم کر کے خالی ڈبا باہر روڈ پر پھینک دیا' برگر کھانے کو اس کا دل بالکل بھی نہ چاہا حالانکہ جب فرہاد یہ برگر خریدنے گیا تھا تو اس وقت اس کی بھوک خوب چمک رہی تھی اور وہ بے صبری سے فرہاد کی واپسی کی منتظر بھی تھی مگر اب ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے کبھی بھوک تھی ہی نہیں' بھوک کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی مرسا گیا ایسا لگا جیسے آج کی ساری تفریح سالار کی ایک ملاقات نے غارت کر دی ہو اس کی وجہ کیا تھی سارے راستے سوچنے کے باوجود وہ سمجھ نہ پائی۔

☆ ☆ ☆

حبیبہ کی شاہ زین سے اگلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ایئر پورٹ پر واپس آنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ شام سے ہی وہ اس کی آمد کا منتظر تھا۔ مگر جانے کیوں اس نے ایک فون کر کے یہ بھی نہ بتایا کہ وہ کس وقت تک واپس آئے گی اور جب ایئر پورٹ جانے کا وقت ہوا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے پاپا کو اطلاع دینا پڑی۔ کیونکہ اس کے پاس حبیبہ کا سیل نمبر نہ تھا۔

"پاپا حبیبہ کل رات اپنی آنٹی کے گھر گئی تھی اور وہاں سے اب تک واپس نہیں آئی اور نہ ہی اس نے اس سلسلے میں مجھے کوئی اطلاع دی ہے۔"

"ہاں میری اس سے بات ہو گئی ہے۔ تم ایئر پورٹ جاؤ' وہ وہیں پہنچ جائے گی۔"

پاپا کے جواب نے اسے تھوڑا سا غصہ دلا دیا "پتا نہیں خود کو سمجھتی کیا ہے۔ اگر میرا نمبر اس کے پاس تھا تو اس کا فرض تھا کہ مجھے خود اطلاع دیتی۔ مطلب میں ہی بے وقوف ہوں جو اس کے لیے اس قدر پریشان ہو رہا ہوں۔ اسے تو میرا رتی بھر احساس بھی نہیں ہے۔ احساس ہوتا تو اپنی خیریت کی اطلاع ضرور دیتی۔"

اسی طرح سوچتا' کلستا وہ ایئر پورٹ پہنچ گیا۔ وہ کندھے پر اپنا واحد چھوٹا سا بیگ لیے کھڑا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوئی حسب معمول بالکل فریش وائٹ کاٹن کی شلوار قمیص میں اس کا سادہ سا چہرہ خاصا نکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ کل والے ہینڈ بیگ کے علاوہ ایک خاصا بڑا بیگ بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ جسے تھامے وہ اس کے قریب آگئی۔

"السلام علیکم سر۔"

"وعلیکم السلام۔" جواب دے کر وہ سامنے چلنے والی اسکرین دیکھنے لگا۔ جہاں مختلف ڈومیسٹک فلائٹس کے ٹائم چل رہے تھے۔ اپنی مطلوبہ فلائٹ کا ٹائم اسکرین پر نظر آتے ہی وہ اندر کی جانب چل دیا' بنا یہ دیکھے کہ حبیبہ اس کے پیچھے ہے کہ نہیں اور یہ ہی ہوا جب وہ اندر پہنچا تو حبیبہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے اب یہ لڑکی۔

اس نے کوفت سے سوچا ہی تھا کہ وہ لاؤنج کے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے پاس کوک کے دو ٹن تھے جن میں سے ایک اس نے شاہ زین کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ۔" شاہ زین نے ٹن تھامتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"ویلکم۔" مختصر سا جواب دے کر وہ سامنے بنے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی۔ شاہ زین بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا اسی کاؤنٹر پر آگیا اور پھر کلیئرنس کے بعد وہ جہاز میں جا بیٹھے' جہاں سے اگلے چند گھنٹوں میں انہوں نے اپنے اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچ جانا تھا۔ اس چوبیس گھنٹے کے ساتھ میں شاہ زین نے محسوس کیا کہ حبیبہ خاصی سرد مزاج لڑکی ہے جس سے دوستی کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھائی آپ شام کو کتنے بجے تک فارغ ہوں گے؟"
وہ کھانا کھا رہا تھا۔ جب رابعہ نے اس سے سوال کیا۔
"کیوں... کوئی کام ہے؟" روٹی کا لقمہ بناتے ہوئے اس نے سوال کیا۔
"خالدہ خالہ نے ایک لڑکی بتائی ہے اور میں چاہ رہی تھی کہ آپ بھی میرے ساتھ چلتے' تاکہ بار بار نہ جانا پڑے اور آپ خود بھی سب کچھ پہلی دفعہ میں ہی دیکھ لیں۔ مطلب لڑکی کا خاندان اور گھر بار وغیرہ۔" جھجکتے ہوئے رابعہ نے اپنی بات مکمل کی۔
"ہوں..." صرف اتنا جواب دے کر اس نے اپنے قریب رکھا پانی کا جگ اٹھالیا۔ تھوڑا سا پانی گلاس میں انڈیل کر دو' تین بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور پھر کھانا درمیان میں ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ رابعہ کو لگا وہ ناراض ہو گیا ہے۔
"لڑکی کی عمر کیا ہے؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔ اس کے سوال نے رابعہ کا حوصلہ تھوڑا سا بڑھا دیا۔ ورنہ وہ تو مارے خوف کے اب آگے کوئی بات بھی کرنے والی نہ تھی۔
"خالہ نے تو چوبیس پچیس سال بتائی ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔
"تمہیں پتا ہے میری عمر کیا ہے؟"
"ہاں میں نے بتادی تھی چالیس سال؟" رابعہ نے جواب دیتے ہوئے یہاں وہاں نظریں گھمائیں۔
"جبکہ تم جانتی ہو میں پینتالیس کا ہو چکا ہوں' پھر تم نے جھوٹ کیوں بولا؟" اس نے اپنی گہری نظریں رابعہ پر گاڑیں۔
"اف و بھائی... آپ تو چالیس کے بھی نہیں لگتے اور ویسے بھی پہلے لڑکی تو دیکھ لیں... پھر ہی پتا چلے گا کہ اس کی بھی اصل عمر کیا ہے۔"
"دیکھو رابعہ اگر تمہیں میرے لیے کوئی رشتہ دیکھنا ہے تو چالیس سال سے اوپر کا دیکھو یہ بچیاں مت ڈھونڈو۔"
رابعہ کے لیے اتنا ہی غنیمت تھا کہ وجاہت نے ہاں تو کی... ورنہ اسے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جسے رابعہ کی اس حرکت پر وہ اسے بے تحاشا سنانے والا ہے۔ مگر اس کی توقع کے برخلاف اس نے رضامندی کا عندیہ دے دیا تھا اور رابعہ کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب گھبراہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی کمرے میں مکمل طور سے اندھیرا طاری تھا۔ شاید لائٹ چلی گئی تھی۔ اس نے ٹارچ کی تلاش میں یہاں وہاں ہاتھ مارا جب اچانک اس کی نگاہ بیڈ کے انتہائی قریب کھڑے اس شخص پر پڑی۔ وہ یک دم خوف زدہ ہو گئی۔ اس نے بستر کے دوسری جانب ہاتھ مارا۔ وہ حصہ خالی پڑا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے کمرے میں بالکل تنہا تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جب سامنے کھڑے ہیولے میں حرکت ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آگیا۔ اس شخص کے سامنے آتے ہی اندھیرے میں بھی اس کے نقوش واضح ہونے لگے۔ اسے احساس ہوا' وہ اس شخص کو جانتی ہے اور پھر اس کا چہرہ واضح ہو گیا۔
"تم..." اس کے حلق سے دبی دبی آواز نکلی۔
"مگر تم تو مر چکے ہو۔" وہ بیڈ پر پیچھے کی طرف سرکتے ہوئے چلائی۔ سامنے موجود شخص بنا کوئی جواب دیے۔ اس کے انتہائی قریب آگیا۔ اتنا قریب کہ اس کی سانس کی آواز اتنے خوف کے عالم میں بھی اس کے کانوں سے

ٹکرا رہی تھی مارے دہشت کے اس کے حلق سے تیز چیخ نکل گئی۔ اتنے میں روشنی کا تیز جھماکا ہوا۔ شاید لائٹ آگئی تھی۔ مگر اتنی دیر میں وہ بے ہوش ہو کر اپنے بستر پر گر گئی۔

☆ ☆ ☆

حبا کی سالگرہ قریب تھی جو ہر سال فضہ بھابھی بڑی دھوم دھام سے مناتی تھیں۔ حبا' حذیفہ اور مریم سے تقریباً" دو سال چھوٹی اور فضہ بھابھی کی اکلوتی بیٹی ہونے کے باعث خاصی لاڈلی تھی۔ زینب نے حساب لگایا ابھی اس کی سالگرہ میں پورے دو ماہ باقی تھے۔ اس بار زینب کا ارادہ بھی اس تقریب کے لیے نیا سوٹ بنانے کا تھا۔ جس کے لیے وہ پچھلے کئی ماہ سے بچت کر رہی تھی۔ اس نے اپنے گھر کے اسٹور میں رکھے بڑے سے ٹرنک سے اپنا ولیمہ کے سوٹ کا گرین دوپٹا نکال لیا تھا۔ جس پر بنا گوٹے کا کام آج بھی پہلے دن جیسا تھا۔ سادیہ کے ساتھ جا کر وہ دوپٹے کی میچنگ کا سادہ سوٹ لے آئی تھی اور پھر خود ہی مشین رکھ کر سی بھی ڈالا۔ فرہاد' مریم اور جگنو کی فراکیں خرید لایا تھا۔

ویسے بھی زینب کو اس بار سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ فنکشن میں شرکت کرنے اپنی ذاتی گاڑی سے جائے گی۔ اسے کبھی بھی اسفند بھابھی یا صمد کا اپنے لیے گاڑی بھیجنا اچھا نہ لگا تھا اور اپنی اسی خوشی میں وہ بڑے دل سے تیاریوں میں مصروف تھی کہ سالگرہ کا دن بھی آن پہنچا۔ سالگرہ کا یہ فنکشن ایک چھوٹے سے مقامی ہال میں رکھا گیا تھا۔ تیار ہونے کے بعد سادیہ نے اس کے بالوں کا بڑا سا جوڑا بنا دیا۔ گرین کلر اس پر ویسے بھی خوب کھل رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی خاندانی فنکشن میں شرکت کے حوالے سے اس قدر پرجوش تھی۔ جس کا اندازہ اس کی کئی ماہ قبل شروع کی گئی تیاریوں کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ مگر اس کا یہ سارا جوش و خروش اس وقت بالکل ماند پڑ گیا جب وہ تقریب میں شرکت کے لیے پہنچی۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ یہاں آئی ہی کیوں اور اس کا یہ افسوس آنے والے دنوں میں پچھتاوے میں تبدیل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

فضل دین کی کئی مس کالز آچکی تھیں۔ مگر انہیں ابھی تک اتنا ٹائم ہی نہ ملا تھا کہ کال بیک کر سکتے۔ دراصل آج وہ صبح سے ہی اپنے آفس ورک میں بری طرح مصروف تھے اور فضل دین سے ہونے والی ان کی گفتگو خاصی تفصیلی ہوتی تھی۔ جس کے لیے وقت درکار تھا۔ لنچ سے فارغ ہوتے ہی جیسے ہی انہیں موقع ملا فضل دین کا نمبر پہلی فرصت میں ملایا۔

"السلام علیکم سر جی۔" وہ یقیناً" ان ہی کی کال کا منتظر تھا۔ پہلی ہی بیل پر فون ریسیو کر لیا گیا۔

"وعلیکم السلام فضل۔۔۔ تمہیں پیسے مل گئے ہیں؟"

"جی سر جی اسی لیے میں آپ کو کال کر رہا تھا۔" وہ جلدی جلدی ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

"میں نے چھوٹی بی بی جی کی داخلہ فیس جمع کروا دی ہے۔ کتابیں اور یونیفارم کے بعد جو رقم باقی بچی تھی' وہ ان کے اکاؤنٹ میں ڈال دی ہے۔" اس نے مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔

"گڈ۔۔۔ بہت اچھا کیا۔" وہ جانتے تھے فضل دین پچھلے کئی سالوں سے ان کی یہ ذمہ داری بڑی ایمان داری اور رازداری کے ساتھ بخوبی نبھا رہا ہے۔ اس پر وہ اتنا ہی بھروسا کرتے تھے جتنا خود اپنی ذات پر۔

"اور بی بی جی۔۔۔ ٹھیک ہے؟ پڑھائی کیسی جا رہی ہے اس کی۔"

"سب کچھ بہت بہترین ہے سر جی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ بس وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"اچھا میں کوشش کروں گا۔ اسی ہفتہ وہاں کا ایک چکر لگاؤں اور ہاں میں تمہیں کچھ اضافی رقم بھیج رہا ہوں۔

ایسا کرو تم اسے اپنے ساتھ بازار لے جاؤ اور کچھ شاپنگ وغیرہ کروا دو۔ کالج کے حساب سے اسے جس جس چیز کی ضرورت ہو لے دینا۔"

"پیسے تو سر جی جو آپ نے پہلے بھیجے تھے وہ بھی میرے پاس موجود ہیں۔ کیونکہ بی بی جی نے کچھ بھی نہیں خریدا تھا۔ اس لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ آپ خود آئیں اور انہیں اپنے ساتھ لے جا کر شاپنگ کروا دیں۔ ہو سکتا ہے اس طرح وہ کچھ خرید لیں۔"

وہ جانتا تھا وہ کبھی بھی اس طرح بازار جا کر شاپنگ نہ کرے گی۔ وہ گزشتہ تین سالوں میں اس کی ہر عادت سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ وہ صرف ضروری گھریلو سامان کی لسٹ بنا کر اسے دیا کرتی جو فضل دین خود خرید کر اس کے حوالے کر دیتا۔ کپڑے وغیرہ تو وہ وہی استعمال کرتی جو ملک صاحب اس کے لیے لایا کرتے۔ فضل دین نے دیکھا۔ وہ کافی قناعت پسند تھی۔ ہر حال میں خوش رہنے والی یا شاید وقت کی کارگری اسے یہ سب کچھ سکھا گئی تھی اور یہ سب کچھ ملک صاحب بھی جانتے تھے۔ پھر بھی شاید اپنی تسلی کے لیے اسے وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ رقم بھیج دیا کرتے۔ چاہتے تھے اس کی کوئی خواہش ادھوری نہ رہے اور اس سلسلے میں وہ ہر ممکن کوشش کرتے۔

"ٹھیک ہے تم اسے بتا دینا.... میں ہفتہ کی صبح آؤں گا۔" انہوں نے دل ہی دل میں حساب لگا کر فضل دین کو بتا دیا۔

"ایک اور بات کہوں سر جی اگر آپ برا نہ مانیں۔" فضل دین نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کوئی بھی بات کرنے کے لیے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے جو کہنا چاہتے ہو بلا جھجک کہو۔ میں سن رہا ہوں۔"

"شکریہ سر جی یہ سب آپ کی عزت افزائی ہے۔" وہ انکساری سے بھرپور لہجہ میں بولا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو فضل دین اپنی بات بتاؤ۔"

"سر جی بات یہ ہے کہ اس بار آپ جب آئیں تو اپنے ساتھ ایشال صاحب کو بھی لے آئیں۔ اگر ممکن ہو تو..."

یہ وہ بات تھی جو کئی بار خود ان کے دل میں بھی آئی تھی۔ مگر اس سلسلے میں وہ آج بھی شاید اتنے ہی مجبور تھے۔ جتنے پہلے دن تھے اور یہ بات فضل دین بھی جانتا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں ان سے ایسی خواہش کر بیٹھا۔

"ہاں سوچا تو تھا کہ اسے اپنے ساتھ لے کر آؤں گا۔ مگر وہ ابھی تک یو کے میں ہی ہے۔"

جانتے تھے... اگر وہ یہاں ہوتا تو بھی کبھی ان کے ساتھ نہ جاتا۔ مگر یہ بات وہ خود کبھی بھی اپنے منہ سے فضل دین کو نہ کہہ سکتے تھے۔ شاید اس سے انہیں اپنی سبکی کا احساس ہوتا تھا۔

"اور یہ بات شاید میں نے تمہیں پہلے بھی بتائی تھی؟"

"جی سر جی۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"میں چھوٹی بی بی کو آپ کے آنے کا بتا دوں؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں... ہاں... بالکل بتا دو۔" اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے فون بند کر دیا۔ کاش وہ ایشال کو اس رشتہ کی اہمیت کا احساس دلا سکتے، جس میں وقت کے ہاتھوں وہ بندھ چکا تھا۔ مگر اپنی لاعلمی کے باعث غفلت کا شکار تھا، نہ صرف یہ بلکہ وہ لاشعوری طور پر عریشہ کی دل آزاری کا سبب بھی بن رہا تھا۔ جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی نہ تھا۔ وہ جس مضبوط بندھن میں بندھا ہوا تھا اسے توڑ کر عریشہ سے کوئی تعلق جوڑنا اتنا آسان نہ تھا، جتنا ان دونوں ماں بیٹا نے سوچ رکھا تھا۔ یہ بات ایشال سے زیادہ اس کی ماں کو سمجھنی چاہیے تھی اور وہ بھی یہ سب کچھ سمجھنے کو تیار نہ تھی۔ ورنہ شاید سب کچھ اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا ہو چکا تھا۔

انہوں نے اپنے ماتھے کو دو انگلیوں کی مدد سے دباتے ہوئے کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ وہ ٹینشن جو اس وقت بری طرح ان کے دماغ پر سوار تھی۔ اس سے پیچھا چھڑانے کا سب سے آسان حل اس وقت یہ تھا کہ خود کو ریلیکس چھوڑ دیا جائے۔ ایسے وقت وہ ہمیشہ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ آنکھیں بند کرکے ٹانگیں لمبی کرتے ہوئے اپنے دماغ کو تمام سوچوں سے آزاد کر دینا۔

☆ ☆ ☆

وہ جیسے ہی فرہاد کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی وہاں کی رونق دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ ہر طرف چمکتے دمکتے لباس والے لوگ، رنگ و نور کا ایک سیلاب سا اس کے چاروں طرف موجزن تھا۔ ایسی ہونٹنگ تو شاید کسی غریب کی شادی میں بھی نہ ہوتی ہوگی جو اس سالگرہ کے فنکشن میں دکھائی دے رہی تھی۔ روپے کا بے تحاشا اسراف ہر طرف نظر آ رہا تھا۔ یہاں وہاں نظر دوڑانے پر بھی اسے فضہ بھابھی کہیں دکھائی نہ دیں۔ وہ فرہاد کے ساتھ ایک قریبی ٹیبل پر جا بیٹھی۔ جب اچانک ہی سالار اپنی بیگم کو لیے ان کے ٹیبل کی جانب آگیا۔ جبکہ اسے سالار کی وہاں موجودگی کی بالکل بھی امید نہ تھی۔ اسی لیے وہ تھوڑا سا حیران ہو گئی۔

"میں کب سے وہاں اکیلا بیٹھا بور ہو رہا تھا کہ اچانک آپ لوگوں کو دیکھا تو سوچا کیوں نہ مل کر ایک دوسرے کی کمپنی کو انجوائے کیا جائے۔"

وہ بے تکلفی سے کرسی کھینچتا ہوا فرہاد کے قریب ہی بیٹھ گیا، جبکہ نازیہ، زینب کے برابر والی کرسی پر آبیٹھی اس کے بیٹھنے کے دوران ہی زینب ایک سرسری سی نگاہ میں اس کا مکمل جائزہ لے چکی تھی۔ قیمتی کپڑے کا سفید سوٹ، جو بے شک اس کے سانولے رنگ پر اتنا نہیں کھل رہا تھا۔ مگر پھر بھی قیمتی لباس، عالیشان جیولری اور مہنگے پرفیوم کی مہک سب مل جل کر زینب کو ایک عجیب سے کمپلیکس کا شکار کر رہے تھے۔ اس نے بے اختیار ہی ایک نظر اپنے دونوں ہاتھوں پر ڈالی جہاں کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں ذرا بھی نہ جچ رہی تھیں یا شاید اسے ہی ایسا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ دوپٹے کے اندر کر لیے۔ عین اسی وقت فضہ بھابھی ہال میں داخل ہوئیں۔ جب وہ نازیہ سے مرعوب بیٹھی تھی۔ ان کے ہیئر اسٹائل اور میک اپ کو دیکھ کر با آسانی اندازا لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پارلر سے سیدھی ہال ہی آئی ہیں۔ بلیک ستاروں والی ساڑھی کے ساتھ بلیک ہی اسٹون کی میچنگ جیولری ان پر خوب کھل رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی سیدھی وہ اسی ٹیبل پر آگئیں۔

"زینب کو تو میں نے پیچھے سے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

قریب آکر گلے ملتے ہوئے انہوں نے بظاہر سرسری سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"شاید اس کا دوپٹا اپنے ولیمہ کے سوٹ کا ہے۔ جسے دور سے دیکھتے ہی میں سمجھ گئی یہ یقیناً" زینب ہی ہوگی۔"

ہنس ہنس کر انہوں نے خوب اپنی زبان کے تیر چلائے۔ زینب جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔

"ویسے تمہارا دوپٹا ابھی تک ویسے کا ویسا ہی ہے۔ اتنے سالوں میں ذرا گوٹا خراب نہیں ہوا۔ چلو اچھا ہے ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ استعمال میں لے آئیں۔"

"ان کی شادی کو زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ سال ہوئے ہوں گے اور میرا نہیں خیال کہ اتنے کم عرصہ میں کچھ خراب ہو جائے۔ بشرطیکہ سنبھال کر رکھا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زینب خاصی سگھڑ ہے۔ کیوں زینب ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔"

سالار کی یہ کوشش اس کے چہرے پر چھائی شرمندگی کو دور کرنے کے لیے تھی۔ زینب نے کوئی جواب دیے بنا فرہاد پر ایک نظر ڈالی۔ جو فضہ بھابھی کے قریب کھڑے اسفند بھائی سے باتوں میں اس بری طرح مصروف تھا کہ

شاید اسے پتا ہی نہ چلا کہ فضہ بھابھی ۔ زبان کی کاری گری بڑی خوب صورتی سے دکھا کر اگلی ٹیبل کی جانب بڑھ گئی ہیں۔ اس کے بعد نازیہ اور سالار نے کافی کوشش کی کہ اپنی باتوں سے اس کے بگڑے موڈ کو بحال کر سکیں۔ مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ وہ فرہاد کے کئی بار کہنے پر بھی کیک کاٹتے وقت اسٹیج پر نہ گئی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر اس نے کچھ بھی نہ کھایا۔ وہ تمام خوشی جو اس تقریب میں شریک ہونے سے قبل اسے تھی۔ یک دم غارت ہو گئی اور جب تک وہ وہاں سے گھر واپس آئی نازیہ اس کا ایڈریس لے چکی تھی۔

"میں ان شاء اللہ تم سے ملنے جلد ہی تمہارے گھر آؤں گی۔" اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ نہایت پیار سے بولی۔

"ضرور آنا... میں انتظار کروں گی۔" نہایت آہستہ سے کہتے ہوئے وہ آگے کی جانب بڑھ گئی۔ فضہ بھابھی سے ملے بنا ہی وہ خاموشی سے باہر کھڑی اپنی گاڑی میں آن بیٹھی۔ سارے راستے فرہاد اس تقریب کے گیت گاتا رہا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھی کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے نظارے دیکھنے میں مگن رہی اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا فرہاد کیا کہہ رہا ہے شاید اسے فرہاد کی آوازیں سنائی ہی نہیں دے رہی تھیں اس کے کانوں میں صرف اور صرف فضہ بھابھی کی آواز گاہے بگاہے سنائی دے رہی تھی باقی دنیا کی ہر آواز ختم ہو گئی تھی وہ وقفہ وقفہ سے فرہاد کی بات کے جواب میں ہوں یا ہاں کر دیتی بالکل ایسے جیسے غائب دماغ ہو اور یہ بات شاید فرہاد نے بھی محسوس کر لی۔

"کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" بالآخر اس کی ہوں ہاں سے تنگ آ کر وہ پوچھ ہی بیٹھا۔

"کیوں میری طبیعت کو کیا ہونا ہے؟؟" جواباً اس نے چڑتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

"پتا نہیں جب سے واپس آئی ہو خاموش خاموش سی ہو اسی لیے پوچھ بیٹھا۔" جگنو اور مریم دونوں راستے میں ہی سو گئی تھیں انہیں بستر پر لٹا کر جیسے ہی وہ واپس کمرے میں آئی ایک بار پھر فرہاد نے سوال و جواب کی عدالت میں گھسیٹ لیا۔

"ایک بات تو بتائیں؟؟" وہ بستر پر فرہاد کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں پوچھو..." فرہاد نے تکیہ اپنی کمر کے پیچھے درست کرتے ہوئے کہا۔

"یہ فضہ بھابھی ہر وقت مجھ سے اتنا جیلس کیوں رہتی ہیں؟؟"

اپنی بات کی وضاحت شاید اس سے زیادہ بہتر انداز میں وہ نہیں کر سکتی تھی۔

"تم سے جیلس..."

فرہاد نے اسے حیرت سے تکا زینب کی بات سن کر اس کے چہرے کے تاثرات بھی کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔

"وہ بھلا تم سے کیوں جیلس ہوں گی۔" اس کی بات نے فرہاد کو ہکا بکا کر دیا تھا۔

"اگر جیلس نہ ہوتیں تو کیوں میرے اچھے خاصے سوٹ میں سب کے سامنے کیڑے نکالنے کھڑی ہو گئیں۔"

وہ اپنا دل فرہاد کے سامنے ہلکا کرنا چاہتی تھی جو جانے کب سے بھرا پڑا تھا۔

"حد ہے زینب تم ہر بات کو اتنا غلط رخ کیوں دیتی ہو وہ تو تعریف کر رہی تھیں کہ تم نے اپنے ولیمہ کا دوپٹا اس قدر سنبھال کر رکھا کہ آج تک نیا ہی دکھائی دے رہا ہے۔"

"ضروری تھا سب کے سامنے یہ وضاحت کرنا کہ میں نے پرانے دوپٹے کے ساتھ سوٹ بنایا ہے۔" وہ قطعی ہار ماننے کو تیار نہ تھی۔

"میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ تم بلاوجہ فضہ بھابھی سے اس قدر خار کیوں کھاتی ہو جو ان کی ہر اچھی بات میں بھی برائی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتی ہو۔"

"اس لیے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی بھی کوئی اچھی بات کی ہی نہیں ہے۔"

فضہ بھابھی نے جان بوجھ کر سالار اور نازیہ کی موجودگی میں جو آگ اس کے دل میں لگائی تھی وہ کسی طرح بجھنے میں ہی نہیں آرہی تھی ورنہ عام طور پر وہ کبھی بھی فرہاد کے ساتھ اس طرح بحث نہ کیا کرتی تھی۔

"پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تم خودان کے گھر کی رونق دیکھ کر جیلس ہو گئی ہو۔"

"میں جیلس ہو گئی ہوں؟" فرہاد کے بے رحمی سے کیے گئے تجزیہ نے اسے مزید دکھی کر دیا۔

"ہاں تم جو کبھی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتیں کہ ہر انسان اتنا ہی خرچ کرتا ہے جتنی اس کی حیثیت ہوتی ہے اور نہ ہی تم یہ مانتی ہو کہ ہم حیثیت اور رتبہ میں اسفند اور صمد بھائی کے مقابلے میں کہیں کمتر ہیں اس لیے کیا ضرورت ہے کسی بھی معاملے میں ان کے ساتھ محاذ آرائی کرنے کی جب کہ یہ پتا بھی ہو کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے ان جیسی کم ظرف عورت سے مقابلہ بازی کرنے کا۔"

اس نے غصہ سے جواب دیتے ہوئے کروٹ بدل لی اس طرح شاید وہ اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو چھپانا چاہتی تھی اس وقت اسے فرہاد کے سامنے بھی اپنے آنسو نظر آنا اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔

"ہر بات اپنے دل پر مت لیا کرو زینب۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"مجھے نیند آرہی ہے اب باقی بات ہم بعد میں کریں گے لائٹ بند کر دیں۔"

اپنے لہجہ کی نمی کو چھپاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی اور پھر اس کی رات بستر پر کروٹیں بدلتے ہی گزر گئی فضہ بھابھی کا حقارت آمیز انداز اسے رہ رہ کر یاد آ آ گیا وہ ساری رات کوئی ایسا طریقہ سوچتی رہی جس سے انہیں نیچا دکھا سکے وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتی تھی مگر کیسے اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا اور پھر اسی طرح جلتے کڑھتے کب اس کی آنکھ لگی اسے پتا ہی نہ چلا۔

☼ ☼ ☼

"اف خالہ اتنی موٹی لڑکی۔۔۔" گھر کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی فائزہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اے لو تم نے ہی تو کہا تھا لڑکی خوب گوری چٹی اور خوب صورت ہو۔"

خالہ نے برقعہ کا نقاب الٹتے ہوئے فائزہ کو گھورا۔

"گوری چٹی اور خوب صورت لڑکی اک ذرا سی موٹی ہو گئی تو کون سی قیامت آگئی۔" خالہ قدرے برا مناتے ہوئے بولیں۔

"اللہ معاف کرے خالہ یہ ذرا سی موٹی تھی۔" فائزہ' رابعہ کے گھورنے کے باوجود پھر سے بول پڑی۔

"خالہ تم کیوں اتنا ناراض ہو رہی ہو اچھی طرح جانتی ہو وجاہت بھائی نے لڑکی کے سلسلے میں کوئی ڈیمانڈ نہیں رکھی سوائے خوب صورتی کے' کم عمری' اعلا تعلیم' حیثیت و رتبہ کچھ بھی تو ان کے نزدیک اہم نہیں ہے سوائے شکل کے' عمر بھی بے شک تیس سے اوپر ہو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

رابعہ نے انہیں سمجھاتے ہوئے کچھ دور کھڑے رکشا کو اشارے سے قریب بلایا۔

"دیکھو بی بی صاف بات اتنی ہے کہ تمہارا بھائی شادی ہی نہیں کرنا چاہتا تب ہی تو ایسی شرط رکھی ہے۔"

"خالہ اب خوب صورت بیوی کی خواہش رکھنا ایسا بھی برا نہیں کہ تم ہمارے بھائی پر اس طرح کے الزام لگانے لگو۔"

فائزہ ایک بار پھر درمیان میں بول پڑی۔

"پینتالیس سال کے مرد کو تو سلیقہ شعار عورت کی خواہش کرنی چاہیے ناکہ کسی حسن کی دیوی کی' تیس سال کے

بعد تو ویسے ہی عورت کا حسن ماند پڑ جاتا ہے اور پھر اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے کم عمری لڑکی بھی اسے پسند نہیں ہے اسے سمجھاؤ صورت چھوڑے سیرت دیکھے زندگی اچھی سیرت کے ساتھ نبھانا زیادہ آسان ہے بانسبت اچھی صورت کے۔"

"دیکھو خالہ سچ تو یہ ہے کہ ایک ملاقات میں کسی کی بھی اچھی سیرت کا پتا نہیں چلتا البتہ صورت دکھائی دے جاتی ہے تو پھر کیوں نہ اس پر توجہ دی جائے جو نظر آتا ہے۔"

اس نے باقاعدہ جتاتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو خالہ آجاؤ رکشا میں بیٹھو باقی باتیں گھر جا کر کر لینا۔" تب تک دیر میں رابعہ رکشا والے سے رقم طے کر چکی تھی۔

"مجھے تو کہیں اور جانا ہے لڑکی دکھانے۔ تم دونوں بہنیں جاؤ ہاں مجھے کچھ رقم ضرور دے جاؤ تاکہ میں واپسی میں خود ہی رکشا کروا کر آجاؤں۔"

رابعہ کو لگا خالہ ابھی تک ناراض ہیں بنا کوئی بات کیے اس نے خاموشی سے اپنے پرس سے دس دس کے کچھ نوٹ نکال کر ان کے حوالے کر دیے "ایک بات اور ہے بیٹا جو دل میں آئی تو سوچا کہہ دوں یاد رکھنا جب مرد کو باہر کے کھانے کی عادت ہو جائے تو وہ گھر میں راشن ڈالنے سے گریز کرتا ہے اور اب شاید مشکل ہی ہے کہ تمہارے بھائی کو بھی اس عمر میں کوئی لڑکی پسند آئے۔"

"تو خالہ ابھی تو کوئی چار پانچ لڑکیاں بھی بمشکل تم نے دکھائی ہیں اس پر بھی اتنی باتیں اور ناراضی کا اظہار کرنے لگی ہو کہ بنا جانے ہی میرے شریف بھائی پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے جا رہی ہو۔"

فائزہ کو ایک بار پھر سے ان پر غصہ آگیا اس سے قبل رابعہ کچھ کہتی خالہ نے بنا کوئی جواب دیے تیزی سے روڈ کراس کیا اور آگے کی جانب بڑھ گئیں "کیا ضرورت تھی فائزہ تمہیں ان سے اس قدر الجھنے کی۔"

رابعہ نے رکشا میں بیٹھتے ہوئے فائزہ کو سمجھایا۔

"میں بلاوجہ نہیں الجھی وہ ہی بنا کسی سبب کے ناراض ہوئے جا رہی تھیں ہم نے انہیں رشتہ دکھانے کے پیسے دیئے ہیں اب جب کوئی لڑکی پسند آئے گی تو ہاں کریں گے ضروری تھوڑی ہے ان کی دکھائی گئی عجیب و غریب کسی بھی لڑکی کو گھر لا کر اپنے ہیرے جیسے بھائی کے ساتھ منڈھ دیں۔"

"بری بات فائزہ کسی کی بیٹیوں کے بارے میں اس طرح کے الفاظ منہ سے نہیں نکالتے اور جہاں تک خالہ کا سوال ہے ان کی تو عادت ہے جلدی غصہ کرنے کی۔"

رابعہ نے اسے گھرکا وہ بنا کوئی جواب دیے رکشا سے منہ باہر نکالے آتے جاتے نظارے دیکھنے لگی بالکل ایسے جیسے اس نے رابعہ کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"میرا خیال ہے اب جب خالہ کہیں تو رشتہ دیکھنے کے لیے میں اکیلی ہی جاؤں کیونکہ تم دونوں کے آپس کے اختلافات ہمیں اپنی کوششوں میں جلد کامیاب نہ ہونے دیں گے۔" رابعہ نے دل ہی دل میں کیا جانے والا فیصلہ اسے سنا دیا۔

"جیسے تمہاری مرضی کرو۔" فائزہ نے مختصر جواب دے کر بات ختم کر دی اور پھر سارے راستے ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر دوبارہ بات نہ ہوئی۔

☆ ☆ ☆

"جانتے ہو میں کب سے صرف تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" وہ اپنے دونوں بازو کھولے آہستہ آہستہ ایشال

کی جانب بڑھی آس پاس پھیلے اندھیرے کے باعث وہ اسے پہچان نہ پایا پھر بھی جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی اسے جانتا ہو۔

"کون ہو تم۔"

وہ خوف زدہ ہوتے ہوئے پیچھے کی جانب سرک گیا۔ اتنی دیر میں وہ سبز دوپٹے والی لڑکی اس کے انتہائی قریب آچکی تھی پھر بھی اس کی شکل واضح نہ ہوئی تھی۔

"تم نے مجھے ابھی بھی نہیں پہچانا۔" وہ اس کے کان کے قریب آکر بولی اس کی سانس لینے کی تیز آواز ایشال کے کانوں سے ٹکرائی ایشال نے دیکھا اس کے سامنے کے دونوں دانت بڑے ہو چکے تھے اور آنکھوں کی جگہ بڑے بڑے حلقے تھے سوکھے سوکھے بازو جو وہ اس کی طرف پھیلائے ہوئے تھی ایشال کو محسوس ہوا کہ خوف کے مارے اس کی سانس بند ہو جائے گی اب وہ مزید پیچھے نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ پیچھے کی جانب دیوار تھی اور آگے بالکل سامنے وہ سبز دوپٹے والی لڑکی یک دم وہ عالم خوف میں چلایا۔

"مما۔۔ مما"

"کیا ہوا ایشال" کسی نے اسے بری طرح جھنجوڑ کر جگایا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں سامنے عریشہ اور اس کی روم میٹ دیوینا کھڑی تھیں شاید وہ برابر والے کمرے سے ایشال کی چیخ کی آواز سن کر آئی تھیں وہ مارے شرمندگی کے اٹھ بیٹھا وہ پسینہ میں بری طرح شرابور تھا جب کہ وہاں اس وقت اچھی خاصی ٹھنڈ تھی۔

"کیا ہوا کیوں اتنی بری طرح چیخ رہے تھے۔" اسے خاموش دیکھ کر عریشہ نے اپنا سوال ایک بار پھر سے دہرایا۔

"کچھ نہیں شاید میں خواب میں ڈر گیا تھا۔"

"اُفوہ اتنے بڑے ہو کر بھی تم ابھی تک خوابوں میں ڈر جاتے ہو۔"

عریشہ اپنے خوبصورت دانت کھول کر ہنسی اسے ہمیشہ سے ہی عریشہ کے موتیوں جیسے دانت بے حد پسند تھے سفید چمکیلے بالکل پرل جیسے قیمتی دانت۔

"پہلے تو کبھی نہیں ڈرا آج جانے نہیں کیوں ایسا ہوا۔" وہ اپنے اس بری طرح چیخنے پر ابھی تک شرمندہ تھا۔

"چلو کوئی بات نہیں کبھی کبھی ایسا ہی ہو جاتا ہے ڈونٹ وری۔" دیوینا اس کی شرمندگی دور کرتے ہوئے بولی۔

"آجاؤ باہر بارش میں تھوڑا سا واک کرتے ہیں تم بھی فریش ہو جاؤ گے۔" عریشہ نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

"واؤ باہر بارش ہو رہی ہے۔" وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اسے ہمیشہ سے ہی بارش بہت اچھی لگتی تھی۔

"ہاں تم تو سرشام ہی سو گئے تھے اس لیے ہم نے نہیں جگایا ابھی بھی ہم دونوں سریش کے ساتھ باہر ہی نکل رہے تھے کہ ایک دم تمہاری چیخ کی آواز نے اپنی جانب متوجہ کر لیا اب سریش تو شاید باہر جا چکا ہے لہٰذا بہتر ہوگا کہ تم ہمارے ساتھ آجاؤ۔" عریشہ نے اسے مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔

"وائے ناٹ۔۔ شیور" اس نے جلدی جلدی بیڈ کے قریب رکھے اپنے سلیپر پہنے تکیے کے نیچے رکھا والٹ نکال کر ٹراوزر کی جیب میں ڈالا اور ان دونوں کے پیچھے باہر آگیا ویلیم روڈ کے دونوں جانب لگے بلب کی روشنی میں بڑی سی تارکول کی سڑک پر گرتی چھوٹی چھوٹی بارش کی بوندیں بہت اچھی لگ رہی تھیں اس کی طبیعت پر چھایا بوجھل پن فوراً ہی دور ہو گیا وہ یک دم فریش ہوا تھا۔

"آجاؤ آئس کریم کھائیں۔" تھوڑی سی واک کے بعد سڑک کے دوسری جانب موجود آئس کریم پارلر کی لائٹس نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا اور وہ بنا کسی کا جواب سنے اس جانب بڑھتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے تو یہ فضہ بھابھی خاصی عجیب سی لگیں۔" نازیہ نے اپنے کپڑے تہہ کر کے رکھتے ہوئے سالار کی جانب دیکھا جو بالکل چت لیٹا ایک ٹک چھت پر جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔
"میں آپ سے بات کر رہی ہوں سالار۔"
کچھ دیر جواب کا انتظار کرنے کے بعد اس نے سالار کا کندھا ہلکے سے ہلایا۔
"ہاں۔۔ ہاں۔" وہ یک دم چونک اٹھا۔
"کیا کہہ رہی ہو پھر سے کہنا میں نے سنا نہیں۔" وہ بالکل غائب دماغی سے بولا۔
"میں کہہ رہی تھی یہ فضہ بھابھی کچھ عجیب سی ہیں بجائے زینب کی خوبصورتی کو سراہنے کے اس کے دوپٹے کی تاریخ بیان کرنے بیٹھ گئیں مجھے تو بہت عجیب۔۔ لگا ان کا اس طرح تبصرہ کرنا جب کہ زینب اس سوٹ میں بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔"
نازیہ نے سادہ دلی سے کھل کر زینب کی تعریف کی وہ سالار کے دل کی حالت سے بالکل بے خبر تھی۔
"واقعی زینب بہت خوبصورت ہے۔"
وہ دھیرے سے بولا بالکل ایسے جیسے سوائے اس ایک جملے کے اس نے نازیہ کی کوئی اور بات سنی ہی نہ ہو نازیہ الماری کھولے اپنی جیولری رکھنے میں اس بری طرح مگن تھی کہ اس تک سالار کی آواز تو ضرور پہنچی مگر یہ نہ سمجھ پائی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔
"کچھ کہا آپ نے۔۔۔؟"
الماری کے پٹ بند کر کے اس نے پلٹتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں میں سن رہا ہوں جو تم کہہ رہی ہو۔"
"آپ نے شاید دیکھا نہیں ہال میں داخل ہوتے ہی فضہ بھابھی کی جوں ہی پہلی نگاہ زینب پر پڑی ان کے چہرے کے تاثرات اس قدر عجیب سے ہو گئے تھے کہ میں تو حیران ہی رہ گئی مجھے فوراً" ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جیلس ہو گئی ہیں جس کی تصدیق فوراً" ان کی دوپٹے پر کی جانے والی تنقید نے کر دی بھلا کیا تک تھی سب کے سامنے یہ جتانے کی کہ دوپٹا تمہارے ولیمہ کے سوٹ کا ہے مجھے تو ان کی یہ بات بہت ہی فضول لگی۔" وہ مسلسل بولے جا رہی تھی یہ جانے بغیر کہ اس کی یہ باتیں کس طرح سالار کے دل پر جا کر لگ رہی ہیں اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا تو اس طرح زینب کے حسن کے قصیدے نہ پڑھتی مگر وہ اپنی لاعلمی کے باعث سالار کے دل میں آگ لگانے کا سبب بن رہی تھی۔ "لائٹ آف کرو مجھے نیند آرہی ہے۔"
سالار کا بالکل دل نہ چاہا کہ اس کی کسی بھی بات کا جواب دے اسی لیے آنکھیں موند کر سوتا بن گیا وہ فوری طور پر خوابوں کی وادی میں اترنا چاہتا تھا جہاں کئی دنوں سے زینب کا راج تھا اس کی آنکھیں زینب کے خواب دیکھنے کی خواہش میں ہی بند ہوتی تھیں وہ خواب جن میں ہمیشہ وہ اس کے سنگ ہوتی فرہاد اور نازیہ دونوں کا ان خوابوں میں کہیں دور دور تک گزر نہ تھا ابھی بھی ایسا ہی ہوا آنکھیں بند کرتے ہی زینب کا خوبصورت ہیولہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا سالار کا دل اندر تک خوشی سے بھر گیا اب ساری رات زینب اس کے ساتھ تھی صبح کے اجالے تک وہ صرف اور صرف اس کی تھی بے شک خوابوں میں ہی سہی۔

☼ ☼ ☼
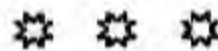
"امی مجھے اس بار عید پر اچھا والا نیا سوٹ لینا ہے بالکل رویا جیسا۔"
وہ ضد کرتے ہوئے بولی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا ورنہ وہ تو کافی صابر و شاکر سی بچی تھی ہمیشہ اپنے حال میں خوش

رہنے والی۔

"کل جو میں نے تمہیں سوٹ سی کر دیا ہے وہ اچھا نہیں ہے کیا؟"

اپنی بیٹی کی اس فرمائش نے انہیں تھوڑا سا حیران کر دیا۔

"نہیں میں سب کے عید کے کپڑے دیکھ کر آئی ہوں وہ بہت اچھے اور خوبصورت ہیں میرا سوٹ بالکل بے کار ہے مجھے نہیں پسند آپ مجھے ویسا سوٹ بنا کر دیں جیسا امین کی امی نے اس کے لیے آپ سے سلوایا ہے یا پھر زویا جیسا لے کر دیں یہ سوٹ میں نہیں پہنوں گی۔"

اس نے چارپائی پر رکھا سوٹ اٹھا کر اپنی ماں کے سامنے لا پٹخا۔

"ان کے سروں پر ان کے باپ سلامت ہیں جب کہ تم یتیم ہو تمہاری پرورش کے اخراجات میں نے ہمیشہ ان جیسے لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے پورے کیے ہیں پھر بھلا ان سے کیا مقابلہ؟"

وہ شروع سے ہر بات اتنی ہی صفائی سے سمجھانے کی عادی تھیں تاکہ بیٹی کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔

"کیوں شاہین کے بھی تو ابو نہیں ہیں پھر کیوں اس کی ہر چیز اتنی اچھی ہوتی ہے۔"

آج وہ مکمل طور پر بحث کرنے کے موڈ میں تھی۔

"شاہین کا سب کچھ کرنے کے لیے اس کے چچا اور ماموں سلامت ہیں اور تمہارا کوئی بھی نہیں اسی لیے میں اتنا ہی کر سکتی ہوں جتنی میری اوقات ہے اس سے نہ کچھ کم نہ زیادہ اگر سوٹ پسند نہیں ہے تو باہر رکھے کچرے کے ڈرم میں ڈال دو میں تمہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں لے کر دے سکتی۔"

انہوں نے سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے ہر بات یکسر ختم کر دی یہ جانے بنا کہ ان کی اس بات کے رد عمل میں معصوم بچی کے دل کو کس قدر ٹھیس پہنچی ہے۔ "بیٹا دیکھ لو شاپنگ مکمل ہو گئی یا کچھ اور بھی لینا ہے۔"

وہ ماضی کی یادوں میں اس بری طرح گم تھی کہ اسے ملک انکل کی آواز بھی سنائی نہ دی جو نہ جانے کب سے اسے پکار رہے تھے وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"جی انکل۔" اپنے خیالوں سے چونکتے ہوئے بے اختیار بولی۔

"تمہیں کچھ اور لینا ہے۔"

ملک انکل کے پوچھے گئے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے فضل دین کے ہاتھوں میں تھامے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ بیگز پر ایک نظر ڈالی۔

"واہ میرے مولا تیرے بھی انداز نرالے ہیں جب ماں تھی تو ہر خواہش لاحاصل رہی اور آج ماں کے مرنے کے بعد ہر خواہش پایہ تکمیل پر پہنچنے کے لیے میرے ایک اشارے کی منتظر ہے آج جو رشتہ میرے پاس ہے وہ اپنے پیسے کے زور پر میری ہر خواہش پوری کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار مگر خواہش ایسے جیسے ختم ہی ہو گئی ہوں۔"

"نہیں انکل جی بہت بہت شکریہ آپ جو کچھ میرے لیے کر رہے ہیں میں تو شاید اس کے قابل بھی نہ تھی۔"

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا سی گئی۔

"بری بات بیٹا اپنوں کا اس طرح شکریہ ادا نہیں کیا جاتا جو کچھ میں تمہارے لیے کر رہا ہوں وہ کوئی احسان نہیں بلکہ تمہارا حق ہے مجھے تو افسوس ہے اتنا عرصہ میں کیسے تم لوگوں سے غافل رہا۔"

انہوں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا وہ بالکل خاموش تھی۔

"فضل دین گاڑی کسی اچھے سے ریسٹورنٹ کی جانب لے چلو مجھے اور میری بیٹی کو بہت سخت بھوک لگی ہے۔"

اسے اپنے ساتھ لگائے گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے انہوں نے فضل دین کو حکم دیا۔

"جی سر جی۔" فضل دین نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے تمام شاپنگ بیگ اندر رکھ دیے اور خود ڈرائیونگ

سیٹ سنبھال لی۔ وہ جانتا تھا کہ ملک صاحب کو اس شہر میں کہاں کا کھانا پسند ہے لہٰذا اس نے اپنی گاڑی کا رخ اس طرف موڑ دیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ لڑکی کون ہے؟" وہ کمپیوٹر میں ڈیٹا فیڈ کرنے میں بری طرح مصروف تھا جب اچانک اپنے قریب سنائی دینے والی مما کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"کون سی لڑکی؟" وہ سمجھ نہ پایا وہ کس کی بات کر رہی ہیں۔

"وہ جو سامنے والے کیبن کے دروازے کے باہر کھڑی ہے۔"

شاہ زین نے ان کے متوجہ کروانے پر اپنی نگاہ شیشے کی دیوار کے اس پار دوڑائی جہاں رائل بلیو جارجٹ کے سوٹ میں ملبوس حبیبہ کھڑی کرن سے باتیں کر رہی تھی کرن کو اس کی ماں جانتی تھی تو یقیناً" ان کا سوال حبیبہ کے لیے ہی تھا۔

"یہ حبیبہ ہے مما آفس کے اکاؤنٹ سیکشن میں ہوتی ہے۔"

وہ اسے دیکھتا ہوا بولا اتنی دور سے بھی حبیبہ کی خوب صورتی بالکل الگ سے دکھائی دے رہی تھی۔

"پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" وہ اپنے دماغ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

"ضرور دیکھا ہوگا یہ کمپنی کے سالانہ ڈنر میں بھی موجود تھی۔"

"مجھ سے ملی تھی؟" وہ ابھی بھی اسے ہی دیکھے جا رہی تھیں جو ان سے بے خبر کرن سے جانے کس گفتگو میں بری طرح مصروف تھی۔

"نہیں کیوں کہ اس کے آنے کے چند ہی لمحوں بعد آپ ماموں کی طرف چلی گئی تھیں۔"

"او اچھا۔" وہ کچھ الجھی ہوئی تھیں۔

"ویسے ایک بات ہے یہ لڑکی بہت خوب صورت ہے۔" وہ ابھی بھی اس کی طرف متوجہ تھیں۔

"صحیح کہا آپ نے اتنا مکمل اور پرفیکٹ حسن کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔"

شاہ زین نے بھی کھلے دل سے اس کی تعریف کی۔

"پتا نہیں کیوں مجھے عورت کے اس قدر حسن سے ڈر لگتا ہے نصیب کا تعلق کبھی بھی حسن سے نہیں رہا اور میں تو ہمیشہ سے یہ ہی دعا کرتی ہوں اے اللہ شکل سے زیادہ نصیب اچھا کرنا۔"

وہ ایک جھرجھری سی لیتے ہوئے بولیں ان کی یہ نرالی منطق شاہ زین کی سمجھ میں بالکل نہ آئی مگر جواباً" وہ خاموش رہا اس کا ارادہ اپنی ماں سے کسی بھی قسم کی بحث کرنے کا بالکل نہ تھا۔

"اچھا بیٹا میں چلتی ہوں۔" وہ اپنے موبائل پر بجنے والے میوزک کی آواز سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"نیچے ڈرائیور آگیا ہے اس نے ابھی مجھے مس کال دی ہے ہم سب تمہارے ماموں کی طرف جا رہے ہیں تم بھی فارغ ہو کر وہیں آجانا۔"

اپنا قیمتی ہینڈ بیگ اٹھا کر انہوں نے بازو پر ڈالا اور گاگلز بالوں پر اچھی طرح جماتے ہوئے باہر کی جانب چل دیں۔

شاہ زین انہیں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئیں وہ جو سمجھ رہا تھا کہ اس کی ماں کرن یا حبیبہ کے پاس ایک پل رک کر ان کی خیریت ضرور دریافت کرے گی مگر ایسا نہ ہوا وہ دونوں کو یکسر نظر انداز کرتی ہوئی گزر گئیں وہ ایسی ہی تھیں اگر کسی سے دوستی کرتیں تو جان تک لٹا دیتیں ورنہ عام طور پر کسی سے سلام دعا بھی بمشکل لیا کرتیں ان کی اس عادت سے شاہ زین بچپن سے ہی واقف تھا۔

(باقی آئندہ)

☼ ☼

راشدہ رفعت

"مجھے آپ کے ذہنی کرب کا اندازہ ہے مسز نعیم' لیکن پلیز آپ حوصلہ رکھیے' اللہ نے چاہا تو آپ کی بچی کا رشتہ بہت اچھی جگہ طے ہو جائے گا۔" میں نے اپنے سامنے بیٹھی خاتون کو نرمی سے سمجھایا تھا۔ انہوں نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اثبات میں گردن ہلائی۔ ٹشو سے آنکھیں پونچھیں' لیکن چند لمحوں میں ہی آنکھیں پھر سے ڈبڈبا گئی تھیں۔

میں جانتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو کمپوز کرنے کی کوشش کر رہی ہیں' لیکن زندگی میں کوئی کوئی لمحہ ایسا آتا ہے جب انسان کا خود پر سے اختیار اٹھ جاتا ہے اور ایسی ماں جس کی بیٹی کو بار بار مسترد کیا جائے شاید اس کا حوصلہ وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہوتا جاتا ہے۔ میں مسز نعیم کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہی تھی۔ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن انہیں تسلی دینے کے سوا میرے بس میں کچھ نہ تھا۔

میں مسز آمنہ خاور' شہر کی جانی پہچانی میچ میکر ہوں۔ پچھلے پندرہ برسوں سے ملن میرج بیورو بہت کامیابی سے چلا رہی ہوں۔ حالانکہ پیشے کے اعتبار سے میں ایک ٹیچر تھی۔ پھر جانے کیسے ٹیچر سے "وچولن" بن گئی۔ مجھے یاد ہے میں نے پہلا رشتہ اپنی ایک اسٹوڈنٹ کا ہی کروایا تھا۔ میں شہر کے مشہور گرلز کالج میں اردو کی تدریس کرتی تھی۔ شمائلہ میری چہیتی اسٹوڈنٹ تھی۔ بہت پیاری اور نٹ کھٹ سی۔

میری جیٹھانی کی بڑی بہن اپنے بیٹے کے رشتے کی تلاش میں تھیں۔ ایک دن باتوں' باتوں میں انہوں نے ذکر کیا کہ وہ کیسی بہو کی خواہش مند ہیں۔ ان کی باتیں سن کر میرے ذہن میں چھم سے شمائلہ کا تصور آگیا' میں نے ہنستے ہوئے ان سے ذکر بھی کر دیا کہ میری ایک اسٹوڈنٹ ان کی من پسند بہو کے خاکے پر پوری اترتی ہے۔ میں نے تو ویسے ہی بات برائے بات کی تھی' لیکن نیلو فرباجی میرے سر ہو گئیں کہ میں انہیں اس لڑکی کے نام' پتے سے آگاہ کروں۔ میں نے پہلے تو انہیں ٹالنے کی کوشش کی' لیکن پھر شمائلہ سے اس کے گھر کا ٹیلی فون نمبر لے کر اس کی والدہ سے بات کی۔ ان کی رضامندی پا کر میں نیلو فرباجی کو ان کے گھر لے گئی۔ خوش اسلوبی سے سارے مرحلے طے ہوتے گئے۔ بی اے کے امتحانوں سے پہلے شمائلہ کا بیاہ ہو گیا تھا۔

آج ماشاء اللہ تین تین پیارے پیارے بچوں کی ماں ہے' وہ جہاں اتنے اچھے گھرانے میں رشتہ کروانے پر آج بھی میری مشکور ہے' کبھی کبھار شکوہ بھی کر دیتی ہے کہ میری وجہ سے اس کا بی اے مکمل نہ ہو سکا۔ شمائلہ کی شادی کے کچھ ہی دنوں بعد اتفاق سے ایک اور رشتہ میری معرفت طے پایا۔

میری چھوٹی بہن کی ساس اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش کر رہی تھیں۔ میں انہیں بیگ صاحب کے ہاں لے گئی۔ بیگ صاحب ہمارے پڑوسی تھے۔ برسوں کا ساتھ تھا۔ وہ اور ان کی بیگم اپنی بچیوں کی شادی کی وجہ سے بہت پریشان تھے اوپر تلے کی چار بچیاں تھیں۔ زیور تعلیم سے آراستہ' خوب صورت اور سگھڑ بچیاں تھیں' مگر سفید پوش گھرانہ

تھا۔ گھر کے سازو سامان سے ہی مکینوں کی مالی حالت کا پتا لگ جاتا تھا۔ رزق حلال پر گزر بسر کرنے والے اس وضع دار گھرانے کی پریشانی دیکھ کر دل بہت دکھتا تھا۔ شمع (میری چھوٹی بہن) کا سسرال مثالی سسرال تھا۔ روپے پیسے کی بہت فراوانی نہ سہی گھر والوں میں بہت کشادگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تینوں بہوئیں بہت سلوک سے ایک ہی چھت تلے رہ رہی تھیں اور اب شمع کی ساس کو چھوٹی اور آخری بہو کی تلاش تھی۔

انہوں نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے انہیں بیگ صاحب کی فیملی سے ملوا دیا۔ فریقین کو یہ رشتہ اتنا پسند آیا کہ جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی صورت حال پیش آگئی۔ پھر اللہ کے فضل سے بیگ صاحب کی منجھلی بیٹی کا رشتہ کروانے کی نیکی بھی میرے حصے میں ہی آگئی۔ میری کولیگ عرفانہ کے بیٹے سے ندا کا رشتہ طے پایا۔ پھر بڑی پھوپھو کی پوتی نغمانہ، خاور (میرے سرتاج محترم) کے چچازاد بھائی کی بہو بنی۔ یہ رشتہ بھی اللہ کی مرضی کے بعد سراسر میری کاوشوں سے طے ہوا تھا۔ میں بیتے

برسوں پر نظر ڈالوں تو یہ اتفاقات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ قدرت مجھے اس کام کے لیے منتخب کرچکی تھی۔ اللہ کے فضل سے میرے طے کروائے گئے ننانوے فیصد رشتے کامیاب ثابت ہوئے تھے۔

آس پڑوس' خاندان' برادری' دوست احباب سب ہی مجھ پر اس معاملے میں اعتبار کرنے لگے تھے۔ میرے تعلقات میں حیران کن حد تک وسعت آگئی تھی۔ اکثر فون کی گھنٹی بجتی تو کوئی اجنبی آواز بہت اپنائیت بھرے لہجے میں مخاطب ہوتی۔

''امینہ باجی۔۔۔ میں رفعت کی خالہ کی بہو بات کررہی ہوں۔ رفعت کی چھوٹی بہن کا رشتہ آپ نے کروایا تھا۔ میری بہن کے لیے بھی کوئی اچھا سا رشتہ بتایئے گا۔'' اتنے مان اور اعتبار سے مجھ سے مدد مانگی جاتی کہ میں کسی اچھے سے رشتے کے لیے سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگتی۔ رفعت میری بچپن کی ہمجولی تھی۔ اس کی خالہ کی بہو سے میرا کوئی تعلق تو نہ تھا' لیکن وہی بات کسی کے کام آنا تو ثواب کی بات تھی نا اور پھر اچانک یاد آتا۔ مجھلی ممانی کی بہن بھی اپنے برخودار کے لیے مجھ سے رشتے کا کہہ چکی تھیں۔ اتفاق سے ذات برادری رفعت وغیرہ والی ہی تھی۔ لو جی یہ رشتہ بھی پایہ تکمیل کو پہنچا۔ رشتے بلاشبہ آسمانوں پر بنتے ہیں' لیکن طے تو زمین پر ہی ہوتے ہیں نا اور جب کسی رشتے کے طے ہونے میں میری کوششوں کا دخل ہوتا تو جہاں بے شمار دعائیں ملتیں وہیں اپنی تعریف سنتے ہوئے انجانی سی مسرت بھی ملتی۔ یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ لیکن اب اس سوشل ورک کی وجہ سے میرا گھر متاثر ہونے لگا تھا۔

آدھا دن کالج میں گزار کر میں گھر لوٹتی تو شام کو ''کسی نہ کسی'' کے ساتھ' کہیں نہ کہیں جانا پڑتا۔ پہلی بار تو لوگ ضرور ہی مجھے ساتھ رکھتے۔ آپ ساتھ چلیں امینہ باجی' ہماری تو ان سے ذرا جان پہچان نہیں۔'' یا پھر یوں کہ ''رشتہ تم کروا رہی ہو بیٹی تمہیں تو ساتھ لے کر ہی جاؤں گی میں۔'' اس آنے جانے کے چکر میں گھر پر میری توجہ کم ہونے لگی تھی۔ تینوں بیٹے تو

ماشاء اللہ ذہین تھے۔ میرے پیچھے سے اپنا ہوم ورک بنا لیتے' پھر کھیل کود میں وقت گزارتے' ورنہ ٹی وی زندہ باد' ہاں خاور ضرور چیں بہ جبیں ہوتے۔

''ہفتے میں دوسری بار دستر خوان پر دال سجی ہے۔ گھر میں دو' دو بندے کما رہے ہیں' پھر بھی دال روٹی کھانی پڑتی ہے۔ مہنگائی تو واقعی آسمان کو چھونے لگی ہے۔'' وہ بظاہر مہنگائی پر اظہار خیال کررہے ہوتے' مگر میں ان کے طنز کو پا جاتی۔

''سوری خاور۔۔۔ آج فہمیدہ کے ساتھ ثریا جی کے ہاں گئی تھی۔ اگر کچھ اور پکانے لگتی تو کھانے کو اور دیر ہوجاتی۔ مغرب کے وقت تو میں گھر لوٹی تھی۔ اس لیے جلدی جلدی مونگ کی دال بنالی۔ آپ کو اچھی نہیں لگ رہی تو انڈا فرائی کردوں۔''

''جی مما کردیں۔۔۔'' خاور کے جواب دینے سے پہلے ہی تینوں بیٹوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ باپ' بیٹے بہت چٹورے تھے۔ دال' سبزی تو ان کے حلق سے ہی نہ اترتی تھی۔

''اپنی اپنی پلیٹیں صاف کریں بیٹا۔'' خاور نے بچوں کو تنبیہی انداز میں ٹوکا۔ میں انہیں ممنونیت سے دیکھ کر رہ گئی۔ اس ٹائم واقعی دستر خوان سے اٹھ کر دوبارہ کچن میں گھسنے کی ہمت نہ تھی۔ آملیٹ بنانے جیسا معمولی کام بھی اتنی تھکن کے عالم میں غیر معمولی ہی لگ رہا تھا۔

''آج صبر شکر کرکے دال کھائیں' کل آپ کی مما ہمارے لیے چکن پلاؤ بنائیں گی' شامی کباب اور میٹھے میں فیرنی۔'' خاور کی اگلی بات سن کر میرا تو والہ حلق میں اٹکا تھا۔

''کل تو مجھے زبیدہ آنٹی کو آپ کے دوست خورشید صاحب کے بھائی کے ہاں لے جانا ہے۔'' میں نے مرے مرے لہجے میں اپنی کل کی مصروفیات سے بھی آگاہ کیا۔ خاور مجھے خشمگیں نگاہوں سے گھورنے لگے تھے۔

''تم باقاعدہ شادی دفتر کیوں نہیں کھول لیتیں امینہ۔'' انہوں نے مجھے خفگی سے مخاطب کیا۔ میں

اس وقت تو اس طنز کو چپ چاپ پی گئی۔ بچوں کے سامنے بات بڑھانے سے کیا حاصل تھا۔ لیکن سچی بات تو یہ تھی کہ خاور کے طنز کے برعکس یہی مشورہ مجھے بہت سے لوگ بہت خلوص سے دے چکے تھے۔

شروع شروع میں تو میں یہ بات ہنسی مذاق میں ٹال جاتی' لیکن آہستہ آہستہ میں اس مشورے کے قابل عمل ہونے کے بارے میں غور و خوض کرنے لگی۔ پرائیویٹ کالج میں پڑھانے سے محض چند ہزار ملتے تھے۔ خاور کی جاب اچھی تھی' لیکن مہنگائی واقعی آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ اتنے سالوں سے محنت کرنے کے باوجود ہم دونوں میاں' بیوی ابھی تک اپنے لیے اپنا گھر نہ بنا پائے تھے۔

میری تنخواہ تو تقریباً" مکان کے کرائے میں ہی نکل جاتی۔ خاور کی تنخواہ سے گھر کا خرچا چلتا' تینوں بیٹے اچھے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ پھر بجلی' گیس کا بل اور بچے کے ڈھیروں اخراجات' تنخواہ ختم ہونے کا پتا نہ چلتا جاب کی وجہ سے مجھے بھی نک سک سے تیار رہنا پڑتا۔ خاور تو ہمیشہ سے ہی خوش لباس اور خوش خوراک تھے ہی۔ سو ہم اچھا پہنتے' اچھا کھاتے اور پھر بڑی شدت سے اگلی پہلی کا انتظار کرتے۔ مہینے کے آخری دنوں میں یا تو خاور کو کسی کولیگ سے ادھار مانگنا پڑتا یا میں پرنسپل سے کچھ ایڈوانس پکڑ لیتی۔ اللہ کا شکر ہے تنگدستی نہیں تھی' لیکن بالکل فارغ البالی اور خوش حالی والی بات بھی نہ تھی۔ ایسے میں میرج بیورو کھولنے والی تجویز میرے دماغ پر دستک دینے لگی تھی۔ دو خاندانوں کا ملاپ کروانے پر جہاں بہت سی دعائیں اور ثواب ملتا تھا وہاں کچھ پیسے بھی ہاتھ لگ جائیں تو کیا مضائقہ تھا۔ اصل مسئلہ خاور کو منانے کا تھا۔

میری توقع کے مطابق شروع میں تو انہوں نے یہ بات ہنسی میں اڑا دی تھی' لیکن جب میرے میکے اور سسرال میں سے بہت سے بہی خواہوں نے خاور کو سمجھایا تو بات ان کی "عقل شریف" میں سما ہی گئی۔ میرے تعلقات کا "نیٹ ورک" تیزی سے بڑھ رہا تھا اور اب مجھے اس نیٹ ورک کو اپنے بزنس کے لیے استعمال میں لانا تھا۔ اللہ کا نام لے کر "ملن میرج بیورو" کے نام سے میں نے شادی دفتر کھول لیا تھا۔ مجھے کسی قسم کی تشہیر کی بھی ضرورت نہ پڑی تھی۔ میرے ملنے جلنے والے ہی تشہیری مہم چلا رہے تھے۔ خصوصاً" وہ لوگ جن کے بچوں' بچیوں کے رشتے میری معرفت طے پائے تھے۔ انہوں نے "ملن" کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔

اتنے برسوں تدریس سے وابستہ رہنے کے بعد مجھے لوگوں سے اچھی طرح "کمیونی کیٹ" کرنا آگیا تھا اور تعلیم تو شخصیت میں ویسے بھی نکھار پیدا کر دیتی ہے۔ الحمد للہ لوگ مجھ سے مل کر بہت اچھا تاثر لے کر جاتے۔ اس کاروبار کی کامیابی کے لیے اعتماد پہلی شرط ہے اور مجھے اول روز سے ہی اپنے کلائنٹس کا اعتماد حاصل رہا۔ بے شک یہ کاروبار میں نے پیسہ کمانے کی نیت سے ہی شروع کیا تھا۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ محض پیسہ کمانا ہی میرا مطمع نظر نہیں رہا۔ اگر کسی رشتے پر میرا دل مطمئن نہ ہوتا فراہم کردہ کوائف مجھے جھوٹے لگتے تو چاہے مجھے کتنی بھی پیسوں کی آفر کی جاتی' میں رشتہ کروانے سے معذرت کر لیتی۔ ہر نماز کے بعد میں خصوصاً" اللہ سے دعا کرتی کہ وہ میرے کروائے گئے رشتوں کو کامیابی سے ہمکنار کرے اور جانے انجانے میں میری ذات سے کسی کو دکھ نہ پہنچے اور جب بچیوں کے والدین رشتہ طے ہونے کے بعد میری فیس ادا کرتے تو رقم سے زیادہ قیمتی مجھے ان ماں' باپ کی دعائیں لگتی تھیں۔ لوگوں کی محبت اور ممنونیت پر میری آنکھیں بھیگ جاتیں اور دل میں بے حد عاجزی سے اپنے رب کا شکر ادا کرتی۔

"ملن" کے قیام کے محض چھ ماہ بعد ہی میں نے کالج کی جاب سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا کام مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ اب تو خاور نے بھی میری مصروفیات سے کمپرومائز کر لیا تھا۔ دال' سبزی پر تو خیر اب بھی کوئی سمجھوتا نہ تھا۔ ہاں اب انہوں نے خود اچھی خاصی کوکنگ سیکھ لی تھی۔ اگر مجھے خاور کا ساتھ نہ نصیب ہوتا تو شاید میں اتنی کامیاب کیریئر

وومِس نہ بنتی۔

وقت آگے سرکتا گیا۔ شہر میں درجنوں میرج بیورو اور کھل چکے تھے 'لیکن "ملن" کی حیثیت مستحکم تھی۔ لوگوں کا اعتبار میرا اصل اثاثہ تھا اور میں ان کے اعتبار کو ہرگز کوئی ٹھیس نہ پہنچنے دیتی تھی 'لیکن اس کام کی نوعیت ایسی تھی کہ کبھی کبھار کوئی دل کو دکھا دینے والی صورت حال درپیش آہی جاتی۔ جیسا کہ آج ہوا تھا۔

سامنے بیٹھی مسز نعیم کو میری ایک بہت پرانی کلائنٹ نے میرے پاس بھیجا تھا۔ وہ اپنی بچی کے رشتے کے لیے بہت پریشان تھیں۔ لوگ آتے تھے۔ کھا پی کر چلے جاتے تھے۔ رشتے کی بیل کہیں منڈھے نہ چڑھ رہی تھی۔ بہت امید اور آس لے کر وہ میرے پاس آئی تھیں۔

ان کی بچی پڑھی لکھی تھی۔ تہذیب یافتہ اور سلیقہ مند۔ بہت زیادہ خوب صورت نہ تھی 'لیکن مجھے تو بچی پرکشش لگی تھی اور مجھے امید تھی کہ اچھی جگہ پر اس کا رشتہ طے ہو جائے گا۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین لڑکے والوں کو ان کی طرف بھیجا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے بچی لڑکے والوں کے معیار پر پوری نہ اتری تھی۔ آج مسز نعیم تیسری پارٹی کا جواب لینے میرے پاس آئی تھیں۔ میں قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی ان سے آنکھیں نہ ملا پا رہی تھی۔ کتنی امید اور آس لے کر وہ میرے پاس آئی تھیں۔ میں نے اپنی دانست میں بہت معقول لوگوں کو ان کے پاس بھیجا تھا۔ لیکن جانے کیوں ان کی بچی لڑکے والوں کے معیار پر پوری نہ اتری۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ لڑکے والوں کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔

جو لڑکے پڑھ لکھ کر اچھی نوکری کرنے لگتے۔ ان کی ماں' بہنوں کو ان کے لیے حور پری درکار ہوتی 'خیر آج کل بیوٹی پارلرز کی وجہ سے معمولی شکل و صورت والی لڑکیوں کا حور پری میں تبدیل ہونا کچھ ایسا مشکل نہ رہا تھا۔ سو تھوڑی تگ ودو کے بعد رشتے طے پا ہی جاتے تھے۔ لیکن مسز نعیم کی بچی میں شاید آج کل کی لڑکیوں والی تیزی طراری نہ تھی۔ میں نے ایک' دو بار اسے دیکھا۔ وہ سادہ اور معصوم سی لڑکی میرے من کو تو بھائی تھی۔ لیکن لڑکے والوں کی ماں' بہنوں کے دل میں نہیں اتر پائی۔ میں نے مسز نعیم کو تسلی دلاسا دیا تھا اور انہیں یقین دلایا تھا کہ میں ان کی بچی کا رشتہ طے کروانے کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کروں گی۔

"ٹھیک ہے مسز خاور میں چلتی ہوں۔" مسز نعیم دلگرفتگی سے کہتی ہوئی اٹھی تھیں۔ اسی لمحے شائستہ اور رامین میرے آفس میں داخل ہوئے تھے۔ شائستہ کالج میں میرے ساتھ پڑھاتی تھی۔ آج کل وہ اپنی بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں مجھ سے رابطے میں تھی۔ اندر داخل ہوتے ہوئے دونوں ماں بیٹی نے ایک اچٹتی نگاہ مسز نعیم پر ڈالی تھی۔ مسز نعیم کا ستا ہوا چہرہ ان کی نگاہوں سے مخفی نہ رہ پایا تھا۔

"خیر تو تھی امینہ۔ یہ خاتون بہت پریشان حال دکھائی دے رہی تھیں کیا ماجرا ہے؟" مسز نعیم کے جانے کے بعد شائستہ نے فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دریافت کیا تھا۔ شائستہ کا شمار میری بے تکلف سہیلیوں میں ہوتا تھا۔ میں اس کے سوال پر ٹھنڈا سانس لے کر رہ گئی۔

"ماجرا کیا ہونا ہے شائستہ۔ ان کی بچی کو بار بار رد کیے جانے کی اذیت بھگتنی پڑ رہی ہے۔ بن باپ کی بچی ہے۔ تین بیٹیاں ہیں مسز نعیم کی۔ ہائی اسکول میں لائبریرین ہیں۔ بیوگی کے باوجود بہت ہمت سے اپنے بچوں کو پالا پوسا۔ اچھی تعلیم دلوائی 'لیکن۔"

"لیکن کیا۔ میرا مطلب ہے کہ بچی کا رشتہ کیوں طے نہیں ہو رہا۔" شائستہ نے افسوس کے عالم میں دریافت کیا۔

"شاید بچی خوب صورتی کے مروجہ پیمانے پر پوری نہیں اتری۔" میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"اوہ۔" شائستہ بس یہی کہہ سکی۔

"اچھا چلو چھوڑو اس ذکر کو۔ رامین بیٹا آپ کیوں اتنی خاموش ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں رامین کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

شائستہ کی یہ بیٹی بہت ہنس مکھ اور باتونی تھی۔

شائستہ آج کل اسی کے لیے رشتہ تلاش کررہی تھی۔ رامین بہت خوب صورت نہ تھی مگر پرکشش ضرور تھی۔

"میرا ایک مشورہ مانیں گی امینہ آنٹی۔ ایسے لوگ جو بلاوجہ کسی لڑکی کو رجیکٹ کرتے ہیں۔ آپ انہیں بلیک لسٹ کروایا کریں۔" کافی دیر سے خاموش بیٹھی رامین نے بے تکلفی سے مشورہ دیا تھا۔

"اپنی آنٹی کے بزنس کو ٹھپ کروانے کا ارادہ ہے کیا۔" شائستہ نے بیٹی کو خشمگیں انداز میں گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں رامین صحیح کہہ رہی ہے۔ میں خود یہ سوچ رہی ہوں کہ جن لوگوں کو تین، چار بار لڑکی دکھانے پر بھی کوئی لڑکی ان کے معیار پر پوری نہ اترے ایسے لوگوں پر ہمیشہ کے لیے "ملن" کے دروازے بند کردوں۔"

"شہر میں صرف "ملن" ہی تو نہیں امینہ آنٹی اور اصل بات تو لوگوں کے مائنڈ سیٹ کی ہے۔ جو مائیں اپنے بیٹے کا رشتہ دیکھنے جاتی ہیں، ان کے ساتھ جانے والی ان کی اپنی بیٹی کتنی ہی معمولی شکل و صورت کی کیوں نہ ہو۔ انہیں بہو ہر لحاظ سے پرفیکٹ چاہیے ہوتی ہے۔" رامین نے کتنا صحیح تجزیہ کیا تھا۔ بس جی یہ شروع ہوگئیں اپنا فلسفہ بگھارنے۔" شائستہ نے بیٹی کو گھورا۔

"کیوں مما غلط تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ ہم دوسروں کو تو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ لیکن اپنا وقت آنے پر ہم بھی دوسروں سے ملتا جلتا طرزِ عمل اپناتے ہیں میں تو آپ کے متعلق بھی پیشن گوئی کرتی ہوں کہ آج آپ میری شادی کی وجہ سے پریشان ہیں۔ لیکن رافع بھائی کے لیے آپ کو بھی ہر لحاظ سے پرفیکٹ لڑکی درکار ہوگی۔ پھر آپ کسی معمولی سی کمی پر بھی سمجھوتا نہیں کریں گی۔"

"دیکھ رہی ہو امینہ۔ میری بیٹی کی اپنی ماں سے متعلق بدگمانی۔" شائستہ نے شکوہ کیا۔

"پرفیکٹ از پرفیکٹ مما۔ یہ آنٹی جو ابھی اتنی پریشانی کے عالم میں اٹھ کر گئی ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ نے ان کی پریشانی کو دل سے محسوس کیا ہوگا۔ آپ خود آج کل اسی صورت حال سے دوچار ہیں، کیونکہ آج کل آپ بیٹی کی ماں بنی ہوئی ہیں، لیکن جب آپ میرے فرض سے سبکدوش ہو کر اپنے بیٹے کا رشتہ ڈھونڈیں گی، آپ ان آنٹی کی بیٹی جیسی لڑکی کو سندِ قبولیت نہیں بخشیں گی۔ امینہ آنٹی نے ابھی یہی بتایا ہے کہ نا کہ وہ لڑکی بھی خوب صورتی کے موجبہ پیمانوں پر پوری نہیں اترتی۔ بالکل میری طرح۔" رامین قدرے تلخ ہوئی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ یہ ہنس مکھ اور بااعتماد سی لڑکی آج قدرے مختلف روپ میں نظر آرہی تھی۔ ابھی تو صرف ایک فیملی نے اسے سندِ قبولیت نہ بخشی تھی۔ اگر اسے بھی مسز نعیم کی بیٹی کی طرح بار بار ناپسند کیا جائے تو کہیں یہ اپنی شخصیت کا اعتماد ہی نہ کھو دے۔ میں نے دکھ سے سوچا تھا۔

"اچھا مانو۔۔۔ فضول باتیں چھوڑو اور آنٹی کو اپنی تصویریں دو۔"

شائستہ نے اس کے پیار کے نام سے اسے مخاطب کیا تھا۔ سو وہ بھی جیسے اپنی پرانی جون میں واپس آئی۔

"یہ لیجیے آنٹی۔ میری تازہ ترین تصویریں۔ پہلے پارلر جا کر نہ نظر آنے والا میک اپ کروایا، پھر تصویریں اتاریں۔ چہرے پر حسبِ ضرورت معصومیت بھی طاری کی ہے۔ دیکھیے کیسے شاہکار تصویریں ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے مجھے تصویروں کا لفافہ پکڑایا تھا۔

"واقعی بہت پیاری تصویریں آئی ہیں۔" میں نے ان پر نظر ڈال کر کھلے دل سے تعریف کی۔

"مجھ سے زیادہ پیاری نا۔" رامین کھلکھلائی تھی۔ شائستہ نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ، چائے منگواؤں یا ٹھنڈا۔" میں نے گفتگو کا موضوع پلٹ دیا تھا۔

"بس امینہ چلتے ہیں۔ کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ دیر ہوجائے گی۔" شائستہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"ارے ایسے کیسے چل رہی ہو۔ میں کولڈ ڈرنک

منگواتی ہوں۔ بلکہ ساتھ کچھ کھانے کو بھی۔ مجھے بھی بھوک لگی ہے۔" میں نے شائستہ کو بعد اصرار روکنا چاہا۔

"میں پھر چکر لگاؤں گی امینہ۔ تسلی سے بیٹھ کر گپ شپ کریں گے۔" شائستہ آج واقعی جلدی میں تھی۔ میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ دونوں ماں بیٹی رخصت ہوئیں تو میں کتنی دیر تک ان ہی کے متعلق سوچتی رہی۔ رامین بالکل ماں کا عکس تھی۔ اسے دیکھ کر شائستہ کی جوانی یاد آجاتی تھی۔ شائستہ ہمارے کالج اسٹاف کی سب سے چنچل ٹیچر تصور کی جاتی تھی۔ ہر وقت ہنسنے مسکرانے اور کھلکھلانے والی۔ اس کا دل اندر سے کتنا دکھی ہے۔ اس راز سے بہت کم لوگ واقف تھے۔

شادی سے پہلے شائستہ کا تعلق انتہائی سفید پوش گھرانے سے تھا۔ والد کی معمولی سی کریانے کی دکان تھی۔ شائستہ نے بہت چھوٹی عمر میں ٹیوشنز پڑھا کر نہ صرف اپنی پڑھائی کا خرچا اٹھایا' بلکہ چھوٹے بہن' بھائیوں کا تعلیمی سفر بھی صرف شائستہ کی ہمت کی وجہ سے جاری رہا۔ تعلیمی سلسلہ مکمل کرکے شائستہ شہر کے مشہور پرائیویٹ گرلز کالج میں لیکچرر تعینات ہوگئی۔ سرکاری نوکری ــــــ کے ساتھ ساتھ وہ شام کو اپنے علاقے میں ٹیوشن اکیڈمی چلاتی تھی۔ اس کی والدہ نے اس کی کمائی سے دو بیٹیوں کی شادی کی۔ شائستہ کی بھی شادی کی عمر ہوگئی تھی۔ لیکن ابھی بھائی کمانے کے قابل نہ ہوئے تھے۔ سو اس کے والدین کو ابھی کماؤ بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ غربت سب سے بڑا نظریہ ضرورت ہے جو بسا اوقات محبت پر بھی حاوی آجاتا ہے۔ شاید اس کے غریب والدین بیٹی سے محبت کرنے کے باوجود اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر تیار نہ تھے۔ پھر شائستہ کا ایک پروپوزل آیا' بلکہ پروپوزل تو بہت آتے تھے' ایسا رشتہ آیا جو ہر صورت ہاں سننا چاہتا تھا۔ ندیم ان کے محلے میں ہی رہتا تھا۔ بینک میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس کی ماں' بہنوں نے شائستہ کے گھر کی دہلیز ہی پکڑلی۔

شائستہ کے والدین انہیں ٹال ٹال کر تھک گئے تھے۔

"ندیم ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ ہم اس کے اصرار پر بار بار آپ کے گھر کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ ایک بار اپنی بیٹی سے بھی پوچھ لیجیے۔ یقیناً" اس رشتے میں اس کی مرضی بھی شامل ہوگی۔" ندیم کی ماں نے تنگ آکر شائستہ کے والدین کو کہہ ڈالا تھا اور اس بات کے بعد تو گھر میں طوفان ہی آگیا۔ شائستہ کے چھوٹے بھائی جو ابھی اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے شائستہ ابھی تک گھر کی دہلیز پر بیٹھی تھی۔ وہ بھائی اچھل اچھل کر شائستہ سے جواب طلبی کررہے تھے۔ دکھ اور افسوس کے مارے شائستہ ان سے کچھ کہہ نہ پائی' لیکن اگلے روز کالج میں میرے سامنے اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اسٹاف روم میں فری پیریڈ میں اس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر اپنے سارے آنسو بہادیے۔

"ندیم میرے پاس ایک بار اکیڈمی آئے تھے۔ ان کی بھانجی وہاں ٹیوشن پڑھتی ہے۔ ہاں میں مانتی ہوں کہ انہوں نے انتہائی شستہ انداز میں میرے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور پوچھا تھا کہ کیا وہ اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر بھیج دیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ کیا میرا یہ قصور اتنا بڑا تھا امینہ۔"

وہ اپنے گھر والوں کے رویے پر بہت اپ سیٹ ہورہی تھی۔ میں نے اسے حتی المقدور تسلی' دلاسا دیا۔ پھر کچھ عرصے بعد شائستہ کی شادی ہو ہی گئی تھی۔ ندیم سے نہیں' بلکہ سرفراز سے۔ وہ ان کا دور پار کا رشتہ دار تھا۔ وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے مطمئن اور خوش تھی۔ خدا نے اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ رافع' رامین اور ارشین' اس کے تین بچے تھے۔ مگر اس کی خوش گوار ازدواجی زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی۔ سرفراز جو بیوی پر جان چھڑکتا تھا اپنے آفس میں کام کرنے والی لڑکی میں دلچسپی لینے لگا۔ اس دلچسپی کا نتیجہ سرفراز کی دوسری شادی کی صورت میں نکلا۔

شائستہ نے شروع شروع میں تو شور ہنگامہ کیا' مگر آخر کار وہ بچوں کی خاطر سمجھوتے پر آمادہ ہوگئی۔ اس

نے سرفراز کی دوسری بیوی کا وجود گوارا کرلیا تھا۔ مگر دوسری بیوی کو شائستہ اور اس کے بچے قبول نہ تھے۔ شادی کے آٹھ سال بعد شائستہ کی شادی شدہ زندگی کا اختتام ہوگیا تھا۔ اس کی زندگی کے آئندہ آنے والے سال شدید جدوجہد کے تھے۔ اس نے اکیڈمی کے ساتھ ساتھ مونٹیسوری اسکول کھولنے کا تجربہ کیا اور پھر کالج کی جاب چھوڑ دی تھی۔ ہم دونوں کولیگز اپنی اپنی فیلڈ میں کامیاب ٹھہریں۔ شائستہ کے مونٹیسوری اسکول کا شمار اچھے اور مشہور اسکولوں میں ہوتا تھا۔ لیکن اس کامیابی کے پیچھے شائستہ کی انتھک محنت کا دخل تھا' بلکہ اس کی تو ساری زندگی ہی محنت سے عبارت تھی اور اب اس کی زندگی کا محور اس کے بچے تھے۔ آج کل وہ رامین کا رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ اسی لیے اپنی مصروف زندگی میں سے وقت نکال کر میرے پاس چکر لگاتی تھی۔ ورنہ تو عرصہ ہوا ہم دونوں کا رابطہ محض ٹیلی فون تک محدود تھا۔ میری بھرپور کوشش تھی کہ رامین کے لیے کوئی بہت اچھا سا رشتہ ڈھونڈوں جو خوشیاں اس کی ماں کے مقدر میں نہ تھیں۔ وہ اس کی لاڈلی کو ضرور ملیں' لیکن فی الحال میری کوششیں بارآور ثابت نہ ہوئی تھیں' لیکن ایسے کاموں میں دیر سویر تو ہوجاتی ہے۔ میں اپنی کامیابی کے لیے پرامید تھی۔

اور محض ہفتہ بھر بعد کی بات تھی شائستہ دوبارہ میرے پاس چلی آئی۔ اس بار وہ اکیلی تھی۔

"شائستہ میرے پاس رامین کے لیے بہت سے پروپوزل ہیں' لیکن بات تو یہ ہے کہ میرا دل ان رشتوں میں سے کسی پر بھی سو فیصد مطمئن نہیں۔ جب تک میری پوری تسلی نہیں ہوگی' میں کسی کو تمہاری طرف نہیں بھیجوں گی۔ شادی زندگی بھر کا بندھن ہے۔ عجلت مناسب نہیں' پھر کون سا رامین کی عمر نکلی جارہی ہے۔ ہم کچھ انتظار تو کرسکتے ہیں نا۔" میں نے شائستہ کی اتنی جلد آمد کو رامین کے رشتے میں جلد بازی سے تعبیر کرتے ہوئے اسے رسانیت سے سمجھانا چاہا تھا۔

وہ میری بات سن کر مسکرادی۔

"میں جانتی ہوں تم رامین کو بیٹیوں کی طرح چاہتی ہو۔ اس کے لیے بہترین بر ہی ڈھونڈو گی۔ مجھے تم پر پورا اعتبار ہے' لیکن آج میں رامین کی وجہ سے تمہارے پاس نہیں آئی ہوں۔" وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

"کیا بات ہے شائستہ' سب ٹھیک تو ہے نا۔" میں اس کی مزاج آشنا تھی۔ اس کے انداز پر قدرے چونکی تھی۔ اس نے محض ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا تھا۔

"آمینہ پچھلی بار جب میں اور رامین تمہارے پاس آئے تھے تو ایک خاتون تمہارے پاس سے اٹھ کر جارہی تھیں۔ یاد ہے نا تم نے بتایا تھا کہ کوئی لائبریرین ہیں۔ ان کی بچی کا رشتہ کہیں طے ہوا؟" شائستہ نے اتنا غیر متعلق سوال پوچھ کر مجھے حیران کردیا۔ میں نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"تم نے بچی دیکھی ہوئی ہے۔ کیسی ہے؟" اس کے اگلے سوال نے میری حیرت میں مزید اضافہ کیا تھا۔

"آخر بات کیا ہے شائستہ۔" میں نے پوچھا تھا۔

اس نے لمبی سی سانس اندر کھینچی۔

"اگر تمہیں مناسب لگے تو ہم رافع کے لیے اس بچی کو دیکھیں؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد شائستہ نے اپنے بڑے بیٹے کا نام لیتے ہوئے پوچھا۔ اب خاموش ہونے کی باری میری تھی۔ رافع رامین سے تین' چار سال بڑا تھا' لیکن میں جانتی تھی کہ شائستہ بیٹی کی شادی سے پہلے بیٹے کی شادی کے حق میں نہیں۔ پھر راتوں رات یہ کیسے کایا پلٹی' یہ سوال میں نے اس سے بھی کر ڈالا تھا۔

"کیا بتاؤں آمینہ۔ اس دن تمہارے پاس سے ہوکر جب میں گھر لوٹی تو اس خاتون کا چہرہ میری نگاہوں میں گھومتا رہا۔ رات دیر تک میں اسی کے متعلق سوچتی رہی۔ تم نے بتایا تھا نا کہ وہ بیوہ خاتون ہیں۔ تن تنہا بچوں کی پرورش کرنا اور اس معاشرے میں سروائیو کرنا کتنا مشکل کام ہے' یہ مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔ میں سوچتی رہی' سوچتی رہی' بہت بچپن میں پڑھی جانے والی کہانی بھی میرے دماغ میں گھومتی رہی' جس کا

عنوان ہوتا تھا۔ "کر بھلا ہو بھلا" میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے میں کسی کے ساتھ بھلائی کروں تو اس کے بدلے میں میری بچی کے مقدر کا ستارہ بھی چمک اٹھے۔ تم مجھے اس بچی کے گھر لے جاؤ۔ میں اسے اپنے رافع کے لیے مانگ لوں گی۔" شائستہ کی بات سن کر میں ششدر رہ گئی۔

"اتنا بڑا فیصلہ جذبات میں آکر نہیں کیا جاتا شائستہ' تم نے جس لڑکی کو دیکھا تک نہیں اسے بہو بنانے چلی ہو۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"تم نے تو دیکھا ہے نا تم ہی بتا رہی تھیں کہ سادہ اور معصوم سی لڑکی ہے تیزی طراری نام کو نہیں اور تمہاری فیس ریڈنگ پر مجھے آج سے نہیں برسوں سے اعتماد ہے اور یہ فیصلہ میں نے جذبات میں آکر نہیں بلکہ پوری طرح سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ رافع میرا اکلوتا بیٹا ہے میری زندگی بھر کی پونجی مجھے اس کے لیے کوئی سادہ سی لڑکی ہی چاہیے اور پھر سچ کہوں تو امینہ آج کل مجھے یہ احساس ستانے لگا تھا کہ میں رافع کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں ماشاء اللہ اس کی شادی کی عمر ہے چند بے بنیاد خدشوں کو دل میں پال کر میں رامین سے پہلے اس کی شادی نہیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن میرے طرز عمل اور میرے گھر والوں کے طرز عمل میں پھر کیا فرق رہ گیا۔ رافع ماشاء اللہ بر سر روزگار ہو گیا ہے۔ اس کے سب دوستوں کے سر پر سہرا سج گیا ہے اور میرا بیٹا میرا لاکھ فرماں بردار سہی' دنیا کی باتیں سن کر اس کے دل میں بھی یہ خیال تو آسکتا ہے نا کہ ماں اس کی شادی کی عمر گزار رہی ہے بس اسی لیے میں اس فیصلے پر پہنچی ہوں کہ اللہ کا نام لے کر رافع کی بات پکی کر دوں۔ اللہ نے چاہا تو میری رامین کا رشتہ بھی بہت اچھی جگہ طے ہو جائے گا۔" شائستہ کا لہجہ پر یقین تھا۔

"تم نے آج مجھے واقعی حیران کر دیا ہے شائستہ۔" میں فقط یہی کہہ پائی۔

"میں ایک مطلقہ عورت ہوں امینہ اور مجھے علم ہے کہ میری بچی کے رشتے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ بھی ہے میرا گھر نہ بس سکا اگرچہ اس میں میرا رتی برابر بھی دوش نہیں لیکن دنیا والوں کی زبانیں کون پکڑ سکتا ہے وہ کہتے ہیں جب ماں گھر نہ بسا سکی تو بیٹی کی کیا خاک تربیت کی ہوگی' ہو سکتا ہے ایک بیوہ عورت کی پریشانی بانٹنے کے بدلے اللہ میری بھی مشکل حل کر دے۔ میں تو سوچ سوچ کر اسی نتیجے پر پہنچی ہوں۔" شائستہ نے کہا اور میں اسے چپ چاپ تکنے لگی۔

چند دن بعد اس کی خواہش کے مطابق میں اسے مسز نعیم کے ہاں لے گئی تھی وہ تو ذہنی طور پر بچی کو پہلے ہی پسند کر چکی تھی اور مسز نعیم کے لیے بھی یہ رشتہ نعمت غیر مترقبہ تھا وہ میرا شکریہ ادا کرتے نہ تھک رہی تھیں' میں انہیں کیا بتاتی کہ اس رشتے کے پیچھے میری کسی کوشش اور کاوش کا دخل نہ تھا۔ یہ خیال شائستہ کے اپنے ذہن میں آیا تھا۔ میرا میسج بیورو ان کے اتفاقی تذکرے کا سبب بنا تھا۔ رافع اور ہما کا رشتہ طے ہونے کے بعد اس بات پر میرا یقین مزید پختہ ہو گیا تھا کہ رشتے واقعی آسمانوں پر بنتے ہیں۔

اور یہ محض دو ماہ بعد کی بات ہے رافع اور ہما کے ولیمے کا فنکشن ہو رہا ہے اسٹیج پر رافع کے پہلو میں سجی سنوری ہما دلہن کے روپ میں بہت دمک رہی ہے۔ شائستہ کی نیکی کا کیا پیارا صلہ ملا ہے' میں نے دولہا' دلہن کو سلامی دینے کے ساتھ ڈھیروں دعاؤں سے بھی نوازا' پھر میں اسٹیج پر بیٹھے دوسرے جوڑے کی طرف متوجہ ہوئی بے تحاشا حسین لگتی شرمائی لجائی سی رامین اور اس کے ساتھ بیٹھا میرا شہزادوں جیسا ارسل دولہا بن کر بھی جس کو شرارتوں سے چین نہیں وہ اپنی دلہن کے کان میں جانے کیا سرگوشی کر رہا ہے کہ رامین سے ہنسی ضبط کرنا دشوار ہو رہا ہے۔

"جی جناب آج میں صرف شائستہ کے بیٹے کے ولیمے کی تقریب میں شرکت کرنے نہیں آئی ہوں بلکہ میں اپنے بیٹے کی بارات کے ہمراہ آئی ہوں ارسل میرا چھوٹا اور لاڈلا بیٹا ہے سب سے چھوٹے بچے میں تو ماں کی جان ہوتی ہے اور جب دوسرے بچے اپنے الگ آشیانے بنا کر ماں باپ سے جدا ہو جائیں تو ماں اپنے پاس رہ جانے والے لخت جگر کو کسی قیمتی متاع کی طرح

ہمیشہ اپنے پاس سنبھال کر رکھنا چاہتی ہے۔ میں اپنے کیریئر کی تفصیل بتاتے ہوئے زندگی کے دوسرے گوشوں کے متعلق بتانا بھول گئی۔ میں شہر کی مشہور میچ میکر ہوں۔ مگر میری اپنی اولاد نے اپنی زندگی سے متعلق فیصلہ کرتے ہوئے نہ میرے تجربے سے فائدہ اٹھایا نہ میری رائے کو اہمیت دی وہ کہتے تھے کہ زندگی ان کی تو پسند اور فیصلہ بھی ان کا۔

شاہ زیب میرے سب سے بڑے بیٹے نے اپنی کلاس فیلو کو پسند کیا اور اتنا پسند کیا کہ میری ناپسندیدگی کو رتی برابر بھی اہمیت نہ دی۔ ماں اولاد کو غلط فیصلہ کرتے کب دیکھ سکتی ہے' میں نے بھی اسے لائبہ سے شادی کرنے سے بہت روکا پیار سے ڈانٹ کر' منت سماجت کر کے غرض اپنی سی ہر کوشش کر کے دیکھ لی وہ الٹرا ماڈرن لڑکی' جس کا فیشن بے باکی کی حدود کو چھوتا تھا بہو کے طور پر مجھے ہرگز قبول نہ تھی' لیکن پھر خاور نے سمجھایا کہ جوان اولاد سے ضد لگانے میں اپنا ہی نقصان ہے اس سے پہلے بیٹا کورٹ میرج کر کے دنیا کے سامنے ہمارا سر نیچا کرے ہمیں اس کی پسند کو سند قبولیت بخش دینی چاہیے۔ میں نے بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا تو خاور کی بات میں صداقت محسوس ہوئی سو دل پر بھاری پتھر رکھ کر شاہ زیب کا رشتہ لے کر لائبہ کے گھر چلی گئی' لیکن اس گھر کے طور طریقے دیکھ کر میں پریشان ہو رہی تھی کہ ایسے گھرانے کی لڑکی کا ہمارے گھر آ کر کیسے گزارا ہو سکے گا' مگر صد شکر ہونے مجھے کسی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ شادی کے دوسرے ہی ہفتے وہ میاں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئی جو اس کے باپ نے اسے شادی کے تحفے کے طور پر دیا تھا۔

آج لائبہ اور شاہ زیب کے دو بچے ہیں شاہ زیب کا ہر پندرہ دن بعد اس سے اس بات پر جھگڑا ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی صحیح طور پر نگہداشت نہیں کرتی اسے میک اپ' شاپنگ اور پارٹیز سے ہی فرصت نہیں۔ بیوی سے لڑ جھگڑ کر شاہ زیب دل کا بوجھ ہلکا کرنے میرے پاس آتا ہے اور میں کیونکہ ایک ماں ہوں بیٹے کی حالت دیکھ کر میرا دل پسیج جاتا ہے۔ خاور تو پھر بھی کبھی کبھار اسے ماں باپ کا کہنا نہ ماننے پر اور اس انجام سے دوچار ہونے پر طعنہ دے دیتے ہیں' مگر میں اسے ہمیشہ سمجھا بجھا کر اس کے گھر بھیج دیتی ہوں اس کے علاوہ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے زندگی اس کی' فیصلہ اس کا' تو نتائج کی ذمہ داری بھی اسی کو بھگتنی پڑے گی۔ اپنے بچوں کی خاطر اسے لائبہ جیسی ہٹ دھرم بیوی کے ساتھ گزارہ کرنا ہو گا۔ میری دعائیں بہرحال اب بھی اس کے ساتھ ہیں۔

شاہ زیب سے چھوٹا کاشان' میرے بچوں میں سب سے زیادہ ذہین' پڑھاکو اور محنتی' پاکستان سے ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے بعد وہ اسپیشلائزیشن کرنے باہر گیا اور پھر وہیں کا ہو گیا۔ جوڈتھ سے اسے پیار کب اور کیسے ہوا لمبی کہانی ہے بہرحال جوڈتھ اب نزہت ہے اور ہماری دوسری بہو کے رتبے پر فائز ہے۔ لائبہ کی نسبت نزہت میرے دل سے قریب ہے۔ ہفتہ' دس دن بعد جب وہ اسکائپ پر ہم سے بات چیت کرتی ہے تو اس نے سلیقے سے دوپٹا سر پر جما رکھا ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے پاکستانی کھانوں کی ریسپیز پوچھتی رہتی ہے۔ میرے اور خاور کے لیے ڈھیروں گفٹس بھجواتی ہے اور مجھ سے فرمائش کر کے پاکستانی ملبوسات منگواتی ہے۔

مجھے کاشان سے اگر کوئی شکایت ہے بھی تو نزہت سے کم از کم کوئی شکایت نہیں وہ مغربی عورت ہوتے ہوئے بھی مشرقی بیوی بننے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے' میرے بیٹے سے محبت کرتی ہے اور اس کے ساتھ مخلص ہے۔ میرے اطمینان کے لیے یہی بات کافی ہے مگر میرے دل میں دبے ارمان تو ابھی تک تشنہ تھے نا' میں اپنے بیٹے کے لیے خود لڑکی ڈھونڈوں' چاؤ سے اس کا رشتہ لے کر جاؤں۔ ارمانوں سے اس کی بری بناؤں' دھوم دھام سے اس کی شادی کروں اور شادی کے بعد بیٹا' بہو ہمارے ساتھ رہیں۔ ہمارے گھر میں پوتے' پوتیوں کی چہکار ہو' بڑھاپے میں مجھے اور خاور کو ہولناک تنہائی اور بے چارگی کا سامنا نہ کرنا پڑے بلکہ

ہمارے ارد گرد بہو' بیٹا اور پوتے' پوتیوں جیسے مخلص رشتے موجود ہوں۔ اس سے پہلے میرا سب سے فرماں بردار ارسل بھی کسی حسینہ کی زلف کا اسیر ہو جاتا' میں نے اسے "کھونٹے" سے باندھنے میں ہی عافیت جانی تھی۔ رامین میری دیکھی بھالی لڑکی تھی بے تحاشا خوب صورت نہ سہی' مگر میں جانتی تھی کہ اس میں اچھی بیوی اور اچھی بہو بننے والی تمام صفات موجود ہیں۔ اس کے باوجود میں نے کبھی ارسل کے لیے رامین کا انتخاب کرنے کا نہ سوچا تھا۔ شاید میں بیٹے کی ماں تھی اور میرے دل کے نہاں گوشوں میں ایسی بہو کی خواہش تھی جو حسن سیرت اور اخلاق و کردار کی تمام خصوصیات کے ساتھ حسن صورت بھی رکھتی ہو لیکن اس دن شائستہ کی باتوں نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کسی دوسرے کے ساتھ اس امید پر بھلائی کرنے جا رہی تھی کہ بدلے میں اسے بھی بھلائی ہی ملے۔ وہ اپنی بیٹی کی وجہ سے پریشان تھی اسی لیے کسی دوسرے کی پریشانی کو کم کرنے کی خاطر اس کی بیٹی کو بہت محبت اور مان سے اپنے بیٹے کی زندگی کا حصہ بنانے جا رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کا یہ عمل اس کی لاڈلی کے نصیب کا دروازہ بھی کھول دے گا۔ اس کی سوچ نے میرے سوچنے کا انداز بھی بدل دیا۔

رامین کی ظاہری خوب صورتی پس پشت ڈال کر میں نے اس کی باطنی خوب صورتی کو ترجیح دے دی۔ ایک اچھی سلجھی لڑکی کا ساتھ میرے بیٹے کی زندگی کو خوشیوں سے ہمکنار کرے گا ساتھ ہی ہماری زندگی بھی سکون سے ہمکنار ہو گی۔ "کر بھلا ہو بھلا" والے مقولے کو شائستہ نے آزمایا تھا تو میں نے اسے منطقی انجام تک پہنچایا تھا اور ہم دونوں کی بہوؤں کے چہروں پر حیا' پاکیزگی اور معصومیت نے وہ نکھار پیدا کیا ہے کہ آج ہر کوئی مجھے اور شائستہ کو اتنی پیاری بہوئیں ڈھونڈنے پر مبارک باد دے رہا ہے۔

"ارے بھئی یہ تو ان کا پروفیشن ہے۔ ظاہر ہے اپنے لیے اتنی ہی اچھی بہو ڈھونڈنی تھی۔" یہ کمنٹس میری بہت پرانی شناسا مسز فرقان کے تھے۔

میں محض مسکرا کر رہ گئی انہیں کیا بتاتی کہ "اچھی بہو" ڈھونڈنا کسی کے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں بشرطیکہ ہم اچھی بہو میں پائی جانے والی اپنی پسندیدہ صفات کا از سر نو تعین کر کے بہو تلاش کریں باقی تو وہی بات کہ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں اور زمین پر طے ہوتے ہیں۔

کہیے! متفق ہیں نا میری بات سے؟

☼ ☼

فاخرہ گل

آج کی رات فیروز احمد کے لیے بے حد اہم تھی کیونکہ آج کی ہی رات ٹھیک چالیس برس پہلے جب ابھی اس کی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔ تب بھی اس کا دماغ اپنے سامنے ہونے والے تمام حالات و واقعات کو بڑے تکنیکی انداز میں محفوظ کر رہا تھا۔

گھٹے گھٹے سیلن زدہ کمروں میں دودھ مکھن اور لسی سے پلنے والی جگنی ادھر ادھر یہاں وہاں گھومتے پھرتے مزید گپلو اور مشکوسی معلوم ہوتی۔ کبھی سامنے کوئی نظر نہ آتا تو نہ صرف دیواروں کے ساتھ قطار قطار رینگنے والی چیونٹیوں میں سے اگر کوئی قطار سے باہر ہوتی تو اسے پکڑ کر زبردستی قطار کے اندر اٹھا کر رکھتی بلکہ دیواروں سے مٹی کھرچ کھرچ کر چکھنے کا کام بڑے شوق سے سرانجام دیا کرتی۔ اس مشغلے کے دوران جیسے ہی کہیں سے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی فٹ سے بی بی کے پلنگ کے نیچے جا گھستی۔ یہ ہلکی براؤن آنکھوں والی ننھی سی لڑکی فیروز احمد کی اکلوتی بہن اور اس کے ماں باپ کی جان تھی۔

فیروز احمد کی پیدائش کے عین گیارہ سال بعد جگنی نے ان کے گھر کی رونقوں میں جو اضافہ کیا تھا اس پر وہ لوگ پھولے نہ سماتے تھے۔

بی بی کو لمبے بالوں کا شوق تھا اس لیے اکثر ہی اسے اپنے سامنے بٹھا کر آملے کے اصلی تیل کی مالش کرتی نظر آتیں۔ اس کے بعد عین ناک سے کنگھا ٹکا کر سر سیدھا کرتے ہوئے دائیں اور بائیں اطراف میں بال تقسیم کرتیں اور بالکل سیدھی مانگ نکال کر ننھی منی سی چٹیاں بھی بنا ڈالتیں۔

اس کے پیدا ہونے کے بعد ہی سے لمبی مستطیل ڈیوڑھی کے آگے لوہے کی مضبوط سلاخوں کا جنگلا لگوایا گیا تھا تاکہ کھیلتے کھیلتے اس کے باہر نکل جانے کا کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔ ہاں البتہ بی بی گھر میں ہوتیں تو جنگلے کا تالا کھلا رہتا اور وہ ہر وقت بی بی کے پیچھے پیچھے ہی نظر آتی۔

سینے سے لگائی کپڑے کی گڑیا' سر پر ٹکا ننھے سے دوپٹے کا آخری کونا جو کہ وہ خود کو بڑا سمجھنے اور ثابت کرنے کے لیے ہر وقت لیے رکھتی اور وہ... ہر وقت بی بی کے گرد چکر کاٹتی محسوس ہوتی۔

فیروز احمد کو یاد تھا کہ صوم صلوٰۃ کی بے حد پابند بی بی ہر جمعرات کو گھر میں کسی بھی دستیاب چیز پر فاتحہ پڑھ کر ارواح کو ایصال ثواب ضرور کیا کرتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر جمعرات کو ارواح دنیا میں موجود اپنے پیاروں کی چوکھٹ پر منتظر ہوتی ہیں کہ کوئی انہیں یاد کرے اور ان کی بخشش کی دعا کرے۔ اس لیے وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی دل گرفتگی کے عالم میں واپس جائے — ہر جمعرات کو درود فاتحہ کے بعد وہ سلور کے تھال میں روٹیاں رکھتیں اور گھر میں پکائے گئے کسی بھی سالن کو تھالی میں ڈالتیں' سر پر اپنا سیاہ برقعہ رکھتیں اور جگنی کو ساتھ لے کر مسجد جا پہنچتیں۔ جگنی اور وہ ایک دوسرے کے لیے اب لازم ملزوم تھیں۔ نہ تو جگنی ان کے بغیر ایک پل گزارتی اور نہ ہی ان کا اپنا دل مانتا کہ وہ لمحے بھر کے لیے بھی ۔ جگنی کو خود سے

دور کریں۔
یوں بھی وہ لوگ جس محلے میں رہتے تھے وہاں سکھ اور مسلمان دونوں آباد تھے۔ وہ مختلف مذاہب ہونے کے باوجود آنا جانا' تہواروں کے موقع پر بنائے گئے مخصوص قسم کے کھانوں کا تبادلہ کرنا اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہونا ان گھرانوں نے اپنی ریت بنا رکھی تھی۔
اور پھر مختلف قسم کے اسلامی تہوار کو جوش و جذبے سے منانا شاید بی بی کے خون میں تھا۔ اسی لیے اس رات جب شب معراج کا چاند بس افق پہ طلوع ہونے

نامِ وطن

کو ہی تھا انہوں نے سب سے پہلے جلنی کے لیے صاف ستھرے کپڑے (جو کہ انہوں نے دھونے اور خشک ہونے کے بعد تکیے تلے تہ لگا کر رکھ چھوڑے تھے) نکال کر اسے ہینڈ پمپ کی مدد سے اچھی طرح مل مل کر نہلایا۔ ہمیشہ کی طرح سیدھی مانگ نکال کر ایک بل کی چٹیا کر کے جلنی ہی کی فرمائش پر ننھا سا پراندہ ڈالا۔ کمرے میں لکڑی کے بڑے سے صندوقچے کو کھول کر اس میں موجود کپڑے میں لپٹا عطر نکال کر

اسے لگایا۔ ننھے ننھے مگر پھولے ہوئے ہاتھوں پر پہلے سے گھلی ہوئی مہندی کی گول ٹکیا بنائی اور اس کی تمام اطراف ماچس کی تیلی کی مدد سے ننھے ننھے نقطے بنا کر اسے مزید خوب صورت کرنے کی بھی کوشش کی اور اسے لوہے کے جنگلے کے عین سامنے بٹھا کر خود ہینڈ پمپ کے سامنے چارپائی کھڑی کر کے غسل کیا اور فیروز احمد کے ہاتھوں کھیر مسجد روانہ کر کے جگنی کے ہاتھ جو دھوئے تو گوری گوری ہتھیلیوں پر اتنا خوب صورت رنگ دیکھ کر انہیں بے اختیار چوم لیا۔

اپنے ہاتھوں پر مہندی وہ ہمیشہ رات کے پچھلے پہر لگایا کرتی تھیں۔

اور اسی دوران جب وہ جگنی کے ساتھ مل کر کڑوے تیل سے دیے بھر رہی تھیں کہ دو گھر چھوڑ کر رہنے والے دلیر سنگھ کی بیٹی سفید کروشیے کی باریک جالی والا اصافی سے ڈھانپی گئی پلیٹ لے کر اندر آئی مگر انہیں مصروف دیکھ کر جھجک کر وہیں رک گئی۔

"آجا نا پتر۔ وہاں رک گئی آجا آجا۔" ازلی خوش اخلاقی اور اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بی بی نے اسے اندر بلایا تو یقیناً اس کا اعتماد بحال ہوا۔

"بی بی بے بے کہہ رہی تھی کہ آج تم لوگوں کی کرموں والی رات ہے اس لیے اس نے بڑے سے کڑاہ میں حلوہ بنایا ہے، سارے محلے میں بانٹنا ہے نا۔"

"اللہ سوہنا قبول کرے۔" بی بی نے حلوہ لے کر اپنی تھالی میں ڈالا تب تک سمرن کور جگنی کے ساتھ انجیر کے درخت کے نیچے کھڑی سامنے رکھی تیل کی بوتل اور قطار در قطار موجود دیوں کو دیکھتی رہی تب ہی جگنی کے ذہن میں جانے کیا آیا کہ اپنی سے بڑی سمرن کور کو مخاطب کر بیٹھی۔

"پتا ہے بی بی کہہ رہی تھی آج کی رات بڑی بختوں والی ہے جو مانگو سو ملتا ہے میں نے تو آج بڑا کچھ مانگنا ہے۔"

جگنی کے انداز میں جوش بھی تھا اور اشتیاق بھی، مگر اس تمام سے قطع نظر اس وقت اس کے لہجے میں ایک فخر ایک غرور در آیا تھا جس میں شاید وہ سمرن کور کو یہ جتانا چاہتی تھی کہ تم لوگ چاہو تو اپنے من پر گجراتی تالا لگائے ہاتھ میں کرپاں تھامے رہو مگر دیکھو ہمیں تو ایک ہی رات میں من کی ہر مراد ملنے والی ہے۔ سمرن کور نے نظر اوپر اٹھا کر اونچے اونچے کنگروں والی دیوار سے بھی اوپر خود پر جھکے سیاہ آسمان کو دیکھا جس پر چاند بھی سینہ تانے محسوس ہوا۔

"آج کی رات... صرف آج کی رات میں؟"

سمرن کے لہجے میں موجود حیرت مایوسی کی شکل مارے ذرا سا جھانکی تھی۔

"تو اور کیا" تو نہیں یقین کرتی تو بھلے میری بی بی سے پوچھ لے۔"

ہاتھوں کو ناک کے نزدیک لا کر مہندی کی خوشبو اپنے اندر اتارتے ہوئے جگنی نے کہا تو سمرن مزید سوال کیے بنا رہ نہ پائی۔

"اگر ایک رات میں ہی سارا کچھ مل جاتا ہے تو پھر تیرا ابا پانچوں وقت جا کر مسجد میں کیوں ماتھا ٹیکتا ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا۔" لاجواب ہو کر جگنی نے اپنا گلابی ہونٹوں کا دہانہ سکوڑا۔

"ہو سکتا ہے بی بی نے یہ بات اسے بتائی ہی نہ ہو۔" جگنی نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے اب بات ختم کرنا چاہی تھی۔

یوں بھی تھی تو وہ بچی ہی اور اس کی معلومات بھی بے حد محدود' اب یہ الگ بات تھی کہ دیکھنے میں وہ اور سمرن کور برابر ہی معلوم ہوتیں۔

"بی بی۔ ایک بات تو بتاؤ۔" دھلی ہوئی پلیٹ ہاتھ میں لے کر آتے آتے بی بی نے سمرن کور کے آنے پر کھلا رہ جانے والا جستی پھاٹک نما دروازہ بند کیا اور انجیر کے درخت تلے آن پہنچیں۔

"پوچھ پتر۔"

"بی بی' آج کی رات کیا تم میرے لیے بھی کچھ مانگو گی؟" لالٹین میں تیل ڈال کر اس کا شعلہ ہلکا سا بلند کر کے بی بی نے چھکا ٹانگنے کے کیل پر اسے لٹکایا کو کہ عام دنوں میں وہ یہی عمل ذرا تاخیر سے کیا کرتی تھیں۔

"کیا چاہیے سمرن تجھے؟ بتا مجھے۔"

"بی بی! گھر میں بڑی خرابی ہو گئی ہے آج کل۔ لدھیانے سے میرے چاچے کا پت آیا ہے اور بے بے اور باپو کہتے ہیں کہ میرا ویاہ اس کے ساتھ کر دیں گے۔" اس کی بات پر بی بی چاند کی ٹھنڈی کرنوں سا مسکرائیں۔

"کیا کرتا ہے وہاں لدھیانے میں؟"

"چاچا تو وہاں ٹانسا بناتا ہے بڑے ورے (سال) پہلے اس نے زمینوں کا کام چھوڑ دیا تھا۔ باقی گھر کے سارے جی اس کے ساتھ ہی ٹانسے کی کھڈیوں میں کام کرتے ہیں پر وہ اکلا (اکیلا) اب ایک بار پھر زمینوں پر کام کرنا شروع ہو گیا ہے۔"

"تو پتر تجھے اعتراض کس بات پر ہے؟"

"بی بی! وہ مسلوں کے بڑا خلاف ہے۔ کئی گھبرو جوانوں کو ساتھ کٹھا کر کے تا اس نے بڑی بڑی پربندھک پارٹیاں بنائی ہوئی ہیں اور بہا ہے کہتا ہے کہ ایک دن بھارت ماتا کو پاک کر دوں گا ان سب مسلوں کو مار کے۔"

دانستہ طور پر سمرن کور نے اپنا لہجہ پست کیے ہوئے تھا اس کے باوجود جب سبک ہوا کی مہربانی سے ہلکے زرد رنگ کا جستی پھاٹک ذرا سا ہلا اور جس طرح اس کی چولیں چرچرائیں۔ خوف سے سمرن کور ایک دم سہم کر بی بی کی طرف جھکی اس کے برعکس جگنی چونکہ اس گفتگو کے تحت ہونے والے آئندہ ممکنہ اقدامات سے ناواقف تھی جبھی بی بی کے مقررہ اندازے کے مطابق ہر دیے میں تیل ڈالنے کے بعد بوتل کھڑکی کے عین سامنے کنستر کے قریب ہی رکھ آئی۔

"پر سمرن پتر! یہاں اس محلے میں تو سکھوں اور مسلمانوں والی کوئی ہی بات ہی نہیں ہے نا۔ ہم سب تو بہن بھائیوں کی طرح اس جگہ کو اپنا وطن سمجھ کر یہاں آباد ہیں۔"

"بی بی! یہ تو تم لوگ سمجھتے ہو نا مگر جب سے سکھبیر نے یہاں سب کو مل جل کر رہتے دیکھا ہے تب سے بیٹھا نتھنے پھڑکا رہا ہے۔ کہتا ہے اس محلے میں کسی مسلے کو نہیں رہنے دے گا اور... لو رہا ہے بے بے نے جب سے بڑے کڑاہ میں حلوہ بنایا ہے نا تب سے گرو جی کی سوگندھ کھا کر کہتی ہوں کہ راجہ ارجن کی طرح پانڈوؤں کی رتھ میں بیٹھا کانپی جا رہا ہے۔"

بی بی کے دل کو سمرن کور کی باتوں نے زندہ کبوتر کے پوٹے کی طرح گرم کر چھوڑا تھا حالات تو یوں بھی پورے ہندوستان میں ہی مسلمانوں کے لیے خراب تھے۔ ایسے میں ایسے علاقے جہاں سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ برابری کی بنیاد پر ایک دوجے کے مذہب عقیدے اور قومیت کے تصور کو چھیڑے بنا رہا کرتے تھے' خال خال ہی نظر آتے تھے۔

"اور اگر ایسا کچھ ہوا تو وہ بھلا کہاں جائیں گی۔" انہوں نے لکڑی کی چھوٹی سی پیڑھی پر بیٹھی جگنی کا معصوم چہرہ دیکھا جو لالٹین کی روشنی کی وجہ سے خوب صورتی میں کہیں بڑھ کر معلوم ہو رہا تھا۔

"میں یہ حلوہ خاص طور پر تجھے دینے اسی لیے آئی تھی تاکہ یہ بتاؤں کہ وقت اور حالات کا ہندوستان سرکار کی طرح کچھ پتا نہیں کب بد سے بدتر ہو جائے... بی بی اپنا آپ سنبھال رکھیں۔"

اس کے اس درجہ خلوص پر بی بی کے دل کے کسی گوشے سے اس کے لیے دعا نکلی تھی' سکھبیر بھی سکھ تھا جو اس محلے میں موجود تمام مسلمانوں کو چن چن کو ختم کرنے پر تلا تھا' مگر دوسری طرف سمرن کور اور اس کے بے بے اور باپو بھی سکھ تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ کسی ناحق کا خون بہے اور کبھی بھی کسی بھی طور کسی بھی ہنستے کھیلتے شخص کو صرف اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے کہ وہ ایک دوسرے مذہب کو ماننے والا ہے۔ جنہوں نے آج شب معراج کی بابرکت رات کو ایک بڑے سے کڑاہ میں صرف اس لیے حلوہ بنایا ہے تاکہ حلوہ دینے کے بہانے ہر مسلمان گھرانے کو آنے والے وقت اور اپنے گھر میں اترنے والی اس خطرناک عفریت سے خبردار کر سکیں۔

وہ عفریت جو اپنی شیطانی ذہنیت کی تسکین کے لیے مذہب کا نام استعمال کرتے ہوئے کتنے ہی دوسرے نوجوانوں کو اپنے ساتھ اس مہم میں شریک کر کے

مسلمانوں کو مکھیوں کی طرح چن چن کر ختم کرنے میں ہندوستانی انتہاپسند تنظیموں کے شانہ بشانہ کھڑے تھے اور بھول چکے تھے کہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والی کسی بھی انسان کو روئے زمین پر رہنے کا حق نہ دینا تو ان کے اپنے مذہب اور عقیدے کے خلاف تھا۔ نہ ان کے کسی گرو نے اس بارے میں حکم دیا اور نہ ہی گھر کی شبابت میں سب سے اوپر رکھی "بانڈی" (سکھوں کی مقدس کتاب) کے کسی پاٹھ میں کوئی ایسی بات درج تھی جس کو بنیاد بنا کر وہ مورکھ "اپنی کرپان کو مسلمانوں کے خون سے رنگتے جارہے تھے۔

"فیروز احمد اور چاچے کو بھی اچھی طرح سمجھا دیں بی بی کہ ذرا دھیان سے رہیں۔"

"بھلا ہو تیرا پتر" اللہ تجھے خوش رکھے اور تجھ سے خوش رہے۔" سمرن کور گھر جانے کے لیے اٹھی تو انجیر کی جھکی ہوئی شاخیں اس کے سر کو چھو رہی تھیں سبی بی کی دی گئی دعا پر مسکرانے لگی۔

"بی بی" آدھی بات تو سمجھ آگئی ہے پر میں ہوئی سردارنی پھر تمہارا اللہ مجھ سے خوش کیسے رہے گا۔"

"پتر عزت اور ذلت اس کے ہاتھ میں ہے نا جس سے خوش ہو کر اسے عزت دینے کا ارادہ کرلے تو کافر بھی کلمہ پڑھ لیتے ہیں "اسی طرح جیسے بعض پتھروں سے پانی کے ٹھنڈے اور میٹھے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔"

"ہوں۔" سمرن کور نے دونوں ہاتھ گالوں پر اور کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا کر بیٹھی کھلو سی جگنی کو دیکھا جو دیے جلانے کے انتظار میں اس کے جانے کی منتظر تھی۔

"مگر ہاں" ہمارے اپنے ہی اعمال کی بدولت اگر کسی کے نصیب میں ذلت لکھ دی جائے تو اس کا مسلمان ہونا بھی اس کو نہیں بچا سکتا جب تک کہ وہ اپنے اعمالوں کے برابر سزا نہ بھگت لے" پر ایک بات بتاؤں...."

بی بی کے چہرے پر رات کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں پھیلتی لالٹین کی زرد روشنی میں بڑی امید افزا مسکراہٹ پھیلی۔

"وہ بڑا رحیم ہمیں معاف کرنے کو بھی تیار رہتا ہے اور کبھی تو کسی کی صرف ایک ادا پر بھی بخش دیا کرتا ہے۔"

آخری بات سمرن کور کو متاثر کر گئی تھی ہمیشہ سے اس کا دل تو چاہتا کہ بی بی کے ساتھ بیٹھ کر ان کی ساری باتیں سنے مگر اس امر کی صرف چاہت ہی رہی سو آج بھی اسے جانا پڑا۔

فیروز احمد اور ابا نے آج کی رات مسجد میں ہی عبادت کرنی تھی۔ یہ مسجد ایک زمانے میں کسی کا گھر ہوا کرتا تھا جہاں اب چٹائی ڈال کر محلے کے لوگ نماز ادا کرلیا کرتے تھے۔

سکھبیر کے متعلق بتائی گئی سمرن کور کی باتوں نے بی بی کے دل میں وقتی طور پر ایک وحشت سی تو ضرور پیدا کردی تھی مگر آج کی رات کو وہ کسی بھی طور رب کی چاہت کے سوا کسی دوسرے جذبے کی نذر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے جگنی کے ساتھ مل کر دیے جلائے اور چٹائی پر کالے اور سفید چیک کا ڈیزائن دار کھیس ڈال کر ہر قسم کے وسوسے اور خدشے کو دور کرنے کی غرض سے ایک بار پھر وضو کیا۔

لکڑی کے نقش ونگار سے مزین اپنے جہیز کی رحل پر سبز غلاف میں لپٹا قرآن پاک رکھا سامنے اگربتیاں جلائیں اور اپنے رب کے سامنے حاضر ہو گئیں۔ اگربتیوں کی بھینی بھینی خوشبو جہاں ماحول کو متبرک بنا رہی تھی وہیں ایک مخصوص قسم کا مقدس احساس فضا میں پھیل رہا تھا۔ آسمان پر کئی ہزار تارے بڑی خوب صورتی سے زمین کی چھت پر موجود تھے اور یقیناً "امت محمدیہ" کے نصیب پر رشک کر رہے تھے۔

جگنی ابھی مکمل طور پر صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن پاک نہیں پڑھ سکتی تھی۔ اس لیے ہاتھ میں موٹے موٹے دانوں والی تسبیح لیے نماز میں دہرائی جانے والی تسبیحات ہی پڑھ رہی تھی۔ بی بی آلتی پالتی مارے قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں جب انہیں اپنی دائیں ٹانگ پر رکھے جگنی کے بازو کا وزن بڑھتا محسوس ہوا یعنی کہ وہ سو گئی تھی۔ سو بی بی نے بڑے

احترام سے قرآن پاک بند کرنے کے بعد اسے سیدھا کرنا چاہا تھا، مگر اسی دوران اس کی ایک بار پھر آنکھ کھل گئی۔

چہرے پر عجیب حیرت اور ناسمجھی کی سی کیفیت تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے بڑی ہی بے چین اور انجان سی نظروں سے یوں اپنے چاروں اطراف دیکھا گویا کہ پہلی دفعہ اس ماحول میں آئی ہو اور شاید بی بی جان کے چہرے سے تو قطعاً" ناواقف ہی ہو خود بی بی اس کا یہ انداز دیکھ کر گھبرا کر رہ گئی تھیں۔

پہلے تو آج تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ ہمیشہ ہنستی مسکراتی جاگنے والی "وجگنی" آج جس طرح بوکھلائی اور ہونق نظروں سے یہاں وہاں دیکھ رہی تھی۔ لگتا تو یوں تھا کہ جیسے اسے کسی اور دنیا سے اٹھا کر ابھی اسی لمحے اس دنیا میں داخل کیا گیا ہو اور یہی وجہ ہو کہ وہ اس دنیا کو فوری طور پر قبول کرنے سے قاصر ہو۔

مگر جس طرح کالی کلیچوں کی ڈار نزدیک سے دیکھنے پر تو اپنا نہایت گہرا اثر بصارتوں پر چھوڑتی ہے، مگر وہی ڈار جب آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہونے لگے تو یہ ہی گمان گزرتا ہے گویا وہ حقیقت میں تو کلیچیں تھیں ہی نہیں سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے دھبے تھے سو وہ بھی وقتاً" فوقتاً" دور ہوتے جارہے تھے۔

عام دنوں میں جلد سو جانے والی جگنی کی آنکھیں تو نیند کے باعث سرخ تھیں مگر انداز اب ایک دم بدل گیا تھا۔ تسبیح جو ابھی تک اس کے دائیں ہاتھ کی درمیانی دو انگلیوں میں الجھ جانے کی وجہ سے نیند کے باوجود اس کے پاس ہی تھی۔ اٹھتے ہی اسے چوم کر آنکھوں سے لگایا اور آخر اپنے معمول کے انداز میں بی بی سے مخاطب ہوئی۔

"بی بی! آج کی رات سوہنے سرکار عرشوں پر گئے تھے نا؟"

"ہاں پتر' گئے تو تھے۔" بی بی اس کے جاگنے کے انداز پر ابھی تک الجھن کا شکار تھیں۔

"بی بی' عرشوں پر ایک بہت بڑا درخت ہے نا جس پر لاکھوں' کروڑوں سے بھی زیادہ پتے ہیں؟" بی بی کی بتائی گئیں باتوں کی آج پھر وہ بی بی سے تصدیق کیوں چاہ رہی تھی۔ بس اس بات کی تو انہیں حیرانی تھی، مگر اسے بولنے کا مکمل موقع دیتے ہوئے انہوں نے سر کو ہاں میں ہلایا۔

"اور کیا ہم سب کا اور آنے والوں کا نام ان پتوں پر لکھا ہوتا ہے؟"

"بالکل پتر' کیوں نہیں۔"

"بی بی' جس کا پتا گر جائے اس کا دنیا میں وقت ختم ہو جاتا ہے کیا؟"

"ہاں پتر' جس بندے کے نام کا پتا پیلا ہو کر یا سبز حالت میں ہی گر جائے تو وہ سال کے اندر اندر اس دنیا کو چھوڑ جاتا ہے۔" بی بی نے گہری سانس لے کر جواب تو دیا، مگر ابھی تک وہ یہ نہیں سمجھ پا رہی تھیں کہ آخر ان سوالات کے پیچھے اس کا مقصد کیا ہے۔

"ابا کہتا ہے نا کہ قائد اعظم کی تقریروں اور ہندوؤں کی بوکھلاہٹ سے لگتا ہے کہ کوئی انہونی بس اب ہونے کو ہے۔ پر بی بی پھر جو ہم نے سوچا ہے کہ آئی عید کے چاند میں بھائی فیروز احمد کی شادی کرنی ہے اس کا کیا کریں گے؟"

"پتر تجھے نیند آئی ہے نا تو ایسا کر سو جا ادھر ہی' میں تو آج فجر تک جاگوں گی۔" بی بی نے اسے تھپک کر لٹانا چاہا، مگر وہ تو اس وقت مزید سوالات لیے تیار تھی اور اس نے باتوں باتوں اپنی سوالات کی دھن میں بی بی کی بات سنی ہی نہیں تھی اور یا پھر سن کر یقیناً" ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات کا ریشم وہیں سے سلجھانا شروع کیا تھا جہاں سے اس نے الجھایا تھا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ اگر ہم بھائی فیروز احمد کی شادی کریں اور ان کا چھوٹا سا بیٹا پیدا تو ہو' مگر میری طرح اس کا بھی پتا بالکل سبز حالت میں ہی عرشوں پر کہیں گر جائے تو بی بی مجھے بتا کہ پھر بھائی فیروز احمد کے دل پر کیا گزرے گی؟"

اس کی بات کی وحشت ہی کچھ ایسی تھی کہ اس غیر متوقع بات پر بی بی کا رنگ مکھن نکلے دودھ کی طرح

سفید پڑ گیا ان کا جسم بے سدھ سا پڑا رہ گیا تھا یوں لگتا جیسے غنچے کی پھوک کی طرح ان میں کچھ نہ بچا ہو۔ جگنی نے ہاتھ پکڑ کر ہلایا تو فوراً بولیں۔

"پتر آج کرموں اور بختوں والی رات ہے‘ آج کے رات دعائیں مانگنے کی‘ سوہنے رب کے حضور سجدہ کرنے اور اسے راضی کرنے کی رات ہے۔ ہم کیا اور ہماری سوچیں کیا۔"

دائیں کندھے پر گردن ڈالے جگنی خاموش ہو گئی تھی۔

"آج تو بس یہ سوچنے کی رات ہے کہ وہ کیسی گھڑی ہو گی جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم عرشوں پر گئے ہوں گے۔ جب پہاڑ‘ درخت اور میرا پتر۔۔۔ کائنات کی ہر چیز سجدے میں چلی گئی ہو گی۔"

"باتیں تو تیری بھی ٹھیک ہیں نا‘ پر مجھے تو جواب دے نا۔"

جگنی ابھی تک جواب کی طالب تھی اور ایک مرتبہ پھر دونوں کہنیاں اپنے گھٹنوں پر جمائے ہاتھوں کے پیالے میں مکھن سا سفید چہرہ دھرے ہوئے تھی۔

"مجھے بتانا‘ اگر میرا پتا ہرا ہی گر جائے یا چل تو پریشان ہو جائے گی میرے بارے میں سوچ کر یہ بتا دے کہ اگر بھائی فیروز احمد کا بیٹا ہو اور اس کا پتا ہرا ہی گر جائے تو اس پر کیا بیتے گی؟"

بی بی کو محسوس ہوا کہ جگنی کے ان سوالات نے ان کے جسم پر ہلکی ہلکی کپکپی طاری کر دی ہے۔ جب ہی جگنی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اس پر بڑا جاندار اور بھرپور بوسہ دیا تھا جواب میں بی بی کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی بالکل ایسی ہی جیسے ابر آلود موسم میں اکثر اوقات کالے سیاہ بادلوں کے درمیان سے چاند نکلا کرتا تھا۔

"بی بی اگر تجھے پتا چل جائے کہ ایسا ہونے والا ہے پھر بھلا تو کیا دعا مانگے گی؟"

"جگنی پتر ایک بات بتاؤں تجھے؟"

جگنی کی آنکھوں میں فوراً "کئی جگنوؤں کی بارات اتری تھی۔ اپنے سوالات کا جواب ملنے کی خوشی اب اس کے چہرے پر یوں آہستہ آہستہ جمع ہو رہی تھی جیسے پھیلے ہوئے دھانوں میں سے چونچ بھر کر ان گنت چڑیاں چار کھونٹ ایک ہی جگہ پر جمع کر دیں۔

"اول تو اگر مجھے پتا چل بھی جائے نا تو بھلا بتا میں گلیاں دار ورڈا کو ڈاکر بھی کیا لوں گی۔ جس کی چیز ہے وہ جب چاہے واپس لے لے‘ پر دل کو خوشی ضرور ملے گی کہ اگر میرے خون کا قطرہ کسی بھی نسل میں رواں ہوتے ہوئے وہ درجہ پا کر دنیا سے جائے جس کی تمنا عرشوں پر جانے والے نے بھی کی تھی۔"

"وہ کیا بی بی؟ ایسی کیا تمنا کی تھی سوہنے سرکار نے؟"

"پتا ہے جگنی‘ شہیدوں کا رتبہ اتنا بلند ہے کہ عرشوں کے دولہا نے بھی ایک دفعہ یہ خواہش کی تھی۔"

بی بی کی بات پر جگنی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا سینہ‘ اس کا دماغ یک لخت جگمگانے لگے ہوں۔ کواٹروں کے چرچرانے اور سیلے کمروں سے آتی جھینگر کی مسلسل آوازیں بھی خوبصورت لگنے لگی تھیں۔ ڈھاکہ کی مخمل سا نرم و ملائم جسم مزید پھولوں سا لگنے لگا اور خود پر بے ساختہ پیار آ گیا۔

"پر یہ تو بتا تو کیوں پوچھ رہی ہے یہ سب؟"

"بی بی میں نے ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے پتا ہے کیا دیکھا؟"

"کیا دیکھا؟"

"میں نے دیکھا جیسے میں نا بھائی فیروز احمد کے بیٹے کے ساتھ کسی سرسبز اور خوب صورت جگہ پر موجود ہوں‘ بہت خوش۔ بہت ہی زیادہ خوش‘ وہاں خوب صورت چہرے والے اور بھی بہت لوگ ہیں بی بی‘ اور وہ کہتے ہیں کہ تم تو خوش قسمت ہو کہ ہمارے ساتھ یہاں آ گئی ہو پر نا۔ وہ کہتے ہیں کہ جو بھائی فیروز احمد کا بیٹا ہے نا‘ وہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہے اس لیے کہ وہ اپنے گھر کے دوسرے لوگوں کو بھی یہاں لے آئے گا۔" بی بی دم بخود بیٹھی اس کی بات سن رہی تھیں۔

"ولیکن پتا نہیں کیوں بی بی‘ مجھے ایسا لگا جیسے وہ

خواب نہیں تھا' بچی میں جسے میں نے جاگتی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا' حالانکہ اصلی میں تو میں تیرے پاس ہی سو رہی تھی نا۔"

جگنی اب کسی الجھن کا شکار تھی۔ مگر بی بی یقینی طور پر اس کی بات کی تہہ تک پہنچ چکی تھیں سر اٹھا کر تشکر آمیز بھیگی نظروں سے اوپر دیکھا تو نظریں تاروں پر رکنے کے بجائے آسمان کو مَس ہوتی محسوس ہوئیں۔

جگنی کا ذہن' اس کے خیالات' جسامت کسی بھی طور اس کی عمر سے میل نہیں کھاتی تھی۔ اس پر آج برکتوں والی رات میں دیکھا گیا یہ خواب۔

"بی بی۔؟"

"بول پتر۔"

"اگر میرے نام کا پتا سبز ہی ہو اور گر جائے نا تو دیکھ روئے گی تو نہیں نا؟" یہ آج اسے کیا ہو گیا تھا' کیسی باتیں کر رہی تھی۔ بی بی نے اسے جی بھر کے دیکھنا چاہا مگر اس کے چہرے پر آج گویا نظر پھسلتی ہی تو جا رہی تھی۔ باوجود خواہش کے وہ اسے دیر تک نہ دیکھ پائی تھیں۔

"جانا' دل چھوٹا نہ کریں۔"

بی بی کو آج جگنی میں اس الہڑ دوشیزہ کی جھلک نظر آ رہی تھی جو شادی سے ایک دن پہلے ماں کے ساتھ گھر کے کسی کونے میں بیٹھ کر اپنا خیال رکھنے اور اس کی یاد میں آنسو نہ بہانے کی تلقین کر رہی ہوتی ہے۔ مگر دل میں نئی زندگی کی امنگ کے ساتھ ساتھ جان سے پیارے رشتوں کو پل بھر میں چھوڑ جانے پر غمگین بھی ہوتی ہے۔

"تو میری فکر نہ کر' پیدا کرنے والا میرے ساتھ ہے۔" بی بی مسکرائیں تو وہ بھی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔

"جا جا کر ایک بار پھر وضو کر اور تسبیح لے کر پڑھ۔" اس رات جگنی کی باتوں نے بی بی کی دعاؤں کے دھارے کو ایک نئی سمت دکھا دی تھی۔

اگست کے دوسرے ہفتے میں اگر کوئی بی بی سے رات کے یخ ٹھنڈی ہونے کے بارے میں کہتا تو شاید وہ حیرت سے تکتیں مگر آج تو انہیں خود شملہ کی طرف برف پوش پہاڑیوں سے ٹھنڈی ریڑھ توڑ ہواؤں کا ریلہ سا آتا محسوس ہو رہا تھا' سیاہ مرمر جیسی ٹھنڈی رات میں ایک عجیب پُرسکون سا احساس تھا۔

جگنی ایک مرتبہ پھر تسبیح ہاتھ میں لیے سو چکی تھی۔

بی بی نے بڑی آہستگی سے اس کے ہاتھ سے تسبیح علیحدہ کر کے جزدان پر رکھی اور تمام تر توانائی اکٹھی کر کے سوئی ہوئی جگنی کو کندھے پر ڈال کر ڈیوڑھی میں موجود اپنے نواڑی پلنگ پر ڈالنے کے بعد اوپر کھیس اوڑھا دیا۔

جگنی کی باتیں ابھی تک بی بی کے ذہن میں موجود اور تازہ تھیں۔

دوبارہ اپنی جگہ آ بیٹھنے کے بعد چند لمحے اس کی کہی ہوئی باتوں کو سوچا تو دو رویہ ٹریفک کی طرح خیالات اور جذبات ایک جگہ پر ایک سمت کی طرف جمع ہو کر نہ دیتے کبھی افسردگی سے آنکھیں بھیگتیں تو کبھی تشکر سے۔

یوں بھی بی بی ان لوگوں میں سے تھیں جو دعا کو بھی عین عبادت سمجھتے ہوئے کتنا ہی ٹائم بس اب سوہنے کے آگے جھولی پھیلائے مانگتے رہنے کو ہی اپنے لیے بخشش کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جن کا روحانی عقیدہ مکمل طور پر یہ ہی ہوتا ہے کہ دعائیں بھی پیتل کے برتن کی طرح ہوتی ہیں۔ ذرا سی بے توجہی جن پر مایوسی کی کائی چڑھانے لگتی ہے۔ اسی لیے رب سوہنے کے دربار میں دعاؤں کے اس برتن کو جتنی بار مانجھا جائے گا۔ چمک دمک اسی قدر زیادہ ہو گی۔ اور یوں بھی دعا کے مانگنے کی ہماری زندگی میں اسی قدر اہمیت ہے' جتنی جسم میں دماغ کی۔

اسی خیال کے تحت بی بی نے سب سے پہلے قرآن پاک کا بوسہ لیا اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔

"عرشوں پر جانے والے سوہنے کے سوہنے ربا' تو ایک ہی ہے' جس سے ہم مانگتے ہیں اور بے شک بس تو ہی دینے والا ہے مالک' تیری یہ کوجی' نکمی اور کسی نہ کم جوگی حقیر سی بندی آج کرموں اور بختوں والی رات

میں تیرے آگے سوالی بن کے بیٹھی ہے میں گلیاں وارو ڑا کوڑا' محل چڑھنے کی کوئی آرزو تو نہیں پر 'سوہنیا' میرے اور میری آنے والی نسلوں کے بھاگ جگادے مالک۔ میری موجودہ اور آنے والی تمام نسلوں کے ایک ایک کو اپنی راہ میں قربان ہونے کے لیے چن لے اور پھر ہم نکموں کی یہ قربانی پسند کرلے۔ تیرے محبوب کے نواسوں کی سنت پر چلا کر ہم میں سے ایک ایک کو اپنے رستے میں قربان ہونے کا ایک واری موقع دے۔ ہماری نسلوں میں اضافہ فرمانا کہ ہم اپنی اولادوں کو تیری رضا پر قربان کریں۔ نصیب جگادے سوہنیا ربا' عرشوں پر جانے والی سرکار کے صدقے۔"

بی بی کی آنکھیں فرط احترام سے بند تھیں' چہرہ تاروں کو نظرانداز کیے صرف آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ آنکھوں سے بہتے مسلسل آنسوؤں نے بی بی کو یہ تک احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ بند آنکھوں سے راہ بنا کر بہنے والے آنسوؤں نے ان کے چہرے کو دھو کر پیتل کے برتن کی طرح دعاؤں کے اثر سے کسی قدر روشن بنادیا ہے۔ مگر وہ کیا جانتیں کہ وہ تو اس وقت سراپا دعا تھیں۔ ان کی سانس' دھڑکن اور جسم کا رواں رواں سوہنے رب کے حضور سوالی بنا بیٹھا تھا۔

"ہم جیسے گناہ گار یقیناً اس قابل نہیں ہیں رب کے تجھ سے یا عرشوں پر جانے والی پاک ہستی سے محبت کا دعوا کرسکیں۔ پر تیری محبت ڈھونڈتے ہوئے اگر یہ جان قربان ہو تو۔ اور پھر کیا چاہیے۔"

بی بی شاید کتنی ہی دیر بیٹھی صرف مانگتی ہی رہتیں کہ گلی میں اٹھنے والے شور و غوغا سے اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کے لیے ایک نئی ارض پاک وجود میں آگئی ہے۔ پاکستان جو صرف ذہن اور نیت کے پاک لوگوں کے رہنے کی جگہ ہوگی اور جہاں کوئی بھی دوسرا متبادل قابل قبول نہیں ہوگا۔

فوراً" ــــ سجدہ شکر بجالانے کے بعد بی بی نے چھت پر جاکر دیکھا تو ایک عجیب جشن کا سماں تھا۔ گلیوں میں لالٹینیں ہی لالٹینیں تھیں۔ لوگ ایک دوسرے سے گلے بھی مل رہے تھے اور مبارکبادیں بھی دے رہے تھے۔ لیکن وہیں بی بی کی سماعتوں سے یہ بات بھی ٹکرائی کہ فسادات میں تیزی آگئی ہے۔ اور مسلمانوں کو چن چن کر شہید کیا جارہا ہے۔ غور کرنے پر - یہ بھی محسوس ہوا کہ سامنے موجود لوگوں میں سکھ برادری کے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں' ذہن میں سیمرن کور کی بتائی ہوئی باتیں اور ہاتھ میں کرپان اور سر پر کشمیری ڈونگے جیسی پگڑی باندھے سکھبیر سنگھ کا ہیولہ ابھرا' یعنی وہ جو پہلے ہی اس محلے میں مسلمانوں کے یوں آباد ہونے کا جان کر چراغ پا تھا اب تو اس کے غصے کو مزید ہوا لگی ہوگی۔

فیروز احمد لمحہ بھر کے لیے گھر آئے۔ بی بی کو قیام پاکستان کی خبر دی اور ایک بار پھر باہر چلے گئے۔ آج کی رات تو بلاشبہ ویسے ہی ہزار ہا راتوں سے افضل تھی اس پر آج ان کی زندگیوں میں آنے والا عظیم انقلاب بھی اسی رات سے آنسلک ہوا تو سب کی خوشیوں اور شکر گزاریوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ اور یوں یہ رات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہوگئی۔

سکھبیر اسی رات واپس روانہ ہوگیا تھا اور یہ جان کر کہ گورداسپور' ہندوستان میں شامل ہوا ہے اس کی خوشیاں انتہا پر تھیں۔ بار بار کہتا کہ کسی میں اتنی جرات نہیں کہ ان سے ان کی جنم بھومی چھین لے اور اگر گورداسپور کو پاکستان میں شامل کیا جاتا تو وہ خون کی ندیاں بہادیتا۔ یوں بھی سکھبیر سنگھ کی بات میں بڑا وزن اس لیے بھی خیال کیا جاتا کہ وہ انتہا پسند ذہنیت کا مالک تھا اور گورداسپور میں موجود کئی لوگوں کے ساتھ مل کر مختلف اوقات میں کتنے ہی مسلمانوں کو شہید کرچکا تھا اور اب اس کی نظر اس محلے ــ پر تھی جہاں اس نے بارات لانی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس زمین پر مذاہب کی "ملاوٹ" نظر آئے۔ ادھر سارے ملک میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی۔ سکھبیر سنگھ جلد ہی واپس آنے کا کہہ کر لدھیانے واپس چلا گیا تھا۔

پاکستان بنے کوئی بیسواں یا بائیسواں روز تھا۔ قتل و غارت اپنے عروج پر تھی ان کے اپنے محلے سے کئی

مسلمان شہید ہو چکے تھے۔ چند سکھ برادری کے لوگ بھی اسی دوران اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

جگنی لوہے کے جنگلے سے لگی ڈیوڑھی میں بیٹھی کپڑے کی گڑیا سی رہی تھی۔ فیروز احمد اپنے ابا کے ساتھ گھر سے باہر تھا جب بی بی کے کانوں میں یہ روح فرسا خبر پڑی کہ جگنی کے ابا کو کسی نے قتل کر ڈالا ہے۔

بی بی کو اپنے ہاتھ پاؤں یک لخت ساتھ چھوڑتے محسوس ہوئے۔ سمرن کور کا بھائی جستی پھاٹک عبور کیے ان کے صحن میں کھڑا تھا۔

"میں خود بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ یہ جگنی کا ابا وہیں پڑا ہے بہار روڈ پر۔ اور اس کے خون سے ساری اینٹیں سرخ ہو رہی ہیں۔"

"اور فیروز احمد؟" بی بی نے پوچھا۔

"اسے تو میں نے نہیں دیکھا' پر غارت گروں' لٹیروں نے چاچے کو قتل کر دیا ہے جتنے لوگ تھے تا سب مارے گئے ہیں بی بی' ایک دوجے کے اوپر نیچے بس لاشیں ہی لاشیں رکھی ہیں۔" بوکھلاہٹ میں ارمندر سنگھ جلدی جلدی بی بی کو تفصیل بتا رہا تھا۔

"تو جا' جا کر سمرن کو ذرا بھیج' میں جگنی کے ابا کو تو لے آؤں۔"

"بی بی! پاگل نہ بن' تو اکیلی عورت ذات ہے۔ لاشوں کی منڈی لگی ہے وہاں بھلا کیسے ڈھونڈے گی اور کیسے لائے گی۔"

"تو جا میرا پتر' سمرن کو بس بھیج دے یہاں جگنی کے پاس۔"

اس کی بات پر قطعاً" کوئی بھی دھیان دیے بغیر بی بی نے ایک بار پھر اپنی کی ہوئی بات دہرائی اور اس کا کوئی بھی جواب سنے بغیر لکڑی کے بڑے سے صندوقچے پر رکھی جائے نماز کی طرف متوجہ ہو گئیں کہ یقیناً" وہ سب سے پہلے رب سوہنے کے حضور شکرانے کے نفل پڑھنا چاہتی تھیں۔ جس نے ان کی دعا قبول کرتے ہوئے ان کے سر تاج کو اپنی راہ میں قربان ہونے کے لیے چنا تھا۔

آنکھوں میں دل سے ہوتے ہوئے موٹے موٹے آنسوؤں پر بی بی نے لمحہ بھر میں کئی قسم کے قفل لگا رکھے تھے۔

سمرن جگنی کے پاس تھی اور بی بی اپنے تئیں کوشش کرتے ہوئے بہار روڈ تک تو جیسے تیسے پہنچیں بھی' مگر یہ حقیقت چھر چلاتی تلوار کی طرح ان کے وجود کے آرپار ہو گئی کہ ان نامرادوں نے نہ صرف ان کی جانیں بھی ختم نہیں کیں' بلکہ کسی طرح ان فانی اجسام کو بھی اٹھا کر کہیں دور جا پھینکا تھا۔ تاکہ ان کے پیارے یوں اچانک ان کے دور ہو جانے اور آخری دیدار تک سے محروم ہو جانے کی اذیت عمر بھر کے لیے اپنے سینوں میں محسوس کریں۔ مگر بی بی کا ایمان تھا کہ جگنی اور فیروز احمد کے ابا شہید ہیں اور تاقیامت زندہ ہیں۔ اس لیے رب کی رضا میں راضی ہوتے ہوئے الحمدللہ کہہ کر واپس ہو لیں۔

محلہ بھگوان داس میں چند دن گزارنے کے بعد واپس جانے والے سکھبیر سنگھ نے جو وعدہ اپنے آپ سے کیا تھا بی بی کی غیر موجودگی میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس وعدے کو نبھانے کے لیے ایک بار پھر محلہ بھگوان داس آ پہنچا۔ جہاں پورے ملک میں امن و امان کی مخدوش صورت حال کے باوجود سکھ اور مسلمان برادری ایک دوسرے کے لیے دلوں میں مثبت جذبات رکھتی تھی۔

سکھبیر کے واپس آنے کی اطلاع پر سمرن کور ڈرتے ڈرتے اپنے گھر میں داخل ہو گئی تھی۔ جگنی اب فیروز احمد کی موجودگی کی وجہ سے تنہا نہ تھی۔ بی بی نے تھکے ہوئے قدموں اور بھاری وجود کے ساتھ گھر میں قدم رکھا۔ ڈیوڑھی میں جا کر سیاہ برقع اتارا تو فیروز احمد اور جگنی دونوں ان کے قریب چلے آئے۔ جگنی سینے سے چمٹی تو فیروز احمد ان کے گھٹنے پر سر رکھ کر خود نیچے جا بیٹھا۔ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آواز میں دونوں ہی رو رہے تھے۔ دونوں کی سسکیاں گلے میں پانی کی اٹکی ہوئی بوند کی طرح صرف حلق ہی میں زندہ تھیں۔

بی بی جانتی تھیں کہ یہ ایک فطری عمل تھا۔ اسی لیے دونوں کے سر پر ہاتھ ضرور پھیرتی رہیں' مگر

خاموش ہونے کا اس لیے نہ کہا کہ صدمے کی حالت میں آنسوؤں کا بہہ نکلنا بھی سوہنے رب کی ایسی نعمت ہے کہ جس سے غم میں کمی تو واقع نہیں ہوتی لیکن دل کی شریانیں رونے کی صورت میں تیزی سے کام سرانجام دینے کی وجہ سے مضبوط ہو جاتی ہیں اور کسی بھی صدمے کو بہتر طریقے سے برداشت کر پاتی ہیں۔

خود بی بی نے چند ثانیے کے لیے گہری سانس خارج کرتے ہوئے اتنی شدت سے ہونٹ بند کیے کہ جب ہونٹوں میں دراڑ پڑی تو ان کی سطح پر سفید سفید لکیریں پڑی تھیں۔

کتنے ہی لمحے خوشی اور غم کے امتزاج بھرے جذبات میں گزرے۔ آخر کار جگنی ان کے سینے سے لپٹی اور بولی۔

"بی بی۔۔۔ ابا چلے گئے نا' ظالموں نے مار دیا انہیں۔"

اس سے آگے وہ کچھ بھی بول نہیں پائی تھی۔ شدت ضبط کے باعث ہونٹ اور ناک کے نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔ دودھ 'مکھن سے پلی جگنی کا چہرہ سرخ تھا اور آنکھیں سوج کر اپنے حجم سے دگنی ہو گئی تھیں۔

بی بی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا' سیدھی مانگ کے باعث کتنے ہی ننھے ننھے بال گھاس کی طرح دوسرے بالوں سے الگ نظر آ رہے تھے۔

"نہ پتر رو نہ۔۔۔ بس یہ سوچ کر خوش ہو جا کہ اللہ نے انہیں پسند کر لیا تھا' اسی لیے کبھی نہ مرنے کے لیے ہم سے اوجھل کر دیا۔"

"کبھی نہ مرنے کے لیے بی بی؟" جگنی حیران ہوئی تو آنکھوں کے کٹوروں میں آنسو چھلکتے چھلکتے رہ گئے۔

"تو اور کیا' اس دنیا سے تو وہ چلے گئے' پر ایک دوسری دنیا میں یہاں سے کئی درجے بہتر زندگی گزاریں گے۔"

"سچ بی بی؟"

"ہاں پتر۔۔۔ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں نا۔ یعنی اللہ کو پیارے لگے تھے تو انہوں نے تیرے ابا کو اپنے پاس بلا لیا۔"

"بی بی۔۔۔ پر میں چھوڑوں گا نہیں ان لوگوں کو' تو دیکھنا۔" پہلی مرتبہ فیروز احمد بولا تو لہجہ گلوگیر ہی تھا۔

"بالکل پتر۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ ظلم برداشت کرکے ہم نے ظالموں کی پرورش تھوڑا ہی کرنا ہے۔" بچے ایک ننھے منے نرم سے پودے کی مانند ہوتے ہیں' جس طرف رخ موڑ دو' اسی انداز میں بڑھنے لگتے ہیں۔ بی بی نے بھی اس دن دونوں کو بڑے پر اثر انداز میں سمجھایا' وضو کروانے کے بعد اپنے ساتھ کھڑا کرکے اس بات پر شکرانے کے دو نفل پڑھوائے کہ ہمیں شہید سے نسبت ملی۔

اس رات لالٹین میں تیل کم تھا اور وہ بھک بھک کرکے اچانک جل اٹھتی اور ایک دم ہی بجھ جاتی۔ فضا میں حبس اتنا تھا کہ گرمی زبان نکالے شکاری کتے کی طرح ہانپے جا رہی تھی۔ شہد کے خالی چھتے کے ٹکڑوں کی مانند بی بی کے خیالات یہاں وہاں بکھرے جا رہے تھے۔ جگنی کے ابا سے اپنی ہونے والی شادی سے لے کر آخری دفعہ ان کے گھر سے نکلنے تک کے واقعات درزی کی کترنوں کی طرح جابجا ان کے ذہن میں بغیر کسی ترتیب کے موجود تھے۔

جگنی اور وہ ایک ہی تکیے پر سر رکھے سو رہی تھیں۔ بی بی کا بازو جگنی کے سر تلے تھا۔ دائیں کروٹ پر لیٹی گل گوتھنی سی جگنی کے ساتھ اب بی بی کو یہ پلنگ تنگ محسوس ہوتا تھا۔ مگر دونوں کی بھی یہ مرضی تھی کہ کروٹ پر لیٹے لیٹے ہی ساری رات بے آرامی تو منظور رہے' مگر اکیلے سونا نہیں۔ یہ الگ بات تھی کہ اس سارے پیار محبت کے کھیل میں جگنی تو بڑے مزے سے جب چاہتی کروٹ لیتی اور جب چاہتی چت لیٹ جاتی۔ البتہ بی بی اسے آرام پہنچانے کے خیال سے اکثر اوقات تمام رات یوں گزارتیں کہ ان کی کمر مسلسل پائنتی پر رہنے کی وجہ سے صبح تک اینٹھ جاتی۔ سو آج بھی جب جستی پھاٹک پر کھٹکا محسوس ہوا تو جگنی ان کی طرف رخ کیے دائیں بازو اور ٹانگ ان پر رکھے ہوئے تھے۔

پہلے تو بی بی اس کھٹکے کو کسی راہ گیر کے اچانک ڈنڈا لگنے کو تعبیر کرتی رہیں کہ رات کے وقت گھر سے نکلتے

ہوئے ہر شخص ہاتھ میں کوئی بانس یا ڈنڈا ضرور لے کر نکلتا۔ مگر اس وقت بی بی چونکی ہو کر اٹھ بیٹھیں جب جستی پھاٹک کے اُس پار سے سرگوشی نما پکار سنائی دی۔

"بی بی! دروازہ کھول میں ہوں ارمندر سنگھ۔"

ارمندر سنگھ کی آواز پر بی بی کا چونکنا لازمی تھا۔ سو جلدی سے جگنی کو خود پر سے ہٹا کر پہلے اپنے جنگلے کے اندر والے قفل میں چابی ڈال کر اسے کھولا اور پھر سر پر چادر درست انداز میں موجود ہونے کا یقین کرتے ہوئے بڑے بڑے قدم لے کر جستی پھاٹک کا بھی جیسے ہی قفل کھولا چولوں کی چرچراہٹ سنائی دی اور کنڈے پر ہاتھ رکھے دباؤ سے اسے کھول کر ارمندر سنگھ ان کے گھر آن موجود ہوا۔

"خیر تو ہے نا بھائی دلیر سنگھ، اس وقت؟" بی بی نے ارمندر کے ساتھ موجود اس کے والد کو مخاطب کیا۔

"سکھبیر کے سر پر خون سوار ہے، بہن جی، محلے کے مسلمانوں کو وہ اور اس جیسے دوسرے کتے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اک کم کرو فیروز احمد اور جگنی کو لے کر ارمندر کے ساتھ چھت سے ہوتے ہوئے ہمارے گھر چلے جاؤ، رات جیسے تیسے گزرے تو صبح میں آپ کو پاکستان جانے والی ٹرین تک پہنچا آؤں گا۔"

"لیکن بھائی جی۔"

"وقت ضائع نہ کرو بہن جی اور نکلنے کی تیاری کرو۔"

عجلت میں بات کرتے ہوئے باہر نکلنے پر وہ ایک مرتبہ پھر مڑا۔

"اندر سے جہندرا (تالا) لگا جانا اور ذرا جلدی۔۔۔ وہ لوگ اس طرف آنے ہی والے ہیں۔"

دلیر سنگھ نے باہر نکل کر دائیں بائیں دیکھا اور پھر سے گلی کے اندھیرے میں گم ہو گیا کہ جستی پھاٹک کی اندرونی سائیڈ پر لگے سیاہ قفل میں چابی گھومنے کی آواز سے اسے کچھ اطمینان ضرور حاصل ہو گیا تھا۔

بی بی نے ایک الوداعی نظر انجیر کے درخت کی نیچے کو جھکتی ڈالیوں کو دیکھا تو ایک ایک کر کے چند پتے خود بخود ٹوٹ کر زمین پر آ رہے۔ چھت کے بڑے بڑے کنگرے، صحن کی سرخ سرخ اینٹیں جنہیں اکثر جگنی بالٹی میں پانی ڈال کر ایک ایک مگھے سے گیلا کرتی اور مزید سرخ ہونے پر دیر تک انہیں بیٹھ کر دیکھا کرتی۔ ڈیوڑھی کا جنگلا، ہر ہر چیز پر الوداعی نظر ڈالنے کے بعد وہیں صحن میں کھلے آسمان تلے کھڑے کھڑے بی بی نے بڑے جذب سے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"ربا سوہنیا، تیرا شکر ہے اور میں خوش ہوں کہ تیرے سوہنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح آج مجھے بھی ہجرت کا حکم ہوا ہے۔ اے تمام عرشوں کے مالک میرا گھر بار، سکھ چین، جان مال سب تیری رضا پہ قربان۔۔۔ تیرا شکر ہے عرشاں والیا کہ تو نے مجھ جیسے گلیاں دے روڑے کوڑے کو بھی اس قابل جانا، تیرا احسان ہے مالک۔"

احساس تشکر سے آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو بی بی نے ہمیشہ کی طرح ضائع کرنے کے بجائے اپنے پورے چہرے پر پھیلا کر دونوں ہاتھ سینے پر لگا لیا تھا۔

ان کا ماننا تھا کہ رب سے عرض کرتے وقت نکل آنے والے آنسو سر آنکھوں پر سجانے کے قابل ہوتے ہیں۔ روز آخرت انہی کی برکت سے یہ سینہ اور چہرا ایمان کا نور پائے گا۔

وہ جگنی اور فیروز احمد کو ارمندر سنگھ کے ساتھ چھتوں کے رستے ان کے گھر لے کر پہنچیں تو سمرن پہلے سے ان کی منتظر تھی۔ کمروں سے ہوتی ہوئی آخری کوٹھڑی جو کہ عموماً گندم اور دوسرا اناج رکھنے کے کام آتی تھی وہاں ان تینوں کو بٹھایا ہی تھا کہ دروازے کے وحشیانہ انداز میں بجنے پر کانپ کر رہ گئیں۔ کمروں کی بناوٹ اس طرح کی تھی کہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور پھر تیسرے چوتھے میں پہنچنا ممکن تھا۔ سارے کمرے برآمدے کے بعد سامنے قطار میں موجود تھے البتہ کوٹھڑی واحد جگہ تھی جس کے آگے ایک کمرہ تھا مگر اس کے باوجود باہر سے آتی آوازیں انہیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جس میں سکھبیر کا وحشیانہ

اندازیلاشبہ محسوس کیا جاسکتا تھا۔

"اوکی گل آپڑ' سب خیر؟"

دلیر سنگھ نے دروازہ کھول کر سکھبیر سے پوچھا جو اس دفعہ ان کا مہمان تو نہیں بنا تھا۔ مگر رشتے داری بہرحال ضرور تھی۔

چاند کی سفید روشنی میں باہر کھڑے نوجوانوں کی کرپانیں ہی کرپانیں نظر آرہی تھیں۔ بلکہ پل بھر کو تو دلیر سنگھ کو لگا جیسے ہر ایک نے ہاتھ میں دو کرپانیں اٹھا رکھی ہیں۔

"بی بی اور اس کے بچوں کو تو نے شرن دیا ہے چاچا؟"

"میں نے۔۔۔؟ او بھلا میں کیوں کسی مسلے کو اپنے گھر شرن دوں گا؟ لگتا ہے آج تجھے زیادہ ہی چڑھ گئی ہے۔" دلیر سنگھ نے دھڑکتے دل کے ساتھ جواب دیا۔

"چاچا۔۔۔ یہ جتنے گھبرو دیکھ رہا ہے ناں تو' یہ سب گرو جی کی سوگندھ اٹھا کر نکلے ہیں کہ ان مسلوں سے ہر جگہ صاف کر کے چھوڑیں گے۔ ہونہہ بڑے آئے مسلے۔۔۔ گلیوں کا روڑا (کچرہ)" بات کر کے وہ فورا" تھوکا تھا۔ سکھبیر کے انداز پر باقی سب بھی زوردار انداز میں ہنسے تھے۔

"وہ تو تیری بات ٹھیک ہے پر۔۔۔"

"پر چاچا' مجھے تیری بات کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔" سکھبیر نے دلیر سنگھ کا چہرہ پڑھتے ہوئے کہا تو سفید لٹھے کی دھوتی اور قمیص پہنے بڑی بڑی مونچھوں والے اس کے ساتھی نے ٹہوکا دیا۔

"باتوں میں وقت برباد نہ کر سکھبے' اب ہم بھی آزاد ہیں چل ان کے گھر کی تلاشی لے۔"

"سکھوں کے ہاتھوں ایک سکھ کے گھر کی تلاشی؟ میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔" دلیر ان کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں بھی ایک غیرت مند آدمی ہوں سکھبے' میرے گھر میں بھی عورت ذات بیٹھی ہے اور سوگندھ ہے مجھے بھی گرو جی کی کہ تم میں سے کسی کو اندر قدم نہیں رکھنے دوں گا۔" بات کرنے کے ساتھ ہی دلیر سنگھ دروازے کے عقب میں رکھی اپنی کرپان لینے کو جوں ہی مڑا برف سے ٹھنڈی نوکیلی چیز اسے اپنی کمر میں پیٹ تک دھنستی محسوس ہوئی اور چند ہی لمحوں میں دلیر اس دنیا سے منہ موڑ گیا۔

نوک دار کھسوں کی چیں چیں صحن سے ہوتی آہستہ آہستہ کمروں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بی بی کی ایک طرف جگنی اور دوسری طرف سمرن کور چپکی ہوئی تھیں۔ فیروز احمد ارمندر سنگھ کے ساتھ ان دونوں کو یہاں چھوڑ کر اور اپنے تئیں نہایت محفوظ خیال کرتے ہوئے اسی محلے میں موجود ایک اور مسلمان خاندان کی طرف روانہ ہوا تھا' تاکہ کسی طور انہیں اس محلے سے نکال کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ کیا جاسکے۔

مگر وہاں تک پہنچنے میں یقینا" انہیں تاخیر ہو چکی تھی۔ سکھبیر اور اس کے ساتھ پانچ افراد اس کنبے کو کرپانوں کے زخم لگا لگا کر اب اس دنیا سے رخصت کر چکے تھے۔ البتہ ان کے قدموں کی چاپ سنتے ہی کپڑوں کے صندوق میں گھس جانے والی پندرہ سالہ صبیحہ ابھی زندہ تھی اور وہاں کھڑے ہو کر کی جانے والی ان دونوں کی گفتگو سن کر پسینے سے شرابور باہر نکلی تو وہ دونوں حیران رہ گئے۔ چھپتے چھپاتے کسی طرح اسے ریلوے اسٹیشن تک پہنچا کر جب وہ دونوں واپس لوٹ رہے تھے تو انہیں اس بات کا اطمینان تھا کہ بی بی اور جگنی تو محفوظ ہیں ہی' مگر وہ صبیحہ کو بھی ایک محفوظ مقام پر چھوڑ کر آئے ہیں۔ جہاں ارمندر کے دور کے رشتے دار نے فیروز احمد کے اپنی والدہ اور بہن کو لے آنے تک اس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔

قیامت تو تب ٹوٹی جب واپس اپنے محلے میں صبح کی چمک دار روشنی میں آئے تو اپنے ہی محلے کو پہچان نہ پائے۔ سکھبیر اور اس کے ساتھی اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر لوٹے تھے۔ دھڑکتے دل اور تھمی ہوئی سانسوں کے ساتھ ارمندر کے گھر میں داخل ہوئے تو دلیر سنگھ کی دروازے کے پاس ہی موجود لاش ان کے اوسان خطا کر گئی۔ سمرن کور کو وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جبکہ جگنی کا ساکت جسم سامنے رکھے بی بی

پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کے چہرے کو دیکھتی اور مہندی لگی ہتھیلیوں پر اپنے ناتواں ہاتھ پھیرتی جاتی تھیں۔ ارمندر سنگھ یہ سب دیکھ کر پاگل سا ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں خون اتر ہوا تھا۔ سوان کو الوداع کہہ کر خنجر اور کرپان لیے گھر سے نکل گیا۔

"بی بی... یہ کیا ہو گیا سب؟"

"فیروز احمد... تو آگیا ہے پتر..." وہ چونکیں۔

چہرے پر مکمل سکوت مگر آنکھوں میں سرخی کے ڈورے لیے کئی گھنٹوں کے بعد اب انہوں نے جگنی پر سے نظر ہٹائی تھی۔

"بی بی... تھوڑا سا رو لے... تیرا دل ہلکا ہو جائے گا۔"

آنسوؤں کا پھندا فیروز احمد کو اپنے گلے میں پھنستا محسوس ہوا تو انہیں کہتے کہتے خود ہی رو دیا۔

"پر کیوں روؤں؟ شہید ہوئی ہے میری جگنی، مری تو نہیں پتر... تو بھلا جا میں روؤں تو کس بات پر، میں شکر کیوں نہ کروں، سوہنے کا، جس نے اسے امر کر دیا، یہاں نہ سہی ایک اور دنیا میں سہی؟"

"تیرا کلیجہ پھٹ جائے گا بی بی، نہ کر اتنا صبر۔"

فیروز احمد اتنے مضبوط اعصاب کا مالک نہ تھا۔ اسی لیے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش بھی نہ کی۔ یوں بھی پہلے باپ اور اب پھولوں جیسی بہن کا اس قدر کرب آمیز انداز میں خود سے جدا ہونا اس کے نزدیک دنیا بھر کے دکھوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔

"دل چھوٹا نہ کر پتر اور تو بھی صبر کر، جو صبر کر گیا وہ تر گیا۔ (یعنی پار اتر گیا) اور پھر پتر یہ تو پیغمبروں کی صفت ہے نا اگر رب سوہنا ہمیں اپنی کوجی اور سوہنیوں والی ذات کو اس رنگ میں رنگنے کا موقع دیتا ہے تو کیوں ان آنسوؤں اور شکوؤں سے یہ موقع گنوا بیٹھیں۔"

فیروز احمد نے اپنی عظیم ماں کو بڑی عزت و تکریم سے دیکھا۔ ماں تو سب کے لیے ہی دنیا میں سب سے عظیم رشتہ اور ہستی ہوتی ہے۔ مگر فیروز احمد کو لگتا ہے کہ اس کی یہ درویش صفت ماں جیسی شاید کسی اور کی ماں نہ ہوگی۔

"اگر رونا ہی ہے تو یہ سوچ کر روؤ کہ کربلا کے میدان میں بی بی زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ تب اگر آنسو نہ نکل آئیں تو ایسی آنکھوں سے بندہ اندھا ہی بہتر۔" فرط جذبات سے فیروز احمد نے پہلے بی بی کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھر آنکھوں سے لگا لیا۔ محلے میں کوئی مسلمان گھرانہ تو دور کوئی مسلمان شخص تک نہ بچا تھا۔ ایسے میں چند سکھ گھرانوں نے ایک بار پھر کسی بھی قسم کے خوف کو رد کرتے ہوئے جگنی کی تجہیز و تکفین میں فیروز احمد کی مدد کی۔ ان ہی کی زبانی فیروز احمد کو پتا چلا کہ سکھبیر نے انہیں چھت کے رستے جاتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے دلیر سنگھ کو بھی انہیں پناہ دینے کے جرم میں مار ڈالا۔ اپنے علاوہ سب کو حقیر جاننے والے سکھبیر سنگھ کا کہنا تھا کہ سارے مسلے اس محلے میں بستے ہیں، اس کے نزدیک گلیوں کے روڑے کوڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور وہ اب یہ دھرتی ماتا صاف کرنے نکلا ہے۔

اور یہ قصہ صرف اسی جگہ کا نہیں تھا کہیں سکھ تو کہیں ہندو خود کو برتر ثابت کرنے کی دھن میں پھل اور سبزی کی طرح انسانوں کو کاٹ کاٹ کر پھینکے جا رہے تھے۔ ایسے میں فیروز احمد، بی بی کے ساتھ کس طرح ریلوے اسٹیشن تک پہنچا۔ اتنی کٹھنائیوں کا اس نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اور پھر دل کٹتا تھا تو بی بی کو دیکھ کر کہ جو پے در پے صدموں کے باعث اور حالات کی کشیدگی کی وجہ سے بے حد کمزور ہو گئی تھیں۔ سیاہ برقع اوڑھے یوں بھی دور سے ہی دیکھنے والوں کو یقین ہو جاتا تھا کہ مسلمان ہیں۔ اسی لیے رسک بھی زیادہ تھا، مگر نہ تو فیروز احمد نے انہیں برقعہ اتارنے کا کہنا گوارا کیا اور نہ ہی خود انہوں نے یہ بات قابل عمل خیال کی۔

ریلوے اسٹیشن پر صبیحہ کو اس سکھ خاندان نے واقعی حفاظت سے رکھا تھا۔ بی بی، صبیحہ اور فیروز احمد جب ریل میں بیٹھے تو باقی موجود تمام لوگوں کی حالت بھی ان ہی کی طرح بے حالی کا شکار تھی۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی، چہرے پر ہلدی کی سی رنگت اور ہونٹوں پر

جمی پپڑی پر سے اڑتی خشکی۔ ایسے میں ریل میں بیٹھتے ہی بی بی نے اپنی یادداشت کے بھروسے ذہن سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بہت ساری آیات پڑھ کر نہ صرف فیروز احمد بلکہ صبیحہ اور تمام مسافروں پر بھی پھونک ڈالیں۔

دبلی پتلی سی صبیحہ جس طرح اپنے تمام گھرانے سے بچھڑ گئی تھی۔ اس پر بی بی کو اس سے بے حد ہمدردی محسوس ہوا کرتی تھی۔ کبھی یوں لگتا کہ صبیحہ کی شکل میں انہیں ایک بار پھر جگنی سے ملا دیا گیا ہو۔ انہیں یاد تھا کہ معراج شریف کی رات جگنی نے جس طرح اپنی کیفیات بیان کی تھیں۔ یعنی کہ اس کے نام کا پتا اسی رات گرا تھا۔ جب وہ بوکھلائی ہوئی یہاں وہاں دیکھتے ہوئے انہیں مختلف طریقے اور مثالوں سے اپنی بات سمجھا رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی انہوں نے سرگوشی میں صبیحہ سے کچھ دیر برقعے کے پلو کی اوٹ سے بات کی اور پھر وہیں ریل میں ہی اس کا نکاح گواہوں کی موجودگی میں فیروز احمد سے قرار پا گیا۔

ریل کے کچھ ڈبوں کو ہندو انتہا پسندوں نے راستے میں نذر آتش بھی کر ڈالا تھا۔ مگر آخر کار ریل کے دونوں اطراف سبزہ دکھائی دینے لگا۔ کیکر کے بڑے بڑے درخت اور گھنی ٹاہلیاں دیکھ کر فیروز احمد نے بی بی کو بتایا۔

"بی بی۔۔۔ دیکھو۔۔۔ پاکستان آگیا ہے۔ یہاں جیسے چاہو نمازیں پڑھو' روزے رکھو' بڑی عید پر جس جس کا دل چاہے وہ ۔۔۔ بے خوف ہو کر بے شک گائے کی قربانی کرے۔ بی بی میں نے ریڈیو میں سنا تھا کہ قائداعظم کہہ رہے تھے صرف مسلمان ہی نہیں' باقی سب مذاہب والوں کو بھی اپنے مذہب کے لیے برابر آزادی ملے گی۔"

خوشی کے مارے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ ریل اللہ اکبر کے نعروں سے گونجتی ہر دل میں موجود جذبہ ایمانی اور حب وطن کو تازہ کر رہی تھی۔ بی بی نے بھی ریل کی سیٹ پر دوزانو ہو کر سجدہ شکر ادا کیا تو آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو نہ روکا کہ شکر کے آنسو تو قسمت والی آنکھوں میں ہی آتے ہیں۔ سو اس روز وہ کھل کر روئی تھیں اور ریل سے اتر کر سرزمین پاک پر قدم رکھتے ہی شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے بعد بہو اور بیٹے کو بے شمار دعاؤں سے نواز ڈالا اور خود اسی رات کیمپ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

☼ ☼ ☼

آج۔۔۔ ٹھیک آج کی ہی رات تھی جب ان کے انتقال نے فیروز احمد کے لیے اس تاریخ کو سوگوار بنا دیا تھا۔ مگر آج چالیس برس بعد آج ہی کی رات جب اس کا بیٹا فوج میں بھرتی ہونے کے بعد پہلی دفعہ گھر آیا تو صبیحہ سمیت خود فیروز احمد کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بی بی کی تمام روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے صبیحہ نے بھی آج جمعرات کے روز کھانا تیار کر کے ٹرے میں رکھا اور مسجد کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں مختلف طاقچوں سے بلب کی روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ صفوں پر نمازی آستینیں سیدھی کرتے ہوئے جمع ہو رہے تھے۔ مغرب کی اذان بس ہونے ہی والی تھی۔ مختلف نمازی اب دریوں پر بیٹھ کر اذان سننے کا احترام کر رہے تھے۔ چند بچے بھی یہاں وہاں گھوم رہے تھے۔ صبیحہ نے ایک بچے کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور اسے ٹرے تھما کر مولوی صاحب کے حجرے کی طرف پہنچانے کا سمجھا کر خود واپس لوٹ آئی۔ یہی اس کی برسوں پرانی عادت تھی۔

وہ شعوری اور لاشعوری طریقے سے بی بی کو ایک عظیم خیالات کی حامل خاتون تصور کرتے ہوئے ان جیسا بننے کی سعی میں لگی رہتی۔ وہی صبر' وہی فکر اور سوچ کا وہی درویشانہ انداز اس کے اندر بھی موجود تھا۔

اور پھر فیروز احمد بھی اکثر اوقات اسے بی بی کی عادات و خیالات کے متعلق مختلف باتیں بتاتا ہی رہتا۔ کچھ وہ خود ایک محلے میں رہنے کی وجہ سے اپنے گھر والوں کی زبانی ان کے متعلق سنتی آئی تھی اور گو کہ فیروز احمد اور صبیحہ کی شادی تو ایک پیچیدہ اور کٹھن صورت حال کی وجہ سے اتنی کم عمری میں ہوئی مگر اس نے اس معاملے میں ان ہی کے نقش قدم پر چلتے

ہوئے صبور احمد کی شادی اس کے بھرتی ہونے سے بھی پہلے بڑی سادگی سے کردی تھی اور آج جب وہ گھر آیا تو نہ صرف اس کے والدین اور بیوی بلکہ نومولود بیٹا بھی اپنا منتظر پایا۔

صبیحہ نے اس کے آنے کی خوشی میں اپنے ہاتھ سے سوجی کی میٹھی ٹکیاں بنا کر ان پر ختم دلایا اور نزدیک و دور کے تمام گھروں میں دے کر بھی آئی۔

یوں بھی پورے گاؤں میں ان کا گھرانہ نیاز اور نماز کا پابند مشہور تھا۔ ہر قسم کے اسلامی تہواروں پر نیاز دلانا تو الگ فعل تھا۔ مگر وہ یوں ہی اکثر اوقات محض شکرانے کے طور پر بھی سب میں نیاز بانٹتی نظر آتی جس کا انتہائی آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ گھر میں کچھ بھی بنالینے کے بعد اپنا دروازہ کھول کر چوکھٹ پر آبیٹھتی اور ہر آنے جانے والے کو نیاز تھماتی اور الحمد للہ کا ورد کرتی رہتی۔

قیام پاکستان سے پہلے تک اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے ہوئے وہ ہرگز ان خیالات کی مالک نہ تھی۔ یہ سب بدلاؤ آیا تو محض بی بی کی قربت حاصل ہونے اور پھر فیروز احمد سے نکاح کے بعد۔

وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ ”اللہ سے اس کی راہ میں قربان ہونے کی دعا مانگا کرو‘ یہ جان تو ویسے بھی چلی جانی ہے تو کیوں نا اس کے نام پر اس کی راہ میں جاکر خوش نصیبوں میں شامل ہوجائے۔“

ریل میں فیروز احمد سے اس کا نکاح ہوجانے کے بعد انہوں نے برقع کے پلو کی اندرونی سائیڈ سے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لاتے ہوئے ایک اور سرگوشی بھی کی تھی۔ تب تو صبیحہ نے اس بات کو اتنا محسوس نہیں کیا‘ مگر صبور احمد کے پیدا ہونے اور پھر اس کے بڑا ہونے پر اب بی بی کی کی گئی وہ سرگوشی اکثر اوقات چلتے پھرتے سیلاب کے پانیوں کی طرح صبیحہ کے وجود کو اپنے اندر گھیر لیتی تھی۔

لہو میں گھومتے رہنے والی سرگوشی۔

آنکھوں کے رستے ”حال“ پر نظر رکھنے والی سرگوشی۔

اور اس پست آواز کے پکارے میں بدل جانے کی خواہش رکھنے والی سرگوشی۔

اندر باہر ہر جگہ صبیحہ کے سامنے بی بی کی وہ سرگوشی ٹپا کھاتی گیند کی طرح ابھرتی رہتی۔ دل سے اس سرگوشی کو پکار کا درجہ دینے کی اس میں ہمت تھی اور نہ ہی اس سرگوشی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کردینے کی جرات۔

جب ہی خود کو اور تمام حالات کو رب کے سہارے چھوڑ کر خود بے فکری گھربار کے سارے چھوٹے بڑے کام نبٹاتی رہتی۔

جب تک تو صبور احمد کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ صبیحہ کی مصروفیات ذرا اور طرح کی تھیں۔ گرمیوں کی جھلسا دینے والی دوپہر ہوتی یا سردیوں کے۔ دھوپ کے دن۔ اپنے چھوٹے سے گھر کو صاف ستھرا رکھنے کا تو اسے خبط تھا۔

دروازے کے اندر آتے ہی مستطیل صحن‘ اس کے آگے سرخ برآمدہ اور اس برآمدے کی چوڑائی پر تقسیم کیے گئے دو کمرے۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ‘ عقیق اور چنبیلی کے چند پودے اور اس تسلسل سے موجود کیاری۔ جس میں دھنیا‘ پودینہ اور ٹماٹر لگایا گیا تھا۔ دوسری طرف چھت کو جاتی پتلی پتلی سیڑھیاں اور ان کی محراب تلے محدود سی جگہ پر بنایا گیا چھوٹا سا باورچی خانہ تھا اور صبیحہ کا پورا دن سوائے پنج وقت نماز اور تلاوت قرآن کے بعد جو بھی وقت ملتا بس مصروف ہی رہتی۔

دوسرے گھروں میں بیٹھ کر عورتوں کے ساتھ غیر اہم گفتگو کرنا یا اپنے ہی گھر آئی ہوئی محلے دار عورتوں سے دوسروں کے متعلق کن سوئیاں لینا اس کے نزدیک انتہائی غیر دلچسپ کام اور محض وقت کا زیاں تھا۔ اور اللہ نے اسے دیے بھی دونوں بیٹے ہی تھے۔ بیٹی ہوتی تو اس کو بناتے سنوارنے میں‘ بال بنانے میں ہی کچھ وقت صرف ہوتا۔ اب ماشاء اللہ دو بیٹے تھے اور وہ دونوں میاں‘ بیوی۔

فیروز احمد نے گھر کی بیٹھک میں دکان کھول رکھی تھی۔ یوں وہ سارا دن گھر میں ہوتے ہوئے بھی گھر سے

باہر ہی لگتا۔ گاؤں میں اپنے اخلاق اور کردار کی وجہ سے اچھی شہرت ہونے کی وجہ سے لوگ گاؤں کے آخری کونے سے بھی اسی کے پاس آیا کرتے تھے اور اسی دکان کی آمدنی میں ہونے والی برکت سے اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو تعلیم دلوا کر ایک کو فوج میں بھرتی کروایا تو دوسرا ابھی کم عمر ہونے کے باعث تعلیم میں مصروف رہا تھا۔ فیروز احمد کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اسے بھی فوج میں بھرتی کروائے۔ اس لیے اس کا بستر اپنے بستر کے ساتھ لگواتا اور رات دیر تک پڑھاتا رہتا۔ خود اتنا پڑھا لکھا تو نہ تھا مگر اپنے شوق کے باعث پاکستان آنے کے بعد اس نے پڑھنے لکھنے اور مطالعہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ چھوٹے سے چھوٹے کاغذ کے پرزے کو بھی کہیں زمین پر پڑا دیکھ لیتا تو پڑھ کر چھوڑتا۔ یوں بھی گھر کے آنگن میں بچوں کی قلقاریاں گونجنے میں کچھ وقت لگا تھا اور ایسی کوئی ذمہ داری بھی نہیں تھی۔ اس پر گاؤں کے حکیم صاحب سے جان پہچان ہونے کے بعد سے تو جیسے پڑھنے کی ساری تشنگی دور ہو گئی۔

ان کے تنگ و تاریک اور انتہائی گھٹن زدہ مطب میں جہاں مختلف قسم کے معجونوں کے مرتبان، رنگ برنگی شربت کی بوتلیں اور سفوف تھے۔ وہیں انہیں بھی کتب بینی کا بے حد شوق تھا۔ سو جتنا کچھ ان سے مستعار لی گئی کتابوں کے ذریعے خود پڑھا تھا۔ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بے حد کام آیا۔

صبور احمد تو اب فوج میں بھرتی ہو چکا تھا۔ سو اس کی ساری توجہ چھوٹے بیٹے داؤد پر ہوتی۔ جس کو وہ رات گئے تک ایک ساتھ بچھائے گئے پلنگ پر بیٹھا پڑھاتا رہتا۔ ایسے میں صبیحہ ہاتھ میں تسبیح لیے امید افزا آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے لب ہلاتی رہتی۔ اٹھتے بیٹھتے اپنے دونوں بیٹوں کی لمبی حیاتی کی دعائیں مانگتی نہ تھکتی۔ گھر آنے پر ذرا سی تاخیر ہونے پر یوں ہونق سی چھت پر جاتی سیڑھیوں کے عین آخر والی اٹھارہویں سیڑھی پر بیٹھتی جیسے کلکلی کھیلتے ہوئے سہیلی نے ایک دم ہی ہاتھ چھوڑ دیے ہوں۔ دل ہی دل میں کتنی ہی سورتیں اور آیات پڑھ پڑھ کر تصور میں ان پر دم کرتے ہوئے خیر خیریت سے گھر لوٹنے کی دعائیں مانگا کرتی۔

صبور احمد کو فوج میں بھرتی کروانے کا فیصلہ مکمل طور پر فیروز احمد کا تھا۔ اگر وہ صبیحہ سے صلاح لیتا تو شاید وہ منع کر بھی دیتی، مگر فیروز احمد کا کہنا یہ تھا کہ اسے اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں بیٹے کسی مقصد سے دیے ہیں اور وہ جانتا ہے کہ کس رستے پر پہنچ کر وہ اپنی منزل تک پہنچ پائیں گے۔

"فیروز احمد۔۔۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ ہر رستے پر اپنے بیٹوں کے ساتھ ساتھ ہی رہوں، تجھے پتا ہے نا میں تو بہت کمزور دل کی عورت ہوں اور میں اپنے بیٹوں سے جدا ہو کر بھلا کیسے رہ سکتی ہوں۔"

صبیحہ کنپٹیوں سے جھانکتے چند سفید بالوں پر دوپٹا جما کر اکثر سیڑھیوں کی محراب تلے بنے باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھی فیروز احمد سے سوال کرتی تو وہ سامنے برآمدے میں چارپائی پر بیٹھا مسکراتا ہوا اٹھتا اور دیوار کے سہارے کھڑی دوسری پیڑھی لے کر اس کے سامنے ہی یوں جا بیٹھتا کہ آدھا جسم برآمدے میں تو آدھا باورچی خانے میں نظر آتا۔

"دیکھ صبیحہ یہ بات تو۔۔۔ تو بھی جانتی ہے نا کہ میں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں کہ دل میں اترتی مثالیں دے کر تجھے اس طرح بات سمجھاؤں کہ تیرا دل مکھن نکلے دودھ کی طرح ایک دم ہلکا پھلکا ہو جائے۔"

باورچی خانے کی ریل کے اکانومی درجے جیسی نیم چھتی تلے بیٹھی صبیحہ کے ہلتے ہونٹ سامنے گلی کے کھمبے سے در آتی زرد روشنی میں اپنے ورد میں مصروف رہے، مگر اس کی سماعتیں فیروز احمد کے منہ سے نکلے ایک ایک لفظ کو بڑے دھیان سے سن رہی تھیں۔ "پر ہاں، اتنا مجھے ضرور پتا ہے کہ بی بی اللہ بخشے کہتی ہوتی تھی کہ دل میں صرف اور صرف منزل کی لگن پیدا کرو۔ راستوں، رکاوٹوں اور واہموں کا وجود ویلڈنگ سے نکلتی چنگاریوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لیے اوپر والے پر بھروسہ کر کے جب سوچو

صرف اور صرف منزل کا سوچو' راستوں کا سوچتے رہو گے تو الجھ جاؤ گے۔ پھر حالات کی چک پھیریاں ان ہی رستوں میں ہمارے لیے غلام گردشیں بنادیں گی۔ ہمیشہ محسوس ہوگا کہ سفر میں ہیں' مگر حقیقت میں ایک ہی جگہ پر دیوانہ وار گھومتے نظر آئیں گے۔"

"راستوں کا نہیں سوچیں گے فیروز احمد' تو بھلا منزل تک کیسے پہنچ پائیں گے۔" جس طرح ننھے منے مسرنے ٹھونگا مار مار کر کنگنی میں سے گری نکال کر چھلکا رہنے دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح صبیحہ نے بھی اس کی بات میں سے اپنی الجھن چن کر نکال لی تھی۔

"راستوں کا بس اسے سوچنے اور فیصلہ کرنے دے صبیحہ' جس نے ہمیں راستے دکھائے ہیں اور جب راستوں کا انتخاب اس اوپر والے رب پر چھوڑ دیا نا تو وہ بہت بہتر جانتا ہے کہ کون کتنا وزن اٹھا سکتا ہے۔ اسی لیے تو وہ کسی بھی جاندار پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔" سانس لینے کو رکتے ہوئے فیروز احمد نے صبیحہ کی ننھی سی ناک پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے بلوریں قطرے چمکتے دیکھے تو مسکرا دیا۔

"اور اگر ہم جیسے تھوڑدلوں (کمزوردلوں) کو پتھریلے رستے دیتا ہے نا تو پہلے مضبوط جوتے فراہم کرتا ہے' تو فکر نہ کریا کر۔" ہنستے لبوں کو روک کر صبیحہ نے مالٹے کی سوکھی پھانک جیسی بے رونق مسکراہٹ سے فیروز احمد کو دیکھا۔

"قسمت والی تھی وہ سمرن کور' جو سکھبیر کے پاس ہو کر بھی اس کی نہ بنی اور کلمہ پڑھ لینے کی پاداش میں اسی کے ہاتھوں دنیا چھوڑ گئی۔"

اچانک بیٹھے بیٹھے صبیحہ کو جانے کیسے سمرن کور کا خیال آیا تھا' جس کے بارے میں انھیں ریل میں ہی پتا چلا تھا کہ سکھبیر نے اسے لدھیانے لے جانے کے بجائے رستے میں ہی مار ڈالا تھا۔ جرم صرف اتنا تھا کہ اس کا اس قدر وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کو ختم کرنا' خود سمرن کور کو بھی اسی رستے پر چلا گیا تھا جس پر چلنے والوں کو سکھبیر سنگھ صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا عزم کیے ہوئے تھا۔

"ہاں۔ اکثر بی بی سے دعا کروانے آتی تھی۔ دل کی صاف تھی اور بی بی بتاتی تھیں کہ مذہب کی طرف رجحان بھی بہت تھا اس کا' تو دیکھ لے جاتے جاتے بھی مر کر زندوں میں نام لکھوا گئی۔"

"ہوں۔۔۔" صبیحہ ہنکارا بھرتی۔

"تو بس منزل کا سوچ اور اپنا تن من دھن اولاد سمیت ہر چیز سوہنے رب کے آگے سجا سنوار کے خوب صورت ترین بنا کے رکھ اور کہہ دے کہ اے عرشوں کے مالک! بے شک یہ سب تیرا ہے اور ہم تو صرف امین ہیں' سوہنیا ہمیں توفیق دے کہ تیری امانتوں کی بہتر رکھوالی کر سکیں اور جب تو اپنی امانت واپس لے تو۔۔۔ تو خوش ہو اور ہم مطمئن۔"

فیروز احمد اپنے تئیں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا' مگر یہ سب باتیں صبیحہ کے کانوں سے ہوتی ہوئی اس کے دل تک نہ پہنچ پاتیں۔ پنج وقتہ نماز اور تلاوت کے بعد وہ یہی الفاظ دعا کی صورت دہراتی تو ضرور' مگر صرف حلق کی اندرونی سطح تک' دل سے ان الفاظ کی ادائیگی نہ ہو پاتی تھی۔ وہ یہ بات رب سے جس انداز میں کرنا چاہتی تھی ہزار کوشش کے باوجود اسے اپنے الفاظ' اپنا لہجہ' اپنا انداز سب ہی رسمی سے لگا کرتے دنیا کی محبت اس کے نفس پر اس طرح پنجے گاڑھے ہوئی تھی کہ بعض اوقات اسے اس بات کا یقین ہو جاتا کہ اس کے انداز میں موجود رسمی پن کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ رب کی رکھوائی گئی امانتوں کو اتنی جلد لوٹانے کا حوصلہ نہ رکھتی تھی۔

ان دنوں جب داؤد احمد کی فوج میں بھرتی کے لیے فیروز احمد دن رات بھاگ دوڑ میں معروف رہنے لگا تو اکثر اوقات جب وہ صبح سویرے ہی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر ازار بند بننے کا اڈا برآمدے کی موٹی دیوار کے ساتھ لگا کر بیٹھتی اور اس کے انگوٹھے اور انگلیاں جس چابکدستی سے دھاگے کے اس تانے بانے میں سے گزرتیں اس پر گمان گزرتا کہ جیسے ننھی منی مچھلیاں پانی میں ڈالے گئے جال سے بچ کر وائیں اور پھر اپنی کا رخ کیے جا رہی ہیں۔

مگر حقیقت اس سے برعکس تھی۔ انگوٹھے اور انگلیاں چلانے کی رفتار میں تیزی اس کے اندر ہوتی جنگ سے تقویت پاتی تھیں۔ ایک عجیب کشمکش اور دوراہا سا ذہن میں آکھڑا ہوا تھا۔ فیروز احمد سے وہ روز یہ تو ضرور پوچھا کرتی کہ کیا بنا؟ مگر دراصل وہ خود نہیں چاہتی تھی کہ داؤد احمد فوج میں جائے۔ گو کہ صبور احمد کی بیوی اور ننھا بیٹا اس کے پاس تھے مگر پھر بھی وہ ایک بیٹے کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ ساری امانتیں ایک ساتھ پیش کر دینے کے خیال سے تو کبھی یوں لرز جاتی کہ آنسو ٹپ ٹپ کرتے زانو پر جذب ہونے لگتے اور وہ بوجھل دل سے پیڑھی پیچھے کی طرف کھسکا کر ہاتھ کی بالشت پر دھاگے کا آٹھ بناتے ہوئے کسی سوچ میں گم نظر آتی۔ ”پتا نہیں صبیحہ کیا رکاوٹ ہے؟ حالانکہ نیت بچی ہے جذبہ کھرا ہے خود داؤد احمد بے چین ہے اس دن کے لیے جب اسے اس منصب کے لیے چنا جائے کہ وہ اس اسلامی مملکت کے لیے اپنا خون پسینہ بہا سکے' پھر۔۔۔ پھر پتا نہیں کیوں اب تک کام نہیں ہو پا رہا۔ ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی نا؟“

فیروز احمد بڑی دل گرفتگی سے کہتا۔

مگر یہ بات صرف صبیحہ بی کے علم میں تھی کہ اس نے تو آج تک داؤد احمد کو خود سے الگ کرنے کا سوچا بھی نہیں ہے اور نہ بھی کبھی وہ چاہے گی کہ اس کا بیٹا کبھی اس سے دور جائے اور در حقیقت ماں ہونے کے ناتے اس کے یہی جذبات بھی تو اصل رکاوٹ تھے ان دنوں میں جب کہ فیروز احمد اور داؤد احمد کی کوششیں اپنے عروج پر تھیں' صبیحہ نے چونکہ قیام پاکستان کے وقت کپڑوں کے صندوق میں چھپنے کے دوران اس کی معمولی سی جھری سے اپنے ماں باپ جوان بھائیوں اور ننھی بہن کو جس طرح خون میں لتھڑے اور مختلف ٹکڑوں میں بٹا دیکھا تھا اور پھر ریل میں بیٹھ کر پاکستان تک آتے ہوئے جو روح فرسا منظر وہ دیکھ چکی تھی۔ اس پر ایک بیٹے کو تو جیسے تیسے چوبیس گھنٹے جان ہتھیلی پر رکھنے کی اجازت دے دی مگر اب اپنے چھوٹے بیٹے کو بھی خود سے دور کرنے کا حوصلہ وہ قطعی طور پر اپنے اندر موجود نہیں پا رہی تھی۔

”اگر ایسا ہو گیا کہ۔۔۔۔“

اس ایک ادھورے جملے کی دہشت نے اسے لوکی کی ہری بیل میں موجود سوکھے پھول کی طرح کمزور کر ڈالا تھا۔ چال میں ایک عجیب ڈھیلا پن تھا جو انہی چند دنوں میں سامنے آیا تھا۔ صبح تڑکے نماز پڑھنے کے بعد مختلف سورتیں پڑھ کر داؤد احمد پر پھونکتی' جمعرات کے جمعرات زردہ پکا کر بچوں میں بھی بانٹتی اور مسجد بھی بھجواتی' قرآن پاک کی تلاوت کرتے کرتے یوں دل بھر آتا کہ بند کر کے خوب روتی۔

وہ رات معراج شریف کی تھی۔

عام طور پر رات کے اس پہر میں سیاہی کسی بیوہ کی آنکھوں کی طرح بے حد بے رونق اور ویران لگا کرتی تھی۔ مگر آج کی رات تو ہزار ہا راتوں سے افضل تھی اور سب کو اس حقیقت کا ادراک بھی تھا سو مسجد سے اسپیکر پر کیے جانے والے خطابات اور نعتوں کی آوازیں گھر گھر جا رہی تھیں۔ باری باری بھی عقیدت مند اسپیکر سنبھالتے اور عرشوں کی سیر کرنے والے کو عقیدت سے بھرپور آنسوؤں بھری آواز میں درود و سلام پہنچاتے وہ چھت پر بچھائی گئی چارپائی پر سفید ولائتی ڈالے اس پر رحل میں قرآن شریف اور ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھی تھی۔ بہو اور پوتا نیچے جبکہ داؤد احمد فیروز احمد کے ساتھ مسجد میں تھا۔

معراج النبی ﷺ کے جشن کی نیت سے آج گھر میں میسر سارے بلب روشن تھے' گلی میں دروازے پر لگا بلب تو یوں بھی روشن ہی رہا کرتا۔

سبک خرام' ہلکی ٹھنڈی ہوائیں درختوں کو چھوتی یہاں وہاں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ گزرتے وقت میں کچھ ایسا سرور تھا کہ دل چاہتا یہ وقت بس تھم سا جائے۔ صبیحہ کبھی چارپائی سے نیچے اتر کر جائے نماز بچھاتی' نوافل پڑھتی اور کبھی جائے نماز لپیٹ کر چارپائی کے پائے پر اٹکاتی اور پھر سے قرآن پاک پڑھنے لگتی۔

مسجد کا اسپیکر اب مولوی صاحب کے ہاتھ میں تھا اور وہ اپنے مخصوص طرز خطابت کے باعث حضرت

آدم علیہ اسلام سے ہوتے ہوئے مختصراً" چیدہ چیدہ پیغمبران کرام کی زندگی کا احوال بیان کرتے آخری رسولؐ اور آج کی رات عرشوں کے مہمان خصوصی بننے کا اعزاز حاصل کرنے والے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی معراج مبارک کے واقعہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ہلکے پھلکے سادہ فہم اور روزمرہ کی زندگی ہی میں استعمال ہونے والے الفاظ کا سہارا لے کر وہ یوں بات کرتے کہ پھر سامع کو اپنے دل میں اترتی محسوس ہوتی۔

چند لمحوں کے لیے قرآن پاک بند کر کے نفل ادا کرنے کی غرض سے نیچی منڈیروں والی چھت پر جائے نماز ڈالتی صبیحہ کے کانوں میں جب ان کی گفتگو کے چند الفاظ پڑے تو بڑی دلچسپی سے وہ بھی وہیں جائے نماز پر ہی بیٹھی ان کا پر اثر خطاب سننے لگی اس وقت وہ حضرت ابراہیم کی بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔اس نے ذرا سا ہاتھ بڑھا کر قرآن پاک کے ساتھ رکھی تسبیح اٹھائی اور بند آنکھوں اور حرکت کرتے لبوں کے ساتھ جسم کے تمام مساموں کو سماعت بنادیا۔

"بھائیو!حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ کی بارگاہ سے اپنی سب سے محبوب چیز اس کی راہ میں قربان کرنے کا اشارہ ملا تو خدا گواہ ہے کہ شیطان کے ڈالے گئے تمام وسوسوں کے باوجود انہیں اپنے جگر گوشے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے محبوب چیز کوئی نظر نہ آئی اور بالآخر شیطان مردود ہارا اور حب الٰہی یوں جیتی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو خود اپنے ہاتھوں سے قربان کرنے کا فیصلہ کیا۔۔۔اور بیٹا بھی وہ جس نے اللہ کا حکم جانتے ہوئے باپ کی رضا کے آگے گردن جھکا دی ۔۔۔بھائیو اور بزرگو!ذرا سی دیر کے لیے اپنے گریبانوں میں جھانکو اور اپنے ہی دل کو جواب دو کیا آج ہم اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹوں کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟"

ایک جھٹکے سے صبیحہ کی آنکھیں کھلی اور تسبیح کرتے ہاتھوں کے ساتھ ہلتے لب ساکت ہو گئے تھے۔

مسجد میں بیٹھے لوگ چونکہ لاؤڈ اسپیکر سے دور تھے اس لیے واضح طور پر نہیں مگر دھیمی آواز میں تمام نمازیوں کے "لبیک اللھم لبیک" کا نعرہ لگانے کے بعد نعرہ تکبیر کہنے کی آواز صبیحہ کو بھی سنائی دی۔

"سبحان اللہ۔"

مولوی صاحب یقیناً" نمازیوں کا جوش دیکھ کر سرشار ہوئے تھے۔

"اور پھر سوچنے کی بات تو یہ ہے نا کہ ہم تو صرف اسی کی دی گئی امانتیں اس کے حضور پیش کرتے ہیں وہ کس کو یہ اعزاز بخشے یہ تو بڑے کرم کے ہیں فیصلے اور بڑے نصیب کی بات ہے۔"

تمام نمازیوں نے مل کر بڑی عقیدت سے مل کر نعت کے دو مصرعے پڑھے تھے اس کے بعد پھر مولوی صاحب بولے۔

"اسے ہماری قربانیوں کی ضرورت نہیں ہے بھائیو' وہ اور اس کا دین تو لازوال ہیں ارے یہ تو ہم ہیں جو اس کی چیز' اسی کے سامنے پیش کر کے اپنی دنیا اور آخرت سنوار لیتے ہیں اور یاد رکھنا کہ گھاٹے کا سودا کرتے ہیں وہ لوگ جو اپنے لیے بہترین چیز کا انتخاب کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں مانگنے والے فقیر یا سائل کو گھٹیا اور فالتو چیز دے کر کہتے ہیں کہ ہم نے کبھی سائل کو خالی نہیں لوٹایا۔ارے کم عقلو' یہ سوچو کہ (نعوذباللہ) کیا خدا ہماری استعمال شدہ چیزوں کا حقدار ہے؟اس کی راہ میں دینا ہے تو اپنی پسندیدہ ترین اور محبوب چیز اس کے سامنے لا رکھو اور عرض کرو کہ یا باری تعالیٰ!تیرے دیے میں سے دیتے ہیں مالک' تو عرشوں کے دولہا کے صدقے قبول کرلے۔"

صبیحہ کو لگا جیسے معراج شریف کی اس بابرکت رات میں وہ اپنے خیالوں میں معراج کو چھو آئی ہو۔دل ہر قسم کے بوجھ اور دکھ سے خالی بارش کے بعد دھلے ہوئے آسمان کی طرح صاف شفاف ہو گیا تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس کے دل کے اندر جذبات کی کنڈی بالکل سیدھی لگی ہوئی تھی' دائیں بائیں موڑ کر مضبوطی سے بند کرتے ہوئے دوبارہ یکدم نہ کھلنے

کی کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ اسی لیے مولوی صاحب کے الفاظ تیز ہوا کی طرح اس کنڈی سے یوں ٹکرائے کہ وہ کھٹ سے خود بخود کھل گئی۔

منزل واضح ہو گئی تھی۔۔۔۔

آگے کون سی گلی بند ہے یا کون سا راستہ کس طرف مڑتا ہے۔ یہ فکر اس نے اپنے کندھوں سے اتار پھینکی تھی۔ اب ذہن میں تھی تو بس منزل اور اسے پانے کا جنون! چھاچھ کو بلوتے رہنے سے کبھی مکھن نہیں نکلتا صرف سطح پر جھاگ ہی جھاگ نظر آتے ہیں اور بلونے والے کے بازو شل ہونے لگتے ہیں۔ یہی حال آج سے پہلے صبیحہ کے ذہن میں اڈتے خیالات کا بھی تھا۔ مگر اب نہیں۔

اب وہ جانتی تھی کہ اس کی دعاؤں کا دھارا کس طرف مڑنا چاہیے اور تب اس رات جب اس نے عرشوں کے سوہنے رب کے حضور اپنا دامن پھیلایا تو حلق کی اندرونی سمت سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے پکارا۔

بی بی کے منہ سے نکلی سرگوشی کو پکار بن جانے کا اذن اس نے اسی رات دیا تھا وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا اور اس کی اوقات کیا۔

بھلا وہ کون ہوتی تھی اپنی منزل کا خود انتخاب کرنے والی۔

کیوں وہ اب تک خیر کے اس رستے سے دور رہی اور پھر اس کے حضور سرخرو ہونے کی حسرت لیے تو لوگ اس جہان فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ جان ہتھیلی پر رکھے قربان ہونے کی تڑپ دل میں لیے اعلا منصب پر فائز ہونے والوں کو حسرت سے دیکھتے رہتے ہیں اور رب کی طرف سے منظوری نہیں ہوتی اور وہ۔۔۔۔ وہ کیوں اس تڑپ میں پیچھے رہ گئی۔۔۔۔!

اسے یاد تھا بی بی نے اس سے سرگوشی میں کہا تھا کہ

"پتر، مجھے نہیں پتا کہ میں کب تک جیوں گی اور کب تک ان ہونٹوں کا دعاؤں سے رابطہ رہے گا مگر میری صرف اک واک خواہش ہے جو اگر تو پوری کرنے میں میرا ساتھ دے۔"

"جی بی بی۔۔۔" نئی نویلی دلہن کی طرح اس نے بڑی سعادت مندی سے سر یوں جھکا دیا کہ ان کی ٹھوڑی اور سینے کے پنجرے میں کوئی فاصلہ باقی نہ رہا تھا۔ یوں بھی ریل میں رش ہونے کی وجہ سے وہ دونوں آپس میں یوں جڑی بیٹھی تھیں گویا دو سیب ساتھ ساتھ ایک ہی ٹہنی پر اگ آئے ہوں۔

"معراج شریف کی رات سے لے کر اب تک میں نے جو دعا سب سے زیادہ مانگی ہے وہ پتا ہے کیا ہے؟"

صبیحہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

"عرشوں کے سوہنے رب سے میں صرف اس کے محبوب کے نواسوں کی سنت پر پورا اترنے کے دعا مانگتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اب اور ہماری آنے والی سب نسلوں میں سے اللہ سوہنا کسی نہ کسی کو اس کے لیے چن کر ہم جیسے گلیوں کے روڑے کوڑے کو اپنی راہ میں قربان ہونے کے قابل سمجھے۔"

"بی بی۔۔" منہ دکھائی میں ساس کی طرف سے ملنے والی یہ نصیحت نما دعا اسے کچھ عجیب لگی تھی۔

"رب جانے معراج شریف کی کس گھڑی کے صدقے میری دعا سنی گئی اور سوہنے نے مجھ کوجی اور نکمی کو نہ سہی پر جگنی اور اس کے ابا کو پسند کر لیا۔ اب آگے باری تیری ہے اور میری پھر دعا ہے کہ اللہ میرے فیروز احمد کی اولاد میں سے بھی کسی کو پسند کرے اور یہ سلسلہ تاقیامت چلتا رہے۔"

"آمین۔" جانے کیوں اس دن بھی صبیحہ نے یہ لفظ محض زبان ہلانے کی حد تک ادا کیا تھا۔

"یہ جند (جان) ویسے بھی تو چلی ہی جانی ہے نا، سوہنے رب کے نام کرنے کی خواہش دل میں پکی کر لے، پھر آگے اس کی مرضی، کروڑوں عرضیوں میں سے ہماری عرضی نکلتی ہے کہ نہیں یہ پھر قسمت۔"

تب اسے بی بی کی ہمت پر بلاشبہ رشک آیا تھا جو اپنی نو عمر پھول سی بیٹی کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا دیکھنے اور شوہر کا آخری دیدار تک نصیب نہ ہونے کے باوجود اب تک اسی رستے پر اسی منزل کی تلاش میں سفر جاری

رکھے ہوئے تھیں۔

مکھبیر سنگھ نے تو انہیں اکیلے زندہ رہنے اور سسکنے کے لیے چھوڑا تھا مگر وہ تو ایک نئے جذبے سے پھر اسی میدان میں کھڑی تھیں۔

سیاہ مگر جگمگاتی رات میں صبیحہ کو لگا جیسے وہ صرف سانس کے سہارے اپنے زندہ ہونے کا یقین کر سکتی تھی۔ سانسوں کی آواز بھی اتنی اونچی ہو چکی تھی کہ لگتا جیسے کوئی قلعی گر بیٹھا اپنی بھٹی جلا رہا ہو۔

خشخش جناں قدر نہ میرا
میرے صاحب نوں وڈے آیاں
میں گلیاں دا روڑا کوڑا
مینوں محل چڑھایا سائیاں

(میری اوقات تو خشخاش کے ایک دانے برابر بھی نہیں ہے اور سب بڑائیاں اسی پاک ذات کے لیے ہیں۔ میں تو گلیوں کے کوڑے کرکٹ کے برابر ہوں۔ مگر بے شک مجھے اتنی عزت دینے والا وہی یعنی رب تعالیٰ ہے۔)

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے بڑے رقت آمیز انداز میں پڑھے گئے یہ اشعار صبیحہ کے کانوں سے بھی ٹکرائے تھے۔ اور تب اس نے کسی مزار کے مجاور کی طرح انتہائی بے خودی کے عالم میں ارد گرد کے ماحول سے بے خبر ہو کر نہ صرف اپنی اس بلکہ آئندہ آنے والی تمام نسلوں کے لیے عرشوں کے دولہا کے نواسوں کی سنت پر پورا اترنے کی دعا مانگی تھی۔ شدت سے آرزو کی تھی کہ اسے بھی اس راہ کے لیے پسند کر لیا جائے جو صراط مستقیم ہے۔

کینچوے کی طرح کبھی آگے اور کبھی پیچھے کا سوچنا چھوڑ کر دھیان صرف منزل کی طلب میں لگایا تو راستے تختی پر چھپی ہوئی الف ب پ کی طرح نہایت واضح اور آسان ہو گئے۔

داؤد احمد فوج میں بھرتی ہوا اور کچھ عرصے بعد بارڈر پر تعیناتی بھی ہو گئی۔

دونوں بھائی باری باری چھٹی ملنے پر بھی آیا کرتے۔ صبور احمد کا پہلا بیٹا چلنے کے قابل ہوا تو ایک اور بچے کی آمد بھی ہو گئی۔

گھر کا نظام راوی کے پانیوں کی طرح بڑے سکون میں تھا۔ خود صبیحہ بھی اپنا سب کچھ مال اور اولاد رب کے حوالے کر کے بے فکر ہو چکی تھی۔ تبھی اس کے دل میں داؤد کی شادی کا خیال ٹکرایا۔ بھلا دور کیوں جاتی حکیم صاحب کی بیٹی مذہب کے علاوہ دنیاوی تعلیم سے بھی بخوبی مالا مال تھی۔ سو داؤد احمد نے جب روٹین کے مطابق گھر آنا چاہا تو صبیحہ نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ابھی نہ آ' بڑی عید کے بعد تیری شادی طے کی ہے تو تب آنا تاکہ کم از کم مہینہ بھر کی چھٹی تو ملے۔"

سو داؤد احمد بارڈر کی خاردار تاروں کے ساتھ اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے میں ایک بار پھر حسب سابق مصروف ہو گیا۔

صبیحہ اپنی بہو کے ساتھ مل کر آنے والی نئی دلہن کے لیے کپڑے وغیرہ تو تیار کر ہی چکی تھی۔ زیور کے نام پر ایک ہلکا سا سیٹ سنار سے قسطیں طے کرنے کے بعد لیا گیا تھا۔ داؤد کے لیے شیروانی یا پینٹ کوٹ کے بجائے سفید کلف لگے کرتا شلوار کو سلوا کر استری کر کے صبیحہ نے پہلے ہی الماری میں جا ٹانگا تھا۔ ساتھ ہی گہرے نیلے رنگ کا استری شدہ رومال اور اپنے ہاتھ سے بنایا گیا ازار بند! دلہا کی تیاری مکمل تھی۔ صرف کلاہ باقی تھا جو داؤد کے آنے پر ہی خریدا جانا تھا۔ صبور احمد اور اس کے ننھے بیٹوں کی تیاری بھی مکمل تھی۔

آس پڑوس اور گاؤں والے ان کے گھر میں ایک بار پھر اترنے والی اس خوشی پر ہر طریقے سے ان کا ساتھ دے رہے تھے۔

عید الاضحیٰ پر قربانی کے لیے نیوز احمد کل ہی منڈی سے بکرا لایا تھا اور اب پوتے کے ساتھ مل کر اسے چارہ کھلانے اور پانی پلانے میں مصروف تھا۔

صبیحہ بیٹھی بہو کے ساتھ شادی کے موقع پر دیے جانے والے نیگ پر بحث کر رہی تھی کہ اچانک انہیں محسوس ہوا جیسے دروازہ بجا ہو۔

تینوں نے یقین دہانی اور تصدیق کے لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اتنی نامانوس دستک بھلا کس کی ہو سکتی ہے.....
ایسی جیسے کوئی چڑیا اڑتے اڑتے ایک دم دروازے سے آ ٹکرائی ہو اور پھر' باہر ہی ہوا میں معلق رہتے ہوئے بار بار اپنی چونچ ٹکرائی ہو۔
گھاس پیچے ٹاٹ کی بچھی ہوئی بوری پر رکھتے ہوئے فیروز احمد نے ہاتھ جھاڑے اور جا کر دروازہ کھولا تو سامنے چند فوجی جوان چہرے پر عقیدت و احترام سجائے داؤد احمد کی راہ حق میں شہید ہو جانے کی خبر لیے کھڑے تھے۔
فیروز احمد کا پورا جسم اس وقت برف کی ڈلی سا بخ ہو گیا تھا۔
سامنے ہی چارپائی پر بیٹھی صبیحہ میکانکی انداز میں چلتی دروازے تک پہنچی تو لگتا تھا کہ اب اس کی آنکھیں شاید کبھی بند نہ ہوں گی۔
ایک ہاتھ کھلے دروازے کے پٹ پر اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی بنائے کمر پر رکھے بس وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کھڑے چاق و چوبند جوانوں کو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ یوں لگتا جیسے کسیلے گھاس کی دھونی اس کے حلق تک میں بھر گئی ہو۔ بات چند ماہ پہلے کی ہوتی تو شاید اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے' وہ زارو زار اپنے جوان بیٹے کی موت پر روتی اور انہیں بد دعائیں دیتی جنہوں نے ناحق سرحد پار سے بلا جواز فائرنگ کر کے اس کی گود اجاڑ دی تھی۔ مگر اب ایسا نہ تھا۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ' اظہار ہمدردی میں کھنچے چلے آ رہے تھے۔
ایک تو جوان موت' پھر شادی میں رہ جانے والے چند روز اور کی گئی تمام تیاریاں اور موقع بھی کیسا کہ عیدالاضحیٰ میں رہ جانے والے صرف دو دن!
ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل غمگین تھا سوائے صبیحہ کے۔

سو جاؤ عزیزو کہ فصیلوں پہ ہر طرف
ہم لوگ ابھی زندہ و بیدار کھڑے ہیں

پاک فوج کی ایمبولینس پر تحریر یہ شعر پڑھ کر گزرنے والا ہر شخص بے ساختہ ایمبولینس کو سیلیوٹ کر کے فیروز احمد کے گھر میں داخل ہوتا۔
اور جب شدت جذبات سے مغلوب ہو کر خواتین سینہ کوبی کرنے لگیں تو اپنی نسوں میں برقی رو سی دوڑتی محسوس کر کے صبیحہ نے ایکدم سب کو منع کر دیا۔
"کیوں؟ کیوں رو رہی ہو تم سب؟ کیوں سینہ پیٹ رہی ہو؟"
صبیحہ کے بولنے پر سب نے اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا جسے اتنا بڑا غم سہنے کو ملا تھا۔
"خبردار' کوئی میرے بیٹے کا نام لے کر بین نہ کرے' وہ شہید ہوا ہے یعنی ایک اور دنیا میں ہم سے کہیں بہتر لوگوں کے درمیان قیامت تک امر ہو گیا ہے' یہ رونے کا نہیں جھلیوں' رب سوہنے کے حضور شکر کرنے کا دن ہے۔" دونوں ہاتھ جوڑ کر صبیحہ نے ہلکے نیلے آسمان کو دیکھا۔
"آج میں سرخرو ہو گئی۔ سب سے پیاری چیز کو اللہ سوہنے نے اپنی راہ کے لیے چنا' ورنہ میں کہاں گلیوں کا روڑا کوڑا اور کہاں وہ اونچی شانوں والا۔" بات ختم کر کے اس نے اس زور سے آنکھیں میچی جیسے اوپلے جلاتے ہوئے کچا دھواں آنکھوں میں آگھسا ہو۔
قربانی والی عید سے پہلے اپنے بیٹے کی رب کی راہ میں قربان ہو جانے کی اطلاع صبیحہ کو لگا جیسے بی بی تک جا پہنچی ہو' ڈھاکہ کی سفید ململ کے دوپٹے میں نور کا سا چہرہ لیے وہ اسے اپنے خیالوں میں اترتی محسوس ہوئی تھیں' چہرے پر خوشیوں کی چاندنی بکھیرے صبیحہ کو مبارک باد دی تو اس کی نم آنکھوں کے ساتھ مسکراتے لبوں کو دیکھ کر تمام عورتوں نے دوپٹوں کے پلو سے آنکھیں اور ناک رگڑتے ہوئے ناسمجھی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مگر صبیحہ کی نظر سب عورتوں کے درمیان بیٹھی اپنی بہو پر جا رکی کہ سب عرشوں کے مالک اس سوہنے رب کے حضور عرضیاں بھیجنے اور دعائیں مانگ کر سرخرو ہونے کی اوٹی سی کوشش کرنے کا عمل اب اس تک منتقل ہوتا تھا۔

☆ ☆

سیما بنتِ عاصم
دائرہ

بڑی لپاک جھپاک سی شخصیت تھی سمن مغل کی۔ یک دم اور پرت در پرت کھل جانے والی۔

کتنی عجیب بات ہے نا میری اس سے صرف تین ملاقاتیں رہیں اور ان تین ملاقاتوں نے اس کی شخصیت سے منسلک تمام اسرار کھول کر رکھ دیے اور ہر بار اک نیا روپ' اس کے حالات زندگی۔۔۔ اس کی محبت۔۔۔ اور اس محبت کا حصول۔۔۔ مگر ٹھہریے۔۔۔ اس طرح شاید بات آپ کی سمجھ میں نہ آسکے۔ لہذا میں اول تا آخر بتاتا ہوں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے' جب اپنی طویل بے روزگاری سے عاجز آکر میں نے اپنے عزیز دوست جمشید کے "شادی دفتر" میں کچھ دیر بیٹھنے کی ہامی بھری تھی۔ مشاہرہ کمیشن کی بنیاد پر تھا۔ جو میرے لیے غنیمت تھا کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے۔ یہ اور بات کہ اس کام کی یکسانیت سے میں بہت جلد عاجز آگیا۔ ہر دوسرا رشتہ کسی لڑکی کا ہوتا۔

لڑکیاں ہی لڑکیاں۔۔۔ اک انبار تھا۔ لڑکیوں کی رجسٹریشن تک ارزاں تھی' مگر لگتا تھا کائنات میں لڑکے رہے نہیں۔۔۔ یا جو ہیں وہ شادی پر آمادہ نہیں۔ کبھی اگر جو کوئی بھولا بھٹکا رشتہ آہی جاتا تو ہم ایسے خوش ہوتے جیسے برسوں کے پیاسے کو پانی نصیب ہو جائے۔ ہمارے پاس گنتی کے لڑکے تھے۔ بلال' سہیل' عامر' سیف الرحمن۔

بلال اک سیاہ فام لڑکا تھا۔ جو اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ تابعدار' دین دار اس کی زندگی کا مقصد فالج زدہ ماں کی خدمت و اطاعت تھا اور یہی امر اس کی شادی میں روڑے اٹکاتا۔ اس کے لیے عام تاثر یہی تھا کہ عرصہ سے بستر پر دراز فالج زدہ ماں کی خدمت سہولت سے آنے والی دلہن کے کھاتے میں جا پڑتی۔۔۔ سو ہر کوئی کانوں کو ہاتھ لگاتا اٹھ جاتا۔

سہیل اک ہینڈسم ڈیشنگ چالیس سالہ آدمی تھا۔ لالچ اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ اپنے لیے کسی موٹی آسامی کا طلب گار تھا۔ یہ اور بات کہ خود اپنی حیثیت دو ٹکے کی بھی نہ تھی۔ عرصہ سے جاب لیس تھا۔ خیر ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو شادی کے ساتھ مالی سپورٹ فراہم کر سکیں مگر۔۔۔

سہیل دو بیویوں کو فارغ کر چکا تھا اور یہی امر اس کی اگلی شادی میں مانع تھا۔ لڑکی والے کتنے بھی مجبور و پریشان ہوں۔ سہیل کی دو طلاقوں کا سن کر ہر کوئی لنگوٹی سنبھال کر بھاگتا نظر آتا۔ سہیل احمد کے نہ کوئی آگے تھا' نہ پیچھے۔ بار بار ٹھکرائے جانے کی ذلت نے اس کے کس بل اچھی طرح نکال دیے تھے۔ وہ جو ہے' جیسا ہے' کی بنیاد پر ہر رشتہ قبول کرنے کو تیار تھا' مگر کوئی اسے بھی تو قبول کرنے پر تیار ہوتا؟؟ اس کی تصویر کوائف سے پر فارم کی فائل عرصہ سے سڑ رہی تھی اور اب سرخ فیتے کے لیے زیر غور تھی۔

عامر ایک دبلا پتلا مریل مدقوق چہرے والا چڑچڑا اور بددماغ لڑکا تھا۔ جس نے نا صرف اپنے اہل خانہ کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ بلکہ محلّہ کے لوگوں تک کے سر پھوڑ رکھے تھے۔ اس کے لیے اک عام تاثر یہ تھا کہ وہ نفسیاتی مریض ہے۔ اسی سبب اس کا جہاں کہیں رشتہ جاتا' کہیں نہ کہیں کوئی روڑا اٹکائے کھڑا ہو جاتا۔۔۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ شادی اس کی شخصیت میں تبدیلی لے آئے گی۔ مگر شادی ہوتی کیسے؟

اور سیف الرحمن کے تو کہنے ہی کیا۔۔۔ صورت شکل' خاندان' نسل' تعلیم — وہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھا۔ گھریلو تنازعوں پر ان سب بھائیوں نے جائیداد کا بٹوارہ کر لیا تھا اور اب کسی کا کسی سے تعلق نہ تھا۔ سب گھر کے الگ الگ پورشنز میں رہا کرتے تھے اور چاروں بھائیوں کا فیملی سمیت صرف ایک ہی کام تھا کہ ایک دوسرے کے سکون میں خلل ڈال کر ان کی خوشیوں کو برباد کرتے رہنا۔ سیف الرحمن بھی سازشوں کا شکار تھا۔

اس کے معاملے میں اک دلچسپ بات یہ رہی کہ جہاں اور جس لڑکی سے اس کا رشتہ لگتا' کسی نہ کسی بہانے رشتہ ٹوٹتا اور آنا" فانا" اسی لڑکی کی کسی اچھی جگہ پر شادی ہو جاتی۔ سیف الرحمن لٹکا رہ جاتا۔۔۔ ایسا

ایک بار نہیں بار بار ہوا تھا۔ سیف الرحمٰن کا خیال تھا کہ اس کے گھر والوں نے اس کے رشتے پر بندش لگوائی ہے۔ کالا جادو کروایا ہے اور میں اور جمشید سوچتے کہ سیف الرحمٰن کو ٹوٹکے کے طور پر استعمال کیا جائے۔

یہ چار لڑکے تھے جنہیں گھما پھرا کر ہم دوسروں کے سامنے پیش کرتے اور جواب تقریباً" یکساں ہی ملتے۔ دو طلاقیں... اف خدایا... ضرور کوئی بڑی وجہ ہوگی۔

"بلکل... ارے نہیں بھئی... ہماری بیٹی پس کر رہ جائے گی۔ فالج زدہ بڑھیا کی خدمت کوئی آسان کام ہے بھلا۔"

عامر کی تصویر تک کوئی پسند نہ کرتا۔ البتہ سیف الرحمن ہر کسی کو بھا جاتے۔ مگر کھودا پہاڑ "نکلا چوہا" والی مثل رہتی۔

میری نظر میں یہ تینوں لڑکے مظلوم تھے۔ دنیا کچھ بھی کہتی رہے... اور لڑکیوں کے رشتوں کے تو کہنے ہی کیا۔

ہمارے پاس ہر دوسرا رشتہ کسی لڑکی کا ہوتا۔ بھانت بھانت کی لڑکیاں... جن کی عمریں گزر گئیں یا گزر رہی تھیں۔ مہذب، خاندانی، خوب صورت، تعلیم یافتہ، یہاں تک کہ اعلا عہدوں پر فائز ڈگری یافتہ شش...

کبھی کبھی میں چڑ اٹھتا۔ "لگتا ہے جیسے کائنات سے لڑکے ختم ہو گئے۔"

"لڑکے نہیں اچھے لڑکے۔" جمشید تصحیح کرتا۔

"ارے تو کیا ضروری ہے کہ جن لڑکوں کو رشتوں کی ضرورت ہے بس وہی اچھے ہوں۔"

"ہوں سمجھ لو کہ جن کا کہیں رشتہ نہیں جڑتا وہ شادی دفتر کا رخ کرتے ہیں۔"

"کیا قیامت ہے کہ ایک سے ایک بہترین لڑکیاں گھر گھر بن بیاہی بیٹھی ہیں۔"

"مگر تمہیں ایک بھی نصیب نہیں۔" اس نے چڑایا۔

"میرے لیے چھوکری نوکری سے مشروط ہے۔"

"اگر چھوکری والی شرط سے ہٹ جاؤ تو نوکری کی ضرورت ہی نہ رہے۔"

"کروڑوں کی جائیداد کی وارث بیوہ۔"

"لعنت۔ لوگوں نے شادی کو بیوپار بنالیا ہے۔"

میری امی نے بھی "چاند سی دلہن" کے ڈھیروں خواب سجا رکھے تھے اور میں... بس جو دل کو چھو جائے... جس کے نہ ہونے سے زندگی میں خلا رہ جائے، مگر ابھی دلی دور تھی۔ مجھے امی کے خوابوں کو پورا کرنا تھا۔ اک عرصہ گزرا تھا بے روزگاری کا عذاب جھیلتے۔ وہ جیسے تیسے گزارا کرتیں اور میں خود سے نظر ملانے کے بھی قابل نہ تھا۔ اچھی تعلیم، ڈپلومہ، یہ وہ سب کسی کونے کھانچے میں پڑے سڑ رہے تھے۔ جانے امی کے خواب سلامت تھے کہ چکنا چور ہو گئے تھے۔ اک عرصہ سر پھوڑ کے بھی شادی دفتر میں بیٹھنا ہی ٹھہرا۔

میں اس گھڑی کو کوستا جب اپنی فراغت و بے کاری سے عاجز آکر میں نے جمشید کی آفر قبول کی تھی۔ وہ مزے سے اپنے دیگر دھندے بھگتاتا اور میں یہاں بیٹھا اخبار چاٹتا یا مکھیاں مارتا رہتا یا پھر اچھی بھلی لڑکیوں کی قسمت پر کڑھتا رہتا۔

ان ہی دنوں ہمارے دفتر میں اک خوب صورت جوڑے کی آمد ہوئی۔ آفتاب مغل اور بیگم آفتاب مغل۔

میرے اندازے کے مطابق ان کی شادی کو چار چھ سال ہی گزرے ہوں گے۔ انہیں اپنی تیس سالہ بہن سمن مغل کے لیے اک مناسب رشتے کی تلاش تھی۔ مجھے خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ حالات کچھ بھی ہوں، لوگوں کو اچھا رشتہ درکار ہوتا ہے۔ جیسے ایک سے بڑھ کر ایک اچھے رشتے شادی دفتر والوں کی جیب میں پڑے ہوں۔

میں نے رجسٹریشن فارم انہیں بڑھا کے تصویر پر نظر ڈالی۔ تصویر جاذب نظر اور نئی ہی لگتی تھی، ورنہ ان معاملات میں لوگ برسوں پرانی تصویر چلاتے ہیں۔ مجھے لگا کہ ان دونوں کو سمن مغل کی شادی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ بھائی، بھاوج

تھے۔ والدین نہیں۔
خصوصاً "بیگم آفتاب مغل کا انداز خاصا کھنچا کھنچا سا تھا۔ مگر اس وقت میری نظریں تیزی سے رجسٹریشن فارم پر قلم چلاتے آفتاب مغل اور دل و دماغ نصف کی بنیاد پر ملنے والے کمیشن پر اٹکے تھے۔ رجسٹریشن فیس کا نصف۔ یعنی ایک ہزار۔ جو سیکڑوں مسائل کا حل نہ سہی۔ بس اک 'دو روز کا خرچا تھا۔ جمشید کو میری ایمان داری پر بھروسا تھا اور یہ رجسٹریشن تو آئے روز چلتی ہی تھی' اس جوڑے کا خاصا پروفیشنل بلکہ جان چھڑا لینے والا انداز تھا۔ منٹوں میں تفصیلات حاصل کیں۔ جھٹ فارم بھرا اور جھٹ فیس ادا کر کے یہ جا وہ جا' رشتہ کیسا ہو' کہاں کا ہو' تمام معلومات کے لیے انہوں نے سیدھے سبھاؤ ثمن مغل کا رابطہ نمبر پکڑا دیا گویا چھٹی ہوئی۔

میں نے جانچ لیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے پاس پیسہ زیادہ اور فراغت کم ہوتی ہے۔ ایسے رشتے خاصے سہل ہوتے ہیں۔ جو نام نہاد رشتوں کی بے پروائی کا شکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ سب ہی فرض کی ادائیگی کے بعد ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ فریقین میں کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو مقدر کا لکھا سمجھ کر ایک دوسرے کو بھگت لیتے ہیں۔ ثمن مغل بھی ایسی ہی لڑکی لگتی تھی۔

بھائی شادی شدہ اعلا عہدوں پر فائز' بھاوجیں جان چھڑانے پر آمادہ' یہیں آکر انسان ہلکا پڑتا ہے۔ جب اپنی کوتاہیوں کو نصیب کے خانے میں دفن کر دیتا ہے۔ خیر۔

میرا ارادہ تھا اس سے رابطہ کر کے اک ملاقات رکھوں کہ وہ کیسا بر چاہتی ہے' مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ اگلے دو چار دنوں میں ثمن مغل خود آ دھمکی۔ وہ خاصی عام سی لڑکی تھی' مگر فان کلر کے چکن کے سوٹ میں ہائی ہیل پر اعتماد سے کھڑی گہری سیاہ سلکی شولڈر کٹ بالوں کے ساتھ مسکراتی گھنی پلکیں جھپکتی' وہ مجھے خاص الخاص لگی تھی۔
تعارف کے بعد میں نے رسماً" کولڈ ڈرنک منگوائی تھی اور کولڈ ڈرنک ختم ہونے تک ہمارے درمیان اچھی خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی اور وہ اپنی زندگی کا ایک رخ میرے کانوں میں اتار چکی تھی۔

"مجھے یہاں اس لیے آنا پڑا کہ میری اور گھر والوں کی ترجیحات خاصی مختلف ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ اچھے رشتے نایاب ہیں۔ مصیبت تو یہ ہے کہ کوئی معقول انسان مجھے سند قبولیت بخشنے پر تیار نہیں۔"

"ارے!" میں حیران رہ گیا۔ "اچھی بھلی تو ہو' کیا کمی ہے تم میں۔"
"کیلشیم کی۔" وہ ہنسی۔
"تم ایک پر کشش لڑکی ہو جو آنکھوں کو اچھی لگتی ہے۔" مجھے کہنا پڑا۔

"کئی جگہ تو حسین ترین لڑکیاں بھی بن بیاہی بیٹھی ہیں۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کا اک سفاک دستور ہے۔ رشتے اسٹیٹس کی بنیاد پر طے کیے جاتے ہیں۔"

"اک وقت ہوتا ہے' جب ہمیں لگتا ہے کہ کائنات ہماری مٹھی میں ہے۔ ہمیں کسی کو بھی رد یا منتخب کرنے کا اختیار حاصل ہے اور جب اسی خوش گمانی میں وقت بہت آگے سرک جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے قدموں تلے زمین بھی اپنی نہیں ہے۔"

میں نے جانچ لیا وہ بھی معاشرے کے کسی سفاک دستور کا شکار ہونے والی لڑکیوں کی طرح کچھ کچھ کمپلیکس کا شکار تھی۔

"میری عمر پینتیس سال ہے' لگتی نہیں وہ اور بات ہے۔" وہ فخریہ ہنسی۔

"ابا گزرے تو سر پر نہ چھت تھی' نہ کوئی وسیلہ' میری زندگی کا بڑا حصہ ابا کے فرائض ادا کرتے گزرا۔ بیوہ ماں' بہن' بھائی اور اب جب سب کی ضرورتیں پوری ہو چکی ہیں تو ان کا خیال ہے کہ میری شادی ہو ہی جانی چاہیے۔"

میرے ذہن میں شہزادی قلوپطرہ کا خاکہ ابھرا۔ عظیم اور قربانی دینے والی اور کیا قیامت ہے کہ ایسے لوگ تنہا رہ ہی جاتے ہیں۔

"اور اب اماں کے گزرنے کے بعد لگتا ہے کہ دنیا

میں کوئی بھی میرا اپنا نہیں رہا۔ مجھے اندازہ تھا' انسان مصنوعی رشتوں میں سانس لیتا ہے تو گھٹن بڑھ جاتی ہے۔ چلتی ہوں۔" اسٹائلش سا ہینڈ بیگ کندھے پر ڈال کر وہ یک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے لگا جیسے کوئی خوش گوار خواب دیکھتے ہوئے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

صرف بیس منٹ! اور اس بیس منٹ کی ملاقات میں مجھے لگا میں اس سے کئی بار مل چکا ہوں۔ بڑی سحر انگیز شخصیت تھی۔ یک دم چھا جانے اور بہت اپنائیت کے ساتھ گھل مل جانے والی۔ مگر سمن کی شخصیت کے دیگر اسرار مجھ پر تہ در تہ کھلے۔

"ایسی لڑکیاں واقعی عظیم ہوتی ہیں۔" جمشید نے سن کر کہا۔

"ہاں۔ مگر لوگوں نے حسن کو معیار بنا رکھا ہے۔ سیرت کی تو کوئی قیمت ہی نہیں رہی۔"

"سچ کہتے ہو' شاید اسی لیے معیار کے نام پر ایک کے بعد ایک لڑکی ٹھکرانے والی مائیں' بہوؤں کے دکھ اٹھاتی ہیں۔"

"اپنی پچیس سالہ زندگی میں' میں نے اتنی سفاکی و ناانصافی کسی اور معاملے میں کم ہی دیکھی ہے۔ لوگوں کا بس نہیں چلتا۔ آسمان کے تارے توڑ کر سروں میں سجالیں۔ ہاہ! حاکمیت۔" میں سر جھٹک کر گنگنانے لگا۔ "رشتے ملتے ہیں شیاروں کو۔"

سمن مغل سے میری اگلی ملاقات بہت جلد ہو گئی۔ وہ ایک پبلک پیلس کے سنگی بینچ پر بیٹھی مزے سے پاپ کارن کھا رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر ٹھٹکا' پھر تھم گیا۔ وہ مسکرا دی۔

"تم... یہاں... کیسے؟"

"میں یہاں شمسی کا انتظار کر رہی ہوں۔" اس نے یوں کہا جیسے شمسی میرا پرانا واقف کار ہو۔ میرا چہرہ سوالیہ نشان بنا تو ہنس دی۔

"اس کا نام کچھ اور ہے' مگر مجھے اچھے بھلے نام کا جلوس نکالنا اچھا لگتا ہے۔"

"مگر اتنا تو معلوم ہو کہ یہ ذات شریف ہیں کون؟"

"شمسی!" اس کے چہرے پر خوب صورت ترین مسکراہٹ بکھر گئی۔ آنکھوں میں ہزار واٹ کے قمقمے جلنے لگے۔ روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔

"شمسی میری محبت ہے۔ وہ محبت جو خود کو بھلا دیتی ہے۔" پھر وہ بتانے لگی۔ شمسی سے اس کی ملاقات اتفاقی تھی۔ جو حیات کا رخ پلٹ گئی' بلکہ ساری حیات پر محیط ہو گئی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ پھر رشتہ تلاشنے کی کیا تک بنتی ہے۔ وہ میرے اندر اٹھتے سوال کو پا گئی۔

"شمسی جوان اولاد کا باپ ہے۔ اک مجبور حساس آدمی' جو احساس تنہائی کا شکار ہے۔ مانتا ہے کہ میری محبت نے اس کی زندگی کو مکمل کیا ہے۔ مگر مجھے اپنا نہیں سکتا۔ اس کے خیال میں میری اور اس کی عمر میں کافی فاصلہ ہے۔ بے وقوف' ان کی شادی کم عمری میں ہوئی۔ میری شادی بھی کم عمری میں ہوتی یا ان ہی کے ساتھ ہوتی تو کیا میں جوان بچوں کی ماں نہ ہوتی؟

میری عمر پینتیس سال ہے۔ لگتی پچیس کی بھی نہیں' یہ اور بات ہے اور شمسی کہتے ہیں کہ مجھے تو کوئی بھی اچھا لڑکا مل سکتا ہے۔"

"وہ درست کہتے ہیں۔" مجھے کہنا پڑا "تمہیں واقعی کوئی اچھا لڑکا مل سکتا ہے۔"

"اچھا لڑکا ملنا اتنا آسان ہوتا تو اب تک مل نہ چکا ہوتا؟" اس کی بات درست تھی۔ دل میں کھب گئی۔ "شادی تو کسی سے بھی کی جا سکتی ہے' مگر محبت نہیں' زندگی میں محبت ہو تو زندگی سہل رہتی ہے' میں کسی لڑکے سے شادی کر لوں اور اس سے محبت نہ کر سکوں تو...؟"

مجھے لگا میرے اندر کوئی شگاف پڑا ہے اور وہ پھیلتا جا رہا ہے۔ اک عجیب سا احساس۔

"میں ایک آئیڈیل پرست لڑکی تھی۔ جب تک ابا رہے' مجھے سپورٹ کرتے رہے۔ وقت گزرتا چلا گیا اور جب' جو ہے' جیسا ہے' کی بنیاد پر گزارنے والی بات آئی تو محبت ہو گئی۔ محبت بھی ایسی' جس کے آگے دنیا ہیچ ہے۔ سینوں میں اتر کر لہو میں گردش کرتی ہے۔"

"تو تم خود کو اس محبت کے لیے وقف رکھنا چاہتی

ہو؟" اس نے تیزی سے اثبات میں سرہلایا۔

"میری زندگی میں میرا اپنا کچھ ہے تو شمسی۔ اس سے میرا دل کا رشتہ ہے۔ باقی میں دنیاداری ہے اور شادی بھی بس دنیاداری کی اک شرط ہے۔"

"ہمم۔۔۔ م۔۔۔ م۔۔۔ یعنی وہ نہیں تو کوئی بھی نہیں۔" اس بار اس نے نفی میں سرہلایا۔

"وہ نہیں تو اس جیسا سہی۔ یہ اور بات کہ کوئی اور اس کا سایہ بھی نہیں چھو سکتا۔ اس میں کوالٹیز ہی اتنی ہیں۔ ڈیشنگ، سویر دوسروں کے لیے خود کو نفی کرنا آسان نہیں ہوتا۔"

مجھے اندازہ تھا۔ اس جیسی میچور لڑکی کس حد تک سلیکٹیو ہو سکتی ہے۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جنہیں زندگی محض چھو کر نہیں گزرتی۔ وہ زندگی کو اس کے حقیقی معنوں میں برت کر کندن بنتی ہیں۔

"اس کا کہنا ہے کہ جب فیملی مکمل ہو جائے تو خود سے خود کو نفی کر ہی دینا چاہیے۔ اس کے سر پر اس کے فرائض ہیں۔ جو اسے خود تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ وہ گھر کے لیے انڈے، ٹماٹر تک خود خریدتا ہے۔ گھر کی عورت کو گھر تک محدود رکھنے کا قائل ہے۔ کتنی عجیب بات ہے نا۔ ایک ویل ایجوکیٹڈ اعلا عہدے پر فائز آدمی محبت کر تو سکتا ہے، اسے پا نہیں سکتا۔ اسے ڈر ہے اس کی بیوی اس پر ٹرک بھر پتھراؤ کر دے گی۔ وہ ڈیپریشن کی مریضہ ہے۔"

"بیویوں کی پروا کون پالتا ہے۔" میں نے اس کی بات اڑا دی۔

"اولاد جوان ہو تو عورت کی حیثیت خود بخود مستحکم ہو جاتی ہے۔"

"خاصے جہاندیدہ لگتے ہو۔" اس نے گھنیری پلکوں تلے سیاہ گھور آنکھیں سیکنڑ کر مجھے دیکھا تھا۔ "وقت بڑا استاد ہے۔" میں ہنس دیا۔

"سوچتی ہوں" آج اگر ابا ہوتے تو ہر قیمت پر شمسی کو میرا ہم سفر بنا دیتے۔" میں پھر ہنس دیا۔ تقدیر کے معاملے میں ہر انسان بے بس ہے۔ وہ کسی خوش گمانی کی ڈور کو تھامے بیٹھی تھی تو حرج بھی کیا تھا۔

"یہ الجھنیں، بندشیں، رکاوٹیں، سب تقدیر کا بہکاوا ہیں۔ جب کچھ ہوتا ہوتا ہے تو اچانک بھی ہو جاتا ہے، خود بخود۔۔۔ اور غیر متوقع۔"

شاید وہ جواباً "کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر۔۔۔

اس کا موبائل بجنے لگا۔ شاید شمسی آ رہا تھا۔ میں رخ بدل گیا، مگر آج اس کی شخصیت کا اک اور اسرار مجھ پر کھل گیا تھا۔ وہی اپنائیت کے ساتھ کھل جانے والی فطرت، جیسے بادل کھل کر برسے اور سب کچھ نکھرتا چلا جائے۔ اگرچہ یہ خاصی بچی سی ملاقات تھی۔ مگر میں جشید کو بتائے بغیر نہ رہ سکا۔

"واہ! محبت کا اک انوکھا فلسفہ۔"

"وہ چاہتی ہے کہ رشتے میں شمسی والی کوالٹیز ہوں۔ ڈیشنگ، ڈی سینٹ، اعلا عہدے پر فائز۔ وہ نہیں تو اس جیسا سہی۔"

"ہاہ۔۔۔ ہاہ۔۔۔" وہ منہ پھاڑ کے ہنسا۔ "تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔"

"یار کبھی تو سیریس ہو جایا کرو۔ یقیناً" وہ ڈیزرو کرتی ہے۔ سچ! ایسی لڑکیوں کے لیے میرا دل بہت کڑھتا ہے۔"

"یار! تم اچھے لڑکے ہو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ تو میں ہوں۔ جب سب لوگ ایک ہی بات کہیں تو مان لینا چاہیے کہ وہ بات درست ہی ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ مگر اس کے اگلے جملے پر میری مسکراہٹ کافور ہو گئی۔

"اور اچھے لوگوں کا ایک المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انہیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔"

"چلو اپنا کام کرو۔" میں نے نروٹھے پن سے کہا۔ "اور مجھے اخبار پڑھنے دو۔"

وہ ہنستا ہوا چلا گیا تو میں سوچنے لگا، سمن مغل ایک اچھی لڑکی تھی اور اچھے لوگ عموماً" ٹریجڈی کا شکار کیوں ہوتے ہیں۔ یہ کیا کم المیہ ہے کہ جسے چاہو، اسے پا نہ سکو۔

پھر بہت سارے بے ڈھنگے اور سست رفتار دن

گزرے۔ میں یوں ہی شادی دفتر میں بیٹھا اخبار چاٹتا یا ادھر ادھر نوکری کے لیے بھاگ دوڑ کرتا پھرتا۔ جانے تنگی حالات میں بھرپور روز و شب اتنے طویل کیوں ہوتے ہیں مجھے لگتا وقت گزر کر بھی نہیں گزرا۔ اک روز جمشید نے اک تصویر میرے سامنے رکھی۔

"یہ لاریب مصطفیٰ ہے۔ حال ہی میں اس کی بیوی کی ڈیتھ ہوئی ہے اور یہ۔۔۔۔"

"دوسری شادی کا خواہش مند ہے۔" میں نے تیزی سے بات اچکی اور اک نظر تصویر پر ڈالی۔ ڈیشنگ سوبر ویل ڈریسڈ میرے تصور میں چھپکے سے اک سراپا ابھرا تھا۔

"یو آر رائٹ۔ میری نظر سے ایسی کئی عورتیں گزری ہیں جنہوں نے شوہر کے بعد اپنی زندگی اولاد کے لیے وقف کردی، مگر مرد ہاتھ میں لاٹھی بھی ہو تو بیوی سے فراغت کے بعد اگلی شادی کی سوچتا ہے۔"

"یہ اک فطری سی بات لگتی ہے کہ مرد میں خواہش اور عورت میں وفا کا ریشو زیادہ ہوتا ہے۔"

"اس عمر میں شادی کی بس ایک وجہ رہ جاتی ہے کہ کوئی چائے بنا کر دینے والی مل جائے۔ بندہ مال دار ہو تو کنواری لڑکی بھی مل جاتی ہے۔"

"لاریب کا خیال کچھ مختلف ہے۔ اس کے گھر کو ایک سوبر و ذمہ دار خاتون کی ضرورت ہے۔ کسی کنواری لڑکی کی مجبوری کو کیش کر کے وہ اس کے ساتھ زیادتی کرنے کے حق میں نہیں۔"

"اس کنواری لڑکی کے ساتھ تو زیادتی ہو ہی جائے گی۔ جسے ان جیسا بھی نصیب نہیں۔ یا جو صرف موٹی آسامی پر نظر رکھتی ہیں۔"

"دولت کے بل بوتے پر کسی کی مجبوری کیش کرنا زیادتی ہے۔ ایک لڑکی جب شادی کرتی ہے اس کے کچھ خواب اور ارمان ہوتے ہیں۔ اپنے گھر اور نئے رشتوں کے خواب۔۔۔ وہ فیملی بنانا چاہتی ہے۔ محبت اور توجہ چاہتی ہے۔ اور لاریب کا کہنا ہے کہ وہ خود سے خود کو نفی کر چکے ہیں۔ ان میں تو بس فرائض کی تکمیل کے لیے سہارا چاہیے۔"

"اگر یہ بات ہے تو آدمی معقول ہے۔" میں نے سراہا۔

"ہاں ڈیشنگ ہے۔ پینتالیس کا ہے، مگر چالیس کا بھی نہیں لگتا۔ آمدنی بھی لاکھوں میں ہے، دوسری شادی افورڈ کر سکتا ہے، مگر کسی کے خواب نہیں توڑنا چاہتا۔"

اس کے لفظوں میں کچھ ایسا تھا کہ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ شمسی اک نام بار بار میرے ذہن پر دستک دینے لگا۔ میں جیسے جیسے سوچتا گیا۔ کڑیوں سے کڑیاں ملتی رہیں اور یہ یقین پختہ ہوتا چلا گیا کہ ہو نہ ہو یہ شمسی ہے۔ ورنہ شمسی جیسا سہی، دونوں صورتوں میں سمن مثل کا سراپا ذہن میں ابھرتا تھا۔ شاید اسی لیے شمسی سے اتنی گہری نسبت کے باوجود سمن کو

پروپوز نہیں کیا۔ وہ محبت کو ترسا ہوا تھا' مگر خود کے لیے ثمن کے خواب نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ یہاں آکر ثمن درست ثابت ہو جاتی تھی کہ اس میں اتنی کوالٹیز ہیں کہ کوئی اس کا سایہ بھی نہیں چھو سکتا۔ میں نے اسی شام بھرپور تفصیلات کے ہمراہ لاریب مصطفیٰ کی تصویر ثمن مغل کو سینڈ کی تھی۔ جواباً" اس کا ردعمل نہایت شدید تھا۔

"او گاڈ... یہ شمسی ہے۔ لاریب مصطفیٰ شمسی۔"

اک ان جانے احساس کے تحت میرا دل زور' زور سے دھڑکنے لگا۔

"تم ہی بتاؤ' اب کیا کرنا چاہیے؟"

"اسے کل اپنے آفس بلاؤ۔"

مجھے اپنی کھوپڑی کی سلامتی عزیز تھی۔ سو فی الفور ہامی بھرلی۔ اس کے لہجے میں جلال ہی اتنا تھا اور کیا مزے کا منظر تھا۔ جب اگلے روز فان کلر کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہ سوبر سادھیمے لہجے میں بات کرتا شمسی ہم دونوں کے سامنے براجمان تھا اور ثمن مغل کی انٹری ہوئی۔

"شمسی!" وہ چھوٹتے ہی اس پر جھپٹ پڑی۔

"تمہاری یہ جرات... میرے ہوتے ہوئے تم رشتہ تلاش کرنے یہاں آپہنچے۔" وہ سٹپٹا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم... میں نے تمہیں ہزار بار بتایا۔ میں تمہارے ساتھ... زی... یا... ٹی..." وہ لڑکھڑایا تھا۔ میں منہ پھیر کر مسکرا دیا۔ زندگی میں پہلی بار کسی مرد کو عورت سے اتنا خائف پایا تھا۔

"جہنم میں جائے تمہاری یہ اسٹوپڈ منطق" مجھے لگا وہ ابھی گن نکال کر اس پر فائر کر دے گی۔ "تم کسی اور سے شادی کر لو گے اور میں دیکھتی رہوں گی۔ تم نے یہ سوچا بھی کیسے؟ تم اس لیے اتنے دنوں سے گم تھے اور مجھے بتایا تک نہیں۔" مجھے اک فلم کا ڈائیلاگ یاد آگیا۔ "میں تمہیں بھول جاؤں یہ ہو نہیں سکتا اور تم مجھے بھول جاؤ یہ میں ہونے نہیں دوں گا۔" واقعی خاصی فلمی سچویشن تھی۔

"میری بات سنو... دیکھو..." وہ سنبھلا' پھر اسے کندھوں سے تھام کر روکا۔

"شٹ اپ۔ مجھے کچھ نہیں سننا... میں نے... میں نے تم سے محبت کی ہے... اور تم پر صرف اور صرف میرا حق ہے' سمجھے۔" وہ شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ لاریب کیوں نہ پسپا ہوتا۔ اور جب وہ لاریب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آفس سے نکلنے لگی تو میں نے چپکے سے انگوٹھا دکھا کے اسے ویل ڈن کہا تھا۔ جواباً" اس نے مجھے وکٹری دکھائی اور آفس سے نکل گئی۔

"الجھنیں... بندشیں... رکاوٹیں... سب انسان کے لیے بہکاوا ہیں' جب کچھ ہونا ہوتا ہے تو یوں بھی ہو جاتا ہے۔ تم سچ کہتے تھے۔" جمشید نے ان کے جانے کے بعد کہا۔

"مجھے اچھے لگتے ہیں وہ لوگ جو چھین جھپٹ کر اپنا حق وصول کرتے ہیں۔ دنیا انتظار کرنے والوں کی اتنی پروا کہاں کرتی ہے۔" میں مسکرایا۔

"انسان کی جیسی قابلیت ہو ویسا ہی کام کرتا ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔ رشتے میں جتنا گہرا ربط ہو' انوالومنٹ اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ کامیابی کا دارومدار نیت کی سچائی پر ہوتا ہے۔"

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کیوں ثمن و لاریب کے معاملے میں انوالو ہوا؟ کیونکہ ثمن وہی لڑکی تھی۔ جس کے نہ ہونے سے زندگی میں خلا رہ جاتا ہے۔ دل کو چھو لینے والی۔

محبت مختصر سہی لیکن
عمر لگتی ہے بھلانے میں

✡ ✡

حنا یاسمین

وہ گاڑی کے بیک ویو مرر سے اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر چار انگلیوں کے نشان۔۔۔ خفت و شرمندگی سے دہکتے سرخ گال۔۔۔ بہتی ناک اور پانی سے بھری آنکھیں۔۔۔ شکستہ وجود۔۔۔ اور چہرے پر نفرت و تھکن کے آثار۔۔۔ جسم پر اترتے سناٹے۔

اپنی ماں کے بارے میں اس کے اندازے یونہی غلط ہوا کرتے تھے۔ ماں کی آنکھ تو اولاد کی وہ ادا بھی پہچان لیتی ہے، جس کے بارے وہ خود بھی نہیں صحیح طرح جانچ سکتا۔

سڑک داہنے طرف مڑ گئی تھی۔ یہ علاقہ پرسکون تھا۔ جہاں زمین کو جھکتے درخت رات کی تاریکی میں خنک ہواؤں کو گزرنے کے لیے راستہ فراہم کررہے تھے۔ وہ اس وقت ہمیشہ گاڑی کے شیشے چڑھا لیتی تھیں۔ انہیں اس کی صحت کے بارے میں ہروقت فکر لاحق رہتی۔ مگر آج شیشے نہیں چڑھائے گئے تھے۔

وہ شاکڈ تھیں۔۔۔ پریشان تھیں۔۔۔ حیران تھیں۔۔۔ یا افسردہ وہ ماں کو کبھی نہیں پہچان سکا تھا۔ نیم تاریکی، خنکی اور افسردگی ماحول کو بوجھل کرنے کے لیے کافی تھی۔ گھر کا راستہ لمبا ہی ہوئے جا رہا تھا۔ اسے گاڑی میں بیٹھ کر کبھی شرارتیں کرنے کی عادت تھی۔ مگر آج اس کی آنکھیں ایک ہی نقطہ پر مرکوز تھیں۔ گمبھیر خاموشی۔۔۔ اور خاموشی کے پیچھے خیالات کا ہجوم۔۔۔ خیالات، خدشوں اور بے ترتیب دھڑکنوں کو خالی جگہیں سوالیہ نشانوں کے ساتھ فراہم کررہے تھے۔

وہ گھبرا رہا تھا۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ مما کچھ تو بولیں مگر وہ خاموش تھیں۔۔۔

اس فارم ہاؤس پر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ڈرنک کررہا تھا اور یہ اطلاع انہیں نہ جانے کہاں سے ملی تھی مما اس کے دوست کے گھر چلی آئی تھیں اور دوستوں کے سامنے ہی تھپڑ دے مارا تھا اسے۔

صد شکر کہ گاڑی عقب سے پورچ تک پہنچ ہی گئی۔ وہ دل گرفتی سے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر نیچے اترا۔

مما نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر چلی گئیں۔ وہ بھی اندر لاؤنج میں ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اس پورے گھر میں کون تھا؟ ان دونوں کے علاوہ۔۔۔ بس ایک چچا ظہور اور اس کی فیملی جو انیکسی میں قیام پذیر تھے۔ وہ بھی اس وقت اپنے گھر سونے چلے جاتے۔ اس کا اپنے کمرے میں جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ جبکہ مما اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ اسے کوئی چاہیے تھا؟ کون؟ جس سے وہ اپنے دل کی بات کرسکے یا جس کے ساتھ اپنی تنہائی کو بانٹ سکے۔۔۔ پر اس کے دوست بھی تو تھے بے تحاشا۔۔۔ مگر کیسے دوست؟ جو ساتھ تو تھے۔ مگر ان کی موجودگی وقتی طور پر تنہائی بانٹ دیتی۔۔۔ پھر بھی ان کے نہ ہونے اور ہونے کا احساس اس کے لیے تقریباً" ایک جیسا تھا۔ کوئی ایک مخلص۔۔۔؟

کوئی ایک ایسا جس سے دل کی کیفیت بیان کی جاسکے۔

ہزاروں کے ہجوم میں بھی ایک تنہا بے چارا دل

مکمل ناول

تنہائی کا مقدر اور انجام دونوں "بھیانک۔"

وہ صوفے پر آڑا ترچھا لیٹ گیا۔ ریموٹ دائیں ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ چینل سرچ کیے گئے۔ ریموٹ کے بٹن پریس کر کر کے مسلسل چینل گھمائے گئے۔ آج تو کوئی رومانٹک سی انگلش موی بھی دیکھنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ تھرکتی۔۔۔ ناچتی۔۔۔ انڈین ایکٹریسز۔ بے ہنگم ڈانس گھٹیا بول۔۔۔ آج کچھ بھی دل کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ہر چینل میں تقریباً" برائی کی ایسی نہ ایسی قسم ضرور تھی۔ جو وقت کو گزارنے کا سبب بنتی۔ پھر بھی دل بے چین تھا اور روح بے قرار۔۔۔ وہ اپنا موبائل اٹھا لایا۔ ٹچ اسکرین پر انگلیاں پھیر پھیر کر گیمز کھیلنے لگا۔ دل پھر بھی بور تھا۔ انجانے نمبر پریس کیے گئے۔ شاید کوئی لڑکی مل جاتی۔ پچھلے دنوں ذوالفقار شہریار کی بیٹی سے بات چیت چل رہی تھی۔ اسکول جاتے ہوئے اکثر ہی وہ اپنی جالی والی کھڑکی سے نظر آجاتی۔ پیاری سی گلابی ہونٹ والی لڑکی اسے انجلینا جولی یا کیٹ ونسلیٹ لگتی کبھی کبھی اسے لگتا۔۔۔ اس کی ناک کی شیپ تو بالکل پینی لوپ کروز جیسی ہے۔

خود کسی بریڈپٹ اور ٹام کروز سے کم تھا۔ نمبر بھی مل گیا۔ اس کے مل جانے کی داستان الگ تھی۔

☼ ☼ ☼

"کون کون جا رہا ہے ٹرپ پر؟" عمائمہ نے اس کی بار بار کی تقریر سے اکتا کر پوچھ ہی لیا۔ چاکلیٹ براؤن کلر کے پردے ہٹا کر وہ باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ بہار ہمیشہ سردیوں کے بعد آتی تھی۔ مگر گرے ہوئے پتوں کو دیکھ کر خزاں کا گماں ہو رہا تھا۔ عمائمہ نے پردوں کو برابر کیا۔ سرد ہوائیں کپکپی طاری کر رہی تھیں۔

"تم سبرینہ کو اٹھاؤ' مجھے مارکیٹ جانا ہے۔" انہوں نے اسے ٹالا تھا۔ جبکہ اس نے لکڑی کے چھوٹے سے بنے ہٹ (جھونپڑی) کو ٹانگ سے ٹھوکر ماری۔ اس کے آگے پڑا چائے کا کپ بھی چھلکا تھا۔ برابر میں پڑی تپائی کے سنہری ڈیزائن میں چائے کی دھاریں جا کر جذب ہو گئیں۔ عمائمہ کو اس کی حرکت پر بے انتہا غصہ آیا تھا۔

"نور سحر!" وہ چلائیں۔

"چلائیے مت۔۔۔" وہ اسی ٹون میں بولی۔

"میرے سامنے اپنی آواز دھیمی رکھا کرو میں نے اتنی دفعہ کہا ہے۔ تم بات ہی نہیں سنتیں۔ ماں ہوں تمہاری۔۔۔!" انہوں نے تصدیق کی تھی یا کروائی تھی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھیں۔

"آپ ماں ہیں تو کیا آپ کو میرے احساسات کا ذرا برابر بھی خیال ہے؟ کیا ٹرپ پر باقی لڑکیاں نہیں جا رہیں کیا ان کے والدین انہیں گھر بٹھا کر بیٹھ گئے ہیں۔۔۔؟"

"باقی والدین کو میں نہیں جانتی۔۔۔ پر اپنی اولاد کو میں ضرور جانتی ہوں۔ اگر تمہاری ایک بھی حرکت میرے لیے قابل قدر ہوتی تو ضرور تمہیں اجازت دیتی۔۔۔"

"آپ کی انہیں باتوں سے میرا دل کرتا ہے کہ میں یہ گھر ہی چھوڑ دوں۔۔۔ آپ لوگ میرے والدین ہیں۔۔۔؟" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

عمائمہ کی برداشت بس یہاں تک ہی تھی۔ ایک زناٹے دار تھپڑ اسے رسید کیا۔

وہ وہیں حق دق کھڑی رہ گئی۔ جبکہ انہوں نے چائے کے چھلکتے کپ کو اٹھایا اور باہر آگئیں۔ لان کا کالج انتہائی خوب صورت تھا۔ امریکن اسٹائل کچن۔۔۔ جہاں کی ترتیب و سلیقہ گھر والوں کے بہترین ذوق کی عکاسی کرتا تھا۔ کچن کی بے ترتیبی اور کچرے نے ان کا پارہ مزید ہائی کر دیا تھا۔ وہ بے زاری کے ساتھ سارا کوڑا کرکٹ اٹھانے لگیں۔ سیفی نے آج اپنے فارم پر دوستوں کو بلوایا ہوا تھا۔ انہوں نے یا ہر یقیناً" اودھم مچایا ہو گا۔ رات کے لیے مچھلی بھی بنانی تھی۔ ابھی اسے صاف کر کے مسالا بھی لگانا تھا اور فرائی بھی کرنا تھی۔ انہوں نے اپنی قیمتی ریسٹ واچ میں ٹائم دیکھا تو شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ مطلب آصف حیات کے آنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ پھر ان کی پسند کا کھانا

انھیں نہیں ملتا تو ایک الگ ہنگامہ برپا ہوتا۔

وہ صبوحہ کو اٹھانے چل دیں۔

"صبوحہ اٹھو صبوحہ۔۔۔۔ !" وہ اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ آڑی ترچھی لیٹی صبوحہ کے اوپر سے آدھا جھلکتا۔۔۔۔ لٹکتا کمبل "اس لڑکی کو تو پتا نہیں کب سونے کی تمیز آئے گی۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔ ان کے اٹھانے پر وہ کسمسائی تھی۔

"مما! سونے دیں نا ابھی تو سوئی ہوں۔ آج چھٹی ہے۔ آج تو سونے دیں۔۔۔۔"

"چھٹی کا مطلب ہے کہ سارا دن تم سوتی رہو۔۔۔۔ دوپہر میں دو بجے اٹھی ہو۔ پھر کھانا کھا کر سو گئی ہو۔۔۔۔ سارا دن سوئے رہنا ہے؟ میرے ساتھ آکر مچھلی بنواؤ۔ تمہارا باپ آکر نیا ہنگامہ کھڑا کردے گا۔ پھر مصیبت پڑ جاتی ہے۔۔۔۔"

"مما! آپ بھی تو دو بجے ہی اٹھی ہیں۔ سارا کام نینی کر گئی ہے۔ ایک کھانا ہی بنانا ہوتا ہے۔ وہ بھی آپ ہمارے سر چڑھ دوڑتی ہیں۔"

وہ بدتمیزی سے کہتی پھر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ عائمہ نے اسے غصے سے گھورا اور واپس کچن میں آگئیں۔ "اس ساری فیملی کو پتا نہیں کھانے کا کیا خبط سوار ہے۔ ہر فضول ڈش کی فرمائش۔۔۔۔" وہ اب اپنے شوہر، نندوں اور ساس کی شان میں کلمات ادا کرنے لگیں۔ پٹخ پٹخ کر چیزیں رکھیں مچھلی صاف کی گئی اور مسالا لگایا گیا۔ اتنی دیر میں آصف حیات گھر تشریف لے آئے۔ بدنظمی اور بے ترتیبی سے جتنی انھیں چڑ تھی اتنی ہی زیادہ انھیں اپنے گھر آکر دیکھنی پڑتی۔

"پھوہڑ عورت!" وہ کچن میں آکر برسنے لگے۔

"تمہاری یہی بات مجھے بری لگتی ہے، آتے ساتھ شروع ہو جاتے ہو۔ دیکھ نہیں رہے کہ مچھلی بنا رہی ہوں۔" وہ پہلے اکتائی ہوئی تھیں۔ اوپر سے آصف حیات کی بات نے انھیں مزید آگ لگائی تھی۔

"ہاں تو تمہاری اور کوئی ذمہ داری نہیں۔۔۔۔ گھر کو ہر وقت کباڑخانہ بنائے رکھتی ہو۔ کیا نہیں کیا میں نے تمہارے لیے؟ ساری دیواروں کے اکھڑے سیمنٹ کو لکڑی کے کام سے کور کروایا۔۔۔۔ تم نے کہا ماں کا گھر چھوڑ کر مجھے فارم ہاؤس میں گھر لے دو۔۔۔۔ تمہاری ساری خواہشیں پوری کیں۔ امریکن کچن بنوایا۔ بتاؤ تمہارے خاندان میں کسی ایک کا گھر بھی ایسا ہو؟" وہ انتہائی نخوت سے بولے۔

"تمہاری تقریر کی میں عادی ہو چکی ہوں۔۔۔۔ اب کوئی نئی تقریر سیکھ لو۔" وہ اپنے شیگی کٹ بالوں کو پیچھے کر کے فرائی مچھلی کو ڈھانپتے بولیں۔ اس طرح کے جواب سے ان کا ہنگامہ کم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اور بڑھ گیا سیفی کو تیز میوزک اور دوست وہیں چھوڑ کر ہنگامے والی جگہ پر آنا پڑا۔

"کیا مسئلہ ہے؟ کیا شور مچایا ہوا ہے؟ کبھی تو اپنی لڑائی بند کر لیا کریں۔۔۔۔" گھڑی نے شام آٹھ بجے کا اعلان کیا تھا اور وقت نے مسکرا کر بیٹے کو ماں باپ پر برستا دیکھا۔

"تم ہمارے درمیان دخل مت دو۔۔۔۔ اور دفعہ ہو جاؤ۔ تم اور تمہارے بے ہودہ دوستوں نے ایک طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا ہے۔" آصف حیات نے سارا غصہ سیفی پر الٹا۔ اس نے مشتعل ہو کر شیشے کا گلاس اٹھا کر سامنے کی شیلف پر دے مارا اور یہ جا وہ جا۔ گلاس

کرچیوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور پہلی دفعہ ڈٹ کر مقابلہ کرتی عمائمہ نے قدرے تاسف سے اپنے خاوند اور پھر بیٹے کو اور دوبارہ بکھری کرچیوں کو دیکھا۔ خوب صورت کور میں لپٹی تہذیب لحہ بہ لحہ ریزہ ریزہ بن کر کرچیوں کی صورت میں بکھر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"علی حمزہ! میں سوچتی ہوں کہ آج کل شرمانے لجانے والا دور نہیں لڑکیوں کو بولڈ اور کانفیڈنٹ ہونا چاہیے۔"

"ہاں یار! لڑکیاں بولڈ ہی اچھی لگتی ہیں۔ تمہارا بے باک انداز ہی مجھے تمہاری طرف اٹریکٹ کرتا ہے۔۔۔ بس تم کبھی کسی اور پر اعتبار نہ کرنا۔۔۔"

وہ اس کا ناصح بن رہا تھا۔ ہمدردی ہمیشہ لڑکیوں کو اچھی لگتی ہے۔ نور سحر کو بھی لگی تھی۔

"علی حمزہ! میں تو سوچتی ہوں۔ اعتبار ماں باپ اور سگے بہن بھائیوں کو بھی ایک دوسرے پر نہیں کرنا چاہیے۔" وہ لولیول کر رہی تھی جب کہ علی حمزہ بی کام پارٹ ٹو کا اسٹوڈنٹ تھا اور باتیں وہ ایسے کر رہے تھے جیسے ابھی ابھی کسی دانا سے عقل ادھار مانگ کر لائے ہوں۔

"میں کل تمہارے گھر کے سامنے جیسکا البا کی تصویر والی شرٹ پہن کر آؤں گا۔۔۔"

"اور میں نے نیو ٹاپ خریدا ہے۔ تم دیکھنا میں جیسکا البا سے کم نہیں نظر آؤں گی۔" اور علی حمزہ اس کی بات پر کتنی دیر تک ہنستا چلا گیا۔

اس نے بیک روم کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی' مسلسل بارشوں نے دروازے کی درزوں پر زنگ لگا دیا تھا اور یہی زنگ علی حمزہ کے لیے بڑا فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ جب بھی مما کمرے سے باہر آتیں۔ چی چیں۔۔۔ کرتا دروازہ آرام سے کبھی نہ کھلتا۔ وہ موبائل کو اتنی دیر میں آف کر کے اکاؤنٹنگ کی کوئی نہ کوئی بک اٹھا کر بیٹھ جاتا۔

"تم سوئے نہیں۔۔۔" وہ اوندھے منہ صوفے پر لیٹا تھا اور آدھا کمبل زمین کو چھو رہا تھا اور آدھا اس کے لمبے چوڑے وجود کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہوں نے کمبل درست کر کے اس کے اوپر ڈالا۔ وہ کسلمندی سے انگڑائی لینے کی ایکٹنگ کرتا اٹھ بیٹھا۔

"مما! کل ٹیسٹ ہے سوچ رہا تھا کہ رات میں اٹھ کر پڑھ لوں گا۔۔۔ اب ریسٹ کر لوں۔۔۔"

"اچھا' میں دودھ کا گلاس لاتی ہوں تمہارے لیے۔۔۔ تم پی کر سونا اور یہ کتابیں تو درست حالت میں رکھا کرو۔" وہ اس کی کتابوں کا سیٹ بنا کر ترتیب سے ریک میں رکھ کر چلی گئیں۔ جبکہ مما کے جاتے ہی اس نے کشن کے نیچے سے موبائل نکالا اور پھر انگوٹھے کی مدد سے جھٹ پٹ بنا دیکھے ٹیکسٹ ٹائپ کیا۔

"یار! میں کل تمہیں سلیولیس شرٹ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ مجھے بھی پتا چلے کہ میری جیسکا البا کیسی ہے؟"

جبکہ دوسری طرف او کے کا ریپلائے آیا تھا۔ وہ بالوں میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کنگھی بنا کر پھیرتے ہوئے فریش ہو کر بیٹھ گیا۔ رمیض کی کال آرہی تھی۔

"یار! کتنی تیاری ہو گئی ہے؟ مجھ سے تو صرف دو چیپٹر بمشکل یاد ہوئے ہیں۔" ان سب میں سب سے پہلے رمیض ہی بوکھلاتا تھا۔

"chill کر یار! تم تو بالکل ہی لڑکیوں کی طرح ڈرفر ہی ہو جاتے ہو۔ وہ تیری سلینا جینٹلی ہے نا۔۔۔ پرچا کو۔۔۔ ذرا منتیں ونتیں کرنا۔۔۔ ایک آدھا ڈانیلاگ مارنا کروا دے گی تجھے کچھ سوال۔۔۔ پاس تو ہو ہی جائے گا۔۔۔"

وہ کترینا کیف کا نیو آئٹم نمبر لگا کر بیٹھ گیا اور پاؤں تھر تھرانے لگا۔

"رہنے دو۔۔۔ وہ لمبے منہ والی سلینا۔۔۔ اوہوں۔۔۔ میں کیوں جھوٹے ڈائیلاگ ماروں؟"

"یار امار لے دو چار جھوٹ۔۔۔ ورنہ پھر سپلی برداشت کر۔" مما کے ڈر سے اس نے والیوم بند کیا ہوا تھا۔ بس کترینا کی ادائیں۔۔۔ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کی جا رہی تھیں۔

"اچھا، کچھ سوچتا ہوں۔" رمیض نے بد مزا ہو کر موبائل آف کر لیا۔ جبکہ وہ مما کی آمد پر ٹی وی آف کر کے بک کھولے یوں بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی انتہائی اہم پوائنٹ پر مغز ماری کر رہا ہو۔ یہ تو شکر ہے کہ مما کی فیلڈ میڈیکل کی تھی۔ ورنہ میٹرک تک جس طرح وہ اس کا ہر سبق سنتی آئی تھیں۔ اب بھی شروع ہو جاتیں۔ اس نے جان بوجھ کر ایف ایس سی میں پری انجینئرنگ لی تھی۔ کم از کم مما سے تو جان چھوٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ افنان نے اپنے ان پڑھ شوہر سے اس زعم میں طلاق لی تھی کہ وہ اور ان کا شوہر ذہنی ہم آہنگی نہیں رکھتے اور وہ ایسے شخص کے ساتھ بالکل نہیں چل سکتیں۔ حالانکہ ابراہیم وہ شخص تھا۔ جس نے فاطمہ افنان کے ساتھ جب شادی کی وہ محض دسویں پاس تھی۔ ابا کے دوست کی بیٹی۔ ابا کو بھا گئی۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے دوست سے ہاتھ مانگ لیا اور دوست وہ بھی لنگوٹیا یار۔۔۔ اس کے لیے دوست کا آنا ہی بڑی خوش آئند بات تھی۔ انہوں نے بلا سوچے فاطمہ افنان کو ابراہیم زیدی کے ہاتھ میں دے دیا۔ فاطمہ افنان اتنا روئیں جیسے ان کی ڈولی نہیں بلکہ اللہ معاف کرے۔ جنازہ اٹھایا جا رہا ہو۔

گھر اس بے جوڑ شادی کی بنا پر جہنم نہ بنتا تو اس میں ابراہیم زیدی کے حلیم طبع والی عادت آڑے آ گئی۔ ان کی نرم طبیعت نے فاطمہ افنان جیسی شیرنی کو محبت کی چاشنی سے رام کرنا شروع کر دیا۔ فاطمہ نے مزید پڑھنے کی ضد کی انہوں نے اسے مزید پڑھایا۔ یہاں تک کہ وہ ایم ایس سی زولوجی کر گئیں اور ایک اچھے ریپوٹڈ اسکول میں جاب کرنے لگیں۔ مگر علی حمزہ کی پیدائش کے بعد سے وہ مسلسل ایک ہی نقطہ پر سوچے گئیں۔ کہ بیٹے کا مستقبل۔۔۔؟ وہ اتنے جاہلانہ ماحول میں کیسے اپنے بچے کو اچھی تربیت دے سکیں گی۔ انہوں نے ابراہیم سے الگ گھر کا مطالبہ شروع کر دیا اور ابراہیم

کے لیے ساری عمر فاطمہ کی بات مانتے مانتے اس موڑ پر یہ بات ماننا مشکل ہو گیا۔ وہ اپنے بوڑھے والدین اور بیوہ بہن کو کسی صورت نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ فاطمہ افنان نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ ابراہیم زیدی نے بہت سمجھایا مگر وہ اپنے ارادے سے ایک انچ بھی نہ پیچھے ہٹیں۔ علی حمزہ کے لیے انہوں نے کیس کیا اور اچھی قسمت تھی۔ جو وہ یہاں بھی جیت گئیں۔

مگر ابراہیم زیدی کے لیے عورت نام سے نفرت اور بے وفائی کا ایک نیا روپ آشکار کر گئیں۔ وہ دلی طور پر ہی دستبردار ہو گئے تھے۔ فاطمہ افنان کے فیصلے کو خاندان بھر میں لعن طعن کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر وقت ' ضرورت اور خواہش میں انسان سب کچھ اپنے لیے جائز سمجھ لیتا ہے۔ خواہش کی پٹی جب بینائی کو چھنتی ہے تو ہلکی سی درز بھی روشنی کی کوئی لہر نہیں بھیجتی۔ انسان بس "میں" "بس "میری" یا "میرا" کے اہرام میں چکراتا پھرتا ہے۔ وہ ملکیت کے زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے اور زعم کسی بھی چیز کا ہو وہ اچھا نہیں ہوتا۔ میں کی کہانی میں 'ہر ہی' ختم ہو جاتی ہے۔

وہ علی حمزہ کو پنڈی لے آئی تھیں۔ یہاں انہوں نے اپنا ایک اسٹیٹس قائم کر لیا تھا۔ دو سال میں لیا چلے گئے ور ماں لاکھ بیٹی کی حرکت پر ناراض ہوتیں پر تھی تو بیٹی ۔۔۔ وہ ان کے پاس پنڈی آگئیں۔ یہاں آکر وہ بمشکل چار سال ہی رہیں۔ مگر علی حمزہ کے آٹھویں کلاس میں جاتے ہی وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ فاطمہ افنان نے بیٹے کو ہر ماڈرن مینوز سکھانے اور ہائی سوسائٹی میں موو کروانے کے لیے سر توڑ کوشش اور محنت شروع کر دی۔ انہوں نے گھر میں ایک عیسائی عورت کو بطور آیا رکھ لیا۔ اس کی انگلش بڑی زبردست تھی۔

ان کی دوست صبیحہ نے اس پر ذرا تشویش کا اظہار کیا تھا۔

"فاطمہ! وہ عورت مسلمانوں والی تو کوئی عادت اس میں نہیں ڈالے گی۔"

"نہیں میں نے گھر میں قاری صاحب بھی لگوائے ہیں۔ وہ علی حمزہ کو بنیادی عقائد اسلام کے سکھا دیں گے اور ویسے بھی تم دیکھو۔۔۔ جن ہائی اسٹینڈرڈ اسکولز میں ہم لوگ پڑھا رہے ہیں۔ وہاں اسپوکن کا کتنا مارجن ہے۔ جس کی اسپوکن اور accent (لب و لہجہ) اچھا ہوتا ہے۔ وہی بچہ آگے جا کر کامیاب ہوتا ہے۔ کروبی کی انگلش بڑی زبردست ہے۔ کافی عرصہ تک روس 'امریکہ۔ اور انگلینڈ وغیرہ میں رہ کر آئی ہے۔ پہلے شیف تھی۔ پھر پاکستان کے کسی آدمی سے شادی کر کے ادھر ہی آگئی۔ اب آیا گیری کرتی ہے۔" وہ صبیحہ کی مرکزی بات کا مفہوم سمجھے بغیر ہی اپنی تفصیل لے کر بیٹھ گئیں۔ وہ انتہائی غیر دلچسپی سے اس کی بات سنتی رہی۔

علی حمزہ کی کروبی سے بے تحاشا دوستی ہو گئی۔ فاطمہ افنان پہلے ماہ ہی کروبی کی عادتوں سے متاثر ہو گئیں۔ علی حمزہ کو سپیکنگ کے۔۔۔ کھانے پینے کے اٹھنے بیٹھنے کے۔۔۔ ہر طرح کے مینوز آرہے تھے۔ علی حمزہ بہت اچھی انگلش بولنا سیکھ گیا تھا اسکول میں اس کی ٹیچر نے بھی اس کی کافی تعریف کی۔ فاطمہ افنان کا سر فخر سے بلند ہوا تھا۔ علی حمزہ کی مثال قائم ہو گئی تھی۔ جب بھی کسی بچے کو سمجھانا ہوتا۔ علی حمزہ کی مثال دی جاتی۔

✡ ✡ ✡

ان کا ٹرپ جا رہا تھا۔ عائمہ کو نور سحر کا مطالبہ ماننا ہی پڑا۔ اس کی بدتمیزیاں عروج پر تھیں۔ پھر پچھلے دو دن کی بھوک ہڑتال نے انہیں اس کی بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ ساری لڑکیاں فل فل کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ کوئی گلابی میکسیوں میں ملبوس خود کو کسی ملک کی پرنس سے کم نہیں سمجھ رہی تھی۔ کوئی شیفون۔۔۔ جارجٹ کے زرد بلیک۔۔۔ بلو کلیوں والی فراک پہنی ہوئی تھی۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ ہلکی ہلکی بارش نے ماحول مزید خوشگوار بنا دیا۔ سبزے سے بھرے اس پارک میں دوسری طرف جھولوں کا انتظام تھا۔ پتوں میں لہر کی صورت ٹپکتے بارش کے قطرے نے پنک سلیولیس شرٹ کے ساتھ بلیک ٹائم پینٹ

پہنے کھڑی لڑکی کی گال کو یوں بھگویا تھا۔ جیسے آنکھ سے آنسو لڑھکا ہو۔ سرما کی بارشیں تو یونہی تھر تھرا دیتی ہیں۔ مگر یہاں موسم کی نزاکتوں اور منجمد کرتی رگوں میں اترتی ٹھنڈ سے بے نیاز۔۔۔ بے فکری۔۔۔ خوشی اور مستی میں ڈوبی لڑکیاں تمام رتوں کی تمازتیں بھلا بیٹھی تھیں۔ ناک سے بہتا پانی۔۔۔۔ قہقہوں اور بلند و بالا آوازوں میں تمام راک اسٹارز کی روحوں کو یاد فرمایا جا رہا تھا۔

وہ دور کھڑا اپنی ہیروئن کو دیکھ رہا تھا۔ گلاسز کو پینٹ کی سائیڈ پاکٹ میں لٹکا کر شرٹ کے کالر کھڑے کر لیے گئے۔ یہ اس کا اپنا اسٹائل تھا۔ بھوتنی کی شکل سے مشابہہ گھڑی الٹے ہاتھ میں باندھی گئی تھی۔ جس کا اسٹرپ چمڑے کی بیلٹ جیسا تھا۔ بالوں کو بریڈ پٹ کی نیو مووی کے ہیرو کی طرح سیٹ کیا گیا۔ اس ہیرو کو تو شاید آسکر ایوارڈ نہ ملتا۔ مگر اس ہیرو کو اتنے شاندار اسٹائل مارنے پر ضرور مل جاتا۔ ایک سم اس نے کان کی لو اور پنہ کے درمیان میں پھنسائی ہوئی تھی۔ ایک سم اس نے اپنی ٹو پاکسز والی انگوٹھی کے ایک باکس میں سیٹ کر رکھی تھی۔ وہ سمیں آل ریڈی اس کے سیل میں تھیں۔ جبکہ وہ جو خود کو جیسکا البا سمجھ رہی تھی۔ اب قدرے کنفیوژ ہو گئی۔ منچلی سہیلیوں کے گروپ نے دور سے اشارہ کر کے اسے ہمت دلائی۔

"دیکھو! میں تم سے ملنے آہی گیا۔ ضروری نہیں کہ ایسا صرف فلموں میں ہوتا ہے۔ حقیقت میں ہم ذرا سی ہمت کریں تو محبت کو پانا آسان ہے۔" وہ اس کے قریب آکر ڈائیلاگ بولا۔

"پر پچھلی دفعہ سبرینہ آپی نے تمہارا دیا گفٹ دیکھ لیا تھا۔ انہیں تھوڑا تھوڑا مجھ پر شک ہو گیا تھا۔۔۔" وہ لائنر شدہ آنکھوں اور پلکوں کو پٹپٹا کر بولی۔۔۔

"یار! یہ کیا اسٹوپڈ لڑکیوں کی طرح شروع ہو جاتی ہو۔ سارے رومانس کا بیڑہ غرق کر دیا۔ ہم آج کے دور کے بچے ہیں۔ تم نے سنا نہیں پیار کیا تو ڈرنا کیا۔۔۔ ویسے بھی یہ ہماری زندگی ہے۔ تم نے وہ اسٹوری نہیں سنی جس میں ایا کا سارے قبیلے کو خاطر میں نہیں لاتا اور

ماں کو باپ کو آخر میں احساس ہو جاتا ہے کہ بچوں کی مرضی کے بغیر۔۔۔ یا ان کی محبت کو توڑ کر اٹھایا جانے والا قدم ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ وہ بیلا کی پہاڑیوں پر موجود سارے کانٹے آنکھ کی پتلی میں گاڑ دیتا ہے۔" وہ اسے دیومالائی داستانوں میں سے ایک کہانی سناتے ہوئے بولا۔

"ہاں حمزہ! بس تمہارے آنے سے یوں محسوس ہو رہا کہ جیسے اصل لائف یہی ہو زندگی کا مزا یہی ہو۔ آج تو میری ساری تیاری زیرو ہوئی تھی۔ تم نے دیکھا۔ تو احساس ہوا کہ اچھا کیا جو دل لگا کر صبح اپنی تیاری کی۔۔۔" وہ اسے بتانے لگی۔

علی حمزہ نے ایک ادا کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ جما کر پیچھے بینچ پر بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اسے بھی پاس بٹھا لیا۔ اچھے خاصے بے حیائی کے اس مظاہرے کو سر کلیم اللہ نے دیکھ لیا۔ پہلے نور سحر کی بے عزتی وہاں ان کے سر پر جا کر کی گئی۔ دوستوں کا گروپ رفوچکر ہو چکا تھا۔ علی حمزہ سب چھوڑ چھاڑ کر بائیک کی طرف بھاگا۔ جبکہ نور سحر وہیں کھڑی سر کا لیکچر سنتی رہ گئی۔ انہوں نے اسے سمجھا بجھا کر خود باقی اسٹوڈنٹس کو اکٹھا کرنے کے لیے مس ماریہ اور لبنیٰ کو بلا لیا۔ جبکہ وہ وہیں کھڑی سوچتی رہ گئی کہ "اس بوڑھے کھڑوس نے خود تو شادی نہیں کی اور ہمارا سر کھانے کے لیے ایسے ہی نازل ہو جاتا ہے۔۔۔"

بس پھر بات سکوں کی صورت میں بجی اور ریت کی مانند بکھر گئی۔ طول و عرض میں نور سحر کی نئی اسٹوری چٹخارے دار بن گئی تھی اور بریک میں انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں کے نیچے خالی پلاٹ سے ذرا پرے وہ گروپ میں بیٹھی تھی۔ جب اقصیٰ اور عمران نے اس کا مذاق بنایا۔

"ہاں جی! مس جیسکا۔۔۔ وہ ٹام کروز کون تھا۔" وہ چہرے پر بڑی دلکشی اور فخریہ مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

"میرا بوائے فرینڈ۔۔۔ میرا لوور۔" گھنے درخت پر بیٹھی بلبل نے بدلتے دور کی یہ رت بھی دیکھی تھی۔ وہ

یورپ کے ساحلوں سے ہجرت کر کے آنے والی مینا کو یہ خبر سنانے کے لیے بے چینی سے پر پھڑپھڑانے لگی۔ آپس میں سرگوشیاں کرتے پتوں کے درمیان ہلچل ہوئی تھی۔ بلبل کے پھڑپھڑانے پر دو پتے پچھلی شاخ سے جدا ہو کر اس دور کی اس "مسلمان لڑکی۔" کے قدموں میں آکر گرے تھے۔ ہواؤں نے انہیں مٹی کے ذرات کے ہمراہ اس جگہ سے دور کر دیا۔ وہ روز قیامت اس بات کی گواہی دینے سے بچ گئے تھے کہ انہوں نے بھی کچھ سنا تھا۔

☼ ☼ ☼

برٹنی اسپیر کی نیو البم ریلیز ہوئی تھی۔ سبینہ اور مما شاپنگ کرنے مارکیٹ گئی ہوئی تھیں۔ ایسے میں وہ صادق چوکیدار کو الرٹ کر جاتیں۔ پاپا دوسرے شہر تھے۔ سیفی دوستوں کے ہمراہ ہائیکنگ پر۔۔۔ وہ بور ہو رہی تھی۔ کچن میں آکر پیپسی کا کین منہ کو لگا لیا۔ پھر صادق چوکیدار کو تیز مرچوں والا پزا اور چپس کے پیکٹس لانے کا آرڈر دے کر وہ کمرے میں آگئی۔ تیز میوزک سے تنہائی دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر پھر بوریت۔۔۔ دن گزارا جائے تو کیسے؟ وہ میوزک آف کر کے باہر آکر ٹی وی لاؤنج میں ریموٹ پکڑے چینل پر چینل گھمانے لگی۔ اسے ڈرامے بہت برے لگتے تھے۔ ایک قسط کے بعد دوسری کا انتظار کرو۔۔۔ کہیں ہیروئین رو رہی ہے۔۔۔ کہیں ہیرو۔۔۔ کہیں ماں نے کچھ کہہ دیا کہیں ساس نے۔۔۔ اسے ٹیپکل کلچر ہمیشہ قابل نفرت لگتا۔ باقی میوزک چینل۔۔۔ ایک جگہ پر وہ تین انڈین گانے سنے۔ ان کی وورڈنگ پر خود ہی دیر تک ہنستی رہی۔ صحیح ہے۔ لڑکے ہوتے ہی فضول ہیں کسی گانے کے الفاظ یاد کر کے وہ دہرانے لگی۔

مغرب کی اذانیں ہونے لگی تھیں۔ ان کا فارم ہاؤس کوئی آبادی سے ہٹ کر نہیں تھا۔ اذان کی آواز با آسانی سنی جا سکتی تھی۔ اس نے والیم آف کر دیا مگر ٹی وی آن ہی رہنے دیا۔ ایک کے بعد دوسری مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی تھی۔ اس کا موڈ آف ہونے لگا۔ یورپین ممالک کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ جہاں مخصوص اوقات میں کمپیوٹرائز نیٹ ورک کے ذریعے صرف ایک دفعہ اذان ہوتی ہے۔ بس پوری سنی اور پھر اپنے کاموں میں مگن۔۔۔ یہاں مولوی حضرات یکے بعد دیگرے شروع ہی ہو جاتے ہیں۔ نہ ایک کی سمجھ آتی نہ دوسرے کی۔۔۔ دماغ نے اتنی مضبوط دلیل دی کہ اس نے ایک بھی اذان پر توجہ مرکوز نہ کی تھی۔ جبکہ وہ ایک ہی وقت میں برٹنی شکیرا۔۔۔ اور سینتی چوہان کو سننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

باہر ڈور بیل بجی تو وہ دروازہ کھولنے گئی۔ ممی اور سبینہ ڈھیروں شاپنگ کا سامان اٹھائے اندر چلی آئیں۔ سبینہ نے اپنے اور اس کے لیے ٹائٹس لی تھیں لانگ شرٹ کے نیچے پہننے کے لیے۔۔۔ جبکہ عائمہ نے خود ٹیلر سے کہہ کر ساڑھی کا بلاؤز شارٹ کروایا تھا۔ ماڈرن لک کے لیے یہ کتنا ضروری تھا اور بھانجے کی شادی کے لیے اسلام آباد بھی جانا تھا۔

ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تینوں خواتین اگلے تین گھنٹے۔۔۔ مسلسل نیو فیشن اسٹائل۔۔۔ نیو سیزن ان اور آؤٹ چیزوں پر تبصرہ کرتی رہیں اور ٹی وی لاؤنج میں لگی کلاک نے سوئی آٹھ کے ہندسے پر پہنچادی۔۔۔

مغرب کی اذان ہو گئی عشاء کی اذان اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ مغرب نے عشاء کو بتایا تھا کہ جو بے رخی میرے ساتھ برتی گئی۔۔۔ شاید تمہارے ساتھ بھی برتی جائے۔ عشاء نے مسکرا کر مغرب کو دیکھا تھا۔۔۔ جیسے پوچھ رہی ہو۔۔۔ بتاؤ بھلا خسارے کا سودا کس نے کیا۔۔۔

☼ ☼ ☼

علی حمزہ۔۔۔ اسکول میں انگلش اسپیچ میں ہمیشہ اول آتا رہا۔ اب فاطمہ افنان نے اسے انٹرنیشنل لیول پر اسٹوڈنٹس کے درمیان ہونے والے انگلش ڈیبیٹس کے مقابلوں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ جب وہ بی کام تک پہنچا تو اسٹوڈنٹس ونگ میں ایک بیسٹ ڈیبیٹر کے طور پر ایک پہچان بنا چکا تھا۔ کچھ نجی چینل میں بھی اپنی

یونیورسٹی کی نمائندگی کر چکا تھا۔

علی حمزہ کے پڑھنے کا طریقہ۔۔۔ اس کی ڈریسنگ۔۔۔ اس کا اسٹائل۔۔۔ اس کی کامیابیاں۔۔۔ اس کی نیبرز (ہمسائے) میں موجود آنٹیوں اور مما کی سہیلیوں کے درمیان ہمیشہ موضوع گفتگو رہتیں۔۔

"یار! بڑا فٹ ہے ویسے وہ۔۔۔" صنم نے اپنے چھوٹے سے شیشے کو بیگ سے نکال کر لپ گلوز کی مزید دو تہیں اپنے ہونٹوں پر جمائیں۔

"ڈیشنگ پرسنالٹی۔۔۔" رباب نے بھی تبصرہ کیا۔

"ایسے لڑکے وقت گزاری کرتے ہیں۔۔۔" تہمینہ نے حسد سے کہا۔

"تو کیا ہماری نور سحر کسی سے کم ہے۔۔۔؟" صنم نے بیسٹ فرینڈ ہونے کا ثبوت دیا۔

"یار! تم اسے ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ کہ تم اس سے محبت نہیں کرتیں۔۔۔ بلکہ عشق کرتی ہو۔۔۔ عشق۔۔۔ اور تم کوئی وقت گزاری نہیں کر رہیں۔" فضہ نے مشورہ دیا۔

"ہاں' میں اسے بتا چکی ہوں کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ اور وہ بھی میرے ساتھ انوالو ہے۔۔۔ بس ذرا اس کا کریئر بن لے۔۔۔ پھر ہم پیرنٹس سے بات کریں گے۔" وہ ایک ادا سے مسکرا کر بولی۔ جبکہ تہمینہ کے منہ سے بے ساختہ ٹھنڈی آہ نکلی اللہ حسن دے تو نزاکت آہی جاتی ہے۔

بھی انداز حسن پیارے ہیں
ہم مگر سادگی کے مارے ہیں

وہ بلاوجہ گنگنانے لگی۔ جبکہ صنم اور اس نے کینہ توز نظروں سے اسے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

آج کل رات کو اسے ڈراؤنے ڈراؤنے خواب آنے لگے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ جاتا۔ اس کا حلق سوکھنے لگتا اور دل غیر معمولی رفتار سے دھڑکتا تھا۔ بن موسم پسینہ پیشانی پر نمودار ہو جاتا۔ اس نے مما سے بات کی تھی اور مما کتنی ہی دیر ہنستی رہیں۔

"شرم کرو۔۔۔ حمزہ — ماشاءاللہ لمبے چوڑے وجود کے مالک ہو۔ تمہیں تو خود دوسروں کو ڈرانا چاہیے اور۔۔۔ ڈر تم جاتے ہو۔۔۔"

"مما! پلیز ٹیک اٹ سیریس (اسے سنجیدگی سے لیں) مجھے واقعی میں رات میں ڈر لگنے لگا ہے۔"

"بس پھر تم لیٹ نائٹ جاگتے ہو۔۔۔ یا ہارر موویز دیکھتے ہو۔۔۔" فاطمہ افنان نے اپنے ناخنوں کی اوپر والی سطح پر نظریں جماتے کچھ دیکھا۔ وہ چیک کر رہی تھیں کہ ناخن فائل ٹھیک ہوئے ہیں' کنارے برابر ہیں۔

"مما! ہارر موویز تو نہیں دیکھتا۔۔۔" وہ چیئر کے ساتھ ٹیک لگا کر ریلیکس ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں' میں نے تمہارا سی ڈی ریک چیک کیا تھا۔ جو موویز تم دیکھتے ہو۔۔۔ وہ ہارر ہی ہیں۔۔۔" مما کی بات پر وہ بری طرح شرمندہ ہوا۔

"میں جانتی ہوں۔۔۔ بیٹا جی! کہ نوجوانی کا جوش ہے۔۔۔ نیا نیا بھوت ہے۔۔۔ ان چیزوں میں دلکشی ہوتی ہے۔ پر اسٹڈی پر کوئی فرق نہ پڑے۔"

انہوں نے بظاہر مسکراتے ہوئے اسے وارن کیا تھا۔ مگر اندر ہی اندر وہ اس کی حرکتوں سے نالاں تھیں۔ انہیں اپنی پرفیکٹ تربیت پر ہمیشہ ہی مان رہتا۔

"مجھے پتا ہے آج کل ابھی بچہ نائنتھ اسٹینڈرڈ میں ہی ہوتا ہے۔ تو اس کی گرل فرینڈ بن جاتی ہے۔ کم ہی کوئی ہوں گے۔ جو لڑکیوں سے دوستی نہ کریں۔ ورنہ تقریباً" ہر ایک کی ہی گرل فرینڈ ہوتی ہے۔ چاہے وہ شہباز کی طرح کے اسٹوڈنٹس ہوں یا تمہارے جیسے میسنے۔۔۔ بظاہر سعادت مند مگر اندر ہی اندر اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث۔۔۔" وہ اس کی کلاس کے سب سے بگڑے اسٹوڈنٹ شہباز کا اس کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے بولیں۔ گو کہ تم اسکول میں علی حمزہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی ان کا اسٹوڈنٹ رہ چکا تھا۔

"مما! آپ تو یوں کہہ رہی ہیں کہ پتا نہیں میں کون سی سرگرمیوں میں ملوث ہوں۔۔۔" وہ تھوڑا ناراض ہوا۔

"میں بس یہ کہہ رہی ہوں کہ تم اپنی گرل فرینڈ کو اپنی گرل فرینڈ ہی رکھنا۔۔۔ اس سے زیادہ نہیں۔" وہ بحث سمیٹتے ہوئے اپنا آرڈر جاری کرچکی تھیں۔

مما نے انکل حسن سے بات کی تھی۔ وہ ان کے ہمسائے میں ہی تھے اور کلینیکل سائیکالوجی میں ماسٹرز کرچکے تھے۔ مما کے استفسار پر اور پریشانی پر۔۔۔ انہوں نے علی حمزہ کو گھر ہی بلا لیا تھا۔ اس کے ڈرنے کے بارے میں انہوں نے اس کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔

"بیٹا! پہلے آپ آج سے سارے جنک فوڈز کو خیرباد کہہ دیں۔ خاص طور پر تیز مرچ مسالوں والے۔۔۔ وہ معدے میں تیزابیت کرکے بے چینی کا مرض بھی لگاتے ہیں۔ نیند ٹھیک طرح سے آنکھوں میں نہ اترے تو دماغ دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ جس سے بعض اوقات ڈر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔۔۔ کبھی کبھی بلاوجہ حلق خشک ہوتا رہتا ہے۔ دماغ پر سوچوں کی یلغار اور پریشان کن خیالات کا غلبہ اترنے لگتا ہے۔ نظام انہضام ٹھیک ہو تو پورا جسم سکون کی حالت میں آجاتا ہے۔ دوسرا رات کی نماز پڑھ کر سویا کرو۔ اکثر گناہوں کے بوجھ سے بھی ضمیر بے چین رہتا ہے۔"

وہ نجانے اور کیا کچھ سمجھاتے رہے۔ علی حمزہ کو گناہوں کے بوجھ کی ہی نہیں سمجھ آرہی تھی۔ اس کی روٹین لائف اتنی بہترین اور سیٹ تھی۔ صبح کو وہ جاگنگ کرتا تو رات کو لازمی واک کرکے سوتا۔ مما کا ڈیلی پلان کیا گیا شیڈول وہ فالو کرتا۔ مگر پھر بھی انکل حسن۔۔۔ وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

ماموں نے سب کو ایک ہفتہ پہلے ہی آنے کا الٹی میٹم دے دیا تھا۔ نور سحر کی فراک کے ہم رنگ۔۔۔ چنٹ اسٹائل کا دوپٹا نہیں مل پا رہا تھا۔ وہ مارکیٹ کی ہر مشہور دکان پر پھر آئی تھی۔ سبینہ نے اسے روڈ کراس کرکے پچھلی دکانوں پر بیٹھے پٹھانوں کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔

"اکثر ایسی چیزیں ان کے پاس آسانی سے دستیاب ہوجاتی ہیں۔"

وہ سبینہ کی ہدایت پر سائرن کی آوازوں پر دھیان دیتی دونوں اطراف سے گاڑیوں کے بپھرتے سیلاب میں ٹھہراؤ کا انتظار کرنے لگی۔ مختلف دکانوں کے سامنے مختلف بڑے بڑے بورڈ لگے تھے۔ آج کل ڈرامے میں آنے والے اس کے پسندیدہ ایکٹر کا بورڈ ایک مشہور برانڈ کے ساتھ آویزاں تھا۔

اس نے سلکی بالوں کی لٹوں کو بڑی نزاکت سے کندھوں سے دور پھینکا اور بورڈ پر مسکرا کر نظر ڈالتے ہوئے روڈ کراس کرنے لگی۔ جب اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کس رخ پر کھڑی تھی۔۔۔ تبھی ایک یلو کیب نے اس کی ٹانگوں کو ہٹ کیا اور دو بھاری بھرکم ٹائر اس کی ایک ٹانگ کی ہڈی کو کرچ کی آواز سے چور کرکے گزر گئے۔ جبکہ گرتے ہوئے دوسری ٹانگ دوہری ہو گئی تھی۔ اس نے غم۔۔۔ تکلیف۔۔۔ دکھ کی شدت سے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ سڑک پر بہتے خون کو دیکھا اور پورے قد سے کھڑی طرح دار خوب صورت۔۔۔ دراز قد لڑکی کے منٹوں میں ٹانگ کے پرخچے اڑتے دیکھا۔ بجلی کی موٹی تاروں پر بیٹھے کبوتروں نے بے چینی سے اپنے پر پھڑپھڑائے۔۔۔ گاڑیوں کے سیل رواں میں سکوت طاری ہوگیا۔ لوگوں کا چیخوں کا شور خون کی بہتی دھاروں میں جذب ہو رہا تھا۔

قیامت اسے کہتے ہیں۔ جب کائنات لپیٹ دی جائے گی۔ جب دنیا کا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔

بہت چھوٹے ہوتے اس نے یہ سوال اپنے قاری صاحب سے کیا تھا اور انہوں نے بڑے تحمل سے اسے سمجھایا تھا کہ قیامت کسے کہتے ہیں؟ آج اس نے اپنی آنکھوں سے کائنات لپٹی ہوئی دیکھی۔ آنکھیں اور دماغ وہی کچھ محسوس کرتے ہیں، جو دل کی دنیا انہیں محسوس کرواتی ہے۔ یہ منحصر کرتا ہے۔۔۔ آنکھیں دل کی زیادہ مانتی ہیں یا دماغ کی۔۔۔

آصف حیات نے پیسہ پانی کی طرح بہا دیا۔ مرتی ہوئی بیٹی کو بچانے کے لیے باپ کو پیسے کی نہیں اس

خون۔۔۔ روح اور مرہم کی زیادہ ضرورت تھی۔ جس کی مدد سے وہ خاک کے اس پتلے کو دوبارہ سے ویسا ہی بھاگتا دوڑتا۔۔۔ زندگی سے بھرپور انسان بنا ڈالے۔ مگر سوچ کبھی حاصل بنتی ہے؟ یہ حاصل اور لاحاصل کے درمیان پنڈولم کی طرح گھومتی رہ جاتی ہے اور تھک کر خود ہی ایک پوزیشن پر آجاتی ہے۔

عمائمہ کے لیے سوائے چیخیں مارنے اور رونے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ سیفی اور سبینہ بھی اداس تھے۔ سرما کی ٹھنڈک نے سارے درختوں پر اداسی کی برف اوڑھا دی تھی۔ سب سر نیہوڑائے دھوپ کی تمازت کے لیے باادب کھڑے تھے۔ ہولے ہولے رشتے داروں کا تانتا لگ گیا۔

"جوان بیٹی ایک ٹانگ سے محروم۔۔۔"

"ہائے بے چاری نور سحر معذور ہو گئی۔"

"اوہ عمائمہ بڑا افسوس ہوا نور سحر ایک ٹانگ سے محروم ہو گئی۔۔۔ جوان اولاد ہائے شادی کیسے کرو گی؟"

"بس عمائمہ صبر کرو۔۔۔ اور اب اپنے ہی جگرے سے اسے لگا کر عمر بتاؤ۔"

کتنے منہ تھے اور کتنی ہزار باتیں۔۔۔ باتیں تو وہ نشتر ہوتی ہیں۔ جن سے چبھنے والی سوئیوں کو سو سال کے بعد بھی کوئی شہزادہ آکر نہیں نکال سکتا۔ یا شہزادہ تھک جائے گا۔ یا پھر سوئیوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ حوصلہ دینا تو صرف اس باکمال ذات کو آتا ہے۔ جو وہاں سے دوبارہ تھامنے آجاتا ہے۔ جہاں سے انسان نے اسے چھوڑنے کا قصد کر رکھا ہوتا ہے۔ اللہ کو چھوڑنے سے اللہ کا کیا جاتا ہے؟ خسارہ تو انسان کے پاس ہی آتا ہے۔ وہ خساروں میں عمر بتاتے بتاتے۔۔۔ گھپ اندھیروں اور منوں مٹی میں چلا جاتا ہے اور اس جیسے وہ کتنے ہی روز ہی بنا ڈالتا ہے۔

عمائمہ نے کتنی ہی دعائیں کر ڈالیں۔ پہلے پاؤں کی درد سے جو وہ عشاء چھوڑ دیتی تھیں۔ اب عشاء نہ چھوٹتی ہاں پاؤں کا درد چھوٹ گیا۔ گورکھ دھندوں میں الجھ کر وہ جو فجر کو بھول گئی تھیں۔ اب فجر نہ بھولتی۔ مگر دھندے بھولنے لگے تھے۔ قیلولہ ظہر چھڑوا دیتا اور عصر بازاروں کی نذر ہو جاتی۔ مغرب کے قریب ترین کھانا بنانا ہوتا۔ پھر پسندیدہ ڈراموں کی ایک لسٹ ٹی وی پر دیکھنی ہوتی تھی۔ اب سب کچھ چھوٹ گیا۔ یاد رہا تو صرف اللہ۔۔۔ اور اس کی شرائط شدہ عبادتیں۔۔۔ جس میں صلوٰۃ کا حکم بار بار اور سب سے پہلے آتا ہے۔

نور سحر تو دو ماہ بے یقینی کے فیز میں رہی تھی۔ زندگی کو دوبارہ سمجھا۔ علی حمزہ کو ٹوٹی ٹانگ والی جیسکا البا نہیں چاہیے تھی۔ اس نے نور سحر کے ہر میسج اور کال کا ریپلائے کرنا چھوڑ دیا۔

نور سحر تنہا ہو گئی۔ اس کی دوستوں کا گروپ۔۔۔ اس کی ایکٹیویٹیز سب ختم ہو گئیں۔ اس کا حلقہ احباب جس قسم کا تھا۔ تو کسی کے پاس اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ نور سحر کے پاس آکر بور ہوتیں۔

☼ ☼ ☼

ان کے پاس wavy کے کتنے ہی پیکٹس تھے۔ کوک کے کین کے کین پڑے تھے۔ کمرے میں بے ترتیبی اور خوشی کا ایک سماں تھا۔ وہ ذکی کی ٹانگ پر سر رکھے لیٹا تھا۔ شہریار سر پر ہیرو کی طرح پٹی باندھے۔۔۔ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ جبکہ فراز نے بڑا کمال کا دیسی گانا لگا دیا۔ اسٹیریو کی آواز پورے کمرے میں گونجنے لگی۔

اتنا مزہ کیوں آ رہا ہے؟
تو نے ہواؤں میں بھانگ ملایا
ہو تیری ململ کی کرتی گلابی ہو گئی
منچلی چال کہ تو نوابی ہو گئی

"نہیں یار دوسرے والا لگا۔۔۔" علی نے اٹھ کر گانا بدلا۔

میں روٹھیا یار مناواں گی
میرے ماہیا صنم جانم۔۔۔
نی میں کملی کملی۔۔۔
نی میں کملی کملی۔۔۔

کترینہ کیف ٹھیک طرح مارشل آرٹس کا مظاہرہ کرتی حقیقتاً "کملی" لگ رہی تھی۔ شہریار اور علی صرف

اس کے ٹریکس دیکھ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر رہے تھے۔ جبکہ فراز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کترینا کی اس کیفیت پر خود کو ہی الٹا لٹکا ڈالے۔ ذکی چاہ رہا تھا کہ عامر خان کا گلا کاٹ کر خود وہاں بیٹھ جائے۔

اتنے میں علی حمزہ کی بیل ٹون بجنے لگی۔

پیار جاننہ کمال ہے۔۔۔

پیار جاننہ کمال ہے۔۔۔

نمبر دیکھ کر وہ بے زار ہو گیا تھا۔ موبائل ویسے ہی تکیے پر پھینک دیا۔ ذکی نے موبائل اٹھالیا۔

"یار یہ "بدتمیز دل" کون ہے" موبائل پر نام کی جگہ بدتمیز دل چمک رہا تھا۔

"یار یہ کون ہے؟۔۔۔" ذکی کو نام کی جگہ بدتمیز دل دیکھ کر ہنسی آگئی۔

"بس ایک مصیبت ہے۔۔۔ ٹانگ تڑوا کر بھی سکون نہیں۔۔۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"یار! یہ کہیں تیری جھسکا البا تو نہیں؟"

"ہاں وہی۔۔۔ پر اب میں فیڈ اپ (بے زار) ہو گیا ہوں۔۔۔"

"ہوں، پھر کیا کہتا ہے۔۔۔"

"بس blacklist کر دو۔۔۔" وہ اب گانا چینج کر کے میوزک انجوائے کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

قہقہے مارنا۔۔۔ خوشی منانا اور زندگی کے سارے مزوں میں کھونا کتنا آسان ہوتا ہے۔ رنگ۔۔۔ اور رنگینیاں۔۔۔ وہ پاپا کے موبائل میں ایک ٹیلی فلم نکال کر دیکھ رہی تھی۔ جہاں لڑکیوں کا گروپ آئس کریم کھاتے ہوئے بھرپور قہقہے لگا رہا تھا۔ گھنگھریالے بالوں والی لڑکی کے ہنستے چہرے اور چمکتی آنکھوں کو ایک حسرت سے اس نے دیکھا۔

آج گھر میں کوئی نہیں تھا۔ مما۔۔۔ سبرینہ کے ساتھ آنٹی روزی کے گھر چلی گئیں۔ سیفی دوستوں کے ہاں۔۔۔ پاپا موبائل گھر بھول کر خود شکار پر۔ صبح سے وقت کاٹنا مشکل ہو گیا تھا۔

آج سے پہلے زندگی کبھی اتنی بور نہ لگی تھی اس نے کھڑکی کے پردے ہٹا کر پھول دیکھے پوری قطار پیلے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کا فارم ہاؤس ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے پیلی چادر باہر بچھا دی سامنے جامن کے درخت پر شہد کی مکھیوں کا چھتا لگا ہوا تھا۔ ایک تتلی پھولوں کا رس چوستے ہوئے شہد کی مکھیوں سے دور بھاگ رہی تھی۔ کتنا زہر ہوتا ہے نا شہد کی مکھیوں میں اور شہد کتنا میٹھا بھی ہوتا ہے۔۔۔ کیا زندگی بھی؟ یونہی کبھی میٹھی۔۔۔ کبھی زہریلی ہوتی ہے' انسان پھولوں کی پتیوں کی طرح ذرا ذرا کر کے ختم ہو جاتا ہے۔ پھر مکمل طور پر۔۔۔ نہ حال کی خبر نہ ماضی کی۔۔۔ ہم اتنے بے توقیر ہو جاتے ہیں۔ پیلی دھوپ۔۔۔ دھوپ سے چھاؤں اور چھاؤں سے دھوپ تک کا سفر سمجھا رہی تھی۔

اپنی ٹوٹی ٹانگ کو ایک نظر دیکھ کر ایک عجیب سی چمک اس کی آنکھوں میں آئی۔ کیا وہ ایک قفس کا حصہ بن گئی تھی۔۔۔ جہاں کبھی سکھ کا گزر نہیں ہے۔ اس نے گھبرا کر سبرینہ کو کال کی۔۔۔ مسلسل بیل جانے پر اس نے ریسیو کرلی۔

"سبرینہ کہاں ہو؟ کب تک آرہی ہو۔۔۔؟"

"کیا مصیبت ہے یار! ابھی اتنا کچھ لینے کو ہے۔ تم بھی نا۔۔۔ میں سمجھی کہ شاید کوئی کام ہے۔" اگلی بات اس نے سنی نہیں اور کھٹاک کر کے فون بند کر دیا۔ وہ پوچھنا چاہ رہی تھی۔۔۔ کہ ممی کہاں ہے؟۔۔۔ وہ ممی کو جلدی گھر بھیج دے۔۔۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ تنہائی۔۔۔ عجیب انداز سے اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ تنہائی کا بھوت اسے پاگل کر رہا تھا۔ وہ کبھی تکیے کو اپنے ساتھ لگائے روئے گئی۔ کبھی دیوار سے ٹیک لگا کر۔۔۔ اسے قہقہوں کی زندگی یاد آنے لگی۔ اب قہقہے نہیں تھے۔ مگر ویرانیاں ضرور تھیں۔

☼ ☼ ☼

علی حمزہ رات دوستوں کے ہمراہ باہر رہا۔ آنٹی رابعہ کے بیٹے کیفی نے فاطمہ افنان کو اس کی ساری

سرگرمیوں کے بارے میں بتایا۔

وہ اسے گھر بلا کر اس کے بارے میں معلومات لے رہی تھیں۔ جیسے جیسے وہ انہیں بتا رہا تھا۔ ویسے ویسے ۔۔۔ وہ اضطراب میں گھر رہی تھیں۔ عمر بھر کا حاصل ۔۔۔ ان کا اپنا بیٹا ۔۔۔ ان کا علی حمزہ ۔۔۔ وہ کیا بن رہا تھا؟ غم' دکھ' تلخی' بے چینی یا بے قراری دل پر گزر جانے والی ساری کیفیتیں وہ بڑی خاموشی سے سہہ گئیں انہیں لگا زندگی کے بڑے سارے سمندر میں وہ تنہا کشتی گھسیٹ رہی ہوں۔ اگر علی حمزہ نے یہی کچھ کرنا تھا۔ تو ان کا فیصلہ ان کی امیدیں وہ کہاں جائیں؟ کس کو بتائیں؟ وہ خود کو کمپوز کر کے کیفی کی باتیں سنے گئیں۔

انہیں رونا نہیں تھا ۔۔۔ نہ ہی وہ رونا چاہتی تھیں ۔۔۔ وہ بہادر تھیں ۔۔۔ بہت بہادر ۔۔۔ زرد مٹی کے صحرا میں اکیلے کھڑے اس ٹیلے کی مانند ۔۔۔ جس پر ہوائیں رقص کرتی تھیں مگر پھر بھی وہ مضبوطی سے اپنی جگہ پر جما رہا۔

☼ ☼ ☼

آج کالج میں Annual Gala تھا۔ وہ سبرینہ کے کہنے پر زبردستی ہٹل کی بنی جدید بیساکھی کے ہمراہ تیار شیار ہو کر کالج آ گئی۔ سبرینہ نے اس کے بالوں کی خود کرلنگ کی تھی۔ ممی' پاپا اور سیفی نے نجانے کتنے لوگوں کی آٹو بائیو گرافی اسے سنا کر اسے کالج جانے پر آمادہ کیا۔ اسے ہمت و بہادری کے بہت سارے اسباق ہیوی ڈوز کی طرح پلا دیے گئے۔

وہ بھیگی رات میں ڈری سہمی بچی کی مانند سبرینہ کے ہمراہ کالج فنکشن میں آ گئی ریڈ میرون کلرز کی لمبی فراک پہنے ۔۔۔ کرلی بالوں کی جھولتی لٹوں کے ہمراہ اس کا گول منہ بے حد پیارا لگ رہا تھا۔

انجینئرنگ کے لڑکوں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف اونچی آواز میں انڈین گانے لگائے ہوئے تھے۔ سبرینہ کے ہمراہ اس نے دور سے ہی ماہ رخ لوگوں کا گروپ پہچان لیا۔ فراز بیک گلاسز لگا کر سیف علی خان کی طرح پورے اسٹیپس لے رہا تھا۔

بے ایمان ۔۔۔ دل ہوا بے ایمان

اس کے دوست اس کے ارد گرد دائرہ بنائے اسی تماشے کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ اسٹوڈنٹس نے آرٹ کے نمونے بنا کر کالج کو سجا رکھا تھا۔

پاکستان کے اس پرائیویٹ مخلوط کالج کی فضا مغرب کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی۔ وہی قہقہے' وہی خوشیاں ۔۔۔ پھر اس نے اسے دیکھا ۔۔۔ ہزاروں میں بھی وہ پہچانا جا رہا تھا۔ علی حمزہ نے ڈارک میرون شرٹ پہن رکھی تھی۔ اوپر سے اس کی رنگت بھی صاف تھی۔ دبلا پتلا ۔۔۔ لمبا ۔۔۔ سا علی حمزہ آج اپنا بھرپور گریس ظاہر کر رہا تھا۔

وہ دوستوں کے گروپ میں کھڑا کسی بات پر قہقہہ لگا رہا تھا۔ وہ کبھی اس کی جھسکا لبا تھی۔ وہ کھلنڈری سی ۔۔۔ بے وقوف سی لڑکی ۔۔۔ اسے علی حمزہ کو دیکھ کر پھر سے دل میں عجیب سی ہلچل محسوس ہو رہی تھی۔

"سبرینہ! ۔۔۔ وہ فرینڈ سے باتوں میں مشغول تھی۔ اس نے اسے پھر سے ٹھوکا دیا۔

"سبرینہ!" اب کی بار آواز ذرا بلند کی گئی۔ مگر وہ باتوں میں ہی اتنی مگن تھی۔ وہ بے زار ہو کر سفید پتھروں سے بنے بینچ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ آنکھوں میں پھیلا کاجل بادلوں کی سیاہی کی طرح اطراف میں پھیل گیا۔ اس کا چہرہ ہی نہیں اس کا وجود بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ علی حمزہ نے یہی سب کرنا تھا۔

"یار! وہ دیکھو تمہاری جھسکا ۔۔۔" شہریار نے علی حمزہ کو متوجہ کیا۔ اس کو دیکھ کر علی حمزہ دوستوں کو وہیں چھوڑے اس کی طرف آ گیا۔ کبھی وہ یار من ۔۔۔ میں شمار ہوتی تھی۔ مگر اب نہیں ۔۔۔ ٹوٹی ہوئی پرانی سی چیزیں بھلا کب کسی کو اچھی لگتی ہیں۔ مگر جب پرانی چیزیں یادداشت میں کسی خوب صورت خیال کی مانند اٹک جائیں ۔۔۔ تو کبھی کبھی خیال آ ہی جاتا ہے۔

"کیسی ہو؟" وہ اس کے قریب آ کر بولا۔

علی حمزہ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ہی اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ مساموں سے پسینہ شفاف قطروں کی طرح

نمودار ہونے لگا۔ آکاس بیل کے اندر ہوا سر سرائی اور بلبلوں کی طرح کوئی خیال آسمان کی نیلی چھت میں گم ہو گیا۔

جیسکا البا کا علی حمزہ گم ہو گیا۔

"دیکھو نور سحر مجھے تمہاری تلاش نہیں اور نہ ہی تم وہ لڑکی ہو۔ جس کے پیچھے میں پاگل ہوتا پھروں آج کل محبت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں بھی فلرٹ ہی کر رہا تھا۔ ویسے بھی پیار ویار یہ ساری باتیں پرانے دور میں اچھی لگتی تھیں جب محبوب ..... محبوبہ کے فراق میں روتا تھا اور محبوبہ، محبوب کی تلاش میں جگہ جگہ پھرتی تھی۔ یار ٹیکنالوجی کا دور لڑکیوں کو تو جسٹ لفٹ کرانے کی دیر ہے۔ یوں چٹکی بجاتے آپ کے آگے پیچھے لٹو ہوتی ہیں۔" اس نے استعارے کے طور پر چٹکی بجا کر دکھائی۔

کلاس میں میں کسی اور کو بھی اپنی جیسکا البا کے لیے منتخب کرتا تو وہ بھی مان جاتی۔ آخر ایک جینٹس ..... گڈ لوکنگ بوائے ہوں.....“ وہ شوخی سے ہنسا۔ اس کی آنکھیں اور انداز تمسخرانہ تھے اور نور سحر عزت نفس جیسے کسی لفظ سے بھی آگاہ نہ تھی۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ علی حمزہ کے لیے سب کچھ کر سکتی ہے اور اسے اس زندگی میں کم از کم علی حمزہ ہی چاہیے۔ صرف اور صرف علی حمزہ.....

"علی حمزہ! میں تمہارے بغیر....."

"بس، بس ....." اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"مزید کچھ ڈائیلاگ نہیں اور میں ویسے بھی اب جا رہا ہوں۔ تم لڑکیاں ایک دفعہ کی لفٹ پر ہی چپک جاتی ہو۔ میں نے ابھی پڑھنا ہے کیریئر بنانا ہے اور ایسے ہی فضول میں میں نہیں تمہیں سر پر بٹھا سکتا۔ پھر ایک ٹانگ تمہاری ہے نہیں ..... آج کل ایسی لڑکیاں پوری ٹانگوں سمیت بمشکل برداشت ہوتی ہیں۔ افیئر چلانے کے لیے تو ٹھیک ہے۔ ساری عمر کا ڈھول کون پیٹے۔ پھر تم تو ایک ٹانگ کے ساتھ بھی بار بار محبت..... محبت۔"

وہ بدمزا سا ہو کر اس کی سنے بغیر واپس اپنے دوستوں کی طرف بڑھا۔ جبکہ وہ وہاں بغیر شرمندہ ہوئے اسی طرح کھڑے یہ ہی سوچے گئی۔ ہائے یہ میرے ساتھ ایسا کیوں کر کے چلا گیا۔ سبینہ کو اس نے روتے ہوئے ساری بات بتائی۔ وہ کافی دیر تک ہنستی رہی۔

"آج کل کے گانوں کی کوئی عمر نہیں تو محبت کی کیا عمر ہوگی....."

پیار جانے کا مال ہے.....
آج بلو ہے جانی اپنی.....
میں ناگن ناگن ڈانس نچتا.....
ماری ماری ماری
تو نے میری مت ماری ..... "وہ گانوں کے بول بول کے..... اسے چیئر اپ کرنے لگی۔ وہ دونوں گاڑی میں آکر بیٹھ گئیں۔ سبینہ کی زلفیں اڑ اڑ کر نور سحر کے منہ پر پڑ رہی تھیں۔ وہ پہلے ہی تازہ تازہ صدمے میں تھی۔

"سبینہ بال سمیٹو..... یا سائیڈ ونڈو کا شیشہ اوپر کرو ..... مجھے تمہارے بالوں سے الجھن ہو رہی ہے۔"

"ڈیئر سسٹر..... آج کل کی چپکنے والی محبتوں سے بھی لڑکوں کو یونہی الجھن ہوتی ہے۔" وہ بالوں کو بینڈ باندھتے ہوئے کدھر کی بات کدھر لے گئی۔

"لڑکے ایسی ہی محبت کرتے ہیں۔ جب تک مستی ..... اور شوخی کا نشہ سوار رہا تب تک آپ اچھے ہیں اور جیسے ہی اترا..... تب محبت سے الجھن ہونے لگتی ہے اور یار تم میں تو پھر بھی ڈیفالٹ (نقص) آ گیا ہے۔ تمہیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔"

وہ گلاسز لگا کر گاڑی اسٹارٹ کر چکی تھی۔ جبکہ وہ یاسیت سے باہر دیکھنے لگی۔

اسے اپنے خالہ زاد کی شادی پر ساڑھی پہنا وہ سین یاد آیا۔ جب جانے سے پہلے علی حمزہ کو اس نے اپنے گھر کے سامنے بلوایا تھا۔ صرف اسے اپنی ڈریسنگ دکھانے کے لیے..... میرون ساڑھی میں وہ کتنی دلکش لگ رہی تھی اور علی حمزہ نے کہا تھا۔

"نور سحر تم میرے خیالوں میں بسنے والی وہ ہی

جھلسکا الباہو۔۔۔ جس کی تلاش ہے مجھے۔۔۔ اور اسے لگا۔۔۔ کہ وہ جدید دور میں قدیم زمانے کی وہ راج کماری ہے۔ جس کے لیے اس کا راج کمار طلب گار ہے اور اس کے لیے بہت سارے احساسات و ارمان رکھتا ہے۔ مگر آج کیا ہوا تھا؟ جس طلسم میں وہ جکڑی ہوئی تھی۔ وہ طلسم ٹوٹ گیا۔۔۔

وہ چپ ہو گئی تھی۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔ سارے راستے صبیحہ بولتی رہی۔ جس میں سرفہرست نور سحر کی بے وقوفیاں۔۔۔ آج کل کا دور۔۔۔ آج کل کے لڑکے۔۔۔ اور باہمت لوگوں کی داستانیں۔۔۔ جو معذور ہو جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں شامل تھیں۔

اس نے چپ کر کے گھر آکر شاور لیا اور اپنے سارے آنسو شاور کے پانی کے اندر بہائے۔۔۔ ساری محرومیاں۔۔۔ سارے دکھ، ساری تکلیف، دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ تو چائے بنا کر وہ ٹیرس پر آگئی۔ ٹیرس سے آسمان کو دیکھنا۔۔۔ اپنے فارم ہاؤس کے گرد پھیلے سبزے کو دیکھنا۔۔۔ اور پرندوں کی اٹھکیلیاں۔۔۔ یہ سب اس کی پریشانی سنتے۔

بچپن میں وہ مما پاپا کی لڑائی سے اپ سیٹ ہو کر بھی یونہی ٹیرس پر آجایا کرتی تھی۔ اس نے ایک نظر اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر ڈالی۔

"پاپا کہہ رہے تھے کہ کراچی میں امریکہ سے ایک ڈاکٹر آتے ہیں۔ جو مصنوعی ٹانگ لگاتے ہیں۔ ان سے چیک اپ کروالیں گے۔"

صبیحہ نہ جانے کب اس کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی۔ صبیحہ کو پتا تھا کہ آج وہ پریشان ہے۔ وہ اس کی ڈھارس بندھانا چاہ رہی تھی۔ وہ کیا کہتی۔۔۔ پاپا مصنوعی ٹانگ تو لگوا دیں گے۔ مگر اس کا دل جو چکنا چور ہوا تھا۔ وہ کیسے لگوائیں گے؟

☼ ☼ ☼

"تم نے اپنی پرسنٹ ایج دیکھی ہے؟" فاطمہ افنان نے کافی پھینٹتے ہوئے کچن سے ہی علی حمزہ کو سنایا جو جاگرز سمیت صوفے پر لیٹا میچ دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ بھی زمانہ تھا جب وہ علی حمزہ کو مینرز سکھایا کرتی تھیں۔ ٹیبل مینرز۔۔۔ ایٹنگ مینرز۔۔۔ سٹنگ مینرز۔۔۔ پر سارے مینرز کا ستیاناس اس کے جوان ہونے پر نکل گیا۔ رہی سہی کسر اس کے دوستوں نے پوری کر دی۔ اب اگر وہ ٹوکتیں تو وہ منہ بگاڑ کر کہتا۔

"او مما! کبھی chill بھی کیا کریں۔ آپ man of freedm (انسان کی آزادی) کو سمجھتی ہیں۔ اپنے لیے زندگی "ان مینرز" جنہیں میں پابندیاں کہتا ہوں ان میں قید کر کے نہیں گزارنی چاہیے۔ یہ ایسے کرو۔۔۔ وہ ایسے کرو۔۔۔ مائی فٹ۔۔۔ آپ ویسے کرو جیسے آپ خود کو ایزی سمجھتے ہو۔ جیسے اگر میرا دل تربوز کھانے کو چاہے تو میں اس کو ٹکڑوں میں کاٹ کر باؤل میں رکھ کر فورک کی مدد سے ہی ضروری کھاؤں میں چھری سے کاٹ کر ویسے بھی تو کھا سکتا ہوں۔" فاطمہ افنان اسے اب جس بھی بات پر ٹوکتیں۔ اس کے پاس بتانے کو ہزاروں دلائل ہوتے۔ وہ چڑچڑی ہوتی جا رہی تھیں۔ علی حمزہ کی عادتیں انہیں ڈپریسڈ کر رہی تھیں۔ انہی عادتوں کو بدلنے کے لیے تو انہوں نے ماضی میں اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔ اوپر سے اس کا سگریٹ پینا۔۔۔ اور ڈرنک کرنا انہیں پریشان کر رہا تھا۔ مگر ابھی تک ان کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہ تھا۔

"علی حمزہ! کبھی ڈرنک یا سگریٹ کو ہاتھ نہ لگانا۔" ان کے تنبیہہ کرنے پر آخر کار وہ ان کی اس بات پر تو وعدہ کر ہی چکا تھا۔ مگر علی حمزہ کو وعدے کا پتا نہیں تھا۔ وہ وعدے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا یا سمجھتا تھا۔ جو کام وہ ماں کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔ چھپ کر کرنے لگا۔ اس نے آج اپنے فرینڈز کے ساتھ تازہ مووی دیکھنے جانا تھا۔

وہ نہا دھو کر نک سک سے تیار ہو کر باہر نکل آیا۔ شہروز نے اسے پک کیا تھا۔

"یار حسان کو بھی بلا لیں۔ بلکہ آج ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ آئس کریم کا بھی پروگرام بنا لیں۔" ہلکی ہلکی بارش بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ ٹائٹ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ آج اپنی کلاس میں آنے والی

اس پٹاخہ کے بارے میں باتیں کرنے لگے ' جس نے اپنے نت نئے فیشن کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔

"یار' بال تو اس کے بڑے سلکی ہیں۔۔۔۔" سعید نے چیونگم کا ریپر دور پھینکتے ہوئے بیٹ اور بال کا فرضی خاکہ بنا کر کر کٹرو الا اسٹائل بنایا۔

"آنکھیں بھی چمکدار۔۔۔۔" عبدالرافع نے بھی مسکرا کر تائید کی۔

"رہنے دو یار' بے وہ پوری بائدری۔۔۔۔ کبھی اچھل کر حارث کے پاس' کبھی فیصل کے ساتھ۔۔۔۔" شہروز کو کل والی بے عزتی بھول نہیں رہی تھی۔ جب وہ اسے ڈیسک پر چھوڑ کر خود فیصل کے ساتھ چلی گئی۔

"یار! بس کرو' bluetooth ہے وہ۔۔۔۔ ہر جگہ connect ہو جاتی ہے۔" ذکی نے آنکھ دبا کر قہقہہ لگایا۔

"کل سر حمدانی کا لیکچر ہے کچھ تیاری شیاری کی۔۔۔۔" علی حمزہ کو ہمیشہ کی طرح پڑھائی کا بھی خیال آگیا تھا۔

"یار! کیا مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔ اس بابے نے ۔۔۔۔ بوڑھی ٹانگیں۔۔۔۔ یونیورسٹی میں ہمارا سر کھانے آجاتا ہے۔ بندہ اب آخری عمر میں بیٹھ کر اللہ اللہ ہی کر لے۔ جب دیکھو اپنی جوانی کی شیخیاں مارنے لگتا ہے۔" ذکی نے منہ بنایا۔

"چاہے' ماضی میں ہزاروں کے پیچھے لگا ہو۔" شہروز کی بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔

"یار! واقعی یہ جو سر وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ بڑے معصوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کچھ نہیں کیا ہوتا ۔۔۔۔" عبدالرافع کی دماغ کی سوئی وہیں پر اٹکی ہوئی تھی۔

"یار! میری نانو کہتی ہیں۔ اتنا کوئی حاجی نہیں ہوتا۔ اپنے دور میں ہر ایک نے گند مارا ہوتا ہے۔ میرے نانا نے اپنے زمانے میں شاید ہی کوئی محلے کی لڑکی چھوڑی ہو' جسے لائن نہ ماری ہو۔" صحام کو ان کی بات پر متفق ہونا ذرا مشکل لگ رہا تھا۔

"یار! وہ دیکھو باجی عالیہ کا نیو پوسٹر۔۔۔۔ مین مارکیٹ میں ایک بڑے سپر اسٹور پلس ہوٹل پر چسپاں بالی ووڈ کی نیو ہیروئین عالیہ بٹ کی پکچر ۔۔۔۔" صحام کا اشارہ سمجھتے ہوئے سب نے سامنے دیکھا۔

"یار! یہ ہماری باجی ہیں۔۔۔۔" ذکی نے منہ بنا کر کہا۔ سب کی زوردار ہنسی کی گونج گاڑیوں کے شور میں بھی نمایاں ہو گئی تھی۔

"تمہاری ہو گی۔۔۔۔" شہروز نے بے ساختہ کہا۔

"یار! ممی اس دن مجھے اتنے پیار سے سمجھا رہی تھیں۔ ممی نے ہم سب بہن بھائیوں کو آج تک مووی نہیں دیکھنے دی۔ گھر میں کیبل پر بھی چینل لاک ہیں۔ پتا کیا ہوا۔۔۔۔ ہم ہوٹل کھانا کھانے گئے۔۔۔۔ وہاں اس کا گانا لگا ہوا تھا۔ ممی میری چھوٹی بہن کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"بیٹا! یہ بڑی آپی کی طرح ہیں۔ یہ ہمیں ویسے ہی خوش کر رہی ہیں اچھل اچھل کر۔۔۔۔"

میں نے اور منیحہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا۔۔۔۔ ممی کو پتا ہی نہیں کہ ہم دونوں نے یہ مووی تایا ابو کے گھر دیکھی ہوئی تھی۔ وہ عالیہ بٹ کی حرکتوں کا امیج ہماری نظر میں اس طریقے سے اچھا بنانے کی کوشش کر رہی تھیں۔"

شہروز کی وضاحت پر سب اپنی اپنی ماؤں کی معصومیت ڈسکس کرنے لگے۔ کہ کیسے وہ سب کچھ جانتے ہیں اور ان کی مائیں انہیں بچہ سمجھتی ہیں۔

"یار! ہماری ماؤں کو تو یہ تک بھی نہیں پتا کہ ہم کتنا کچھ جانتے ہیں۔۔۔۔ ہم تو گرل فرینڈ اور بیوی کے ریلیشن تک کو سمجھتے ہیں کہ کس کو کتنے فاصلے پر رکھنا ہے اور کس کو کتنے پاس۔۔۔۔ اور کس کو کیسے ٹریٹ کرنا ہے۔"

شہروز نے سائیڈ پاکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ ان سب میں وہ سگریٹ نوشی زیادہ کرتا تھا۔

آسمان پر پھیلے پورے چاند نے اپنی کرنوں میں نور کی بجائے آلودگی کے مترادف گندگی گھستے دیکھی تھی۔

نور کی روشنی اپنی پاکیزگی میں اس آمیزش سے گھبرا کر ماتم کناں تھی۔

اس دن کے بعد اس نے کالج جانا بند کر دیا تھا۔ ہر بندہ اپنی لائف میں مصروف اس کی مما اور پاپا اپنی لائف میں۔۔۔ اس کے لیے کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ اگر تھوڑا بہت ہوتا تو نصیحتوں پہ مبنی ہوتا۔ اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا۔

علی حمزہ کی بے رخی اسے اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ سے زیادہ چبھ رہی تھی۔ جسم کے زخم سے دل کا زخم آج کل بڑا محسوس ہو رہا تھا۔ دل کا زخم ہمیشہ روح پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب روح کو چوکے لگیں تو انسان زیادہ تڑپتا ہے۔ دنیا میں روح کا علاج کرنے والوں کو تلاش کرتا ہے۔

اس نے اپنے لیپ ٹاپ پر نیٹ سرچنگ کرنی شروع کر دی اور ڈپریشن دور کرنے کے طریقے پڑھنے شروع کر دیے۔ عظیم لوگوں کے ڈپریشن کے دوران تاثرات پڑھنے شروع کر دیے۔ مثلاً "ایک عظیم فلسفی ڈپریشن میں اپنے ناخن چباتا تھا۔۔۔ کوئی ڈپریشن دور کرنے کے لیے فنی موویز دیکھتا کوئی باغبانی شروع کر دیتا۔ تو کوئی فلاحی کاموں میں دلچسپی لینے لگا۔ اس سارے مطالعے کے دوران اسے ایک بات تو سمجھ میں ضرور آگئی تھی کہ ڈپریشن کا فیز ہر خاص و عام پر زندگی میں ضرور آتا ہے۔ بس ذرا ڈپریشن کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

پورے دو دن اس نے کمرے میں بند رہ کر اپنی پسند کا میوزک سنا۔ پر جلد ہی وہ اکتا گئی۔ اپنی پرانی سہیلیوں سے رابطے کیے۔ مگر کوئی اتنی فارغ نہ تھی کہ گھنٹوں پیکج کروا کر اس سے بات کرتی۔

جس دن گھر میں ممی یا سبین نہ ہوتی وہ مزید وحشت زدہ ہو جاتی اسے لگتا کہ دنیا میں اس کے لیے کچھ نہیں ہے۔ وہ آج مر جائے تو کوئی افسوس بھی نہ کرے۔ وہ ایک ناکارہ پرزہ بن چکی تھی۔ حد سے زیادہ خود ترسی کا شکار۔۔۔ ممی اور سبین پر اب وہ غصہ کرنے لگی تھی

"آپ دونوں کو ذرا بھی میرا خیال ہو تو آپ لوگ چھٹی کے دن تو گھر میں ٹک جایا کریں۔۔۔" وہ سنڈے کو ان کے آنٹی غزالہ کے ہاں جانے پر۔۔۔ غصے سے بولی۔

"تو کیا ہم تمہاری خاطر گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائیں۔۔۔" سبین نے اکتا کر کہا۔

ثمائمہ کو تھوڑا بیٹی کے لیے دکھ ہوا تھا۔

"نہیں بیٹا! ہم لوگ جلدی آجائیں گے۔ تم ٹی وی وغیرہ دیکھ لینا۔" وہ پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے بولیں۔

ان کو جاتا دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے کھڑکی تک آئی۔ ممی اور سبین تیار شیار، فریش۔۔۔ خوش باش گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں اور چوکیدار نے گیٹ کھولا

سبین نے پر اعتمادی سے گاڑی بیک کر کے نکالنے لگی۔ پھر زن سے وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل بھی ہو گئے۔ کبھی اس کی بھی اسی طرح سوشل لائف ہوا کرتی تھی۔ ملنا ملانا۔۔۔ آنا جانا۔۔۔

وہ بے زاری۔۔۔ تھکن۔۔۔ خود ترسی، تنہائی کے احساسات کے ہمراہ صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ بددلی سے ریموٹ اٹھا کر چینل گھمانے لگی۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ ایک جگہ کرکٹ کا میچ۔۔۔ کچھ دیر وہ دیکھتی رہی پھر بھی دل کی بے سکونی کم نہ ہوئی۔ ایک جگہ ڈرامے چل رہے تھے۔ جو کم و بیش ایک ہی جیسے اسے لگتے۔ وہ پہلے ڈرامے نہیں دیکھتی تھی۔ مگر آج کل گھر رہ رہ کر وہ یہ کام بھی کرنے لگی۔ مگر جلد ہی وہ ڈراموں سے بھی فیڈ اپ ہو گئی۔ اگر ایک چینل پر ایک ڈراما دیکھتی تو کچھ دنوں بعد کسی اور چینل پر کوئی اور ڈراما دیکھتے ہوئے اسے پہلے والے ڈرامے کا ہی گمان ہوتا۔ تھوڑی بہت تبدیلیوں کے علاوہ کم و بیش زیادہ تر ڈرامے ایک جیسے ہی ہوتے۔ میوزک وہ اتنا سن چکی تھی کہ اس پر بھی دل نہ چاہا۔ ایک چینل پر ایک مولوی صاحب بیٹھے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ان کو سننے لگی۔ کسی زمانے میں اسے دنیا میں سب سے بیچاری سی مخلوق مولوی

حضرات لگا کرتے تھے۔ اسے لگتا جن کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں ہوتا وہ مولوی بن جاتے ہیں۔ جان بوجھ کر ایسی ایسی حدیثیں اور آیتیں سناتے ہیں۔ جن سے لوگ ڈرنے لگتے ہیں۔ زندگی سے سارا مزا ایسے چوس لیتے ہیں۔ جیسے تتلی پھولوں کا سارا رنگ چوس کر اسے بے رنگ کر دے۔ وہ خود کب کی بے رنگ ہو گئی تھی۔ جب علی حمزہ نے اسے اپنی جیسکا البا بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ یا پھر تب جب وہ سڑک کے بیچ و بیچ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"جب مردے کو قبر میں لٹا کر چار قدم ہی اس کے گھر والے جائیں گے۔ تو اللہ پھر اتنا شعور اور عقل اس انسان میں ڈال دے گا۔ جتنا مرنے سے پہلے تھا۔ اس کا حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔" مولوی صاحب اپنے مخصوص لہجے میں مرنے کے بعد کے حالات بتانے لگا اس نے جلدی سے ٹی وی آف ہی کر دیا۔ ایک عجیب سی گھٹن اسے ہونے لگی۔

اسے لگا کہ یہ اس کا گھر نہیں جیسے اس کی قبر ہو..... جیسے وہ دنیا چھوڑ چکی ہو۔ سیرینہ اور ممی کے خوش باش چہرے اسے دنیا لگنے لگے۔ پھر اس نے اپنے خیالات پر لعنت بھیجی اور لیپ ٹاپ آن کر کے بیٹھ گئی۔ برانڈڈ لائنز کے اسٹائل نے اسے وقتی طور پر بہلا دیا تھا۔ ایک دو مارننگ شو نیٹ سے نکال کر دیکھنے لگی۔ جہاں بے چینی کم کرنے کے گر بتائے گئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے والی وحشت ذرا کم ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یار! یہ ہے کیا چیز۔"

"ہمیں اسٹیفنس کرائے گی۔" علی نے چیونگم چباتے ہوئے اسے جواب دیا۔

پتلی سی کمر پر جھولتے بال..... بال بھی لمبے تھے۔ ان کی نئی مس خاصی خوب صورت واقع ہوئی تھیں۔ اس کا دل نہ رہ سکا اس نے سائیڈ پاکٹ سے موبائل نکال کر کیمرے کے ذریعے پیچھے سے تصویر لی۔ پھر یہ تصویر اس شہوز اور ذکی کو send کر دی۔ جو اگلی رو کے دوسرے والے بینچ پر بیٹھے تھے۔

"تیری کمر پر ہم مر مٹے۔" شہوز نے اس کی اسٹیٹ منٹ میں تھوڑی تبدیلی کرکے وہ حنان لوگوں MMS کر دی۔

"لک ٹوئنٹی ایٹ کڑی دا..... فوٹی سیون ویٹ کڑی دا....."

"یار! اب یہ سانگ پرانا ہو گیا ہے۔" اس کی جگہ تم کہو۔

بلو آئی ز تو تائز تیری کردی اے مینوں.....

آئی سویٹر چھوٹی ڈریس میں..... تو یوم — لگدی مینوں....."

ذکی کے کمنٹس پر اس نے پھر اسے میسج بھیجا۔

"یار! وہ تمہاری باجی ہے..... اس لیے تم پرہیز ہی رکھو۔ ورنہ تمہاری مما کو بتا دوں گا کہ اپنی باجی کے گانے سر عام کلاس میں گانے شروع کر دیے ہیں....."

شہوز کا اشارہ وہ سمجھ گیا تھا۔

اس لیے دبی دبی آواز میں ہنسا..... پتلی کمر والی مس کی آواز کافی زور دار تھی اور ان کا غصہ اس سے بھی زیادہ کرنٹ مارتا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ ڈائریکٹ ہی شاک لگا کر پرنسپل کے پاس لے جاتیں چونکہ وہ ان کی حرکتوں کو محسوس کر چکی تھیں۔ لہٰذا اب سارے چہرے پر زمانے بھر کی شرافت سجائے یوں آرام سے بیٹھ گئے جیسے انہیں کچھ پتا ہی نہ ہو۔

"تم نے آج سب کو مروانا تھا۔ بیک بینچر....."

ذکی نے سر کھجاتے پریڈ آف ہوتے ہی علی حمزہ سے کہا۔ وہ سارے اسے بیک بینچر کہتے۔ پچھلے دو سالوں سے اس کا یہ مخصوص بینچ تھا۔ جہاں کسی اور لڑکے کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں بیٹھ کر نت نئی شرارتیں سوچنا..... اور نئے شگوفے چھوڑنا اسے ہمیشہ آسان لگتا۔ ان سب کے باوجود وہ انٹیلی جنٹ تھا۔ اس کی یہی خوبی اسے ٹیچرز کی نظر میں ڈی گریڈ ہونے نہ دیتی۔

☼ ☼ ☼

ان سب کی آج ہیڈ آفس میں میٹنگ تھی۔ فاطمہ

زنان کی طبیعت صبح سے ہی گری گری تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ بڑی حاضر جوابی سے میٹنگ کے پوائنٹس ڈسکس کرتیں۔ نئی نئی باتوں کو منظر عام پر لاتیں۔ آدھے سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرتیں۔ مگر ان کی ہتھیلیوں اور پسینے سے پیشانی پر لکھی تحریر کچھ اور ہی کہانی بیان کرنے جارہی تھی۔

"مومنہ! میری طبیعت نہیں ٹھیک ۔۔۔ عجیب سی پریشانی ہو رہی ہے۔۔۔"

انہوں نے اپنی ساتھ والی کرسی پر بیٹھی مومنہ کو مخاطب کرکے کہا۔

"آپ پانی پئیں ۔۔۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟" وہ تھوڑا متفکر ہوئیں۔

"میں میٹنگ چھوڑ کر جارہی ہوں۔" وہ بے چین سا ہو کر اٹھ گئیں۔ دل سے ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔ ساری ٹیچرز ان کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ مس فاطمہ اتنی ہنس مکھ، نیک اور ذمہ دار ۔۔۔ ان کا میٹنگ چھوڑ کر جانا سب کو پریشان کر گیا۔

"ان کی طبیعت نہیں ٹھیک ۔۔۔ کافی بے چینی محسوس کررہی ہیں۔" مومنہ نے سوالیہ چہروں کو جواب دیا۔ تاکہ ان کی حیرانی ذرا کم ہو۔

باہر آکر وہ کافی دیر کھانستی رہیں۔ اور بمشکل گھر پہنچیں جہاں ان کو پوچھنے کے لیے خالی دیواریں۔ چند پودے اور علی حمزہ کی بکھری چیزیں تھیں۔ وہ آکر سیدھی لاؤنج میں بیٹھ گئیں۔ کبھی سانس ہموار ہو جاتی کبھی انہیں اپنی سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہوتی۔

علی حمزہ اس وقت کالج تھا۔ وہ درود شریف پڑھنے لگیں۔ مگر وہ ان سے پڑھا نہ جارہا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر ٹہلنے لگیں۔

"علی حمزہ کو کال کرکے بلالوں ۔۔۔" کتنی ہی دفعہ انہوں نے سوچا مگر ہمت نہ ہوئی۔ انہوں نے کلمہ یاد کرنے کی کوشش کی۔ مگر تکلیف کی شدت اتنی تھی کہ ان کو کلمہ بھی نہ یاد آرہا تھا۔ وہ اٹھ کر بمشکل پانی لے کر ایک گھونٹ لینے میں کامیاب ہوئیں۔ گھر کا دروازہ ویسے ہی کھلا تھا وہ آج بند کرنا بھول گئیں۔

انہوں نے باہر علی حمزہ کی بائیک کی آواز سنی۔ انہیں اپنے سینے پر بوجھ بڑھتا محسوس ہوا۔۔۔ وہ صوفے پر آڑی ترچھی لیٹ گئیں۔ علی حمزہ کھلا گیٹ دیکھ کر ویسے ہی مٹی کیچڑ والے جوتے لیے اندر آگیا۔ آج مما نے اسے ڈانٹا بھی نہ تھا کہ وہ گندے شوز لے کر صاف فرش پر کیوں آیا۔ وہ گیٹ سے آگے انڈور گیٹ کھول کر سیدھا لاؤنج میں آگیا۔ وہاں مما آڑی ترچھی لیٹی تھیں۔

"مما!۔۔۔" وہ حیران ہوتا ان کی طرف بڑھا۔۔۔ مما کی طبیعت خراب سے خراب تر ہو رہی تھی۔

"علی حمزہ۔۔۔!" وہ بمشکل بولیں۔

"علی حمزہ! مجھے کلمہ سناؤ۔" وہ لجاجت سے بولیں۔

علی حمزہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مما کو دیکھا۔

"مما! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"مما!۔۔۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔؟"

"علی حمزہ! کلمہ پڑھو۔۔۔" وہ بدقت بولیں۔

ان کے سینے کا بوجھ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ علی حمزہ بدحواسی میں وہاں سے بھاگا۔ ساتھ والے گھر میں انکل جمشید لوگوں کی بیل بجائی۔

گھر میں ماں صوفے پر دوہری ہوئی جارہی تھی اور یہاں وہ جلدی دروازہ بھی نہیں کھول رہے تھے۔ علی حمزہ کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اس کی مما۔۔۔ پتا نہیں اس کی مما کو کیا ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا رہا تھا۔ پریشان ہو رہا تھا۔

"انکل! میری مما کو پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔" گیٹ کھلتے ہی وہ یکدم بولا۔

"نہیں ۔۔۔ کیا ہوا؟" انکل نے گلے میں لٹکے چشمے کو درست کرکے آنکھوں پر سجایا۔

"چلو تم، میں اور تمہاری آنٹی آتے ہیں۔" وہ سنتے ہی اپنے گھر کو بھاگا۔ صوفے پر وجود ساکت پڑا تھا۔

"مما۔۔۔ مما۔" علی حمزہ ان کے پاس جاکر چیخا۔ مگر تھوڑا سا منہ ان کا کھلا رہ گیا اور وہ ساکت ۔۔۔ اور خاموش ہو گئیں۔

علی حمزہ پاگلوں کی طرح انہیں ہلانے لگا۔ اتنے میں

انکل اور آنٹی بھی آگئے۔ انہیں ہاسپٹل لے کر گئے۔ مگر وہاں ڈاکٹر نے کہہ دیا وہ تو کب کی ہمیشہ کی نیند سو چکی تھیں۔

فاطمہ افنان کی زندگی کا باب ختم ہو گیا تھا۔ وہ زندگی جس کو بنانے اور سنوارنے کے لیے انہوں نے ایک بڑی جدوجہد کی تھی۔ وہ فرانسیسی سپاہیوں کی طرح جلدی جلدی فیصلے لینے کی عادی تھیں اور ہر دفعہ فیصلہ کرکے اس پر ڈٹ جاتیں۔ جنگ میں قید سپاہی آزادی کے لیے ہر وہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو انہیں قفس سے رہائی دلا دے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سپاہیوں کی نفسیات اتنی بگڑ گئی تھی کہ وہ آزادی کی خاطر اپنے سگے رشتے داروں کا سودا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ فاطمہ افنان نے ان پڑھ۔ ابراہیم کو لائف اسٹائل کے لیے چھوڑ دیا۔ اس کے کسی بھی احسان کو سمجھے بغیر جو اس نے اسے تعلیم یافتہ ہونے میں اس کے ساتھ سمجھوتے کے طور پر کیا تھا۔ زندگی کی گاڑی فاطمہ افنان کی بے حسی پر جاکر ختم ہو گئی۔ پر زیادہ ظلم علی حمزہ پر ہوا تھا۔ وہ آج زندگی کے اس نازک موڑ پر بالکل اکیلا اور تنہا کھڑا تھا۔ کسی بھی سہارے کے بغیر۔۔۔ وہ اللہ کے متعلق بھی صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ ذات ہے جس نے اسے پیدا کیا اور جو سارے جہاں کا مالک ہے۔ ماڈرن دور کے ہزاروں لوگوں کی طرح وہ اللہ اور بندے کے تعلقات کو جانچ نہیں سکتا تھا۔

اسے آج تک یہ احساس نہیں دلایا گیا۔ کہ جب کوئی نہ ہو تب اللہ پھر بھی ہوتا ہے اور جب اللہ ہو تو پھر کسی اور کی ضرورت نہیں رہتی۔ فاطمہ افنان نے اکیسویں صدی کے سارے سوسائٹی مینرز اسے سکھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر بہت سی چیزوں سے محروم کر دیا۔

علی حمزہ۔۔۔ باپ کے رشتے کو نہیں سمجھتا تھا۔۔۔

علی حمزہ کو اللہ سے کیسے اور کب اور کس طرح سے مانگتے ہیں۔۔۔ نہیں آتا تھا۔

علی حمزہ کی خوشی، غمی، لڑائی، جھگڑے، بات چیت اور دکھ سکھ والا صرف ایک ہی رشتہ اس دنیا میں تھا اور وہ تھی۔۔۔ اس کی ماں۔ وہ چلی گئی۔ اسے لگا سب کچھ چلا گیا۔ اس کے پاس کچھ نہ رہا تھا۔

وہ روتا چلاتا۔۔۔ بلک بلک کے ماں کے جنازے پر رویا۔ اسے ہمسائے میں موجود انکل اور آنٹی سمجھا رہے تھے۔ وہ ایف ایس سی میں تھا۔ تو اس کی ماں نے اس کے لیے فارن کنٹری میں ایڈمیشن لینے کے فارم بھروائے تھے۔ اب وہ ہی کالم کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اس کو آج وہاں سے ایڈمیشن لیٹر بھی موصول ہوا تھا۔ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ پر اس کا دماغ بند تھا۔ انکل اور آنٹی اسے سمجھا رہے تھے۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ جو سب کو ہی آکر رہتی ہے۔ اسے سمجھایا جا رہا تھا کہ اب وہ زندگی کو اکیلے ہی بسر کرے گا اور اسے صبر کرنا چاہیے۔

مما کی کولیگز۔۔۔ اور فرینڈز۔۔۔ سب کا تانتا لگا ہوا تھا۔ سب علی حمزہ کے لیے دکھی تھے۔۔۔ اداس تھے۔ مگر رکنے کو کوئی تیار نہ تھا۔

مما کہا کرتی تھیں کہ ان کے بغیر ان کے اسکول کا سسٹم نہیں چلنے والا۔ اتنی وہ قابل ٹیچر تھیں۔ مگر وہ مما کو کیا بتاتا۔ مما اسکول بھی چل رہا ہے۔۔۔ اور آپ کے بغیر باقی دنیا بھی۔ صرف علی حمزہ چلنا بھول گیا۔ آپ جن رستوں پر اسے چلا رہی ہیں۔۔۔ اب اس سے وہ بھی کھو گئے۔ اس کے پاس مما سے کرنے کے لیے کتنی ہی باتیں تھیں۔

پھر لوگ بھی آنا بند ہو گئے۔ اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ سو نہیں پاتا تھا۔

"علی حمزہ! مجھے کلمہ سناؤ۔۔۔" ایک ہی بات بار بار اس کے کانوں میں بازگشت بن کر گونجتی۔۔۔ ایک آنٹی کے کہنے پر اس نے ٹیوشنز پڑھانی شروع کر دیں۔ کچھ پیسہ مما نے بینک میں ڈیپازٹ کروایا ہوا تھا۔ اس سے اس نے تعلیم کا سلسلہ پھر سے جوڑا۔ علی حمزہ کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے وہ کمزور ہو گیا۔ کبھی وہ دودھ نہ پیتا تو فاطمہ افنان اسے کتنے ہی لالچ دے ڈالتیں۔ کبھی بائیک کا تو کبھی موبائل کا۔۔۔ اب وہ کتنے ہی دن بیت جاتے۔۔۔ دودھ کا ایک گھونٹ نہ بھرتا۔ سارے بادھے

کچھ نہ کچھ کھالیتا۔ وہ ڈیپریس رہنے لگا۔

ڈپریشن سے بچنے کے لیے وہ مصروف رہتا۔ مگر رات کو بیڈ پر جاتے جاتے مما کسی آسیب کی طرح اس کے حواسوں پر چھا جاتیں۔

"علی حمزہ۔۔۔ مجھے کلمہ سناؤ۔۔۔"

اس کی ماں کی آنکھیں۔۔۔ آخری لمحات۔۔۔ اسے بھلائے نہ بھول رہے تھے۔

وہ راتوں کو اٹھ کر ہچکیوں سے روتا۔

"مما! ایک دفعہ واپس آجائیں۔ مما میں اچھا بن جاؤں گا۔ مما دیکھیے میں نے سارے دوست چھوڑ دیے۔ اب میں سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ ڈرنک بھی نہیں لیتا۔ مما آپ کا علی حمزہ اچھا ہو گیا ہے۔" وہ روتا ہی رہ جاتا اور اپنی ہی آواز کو سن سن کر تھک جاتا وہ برانڈڈ شرٹس کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں گیا تھا۔ مگر اب وہ کتنے ہی دن ایک ہی ٹراؤزر شرٹ۔۔۔ میں پھرتا رہتا۔

وہ اتوار کی ایک چمکیلی صبح کا دن تھا۔ اس کا پیٹ خراب ہو چکا تھا۔ باہر کے کھانے کھا کھا کر۔۔۔ اس کی طبیعت گری گری سی تھی۔ وہ اپنے مختصر لان میں آکر بیٹھ گیا۔

سوکھے ہوئے پودے۔۔۔ مرجھائی ہوئی گھاس۔۔۔ اس گھر کے در و دیوار سے عجیب سی اداسی لپٹ گئی تھی۔

باہر کا گیٹ کوئی مسلسل بجانے لگا۔ اس کا دل اٹھنے کو نہ چاہ رہا تھا۔ مگر پھر بھی چار و ناچار اٹھنا پڑا۔

گیٹ پر ایک چھوٹی سی عمر کا لڑکا کھڑا تھا۔ جو اسے کچھ پکڑانے لگا۔

"یہ کیا ہے۔۔۔؟" کچھ قرآن کی آیتیں اور حدیثیں تھیں شاید۔۔۔ جو کتابچے کی شکل میں تھیں۔ وہ بچہ اس کے بدلے اس سے ہدیہ طلب کرنے لگا۔

علی حمزہ بڑا حیران ہوا۔ کہ قرآن کی آیتیں اور حدیثیں بھی اس طرح سے کوئی بیچتا ہے۔ وہ ان چیزوں سے ان ٹچ ہی سہی مگر یہ ضرور سمجھتا تھا کہ یہ وہ مقدس کتاب ہے۔ جس کی تکریم سب مسلمانوں پر فرض ہے۔

"بے شک دلوں کا اطمینان اللہ کے ذکر میں ہے۔" کتابچے کی مین ہیڈنگ ہی یہی تھی۔ اس بچے سے لے کر ہدیہ دیا اور دھوپ میں بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ اس کا دل خودکشی ویرانے سے کم تھا۔

"علی حمزہ! قرآن پاک بھی پڑھ لیا کرو۔ رمضان میں قرآن مکمل کرنے کا اتنا ثواب ہے۔" مما کی آواز ایک یاد بن کر گونجی تھی۔

وہ پھر سے اداس ہو گیا تھا۔ اداسی کے دورے وقفے وقفے سے الیکٹرک شاک کی طرح اسے لگتے تھے۔

☼ ☼ ☼

نیٹ سرچنگ کے بعد اس نے ایک اسلامک تنظیم جوائن کرلی تھی۔ وہ روزانہ قرآن کی کلاسز لینے لگی۔ علی حمزہ کی محبت اسے کبھی کبھی پچھلا وقت یاد کروانے لگتی۔ مگر۔۔۔ وہ ذہن جھٹکتی۔ مما اور سبرینہ اس سے ناراض ہی رہتیں۔ اس نے تعلیم کو تقریباً "خیرباد کہہ دیا تھا۔ یہ والی تعلیم اسے سکون دے رہی تھی۔

پاپا نے سیفی کو آسٹریلیا بھجوا دیا۔ سبرینہ کے آج کل دو تین پرپوزل آئے ہوئے تھے۔ لوگ اس کو ترحم بھری نظروں سے دیکھتے۔ وہ اب اپنے کمرے میں ہی رہتی۔

سبرینہ نے آج کل کوئی نیا میڈیکیٹڈ فیشل کروایا تھا۔ اس کی رنگت کھلی کھلی سی تھی۔

مما نے بھی پارلر سے سیشن لیے تھے فیشل کے۔۔۔ مشہور ڈیزائنرز کے ڈیزائننگ والے ڈریسز سلوائے گئے۔ سبرینہ کی بات بدرالدین کے بیٹے سجاد سے طے کردی گئی۔ لڑکا خوب صورت اور ہینڈسم تھا۔ آج کل وہ ہواؤں میں تھی۔ نور سحر حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتی۔ یہ رونقیں اب شاید ہی اس کی زندگی کا حصہ بنیں۔ محرومی اور نوازے جانے کا سبق اس نے ازبر کرلیا تھا۔

پاپا نے سبرینہ کے نام آدھا فارم ہاؤس کردیا۔ آدھا نور سحر کے نام جبکہ سیفی کے نام مارکیٹس والی دکانیں

کروں۔

سبرینہ کی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی۔ دونوں ماں بیٹی کے چکر بازاروں میں لگنے لگے۔ نور سحر نے اپنا دھیان قرآن پڑھنے کی طرف لگا لیا۔ کئی چیزیں جو اسے پریشان رکھتی تھیں۔ اس نے اب ان پر سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک روٹین سیٹ اپ میں آ گئی تھی۔ پہلے اس سے وقت گزارنا مشکل ہو جاتا۔ گھر میں سبرینہ کی شادی کی وجہ سے بہت سے کاموں کا بوجھ بڑھ گیا۔

گاؤں سے اس کے کافی ددھیال والے وقت سے قبل ہی آ گئے۔ اس کی بیٹل کی بیساکھی کو ترحم بھری نظروں سے دیکھا جاتا۔ بڑی بڑی آنکھوں والی گھنگھریالے بالوں والی وہ خوب صورت لڑکی تھی۔ بس یہ ہی نقص رہ گیا۔ سبرینہ کی نسبت اس کے ہونٹ بھی بھرے بھرے تھے اور رنگت بھی دودھیا تھی۔

صائم ' احتشام ـــــ مہک پھپھو اور ملائکہ اپنے بڑے بڑے بیگ سنبھالے رہنے آ گئیں۔ مما نے اوپر کا پورشن ان لیے مختص کر دیا۔ ملائکہ بھی الرٹ تھے۔ وہ سب سے الگ تھلگ کمرے میں بیٹھی رہتی۔

صائم کو اپنی یہ کزن کبھی بڑی پسند ـــــ تھی۔ مگر اب وہ بھی یوں کترایا کترایا پھرتا جیسے اسے کسی آسیب نے اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ وہ دونوں ایج فیلو تھے۔ تھوڑی بہت جو گپ شپ رہتی۔ اب وہ بھی برائے نام ہو گئی۔ ملائکہ نے آتے ہی آدھے کام مما اور سبرینہ کے بانٹ لیے۔

گھر میں گہما گہمی کا عالم تھا۔ آصف حیات کو اپنی الگ تھلگ بیٹھی بیٹی کبھی کبھار دکھی کر دیا کرتی۔ ورنہ ہمیشہ اس کی چہچہاٹیں پورے گھر میں سنائی دیتی تھیں۔

پھپھو نے قصوری میتھی کے تڑکے سے پاپا کی پسند کا دال گوشت کا سالن بنایا مسالے کی خوشبو گھر کے پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ شیکسپیئر کا ناول وہیں صوفے پر چھوڑ کر بیساکھی کے سہارے پھپھو کی مدد کے خیال سے کچن میں آ گئی۔

"پھپھو! چاول میں بنا دیتی ہوں۔" وہ لہجے میں مٹھاس لیے بولی۔

پھپھو نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں بیٹا میں بنا لیتی ہوں۔ آج تم میرے ہاتھ کا کھانا کھاؤ گی۔" پھپھو کی نظروں میں ہمیشہ اس کے لیے پیار ہوتا۔ اس کی زندگی میں ایک واحد وہ تھیں جو اسے ترحم بھری نظروں سے نہیں دیکھتی تھیں۔ نور سحر کو ان کی آنکھوں میں ہمیشہ محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا وہ پھپھو کے نہ نہ کرنے پر بھی ان کے ساتھ لگ گئی۔

"بیٹا! تم تھک جاؤ گی۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔" پھپھو نے نجانے کس جذبے کے تحت اسے کہا تھا۔

"نہیں پھپھو میں نہیں تھکتی ـــــ آپ تو میرے لیے ایسا نہ سوچیں ـــــ بس میرا دل چاہ رہا ہے۔ کچھ وقت آپ کے ساتھ گزارنے کو ـــــ" وہ آنکھوں میں آئی نمی کو چھپا کر بولی۔ مہک پھپھو نے محبت سے اسے دیکھا۔ مگر خاموش رہیں۔ وہ کم از کم اس کی دل آزاری کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

سبرینہ ـــــ مما اور ملائکہ شاپنگ کرنے گئی ہوئی تھیں۔ اس نے اور پھپھو نے مل کر کھانا تیار کر لیا۔ پاپا آج گھر ہی تھے۔ وہ لوگ شام پانچ بجے سے پہلے تو کبھی نہ لوٹتیں پاپا بھوک کے کچے تھے۔ پھپھو نے اس کے اپنے اور پاپا کے لیے کھانا لگا دیا۔ بڑے اچھے اور خوشگوار ماحول میں ان تینوں نے کھانا کھایا۔ چیئرز پر بیٹھے یہ دونوں افراد کم از کم نور سحر کے لیے اچھا دل رکھتے تھے۔

"تو آج نور سحر نے کیا بنایا ہے ـــــ؟" پاپا نے ڈھکن اٹھا اٹھا کر ایک ایک ڈش چیک کرتے ہوئے کہا۔

"نور سحر نے میرے ساتھ سارا کام کروایا ہے ـــــ" پھپھو نے پیار سے کہا۔

"جب میری یہ بیٹی ہوئی تھی تو مہک تمہیں یاد ہے نا کہ اماں نے کیا کہا تھا۔" وہ بہن کو اپنی ماں کا حوالہ دے کر کوئی بھولی بسری یاد کو یاد دلا رہے تھے۔

"اماں نے کہا تھا کہ ہماری بیٹی کا نام نور سحر ہو گا۔ جو

صبح کا نور ہو گی۔۔۔ صبح کا اجالا۔۔۔ جس کی ٹھنڈی میٹھی روشنی سے تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ جو نئی زندگی کی نوید سناتی ہے۔ نورِ سحر۔۔۔ کا مطلب ہر اندھیرے کے بعد روشنی کا سفر۔۔۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

پاپا اپنی بات مکمل کرکے پھپھو کی طرف تائید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی بالکل۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اماں نے بڑا پیارا نام رکھا ہماری بیٹی کا۔۔۔" وہ بھی ماں کو سوچ کر تھوڑی آبدیدہ ہو گئیں۔

جبکہ نور سحر سوچ رہی تھی کہ وہ کیسے ہر اندھیرے کے بعد روشنی کا سبب بن سکتی تھی۔

"نور سحر بیٹا! اب اچھی سی چائے بھی پلواؤ۔۔۔" پاپا نے اس کے خیالات منتشر کیے۔ وہ کچن میں چلی آئی۔

"مہک؟ کیا نصیب ہیں میری بیٹی کے۔۔۔" آصف حیات غم زدہ لہجے میں بہن سے بولے۔

"بھائی آپ بھی نا۔۔۔ کیا کمی ہے ہماری بیٹی میں۔۔۔؟ حادثات بھی زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتے ہیں۔" وہ سلاد والی پلیٹ کو واپس اسی کی جگہ رکھ کر سیدھی ہو کر بولیں۔ بھائی کے لہجے میں ٹوٹتی اداسی اور درد کو وہ محسوس کر سکتی تھیں۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم صائم کو۔۔۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر قدرے شرمندگی سے سر جھکا کر چپ کر گئے۔

بیٹیوں کے لیے ماں باپ کی پریشانیاں اور دکھ ایسے بوجھ سروں پر لاد دیتے ہیں کہ ان پشیمانیوں کے زیر اثر انسان کا وجود ذرے سے بھی ہلکا ہو کر رہ جاتا ہے۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی ایسا سوچا ہے۔" مہک پھپھو نے اس کے پاپا کی جھکی گردن کو تقویت دی تھی۔

"میں نے صائم سے بات نہیں کی۔ اس کا راضی ہونا بھی تو ضروری ہے۔ میں بات کروں گی اس سے۔۔۔" ذرا سی ڈھارس نے آصف حیات کو پرسکون کر دیا تھا۔ جبکہ چائے لاتی نور سحر وہیں ڈگمگا گئی۔ بمشکل لرزتے ہاتھوں سے چائے کے کپ ٹیبل پر رکھ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

دکھ ٹانگ کے ٹوٹنے کا نہ تھا نہ اس بات کا کہ صائم کو منانے کے لیے اس کی عزت نفس کو بھی مجروح کیا جا رہا ہے دکھ اس بات کا تھا کہ وہ زندگی کے اس حصے میں محبت کر بیٹھی تھی۔ جب وہ محبت کو ابھی اچھی طرح سمجھ بھی نہ پائی تھی۔

وہ علی حمزہ کی جھمکا البا تھی۔ اسے علی حمزہ ہی چاہیے تھا۔ علی حمزہ کا ہیولا اس کے وجود میں گڑ کر رہ گیا تھا۔ اس کی نفرت۔۔۔ انسلٹ سب ۔۔ کے باوجود اسے علی حمزہ سے محبت تھی۔ وہ جب جب اسے یاد آتا۔۔۔ تب تب اس کا دل اسے بددعا دینے کو بھی نہ چاہتا۔ اس کی بے عزتی دکھ تو دیتی۔۔۔ پر اس کا دل۔۔۔ اسے لگتا کہ اگر علی حمزہ اسے مل جائے تو اسے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا بھی درد بھول جائے۔

وہ جب روتی تو بڑی دعا کرتی کہ وہ ایک دفعہ ضرور علی حمزہ سے ملے۔ اسے بتائے کہ دیکھو دنیا میں کہیں نہ کہیں ایک پاگل لڑکی ابھی بھی اس کے لیے روتی ہے۔ جسے عزت نفس کے اوپر محبت حاوی ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ خود کو لعنت و ملامت بھی کرتی ہے۔ مگر وہ پھر بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ اسے وہ ناپسند ہی سہی مگر اس نے اس سے سچی محبت ضرور کی ہے۔ آج اتنے دنوں کے بعد پھر دل میں علی حمزہ علی حمزہ کا شور برپا ہوا تھا۔

وہ کپکپاتے ہاتھوں سے اپنا موبائل اٹھا کر بیٹھی۔۔۔

"میں تمہارے لیے اپنی محبت کو کم نہیں کر پا رہی۔ مجھے پتا ہے کہ میں ایک ناکارہ انسان بن چکی ہوں۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ والی جھمکا البا تمہیں کہاں یاد رہی ہو گی؟ مگر تم ایک یاد بن کر آج بھی میرے دل میں ہلچل مچانے آجاتے ہو۔ علی حمزہ! میرے بس میں نہیں۔۔۔ ایکسٹریملی سوری۔۔۔ میں تمہیں نہیں بھول پا رہی۔ شاید تمہیں میں زہر لگتی ہوں یا تم میرا میسج بھی پڑھے بغیر ڈیلیٹ کر دو یا مجھے دنیا کی سب سے بری لڑکی سمجھو مگر مجھے نہیں سمجھ آرہی کہ میں اپنے دکھ کو کس طرح سے تمہیں سمجھاؤں کہ تمہارا نہ ہونا مجھے

سب سے زیادہ دکھی کر دیتا ہے۔"

وہ ٹین ایجر تھی اور ٹین ایجر میں کی جانے والی محبتیں عقل سے دور ہی ہوتی ہیں۔ بلکہ محبت ہوتی ہی عقل سے دور جا کر ہے۔ وہ محبت میں پاکیزگی کو سمجھ سکتی تھی۔ مگر دل کی بے چینیوں کو سمجھا نہیں پا رہی تھی۔

ٹیکسٹ send کر کے وہ صوفے پر سر رکھے روتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

ٹیرس پر بیٹھے علی حمزہ نے خود کو خیالوں سے باہر نکالا ۔ میسج ٹون نے اسے متوجہ کیا تھا۔ اس کا اب دل ہی نہ کرتا کہ وہ موبائل کو ہاتھ بھی لگائے۔

مگر نہ چاہتے ہوئے بھی دل میں کوئی چیز کھنچاؤ پیدا کر رہی تھی۔

یہ قدرتی امر ہے۔ اگر آپ دنیا میں شدت سے کسی شخص کو یاد کریں تو وہ یقیناً" آپ کو یاد کرے گا۔ چاہے وہ آپ سے میلوں دور ہو۔ مگر جب آپ کسی کی یاد میں اپنے قیمتی آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے لیے بلکتے اور تڑپتے ہیں تو لازما" متعلقہ شخص تک آپ کی شدتوں کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور پہنچ جائے گا۔

علی حمزہ نے میسج پڑھا۔ وہ وہیں ساکت بیٹھا رہ گیا۔ وہ خاموش۔۔۔۔ چپ تھا۔

آج اس نے اس کے میسج کو ڈیلیٹ نہیں کیا تھا۔ ہاں مگر محفوظ کر لیا تھا۔

آج اس نے اپنے دوست احمد کے بابا عبدالباسط باقی کے پاس جانا تھا۔ انہوں نے اس کے لیے ایک کوریا کی ایجنسی میں ملازمت ڈھونڈی تھی۔ وہ اپنے پیپرز مکمل کر رہا تھا۔ اس طرح کے فیوچر کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس کی مما کا خواب تھا کہ وہ اسے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز باہر کی کسی مشہور یونیورسٹی سے کروائیں۔ اب اس کی پرسنٹ ایج پر کوئی پریشان ہونے والا نہ تھا۔ اس کی سرگرمیوں کی طرف کوئی نظر رکھنے والا نہ تھا۔ مما نے آج تک

اس سے بابا کی بھی کوئی بات نہ کی تھی۔ کاش۔۔۔ وہ ان سے مل سکتا۔ اکیلی زندگی وحشت زدہ لگتی تھی۔

وہ دن میں ہزاروں بار کلمہ پڑھتا۔ مما کے آخری لمحات میں وہ کلمہ نہیں پڑھ سکا تھا۔

وہ گھبرا گیا تھا۔۔۔ پریشان ہو گیا تھا۔ پتا نہیں وہ آخری لمحے میں ماں کی خواہش کیوں نہ پوری کر سکا۔ بہت سارے پچھتاووں میں اسے یہ بھی بڑا پچھتاوا تھا۔

وہ اس بات پر جتنا بھی پشیمان ہوتا اتنا کم تھا۔ ہوا بالکونی میں لگے سوکھے پتوں کو ہلا کر چلی گئی۔ شام کی سیاہی پھیلنے لگی۔ وہ ٹیرس سے اٹھ کر اپنے کمرے کی اداسی میں آگیا۔

ظہور چچا وغیرہ بھی اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ علی حمزہ کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ ان کی فیملی افورڈ کرتا۔ گھر کے زیادہ تر کام وہ خود کرنے لگا۔ اکیلے لڑکے کو دیکھ کر کوئی نوکرانی بھی نہیں آتی — وہ کچن میں چائے بنانے کے لیے چلا آیا۔ مگر خالی ڈبوں نے اسے سمجھایا تھا کہ ڈپریشن اور اداسی کے علاوہ بھی زندگی کی چند حقیقتیں جوں کی توں ہیں۔ ابھی ان سے بھی نبرد آزما ہونا ہے۔

چچا ظہور۔۔۔ اس کی بیوی اور مما والے سارے کام اب اسے کرنے تھے۔ وہ پریشان سا ہو کر بیٹھ گیا۔

پھر سارا گھر لاک کر کے چابیاں اٹھائے باہر آگیا۔ اس کا ارادہ ذکی کی طرف جانے کا تھا۔ وہ جیولرز مارکیٹ کی پچھلی کالونی میں رہتا تھا۔ اس نے اسٹابری کے موسم کے مطابق اسٹابریز خریدیں اور ذکی کے ہاں چلا آیا۔

ذکی کی مما۔۔۔ مہوش آنٹی بڑے پرتپاک انداز میں اس سے ملیں۔ ذکی اسے اپنے کمرے میں ہی لے آیا۔

"ان کا شیک بنوا دو۔۔۔" وہ اسٹابریز اسے پکڑاتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔۔۔" وہ اس سے اسٹابری لے کر باہر چلا گیا۔ اکثر ذکی کے گھر آکر وہ کچھ نہ کچھ بنواتا رہتا۔

زندگی ایک عجیب فیز سے گزر رہی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو تکیہ بنا کر وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کھو جانے کا دکھ بہت زیادہ ہوتا ہے اور

زندگی کا ننیوکلئیس ہی کھو جائے تو سارا سیل خراب ہو جاتا ہے۔ انسان ان جانداروں کی طرح بن جاتا ہے۔ جو اپنی خوراک بھی خود نہیں تیار کر سکتے۔
کبھی وہ ذکی کی طرف ہوتا..... کبھی طلحہ کی طرف ..... مگر کب تک؟
آج اس کا پروگرام جمعہ پڑھنے کا بھی تھا۔ ورنہ ہر جمعہ کو وہ مما سے سو سو بہانے کیا کرتا تھا۔
مگر اب وہ ہر کام کرتا..... جو لاشعوری طور پر اس کی ماں کی روح کو خوشی بخشتے۔ اس نے گھر جا کر اپنا سفید کرتا بھی خود پریس کیا۔
"مما! میں جمعہ پڑھنے جا رہا ہوں....." ماں کی تصویر سے اس نے باتیں کرنا سیکھ لیں۔
جمعہ کی جماعت میں شامل ہو کر اس نے بڑی توجہ سے نماز پڑھی۔ ورنہ ہمیشہ وہ بس مارے باندھے وقت پورا کرتا تھا۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے اس کی ہچکیاں خود بخود بندھ گئی تھیں۔
اسے بار بار مما کا نیم وا کھلا منہ آنکھوں کے سامنے نظر آجاتا۔ جہاں ایک ہی فقرہ ثبت ہو گیا تھا۔ "علی حمزہ مجھے کلمہ سناؤ....."
"رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور اللہ شرمندہ بھی نہیں کرتا اپنے بندے کو..... کسی اور کے سامنے رونے سے بڑی شرمساری محسوس ہوتی ہے۔"
وہ اسی کی عمر کا لڑکا تھا۔ جو اس کے قریب آکر بولا۔
علی حمزہ نے آنکھیں رگڑیں..... اور اس کی طرف دیکھا۔ اس انجان لڑکے نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
"میرا نام عمر فاروق ہے..... اور یہ مسجد ہماری اپنی ہے..... آج سے پہلے آپ کو نہیں ــ دیکھا....." وہ بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اسی لیے اپنا تعارف کروانے لگا۔
"آج سے پہلے میں اس مسجد میں کبھی آیا جو نہیں ..... شاذو نادر ہی جمعہ کی نماز پڑھتا وہ بھی اس وقت جب ہر مسجد میں جمعہ کا وقت نکل چکا ہوتا بس کبھی کبھار جہاں تھوڑا ٹائم ہوتا وہیں جا کر پڑھ لیتا۔"

علی حمزہ بغیر شرمندگی کے بڑے آرام سے بولا۔
"پھر آج کیسے؟" وہ تکلفات کو دور پھینکے بے تکلف ہو گیا۔
"تاکہ میری عادت بن جائے نماز پڑھنے کی..... ورنہ مجھے بھی آخری وقت میں بہت ساری چیزیں بھول جائیں گی....."
"اچھی سوچ ہے..... انسان کو جینے اور مرنے دونوں کے طریقے سلیقے سیکھنے چاہئیں....."
"اچھا میں اب چلتا ہوں....." علی حمزہ اسے سلام کیے باہر نکل آیا۔ جبکہ عمر فاروق وہیں پر کھڑا اسے کافی دیر دیکھتا رہا۔
جس کوریا کی ایجنسی میں اسے جاب ملی تھی۔ وہاں زیادہ تر کام غیر قانونی ہوتا۔ علی حمزہ دو دن کے بعد گھر بیٹھ گیا۔ اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ کہیں جانے کو دوبارہ سے ٹیوشنز تلاش کرنی شروع کر دیں۔ ایک جگہ سے ٹیوشن مل گئی۔ کسی اکیڈمی نے اسے وہاں recomend کیا تھا۔
جہاں تین بچوں کو ہوم ٹیوشن دینی تھی۔
وہ اپنی بائیک پر دوپہر کی گرمی برداشت کرتے اس ایڈریس پر پہنچ ہی گیا۔ اطلاعی گھنٹی بجا کر وہ کتنی ہی دیر کھڑا رہا تھا۔ پھر چوکیدار نے شکل دکھائی تو علی حمزہ نے اپنا تعارف کروایا۔ یہ زمان مقصود کا گھر تھا۔ ان کی بیوی نے اپنے تینوں بچوں کا تعارف کروایا۔ علیزے..... عبان..... اور عبیر
علی حمزہ نے دس، بارہ اور پندرہ سالہ ان بچوں کو غور سے دیکھا۔ اسے اپنا بچپن یاد آگیا۔ وہی اسٹائل وہی طور طریقے.....
"سر! آج آپ اپنا تعارف کروائیں آج ہم نے نہیں پڑھنا....." ان کی بڑی بیٹی علیزے بولی۔
علی حمزہ نے تحمل سے اپنا تعارف کروایا بچے موویز کی..... گانوں کی..... اسکولز کی اس سے باتیں کرتے رہے۔
اگلے دن سے اس نے باقاعدہ پڑھانا شروع کر دیا۔
مگر تین چار دنوں میں ہی علی حمزہ کو محسوس ہو گیا تھا

کہ اس کے پاس ایک ٹف ٹاسک آچکا ہے۔ تینوں بگڑے ہوئے تھے۔ ماں باپ نے دو دو موبائل لے کر دے رکھے تھے۔ کھانا پینا اور اڑانا بس یہ ہی سب تھا۔ کبھی وہ بھی ایسا ہی تھا۔ مگر حالات اسے کہاں لے آئے تھے۔ اس نے آج انہیں میتھس کی پریکٹس کروائی تھی۔

وہ بائیک پر مقررہ ٹائم سے ذرا پہلے ہی پہنچ گیا۔ اس کالونی میں ہر گھر کے سامنے چھوٹا سا لان بنا ہوا تھا اور تقریباً" ہر گھر میں ہی بیلیں لگی ہوئی تھیں۔ علی حمزہ نے بطور خاص نوٹ کیا تھا کہ ہر گھر کی بیلوں پر کھلے پھولوں کا رنگ ایک دوسرے سے جدا جدا تھا۔

وہ بائیک کو لگ لگا کر اسٹینڈ پر کھڑا کر کے نیچے اترا۔ سامنے والے گھر کے بلیک گیٹ سے ایک ہپی ٹائپ بچہ برآمد ہوا۔

کانوں میں ہینڈ فری لگائے یقیناً" اس کے گانوں سے محظوظ ہوتا وہ بائیں ہاتھ سے کیک پکڑے، اسے مزے سے کھا رہا تھا۔ علی حمزہ کو کچھ ماہ پہلے کا منظر یاد آیا۔

"حمزہ! سیدھے ہاتھ سے کھایا کرو۔۔۔"

سمندر سے گہری گہرائی کے اندر سے کوئی آواز دور سے اسے سنائی دی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ مقدر کیا ہوتے ہیں اور دنیا میں مقدر کے سکندر کون کون بنتے ہیں۔ وہ کھلنڈرا نوجوان تھا۔ جس کی ذہنی حالت پچھلے تین ماہ سے اس قدر تیزی سے تبدیل ہوئی تھی کہ اسے لگتا کہ وہ اپنی عمر سے پانچ سال آگے چلا گیا ہے' وہ سر جھٹکتا اندر چلا گیا۔

بچوں نے پہلے سے زیادہ اسے تنگ کیا تھا۔ کبھی وہ بھی یونہی پرابلم چائلڈ تھا۔ علی حمزہ کو شخصیت کی پراگندگی کا اندازہ اچھی طرح ہو رہا تھا۔

"سر! آج نہیں پڑھنا۔۔۔ آج مما پاپا گھر نہیں ہیں۔۔۔ ہمیں انجوائے کرنا ہے۔" پہلے والے صاحبزادے نے آتے ہی اسے یہ کہہ دیا۔

وہ جو صوفے پر بیٹھ کر پڑھانے کا موڈ بنائے کھڑا تھا۔ ایک دم غصے میں آگیا۔

"کیوں نہیں پڑھنا؟ تم لوگوں نے روز کا تماشا بنایا ہوا ہے۔ آج تو پڑھنا ہی ہے۔ تمہاری مما پھر مجھ سے کہیں گی۔۔۔" وہ انہیں گھورتے ہوئے بولا۔

"سر کوئی بات نہیں میری 7.5 ایکسائز ہے' وہ مجھے آتی ہے اور عباد اور عبیو کو بھی سائنس کا پچھلا ہی ٹیسٹ ملا ہے۔ ہم آج مزے کرتے ہیں۔ آپ بھی آجائیں۔" علیزے اپنی موٹی موٹی براؤن آنکھوں کے اوپر پلکوں کی جھالر اٹھاتے اور گراتے ہوئے بولی۔ اس کے اس اسٹائل پر اسے کچھ یاد آیا تھا۔ بارش کا وہ سین جب وہ اور اس کی جیسکا البا۔۔۔ مما سے چھپ چھپ کے ملنا۔۔۔ میٹرک میں ہی وہ لڑکی اسے اچھی لگنی شروع ہوئی تھی۔ انٹرمیڈیٹ تک سارے جہان کے سارے گانے وہ اسی کے لیے سنتا اور پھر وہ واقعہ پیش آگیا۔ اس کی جیسکا ایک ٹانگ کھو بیٹھی۔۔۔ اور وہ سب بھول گیا۔ اوائل عمروں کی محبتیں یونہی پانی کے بلبلوں کی مانند ہوتی ہیں۔ جو پانی کی سطح پر وقتی لہر کے جوش میں آنے سے ابھر تو جاتے ہیں۔ مگر پھر اتنی ہی جلدی غائب بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر اب بھی دل کے پانی میں وہ ہی بلبلے بار بار بننا شروع ہو گئے تھے۔ وہ سر جھٹک کر بچوں کے ساتھ پھر مگن ہو گیا۔

بچوں نے بیج طوفان بدتمیزی مچایا۔۔۔ علی حمزہ کو آج غصہ بھی آرہا تھا اور افسوس بھی۔۔۔ پہلے انہوں نے اپنے پسندیدہ سنگرز کے گانے لگا کر ان پر ڈانس کیا۔ پھر اس سے اکتا کر۔۔۔ اسے بھی باہر لان میں لے آئے۔۔۔ اور میچ کھیلنا شروع کر دیا۔ علیزے اس کے پاس سفید کرسیوں کے قریب آکر بولی۔

"سر! آپ کو پتا ہے کہ آپ کتنے خوب صورت لگتے ہیں۔ رنبیر کپور لگتے ہیں۔۔۔" علی حمزہ کو اس کی بات بڑی بری لگی۔

"مگر آپ بچی لگتی ہیں۔۔۔ کوئی ہیروئین نہیں۔۔۔" وہ لفظ چبا چبا کر بولا۔

"اتنی بھی بچی نہیں پورے پندرہ سال کی ہوں۔۔۔ آپ مجھ سے چار پانچ یا زیادہ سے زیادہ چھ سال ہی بڑے ہوں گے۔۔۔"

"آپ خود کا میرے ساتھ کیوں موازنہ کر رہی ہیں ۔۔۔" وہ اسے وہیں ٹوک کر سخت لہجے میں بولا۔

"سر! میں آپ کی گرل فرینڈ بننا چاہتی ہوں۔۔۔ میرا ابھی تک کوئی بوائے فرینڈ نہیں بنا۔" وہ منہ بنا کر بولی' جیسے علی حمزہ کا سخت لہجہ اسے پسند نہ آیا ہو۔

"مگر مجھے ایسے لوگ زہر لگتے ہیں۔۔۔ میں نہیں بنوں گا۔۔۔ میں یہاں پڑھانے آتا ہوں۔۔۔ آپ کی مما یا پاپا کو آنے دو۔۔۔ میں ان سے بات کرتا ہوں۔" وہ غصے سے بولا۔

علیزے چپ کر گئی۔ مگر اسے ناگوار ضرور گزرا تھا۔ علی حمزہ پھر تھوڑی دیر وہاں رک کر گھر آگیا۔

دوسرے دن ایک ہنگامہ نہیں بلکہ ایک نیا ڈراما تیار تھا۔

علیزے ایک پوری جھوٹی کہانی تیار کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔

مسز زمان اپنی نیلے پھولوں والی ساڑھی سنبھالتی ٹک ٹک کرتی اس کے سر پر پہنچ گئیں۔

"میں پہلے ہی ایسے نوجوان کو ٹیوٹر رکھنے کے حق میں نہیں تھی۔ تمہاری بدنیتی کا اتنی جلدی اندازہ ہو جائے گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تم نے علیزے کو کل کتنی گھٹیا بات کی ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ دھکے مار کر باہر نکال دوں۔ تمہیں گرل فرینڈ بنانے کے لیے کوئی اور نہیں ملی تھی۔ میری معصوم سی بچی ۔۔۔ ورغلانے کے لیے تمہیں یہی ملی تھی۔" وہ بمشکل غصے کو قابو میں لاتے ہوئے بولیں۔ علی حمزہ اتنی الٹ بات پر ہکا بکا اسے دیکھے گیا۔ وہ ان عورتوں میں سے تھیں۔ جو کسی کی بات سننا گوارا نہیں کرتی تھیں۔ صرف اپنے ہی فیصلے۔۔۔ اپنی ہی باتیں سنانے کی عادی تھیں۔

"میری غلطی نہیں۔۔۔ علیزے جھوٹ بولتی ہے۔ وہ میرے لیے بچی ہے۔ وہ آپ سے غلط بیانی کر رہی ہے۔۔۔"

وہ جتنا لوز نمبر تھا۔ اسے اتنا ہی متحمل مزاج ہونا پڑ رہا تھا۔

"بکواس اپنی بند کرو اور نکلو یہاں سے۔۔۔ آج کے بعد نظر نہ آنا۔۔۔" وہ غصے سے پھنکارتی بڑے کروفر سے اپنی ساڑھی کے پلو کو زمین پر گھسیٹتے وہاں سے چلی گئیں۔ علی حمزہ تذلیل اور ہتک کے احساس سے وہاں سے اٹھ آیا۔

وہ بڑا ہی دلبرداشتہ ہوا۔

میگا اسٹارز کی پچھلی گلی سے گزرتے ہوئے اسے بلیک دیوار کے اوپر چاک سے لکھے ہوئے اقتباس نے بے اختیار متوجہ کیا تھا۔

"میں گمشدہ نسل کا ایک حصہ ہوں اور میں اس بات کو ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ میں دنیا بدل سکتا ہوں۔"

وہ ایک سال پہلے گمشدہ نسل میں شمار نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ آج کی نسل کا ہی بچہ تھا۔ جسے حالات اور وقت نے گمشدہ کر دیا تھا۔ اس کے ارد گرد کوئی ایسا نہ تھا۔ جس کے سامنے وہ روتا۔۔۔ وہ اکیس یا بائیس سال کا ایک ایسا نوجوان تھا۔ جو فر فر انگریزی بول سکتا تھا۔ اپنا بہترین اکیڈمک ریکارڈ دکھا سکتا تھا' جو کہ اب مزید پڑھائی کو بھی اتنے شاندار طریقے سے جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ مگر اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہو گئی تھی کہ اسے دنیا میں ہوتے ہوئے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور اگر وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ مر جاتا۔۔۔ تو کتنا اچھا ہوتا۔

علی حمزہ۔۔۔ عمر فاروق سے ملا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سامنے رو پڑا۔۔۔ اپنا بچپن۔۔۔ اپنی ماں ۔۔۔ اپنی زندگی۔۔۔ اس کے پاس صرف چند یہ ہی باتیں تھیں بتانے کو۔۔۔

عمر فاروق نے اسے اپنے ساتھ مسجد میں رہنے کی دعوت دی تھی۔

عمر فاروق کا گھر مسجد کی اوپری منزل پر تھا۔ جہاں اس کی ماں کے ہمراہ اس کے دو بھائی اور رہتے تھے۔ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ اس کا باپ امام مسجد تھا اور یہاں ایک انٹیریئر ڈیزائنر تھی۔ وہ جو مولویوں کی زندگی کا تصور رکھے ہوئے تھا۔ اس سے قدرے دور یہ کوئی اور ہی دنیا تھی۔

علی حمزہ کو وہ اپنے ہمراہ اپنی ماں سے ملوانے گیا۔ گلابی سے گالوں والی چادر میں لپٹی اس کی ماں سراپا میں گلابی ٹھنڈی میٹھی دھوپ کا پرتو لگ رہی تھی۔ لکڑی کی درزوں سے آتی چھن چھن روشنی کا نور۔۔۔ چار سو پھیلا ہوا تھا۔ وہ اتنی محبت اور نرمی سے علی حمزہ سے ملیں۔

"بیٹا! میں آپ کے لیے لیمن جوس لاتی ہوں۔۔۔ آپ لوگ بیٹھو۔۔۔" وہاں نہ میز تھی نہ کرسی۔۔۔ ساری عمر وہ ٹیبل مینرز کا عادی رہا تھا۔ خوب صورت پھولوں سے مزین صاف ستھری تپائی بچھی تھی۔ جہاں دو گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ وہ عمر فاروق کے ساتھ جوتا اتار کر وہیں بیٹھ گیا۔ وہ ان دونوں کے لیے لیمن جوس کے ہمراہ گھر کے بنے نگٹس لے کر آئی تھیں۔

علی حمزہ کھانے لگا۔۔۔ تو عمر کی مما نے تھوڑی اونچی آواز میں بسم اللہ پڑھی تھی۔ مطلب علی حمزہ کو یہ سمجھانا مقصود تھا کہ کوئی بھی چیز کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے ہیں ــــــــــــــــ اگر بھول گیا تو اسے یاد آجائے۔

وہ چھوٹے چھوٹے سوال اس سے کرتی رہیں۔ وہ جواب دیتا رہا۔ عمر فاروق کے دونوں بھائی عبدالقدوس اور عثمان بھی آگئے۔ ان میں سے ایک انجینئر بن رہا تھا اور ایک آئی سی ایس کا طالب علم تھا۔ وہ حیران تھا کہ یہ لوگ مسجد میں رہتے ہوئے ایسی تعلیم کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ آج کل کے بچوں میں تعلیم کا تصور دو طرح سے ہے۔ ایک یہ کہ ہم سائنس 'میتھس' انگلش 'کمپیوٹر پڑھ رہے ہیں۔ تو قرآن کا بس ناظرہ پڑھ لو۔ ان سبجیکٹس میں ناغہ نہ کرو۔ مگر قرآن چاہے دس دن چھوڑ کر بھی پڑھ لو۔ چاہے پورا پورا سال پڑھو ہی نہ۔۔۔ اگر کوئی قرآن کا ترجمہ پڑھے یا حافظ بن رہا ہو۔ پانچ وقت کی نماز ادا کر رہا ہو۔ تو یقیناً "وہ کسی مذہبی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ باقی سارے ویسے تو مسلمان ہیں۔ مگر ان کا کسی قسم کا مذہبی ماحول نہیں ہے۔ اگر کوئی رکھنا چاہے تو وہ rigid (کٹر) ہے۔ پھر وہ لوگ جو قرآن کو سیکھتے بھی ہیں۔ اس پہ عمل بھی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ڈاکٹرز بھی بن جاتے ہیں۔۔۔ انجینئرز بھی بن جاتے ہیں۔۔۔ یہ بات نہ صرف حیران کن لگتی ہے بلکہ متاثر کن بھی۔۔۔

علی حمزہ کو اپنے گھر آئی مما کی وہ دوست یاد آگئی۔ جو اس ڈر سے اپنی بیٹی کو قرآن پاک کا ترجمہ نہیں پڑھانا چاہ رہی تھی کہ وقت سے پہلے اسے ساری باتوں کا علم ہو جائے گا کیونکہ قرآن کے احکام واضح ہیں۔ مگر بچے جو نیٹ سے ساری باتیں سیکھ رہے ہیں اس کا کوئی پتا نہیں اسے اپنی اور علیزے کی مثال سے بڑا کچھ سمجھ آیا تھا۔

وہ اپنے اندر اٹھنے والے سوالات دبا نہ سکا تھا۔

"آنٹی! آپ نے کافی پڑھا ہے۔۔۔ آپ کے بچے بھی پڑھ رہے ہیں۔۔۔ مگر یہ ماحول اور یہ ساری سیٹنگ۔۔۔؟" وہ حیران تھا اور سوالات صحیح پیرائے میں بیان بھی نہ کر سکا۔

مگر عمر فاروق کی زبانی وہ علی حمزہ کے پس منظر سے اچھی طرح واقف تھیں۔

"بیٹا! آپ ایک بات سمجھ لیں۔ جب ماں باپ اپنے بچوں کو پورا قرآن سکھا دیں۔۔۔ اس کے احکامات سمجھا دیں۔ پھر کسی بھی قسم کی تربیت کی ضرورت نہیں رہتی۔۔۔ کسی بھی قسم کی روک ٹوک نہیں کرنی پڑتی۔۔۔" وہ مختصر سا بول کر برتن اٹھا کر رکھنے چلی گئیں۔ وہ جتنی دیر وہاں بیٹھا ان گنت سوالوں کا انبار اس کے سر پر سوار رہا۔

وہ گھر آگیا۔ ایک نیا دن گزار کر۔۔۔ جس کی شروعات علیزے کے گھر سے ہوئی تھی اور بے شک دن کا آغاز انتہائی برا ہوا تھا مگر اس کا اختتام۔۔۔؟

انسان کا آغاز چاہے کیسا بھی ہو۔ بس اختتام برا نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کو نہیں پتا ہوتا کہ وہ غریب کسان کے گھر پیدا ہو رہا ہے یا کسی وزیراعظم کے گھر۔۔۔ وزیراعظم کی بجائے اگر آخرت میں کسان کا بیٹا جیت گیا تو۔۔۔؟

پورے اعضاء اور پوری عقل والے انسان کی بجائے اگر آخرت میں معذور اور کم علم رکھنے والا جیت گیا

تو۔۔۔؟

سب کو آغاز بھول جاتا ہے اگر اختتام خوب صورت ہو۔۔۔ اگر اختتام برا ہو تو آغاز سب سے پہلے یاد آتا ہے۔۔۔ اچھے اختتام پر برا آغاز بھی اچھا لگتا ہے اور برے اختتام پر آغاز کی بھی دھجیاں لوگ اڑانے لگتے ہیں۔۔۔

"آنٹی! مجھے بھی قرآن سکھائیں۔۔۔ میں اتنا خوش قسمت نہیں کہ میں اتنے منظر دیکھ کر بھی زندگی کو ڈھنگ سے گزارنے کا طریقہ سیکھ سکوں۔۔۔" وہ دوسرے دن پھر عمر فاروق کے گھر اس کی ماں کے روبرو ہوا۔۔۔

وہ اس کی بات پر مسکرا دیں۔ "تم بہت خوش قسمت ہو۔ جو اپنے منہ سے اور دل سے یہ بات کہہ رہے ہو کہ تمہیں قرآن سیکھنا ہے۔ لوگ اتنی اتنی عمر کو پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ موت ان کو آکر گھیر لیتی ہے۔ پھر بھی انہیں سمجھ نہیں آتی کہ وہ زندگی کو کس ڈھنگ سے گزار گئے۔ تم پر تو بیٹے! اللہ کا خاص کرم ہے۔ جو اس پاک ذات نے تمہارے دل سے یہ کہلوا دیا۔۔۔"

علی حمزہ کی آنکھوں میں نمی سی چمکی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ کچھ کھو چکا تھا۔ ہمیشہ وہ اپنے حصے کی خوشیوں کے کھو جانے پر روتا آیا تھا۔ آج کچھ پا لینے کے جذبے نے اس کی آنکھیں روشن کی تھیں۔

علی حمزہ کے لیے نئی دنیا کھل گئی تھی۔ اسے وہ وقت یاد آتا جب اس کا فیورٹ یو یو ہنی سنگھ۔۔۔ اور عاطف اسلم وغیرہ ہوتے۔۔۔ جب بے ہنگم ڈانس کا شور اسے محظوظ کرتا۔۔۔ یہ کوئی اتنا لمبا عرصہ نہ تھا۔ ایک سال پہلے کی ہی بات تھی۔ اس کے لیے یہ سال ایک صدی بن گیا تھا۔ اتنی تیزی سے اس کی ذہنی حالت تبدیل ہوئی تھی کہ وہ خود بھی حیران رہ جاتا۔ شکیرا کو دیکھے بغیر اسے نیند نہ آتی۔۔۔ برٹنی اسپیئرز اور جیسکا کے پورٹ فولیو اس کے پاس بنے پڑے تھے۔ وہ تصور میں خود کو ہمیشہ مستقبل میں ہالی ووڈ کا ایکٹر دیکھتا۔۔۔ مگر اب وہ سوچتا کہ وہ کیڑا تھا جو کچرے سے رزق تلاش کرتے کرتے یکدم پاک جگہ پر کھڑا کر دیا گیا۔

وہ جو مولویوں کا مذاق اڑاتا۔۔۔ وہ سمجھتا تھا کہ مذہبی لوگوں کے درمیان بیٹھ کر زندگی بے رنگ ہو جاتی ہے۔ مذہبی لوگ کلرلیس ہوتے ہیں۔ جو نصیحتیں کر کر کے زندگی کی رونقیں ختم کر دیتے ہیں۔ مگر اب اسے لگتا کہ یہ لوگ کلرلیس نہیں ہوتے بلکہ آکسیجن ہوتے ہیں۔ جب زندگی اختتام کو پہنچنے لگتی ہے۔ جب جسم کو تو آکسیجن مل رہی ہوتی مگر روح تک نہیں پہنچ پاتی۔۔۔ تب یہ لوگ آپ کی مردہ ہوتی روحوں کو زندہ کرتے ہیں۔ اصل دنیا کی رونقیں انہیں لوگوں کے دم سے ہیں۔

آج بھی وہ ویسا ہی دبلا پتلا۔۔۔ لمبا خوب صورت نوجوان تھا۔ جس پر کالج کی لڑکیاں مرتیں تو وہ اتراتے نہ تھکتا تھا۔ مگر اب اسے لگتا اتنا خوب صورت جسم اگر آگ میں جھونک دیا جاتا تو۔۔۔ آج بھی اسے اپنی ماں کا آخری وقت یاد آتا اور اس کا دل خشک پتوں کے اس ڈھیری کی مانند پھونک بن کر اڑ جاتا جو ہلکی ہوا کے دھکے سے بھی منٹوں میں اپنی جگہ چھوڑ جاتے۔

مگر اس کے دل کی آواز ایک پرانی یاد کو پھر سے بلاتی۔۔۔ اسے اب جیسکا البا نہیں پر نور سحر بڑی یاد آتی۔ اسے اس کی ٹوٹی ٹانگ۔۔۔ آنکھوں کی نمی۔۔۔ اور اس کی بے اختیاری۔۔۔ پر اپنے دل پر بھی اختیار نہ رہتا۔ وہ دونوں غلط تھے اور غلط طریقے والی محبت میں مبتلا۔۔۔ غلط رستوں کے ہم سفر۔۔۔

اب زندگی کا یوٹرن چیلنج ہو گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

درختوں اور سبزے میں گھرا وہ فارم ہاؤس۔ جہاں لکڑی کی بنی دیواروں کے گرد کاسنی پھولوں کی بیلیں سر نیہواڑے کھڑی تھیں۔ جہاں سرما۔۔۔ کی دھوپ اور گرما کے بادل بھی خوشی نہیں پہنچا رہے تھے۔

اور پچھلے دروازے کے گول حصے کے درمیان بیٹھی۔۔۔ وہ اداس لڑکی۔۔۔ اپنے حصے کی خوشیوں کے روٹھ

جانے پر غمزدہ نہ تھی۔ بلکہ اپنے اس نقص کی وجہ سے غمزدہ تھی جس کے بعد اسے اس کی محبت نہیں مل سکتی تھی۔ اس کی ٹوٹی ٹانگ نے اس کے اور اس کی محبت کے درمیان لمبی فصیلیں گاڑدی تھیں۔

وہ موٹے موٹے گلابی ہونٹوں والی۔۔۔ سنہری آنکھوں والی پیاری سی لڑکی۔۔۔ ہر چھوٹی سی بات پر روتی تھی۔

اسے جیسکا البا سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ نور سحر تھی۔۔۔ اس کے بابا کہتے وہ دن کی روشنی ہے اور دن کی روشنی پاکیزہ ہی اچھی لگتی ہے۔

وہ ڈپریشن کے دوروں سے بچنے کے لیے نماز پڑھتی۔۔۔ خود ہی نیٹ سے سرچ کر کر کے قرآن سیکھتی۔۔۔ قرآن نے ہی اسے سکھایا تھا کہ جہاں ناممکن کا لفظ آجائے زندگی میں۔۔۔ وہاں ممکن کے لیے اقدامات پیدا کرنا اللہ کا کام ہے۔۔۔ بس مانگنا تمہارا کام ہے۔

اور وہ علی حمزہ کو مانگتی تھی۔

وہ محبت کی اس پہاڑی پر پہنچ گئی تھی۔ جہاں سے نیچے اترنا۔۔۔ اسے عذاب لگ رہا تھا۔

سبرینہ اپنے ہسبنڈ کے ساتھ بیرون ملک چلی گئی۔ عائمہ کو ہر وقت اس کی فکر ستانے لگی۔ جبکہ آصف نے اپنا دھیان کاروبار کی مصروفیت میں بڑ کر لیا تھا۔ جوان بیٹی کا دکھ ماں باپ دونوں کے لیے تکلیف دہ تھا۔

اور وہ خود جیسے بوسیدہ فریم میں اداس تصویر کی مانند زندگی کے منظر نامے پر منجمد ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
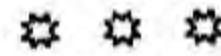
عمر فاروق کو پودے بڑے اچھے لگتے تھے۔ وہ اور علی حمزہ قریبی پارک میں چلے جاتے۔۔۔ جو عمر فاروق کے بابا نے ہی بنوایا تھا۔ ایک بنجر زمین کو ہموار کر کے پارک کی شکل دینے میں بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔

وہ علی حمزہ کو گوڈی کرنا سکھاتا پودوں کی نشوونما سے متعلق باتیں کرتا۔ اتنے نرم لوگوں کے احساسات بھی یونہی نرم گرم تھے۔ علی حمزہ کو ایک فیصد بھی ان پھول

۔۔۔ پودوں اور پیڑوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر عمر فاروق کی خاطر وہ بھی دلچسپی لینے لگا تھا اور رفتہ رفتہ اسے بھی ان میں حقیقی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی ترجیحات اور دلچسپیاں بدلتی جا رہی تھیں۔ وہ صبح میں واک کرنے کے بعد قرآن کی کلاس لیتا۔ پھر مقامی بڑے سپر اسٹور پر ری ٹیلر کی جاب کرتا۔ دو بجے وہ عمر فاروق کی مسجد میں نماز کی ادائیگی کر کے وہیں اس کی ماں کے ہاتھ کا بنا کھانا کھاتا۔ یہ بھی آنٹی کی سخت تاکید تھی کہ شادی ہونے تک علی حمزہ ان کے ہاں لنچ کیا کرے گا۔ مورننگ اور ایوننگ میں چاہے کچھ ہلکا پھلکا کھا لیا جائے۔ مگر لنچ میں ہمیشہ سب کو زوروں کی بھوک لگتی ہے۔

اس کی ڈائری جو مما کے زمانے سے اس کے پاس تھی۔ "Things to do" (کرنے والے کام) جو وہ ہمیشہ لکھتا تھا اب اس کی ترتیب بدل گئی تھی۔

پہلے وہ روزانہ کی روٹین کچھ یوں ترتیب دیتا۔

واک۔۔۔ کالج۔۔۔ فرینڈز کے ساتھ دو گھنٹے۔۔۔ ایک گھنٹہ مما کے ساتھ۔۔۔ نیٹ پر تین گھنٹے۔۔۔ ایک گھنٹہ ٹی وی۔۔۔ اور سارا دن موبائل پر گیمز اور چیٹنگ مگر اب ترتیب کچھ یوں تھی۔

نماز۔۔۔ واک۔۔۔ کام۔۔۔ نماز۔۔۔ قرآن کی تعلیم۔۔۔ باغبانی۔۔۔ عمر فاروق کے ہمراہ فلاحی ادارے میں بچوں کو مفت تعلیم دینے جانا۔۔۔ شام میں معذور لوگوں کے ادارے میں جا کر وہیل چیئر پر بیٹھے لوگوں کو ایک گھنٹہ باہر لان میں صدقہ جاریہ سیر کروانا اور ان کی دلجوئی کرنا۔۔۔ رات کو اپنا پڑھنا۔۔۔ زندگی میں ایک سکون ایک ٹھہراؤ آگیا تھا۔ ۔۔۔ بے چینی۔۔۔ بے ہنگم کیفیات کہیں دور چلی گئی تھیں۔

"علی حمزہ تم شادی کر لو۔۔۔"

اس اتوار وہ آنٹی کے ہاں آیا تو انہوں نے باتوں باتوں میں اس سے کہا۔

"آنٹی! ابھی میں بائیس سال کا ہوں۔"

"تو کیا یہ عمر شادی کی نہیں ہے۔۔۔؟" انہوں نے جواباً" پوچھا۔

"نہیں ابھی تو مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے۔"
"کون سا کیریئر۔۔۔؟" آنٹی اسی پرسکون انداز سے بولیں۔
"جو آج ہے وہی کیریئر ہوتا ہے بیٹا۔۔۔"
اتوار کا دن تھا۔ عمر فاروق کے پاپا بھی گھر میں ہی تھے۔ علی حمزہ اور آنٹی کے مابین گفتگو سن کر وہ بھی ادھر ہی آکر بیٹھ گئے۔
"ہمیں آنے والے وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا
"Future is blind" بیٹا
"Just present has eyes" اپنے حال کی آنکھوں سے اپنی زندگی پر نظر ثانی کرو۔ جو زندگی تم گزار رہے ہو۔ اس میں تمہارے ساتھ کسی بااعتماد ساتھی کا ہونا ضروری ہے جو تمہیں اور تمہارے گھر کو سنبھال سکے۔ تم تنہا ہو۔۔۔ اور اللہ نے دنیا میں شادی کی صورت میں میاں بیوی کا یہ رشتہ اسی تنہائی کو دور کرنے کے لیے بنایا ہے۔ ہم اس کی نعمتوں کی ناشکری کیوں کریں۔"
انھوں نے بڑے خوب صورت انداز میں اسے سمجھایا تھا۔
"مگر انکل! میری تنخواہ بھی اتنی کوئی خاص نہیں۔ ایک بندے کا اضافی بوجھ۔۔۔ اور ویسے بھی پہلے کی بات اور تھی میں اب اپنی زندگی سے مطمئن ہوں اور اپنی روٹین لائف سے بھی۔۔۔"
"وہ تو ٹھیک ہے۔ پر رازق کون ہے؟ اللہ نا۔۔۔" جیسے بچوں سے پوچھتے ہیں۔ وہ اسی انداز میں اس سے پوچھ رہے تھے۔
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"بے شک اللہ ہی رازق ہے اور ہر بندے کے رزق کا انتظام اس نے ہی کرنا ہے۔ جب میری شادی تمہاری آنٹی سے ہوئی تھی۔ تب بمشکل ہم لوگ روٹی ہی پوری کر سکتے تھے۔ میرے پاس کچھ نہ تھا۔ پر عقیدہ۔۔۔ ایمان۔۔۔ اور کوشش وہ ہتھیار تھے۔ جس سے آج ہم خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔
میری اولاد کو بھی اس رب نے پڑھایا۔۔۔ پہننے۔۔۔ اور کھانے کو بھی اچھا دیا۔۔۔ رہنے کو بھی بہترین جگہ دی۔ ہم جتنا بھی اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں اتنا کم ہے۔"
ان کی بات پر وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
"تم سوچ لو۔۔۔ بیٹا! ہم لوگ بھی تمہارے ماں، باپ کی جگہ ہی ہیں۔ گھر بسا کر اچھی زندگی کی شروعات کرو۔۔۔
"بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے' قرآن کی اس آیت سے ہم نظریں نہیں چرا سکتے۔ برائی میں پھر بھی کشش ہے۔ وہ ہمیشہ بندے کو اچھائی کے راستوں پر کبھی ڈگمگاتی ہے۔ کبھی ڈولتی ہے اور اکیلے انسان کو نفس کی خواہشوں پر قابو پانا زیادہ مشکل لگتا ہے۔ جب ایک گھر نہ ہو۔۔۔ ماں باپ۔۔۔ بہن بھائیوں کی صورت میں تو پھر بھی کچھ عرصہ تک یونہی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ اگر نہیں تو اللہ کی دی گئی نعمت سے اپنا گھر بساؤ۔۔۔ اور گھر مکینوں سے ہی بنتے اچھے لگتے ہیں۔۔۔" وہ بہت گہری بات کر گئی تھیں۔
علی حمزہ اپنی چپل کے انگوٹھے پر نظریں جمائے۔۔۔ ان کی بات کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

آم کے درختوں پر بور آنا شروع ہو گیا تھا۔ آلوچے کے گلابی پھولوں کی مہک نے فارم ہاؤس پر اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ گھر کے پچھلے دروازے کے پاس بنی گولائی والی جگہ پر بیٹھنا اس کا روز کا معمول بن گیا تھا۔
کبھی ان موسموں۔۔۔ ان فطری خوب صورتیوں سے دور کی دنیا کی وہ باسی ہوا کرتی تھی۔ جسے نیٹ پر بیٹھے بیٹھے یہ تک یاد نہ آتا کہ باہر بارش ہو بھی رہی ہے کہ نہیں جیسے لیٹسٹ ڈیزائنر کی ڈیزائننگ میں کھو کر یہ تک بھول جاتا کہ وہ ایک ایسی جگہ پر رہتی ہے۔ جس کے اردگرد اللہ کی بے پناہ خوب صورتی پھیلی ہوئی ہے۔
اور جو اس خوب صورتی کے اصل حسن کو سمجھ لیتا ہے۔ پھر اسے کسی ڈیزائنر کے خوب صورت

ملبوسات متاثر نہیں کرپاتے۔۔۔ اسے کوئی برانڈ اپنی طرف کشش نہیں کرپاتا۔

اس کی دنیا میں کیلنڈر اور سرد گرم کپڑوں کی ورائٹی اسے بتاتی تھی کہ اب سردیاں شروع ہو گئی ہیں۔ اب خزاں کا موسم ہے۔۔۔ یا گرمی اپنے جوبن پر آگئی ہے۔ مگر اب اسے درختوں پر پھولوں کے سارے انداز یاد تھے۔ جو ہر موسم کو برت کر وہ اپنا لیتے اب اسے سرما اور گرما کی دھوپ کا فرق بھی سمجھ آنے لگا تھا۔ اسے سرما کی سرد راتوں میں چائے پینے میں مزا آنے لگا۔۔۔ اور گرما کی گرم رت میں۔۔۔ اس گولائی والی جگہ پر بیٹھ کر نیم گرم جھونکوں کو انجوائے کرنا اسے اچھا لگتا۔ درختوں پر کسی بھی بیل کے پھول اور بور کے رنگ اسے ازبر یاد ہو گئے اور آج سے پہلے اسے جو گھر میں رہنا عذاب لگتا۔ اسے جو فرینڈز کی گیدرنگ میں چیخنا چلانا اچھا لگتا۔ اب اسے اپنے پیارے گھر سے پیار ہو گیا تھا۔ اسے لگتا وہ اب ان پھولوں۔۔۔ خوشبوؤں۔۔۔ اور ہواؤں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔

وہ ایک دن نماز نہ پڑھتی تو سارا دن اسے بور۔۔۔ بور لگتا۔ ادھورے پن کا احساس ہوتا۔ کچھ کھو جانے کا درد ستاتا۔ ٹھنڈی چھاؤں اسے پیاری لگتی۔ پھولوں کا رس چوستی تتلی اور آم کی بور پر ٹھونگے مارتی چڑیا اس کی پکی سہیلیاں بن گئیں۔ اس نے نیٹ پر آن لائن جاب اسٹارٹ کردی۔ باہر کے ملکوں میں بیٹھے بچے کو وہ قرآن پاک کے ناظرہ کی تعلیم دیتی۔ اس کے ارد گرد سکون اتر رہا تھا۔

بس کبھی جو مما اس کو دیکھ کر آہیں بھرتیں۔ یا بابا کی آنکھوں میں نمی جھانکتی تو وہ بے چین ہو جاتی۔

کبھی وہ سبین کی کال اٹینڈ کرتی اور وہ اپنی باتیں سناتی۔۔۔ تو ایک زندگی جو اس کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی۔۔۔ اس کا دکھ اسے تھوڑا بے چین کردیتا۔

کبھی کبھی وہ خوب صورت دبلا پتلا لمبا سا۔۔۔ سفید چہرے سلکی بالوں والا لڑکا یاد آتا۔۔۔ جو کالج کا سب سے بڑا ہیرو ہوا کرتا۔ اس کے ساتھ گزرا وقت تو اسے ضرور شرمندہ کرتا کہ وہ کبھی اچھی مسلمان نہیں رہی تھی اور اب اسے اچھی مسلمان بننا تھا۔

ہاں مگر وہ نہیں بھولتا تھا۔ وہ۔۔۔ وہ نور سحر۔۔۔ تھی جس نے پہلی دفعہ اپنے دل کی دھڑکن کو علی حمزہ کے لیے سنا تھا۔

اتنے لڑکوں کے ہجوم میں کھڑا وہ اسے ہمیشہ اپنا سا لگتا۔۔۔ اس کی بے رخی اسے کتنا اداس کیا کرتی تھی۔ اسے وہ سین اب بھی یاد تھا۔ جب بلو شرٹ میں پنک اسٹرپس لگوائے وہ لڑکوں کے گروپ میں اپنا نیا فیشن متعارف کروا رہا تھا اور وہ اور ساری لڑکیاں اس پر ہنس رہی تھیں۔ مگر وہ۔۔۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اسے کتنا اچھا لگا تھا۔ اس شرٹ میں۔۔۔ بالوں کے اسپائکس بنائے۔۔۔ آنکھوں کو نئے گانے کے بول پر مٹکاتے اور پاؤں کو ٹوئیسٹ کی شکل میں موڑے۔۔۔ وہ اسے اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ وہ اسے پاگلوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔ تب اس کی علی حمزہ سے دوستی بھی بہت تھی۔ مگر وقت وقت کی بات تھی۔ اب تو وہ چاند کی طرح دور افق میں کھو گیا تھا۔ جہاں تک اس کی رسائی نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"علی حمزہ! میں نے تمہارے لیے ایک لڑکی دیکھی ہے۔ بہت اچھی ہے۔ اس کی والدہ کی ڈیتھ ہو چکی ہے اور اس کے والد عمر کے بابا کے ساتھ جاب کرتے ہیں۔ اچھی نیک بچی ہے۔ تم دیکھ لو۔۔۔ پھر میں بات کرتی ہوں۔" آج مسجد میں حافظ بچوں کے لیے کھانا تیار کرنا تھا۔ پچاس کے قریب بچے تھے۔ وہ اور عمر فاروق دونوں آنٹی کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ جب آنٹی نے اس سے کہا تھا۔

علی حمزہ ان کی بات پر خاموش ہی رہا۔ اس نے کڑاہی میں تیل ڈال کر چکن پیس فرائی کرنا شروع کر دیے۔ آنٹی نے سبز پھولوں والی گہری ٹرے نکال کر اس میں ٹشو پیپر بچھا دیے۔

"امی! میں تیار ہوں۔۔۔" علی حمزہ کی بجائے عمر فاروق نے سنجیدگی سے کہا۔ چکن پیس کڑاہی میں ڈالتا ہاتھ وہیں رکا۔۔۔ اور ٹشو بچھاتا ہاتھ بھی وہیں تھم گیا۔

پھر وہ تینوں عمر فاروق کے مذاق پر کھلکھلا کر ہنسے تھے۔

مگر مذاق۔۔۔ حقیقت کا روپ دھار گیا تھا۔ علی حمزہ کو بظاہر ناپسندیدگی کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ مگر اس نے انکار کر دیا اور آنٹی نے عمر فاروق کے لیے سنجیدگی ظاہر کر دی۔ بابا کے دوست کی بیٹی عمر فاروق کے لیے پسند کر لی گئی۔

مگر علی حمزہ کا معاملہ پھر لٹک گیا۔ پھر آنٹی نے کتنی ہی دفعہ ذکر کیا۔ مگر علی حمزہ کو کچھ پسند ہی نہیں آرہا تھا۔

یونہی کرتے کراتے چھ ماہ مزید گزر گئے۔ علی حمزہ نے اب ایک فیکٹری میں جاب ڈھونڈلی۔۔۔ اس کا بی کام بھی مکمل ہو گیا تھا۔ اب وہ ایم کام میں داخلہ بھجوا چکا تھا۔

آنٹی نے اس کے معاملے میں خاموشی اختیار کر لی۔ وہ اس پر کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

مگر علی حمزہ پشیمان تھا۔ وہ کیا چاہتا تھا؟ وہ خود بھی سمجھ نہ پا رہا تھا۔ اس کا دل شادی والی بات پر آہی نہیں رہا تھا۔

اس نے گھر میں پینٹ کروایا تھا۔ مما کی چیزیں نکالتے ہوئے وہ بے تحاشا رو پڑا تھا۔

کتنی ہی پرانی یادیں۔۔۔ پرانی چیزوں کے ہمراہ اجاگر ہوئی تھیں۔ گرین ڈائل والی وہ گھڑی جو مما نے اپنی دوست سے کہہ کر اس کے لیے جاپان سے منگوائی تھی۔ اس نے 8th کلاس میں +A گریڈ لیا تھا۔ مما کی ساڑھیاں۔۔۔ ڈریسز وہ بس دیکھے گیا۔

"مما اتنی جلدی اتنا اچانک ہی چلی گئیں۔۔۔" وہ یونہی ہمیشہ حیران ہوتا۔ مما کے خواب۔۔۔ خواہشیں مما کے چلے جانے سے زندگی اس پر پوری طرح آشکار ہوئی تھی۔ وہ آخری وقت تو اسے بھولتا ہی نہ تھا۔ جب مما نے کہا کہ علی حمزہ کلمہ پڑھو۔۔۔ اور وہ بوکھلا گیا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ میں کلمہ پڑھنا ہی بھول گیا تھا۔ وہ مما کی حالت پر بس پریشان ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بجھتی زندگی اور بے چارگی نے بہت کچھ اس پر عیاں کیا تھا۔

لکڑی کی الماری میں نچلی درازوں کے ڈھیر میں۔

اس نے وہ والی تصویر بھی ڈھونڈی تھی۔ جب وہ اور اس کی جمسکا۔۔۔ نہیں بلکہ نور سحر ری فرسٹ ایئر کلاس میں نئے نئے آئے تھے اور ایک کلاس کے ہنگامے کے دوران اس نے لی تھی۔ پھر نور سحر نے سوچ کے کئی در وا کیے تھے۔

اس کا دل کچھ اور ہی سمجھا رہا تھا۔ جو وہ نہیں سمجھنا چاہ رہا تھا۔ پھر بھی دل کی آوازیں بند نہیں ہوئی تھیں۔ وہ رات تک ایک نتیجے پر پہنچا تھا۔ دوسرے دن اس نے آنٹی سے سب کچھ شیئر کر دیا۔

"بیٹا! اچھی طرح سوچ لو۔۔۔ وہ بچی معذور ہے اور معذور لوگ پہلے حساس ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہو زندگی کے کسی بھی موڑ پر تمہیں کوئی پچھتاوا ہو کہ تم نے معذور لڑکی کو اپنا جیون ساتھی منتخب کر لیا تھا۔" آنٹی نے بھرپور سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں آنٹی! اگر میں نے اس کو نہ اپنایا۔۔۔ تو اس کے نہ ہونے کا پچھتاوا بھی ساری عمر مجھے رہے گا۔۔۔ اور یہ پچھتاوا اس پچھتاوے سے بڑا ہو گا۔ ویسے بھی یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں ہے۔ میرے دل کی پوری آمادگی شامل ہے۔ پھر اللہ ہے نا انسان کو ثابت قدم رکھنے کے لیے۔۔۔"

آنٹی اس کی بات پر مطمئن ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اوائل خزاں کی رت تھی۔ فارم ہاؤس کے سارے درختوں کے پتے اپنی عمر پوری کر کے گر رہے تھے۔ چڑیا۔۔۔ تتلی اور وہ تینوں اداس تھے۔ مگر یکدم ہی بہار نے اسے نئے پتوں اور پھولوں کی نوید سنائی تھی۔

نور سحر کو لگا کہ وہ ایک خواب دیکھ رہی ہے اور اس خواب کا سحر اسے سحر زدہ کر رہا تھا۔

علی حمزہ کا رشتہ آیا تھا نور سحر کے لیے۔۔۔ عمائمہ کو لگا کہ وہ پھر سے جوان ہو گئی ہیں اور آصف حیات کو بیٹی کا غم ہلکا ہوتا محسوس ہوا تھا۔

مبینہ کو اطلاع ہوئی۔ تو اس نے نور سحر کو علی حمزہ کے مل جانے پر بے حد مبارک باد دی۔ وہ بہن کی خوشی پر دل سے خوش تھی اور دعا گو بھی۔۔۔ سیفی بھی خوش تھا۔ نور سحر کی شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ سیفی اور مبینہ نے اپنی سیٹس کنفرم کروا کر انہیں ڈیٹ فائنل کرنے کا کہا تھا۔ وہ دونوں۔ بہن بھائی اپنی چھوٹی بہن کی خوشیوں میں شامل ہو کر اس کی دلجوئی کرنا چاہتے تھے۔۔۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی بہن پچھلے ایک سال سے خوشیوں سے محروم تھی۔ سیفی نے اس کے لیے بطور خاص الیکٹرونکس کا سامان لیا تھا۔ جبکہ مبینہ نے اسے بوتیک اسٹائل میں اس کی پسند کے کلرز کے بہترین ڈیزائنوں سے کپڑے سلوا کر دیے تھے۔ مگر نور سحر کی ذہنی حالت یکسر بدل چکی تھی۔ اسے اب ان چیزوں کی خواہش ہی نہیں رہی تھی۔ اسے تو اس رب پر بے اختیار پیار آ رہا تھا۔ جس نے سب سے بڑی خوشی اسے دے دی تھی۔

نور سحر کو علی حمزہ کے بعد کچھ بھی مل جاتا۔۔۔ بس علی حمزہ کا مل جانا سب سے بڑی خوش آئند بات تھی۔

علی حمزہ بھی آج کتنے عرصے کے بعد دل سے خوش تھا۔ اس نے اپنے گھر کے لان میں خود باغبانی کی تھی۔ وہاں بھی آم کا بور لگتا اور آلوچے کے گلابی پھول کھلتے۔ چڑیا اور تتلی نے نور سحر کے ساتھ ہی اس گھر کا سفر کیا تھا۔

علی حمزہ کو لگا کہ اس کا گھر نور سحر کے آجانے سے پھر سے جاگ گیا ہو۔ ورنہ اس گھر کی دیواریں بھی مما کے چلے جانے کے بعد سو گئی تھیں۔

دنیا حیران تھی کہ اتنا خوب صورت جوڑا۔۔۔ مگر ایک ٹانگ سے محروم لڑکی۔۔۔ پھر بھی ایک دوسرے کی ہمراہی میں خوش باش زندگی گزار رہے تھے۔

محبت زندگی کو مطمئن بھی کر دیتی ہے اور جینے کی امنگ بھی دیتی ہے ورنہ پورے اعضا والے ہم سفر۔۔۔ بغیر کسی نقص کے بھی تکلیف دہ ہی زندگی گزارتے ہیں۔۔۔ بے رنگ اور بے رونق۔۔۔ پورے پورے وجود لے کر بھی محبت سے محروم رہتے ہیں اور تاحیات ایک دوسرے کے لیے تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔

"نور سحر! کیا تمہیں زندگی سے کچھ اور خواہش ہے

—"وہ دونوں لان کی خوبصورتی کو انجوائے کرنے کے لیے شام کی چائے اکٹھے پی رہے تھے۔

"نہیں، علی حمزہ مجھے سب سے بڑی جو خواہش تھی وہ مل گئی— پھر اس خواہش کے پورا ہو جانے کے بعد میری یہ خواہش ہے کہ اب ہماری نسل میں کوئی ایسی بچی نہ ہو جیسے جیسکا البا بننا پڑے۔ ہمارے بچوں کو اصل ہیرو کی پہچان ہو۔ جو حیا کے لفظ سے پوری طرح آشنا ہوں—"

"اور تمہاری کیا خواہش ہے—؟" نور سحر نے اس سے پوچھا تھا۔

"میری خواہش ہے کہ میں اپنے بچوں کو جینے کے بھی آداب سکھاؤں اور مرنے کے بھی اور جب میں مروں تو انہیں مجھ پر کلمہ پڑھنا آنا چاہیے۔ اگر مجھ پر موت کی تکلیف اترے اور میں چاہوں کہ میرے گرد میری اولاد مجھے اس تکلیف میں بھول جانے والے کلمے کو یاد کروا دے۔ تو وہ مجھے یاد کروا دے۔ اسے اتنے میچور ہوں کہ وہ مرے ہوئے یا مرنے والے والدین پر بوکھلانے کی بجائے ان پر کلمہ پڑھے۔ ان کی تکلیف کو کم کرنے کا سبب بنے—"

نور سحر نے ناسمجھی سے اسے دیکھا تھا۔ مگر علی حمزہ اس بات کا پس منظر اچھی طرح سمجھتا تھا۔

"نور سحر! اللہ کن اور فیکون کے درمیان بے تحاشا چیزیں بنا رہا ہے۔ انسان بھی— پیڑ بھی— پھول پودے بھی— اور ہر جاندار فانی ہے— ایک مر رہا ہے تو ایک بن رہا ہے— مالی پیڑوں کو نہیں سنبھالے گا— پھولوں کی دیکھ بھال نہیں کرے گا تو اس صدائے کن فیکون کے شور میں وہ مسمار ہو کر کھو جائیں گے اور ان کی جگہ لینے کو اور بہت سے بن جائیں گے۔ اس طرح والدین اگر بچوں کو ٹھیک تربیت— ٹھیک میچور نہیں دیں گے تو بچے دنیا کی تیزی میں کھو جائیں گے۔ پھر بچے اور والدین فنا ہو گئے تو مزید نسلیں بن جائیں گی۔ جو پرانی نسلوں کے عذاب بھگتنے کو تیار ہوں گی اور ہر نسل آخرت میں حساب کی چکی پستی رہ جائے گی۔

ہم اچھے پودے لگائیں گے جو مرنے کے بعد بھی ہمیں پھل دیں— ہمارے لیے ذریعہ نجات بنیں"—

علی حمزہ کی بات نور سحر کو سمجھ میں آگئی تھی۔ اور وہ بھی علی حمزہ کے ہمراہ اس کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے مصمم تھی۔

سورج نے مسکرا کر دونوں کے فیصلے کی تائید کی تھی— اور سویر بن جانے والے آم نے تالیاں بجائیں۔ چڑیا اور تتلی کو آنے والے اچھے وقت کا بے چینی سے انتظار ہونے لگا اور ہوا کے اضطراب میں سکون اترا تھا۔

☆ ☆

فرحانہ ناز ملک

عقیدت اپنی اماں اور جمیلہ کے ساتھ اپنے آبائی شہر کو چھوڑ کر لاہور شفٹ ہو گئی ہے۔ اس بات سے عقیدت کے بہن بھائی تحریم اور شہیار سخت ناراض ہیں۔ عقیدت ایک کم ہمت، کم گو اور اپنی ذات میں بند رہنے والی لڑکی ہے۔ اس کی اماں بے حد حسین ہیں۔ سنعان ماں، باپ کی توجہ کو ترسا بکھرا ہوا نوجوان ہے۔ اس کے گھر میں دولت کی ریل پیل ہے۔ وہ اکلوتا ہے، مگر محبتوں سے محروم ہے۔ اس کی ماں فائزہ شوہر کی بے رخی اور ظلم کی وجہ سے نفسیاتی مریضہ بن چکی ہیں۔ "غوری منزل" میں تین پورشنز ہیں۔ جہاں کریٹی تین بیٹوں، بہوؤں اور پوتے، پوتیوں کے ہوتے بھی تنہا ہیں۔ نورین اور سلمان صاحب کی بیٹی حبہ سلمان ٹی وی پر اینکر ہے۔ اس کے چچا کا بیٹا حارث اسے پسند کرتا ہے۔ لیکن حبہ شادی کرنے کے حق میں نہیں۔ عالم صاحب ایک مشہور و معروف جاگیردار ہیں۔ زندگی کی تمام عیاشیوں کے مزے لوٹنے کے بعد وہ اب احتسابی دور سے گزر رہے ہیں۔ ان کا ایک مفلوج و اپاہج بیٹا جلال بھی ہے۔ جو ان کی بہو سحر کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ عالم صاحب کو جلال کی فکر ہے۔

٦

چھٹی قسط

"لوگو..... میں نے سنعان آفندی کو دیکھا۔" اور نورین کافی پینا بھول گئیں۔ آج عرصے بعد عاشر بھی موجود تھا۔ بالکل حارث کی طرح اس کا منہ ہی نہیں آنکھیں بھی کھلی رہ گئیں۔ زینب میگزین کے غیر اہم صفحے پر اٹک گئی تھی لیونگ روم کی طرف آتی عفیرہ کو بھی دروازے پر ٹھٹکنا پڑا اور خبر یقیناً "بریکنگ نیوز" کے زمرے میں آ رہی تھی۔ شانزے اور کشف پر بھی بیک وقت سکتہ طاری ہوا' بلکہ شانزے کو لگا اسے سننے میں مغالطہ ہوا ہے.....
حبہ بھلا کیسے سنعان آفندی سے مل سکتی ہے۔ وہ بھی ایک طویل عرصے کے بعد وہ بھلا پہچان کیسے پائی ہو گی اسے؟
"کیا واقعی.....؟"
"قطعی جھوٹ۔"
"یقیناً" نظر کا دھوکا ہوا ہو گا۔"
"وہ ٹی وی پر آئے گا کیا..... تم نے اس کا انٹرویو لیا؟" حیرانی کا دورانیہ طویل ترین ہونے لگا۔ بے یقینی بھرا ایسا شور کہ حبہ کو کانوں پر ہاتھ رکھنے پڑے۔ اگرچہ یقین تھا جتا دینے کے بعد ایسا ہی سننے اور دیکھنے کو ملے گا۔
"پلیز کول ڈاؤن..... آہستہ۔" اسے جھنجلاہٹ نے آلیا تھا۔ جبکہ سنعان کے صرف نام سے ہی واقف معیز نے با آواز بلند تبصرہ جھاڑا.....
"یہ سنعان آفندی پہنچی ہوئی چیز لگ رہے ہیں۔ سب کیسے ایک دم سے چارج ہو گئے؟" اور کوئی حبہ سے پوچھتا وہ کتنی پہنچی ہوئی چیز لگ رہا تھا۔
"یعنی دنیا گول ہی نہیں چھوٹی بھی ہے۔" معیز نے گفتگو کو اختتام دینا چاہا مگر جملہ حاضرین اب اس موضوع کو چھوڑتے بھی تو یہ موضوع ان کو نہ چھوڑتا۔
"بائے دا وے دیکھا کہاں؟" کشف جیسی کو بھی اس موضوع میں دلچسپی محسوس ہوئی۔
"وہیں آس پاس۔ جہاں وہ رہتا ہے۔" حبہ حتی المقدور بے نیاز و لاپروا نظر آنے کی کوششوں میں تھی۔ مگر کون جان سکتا تھا اس کے دل کی دنیا میں کیسے ساز بجنے لگے تھے۔ نہ جانے کس جذبے نے لاچار کر دیا تھا وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی اس نے اک پل کے ہزارویں حصے میں پہچان لیا تھا۔ نہ صرف پہچان لیا تھا بلکہ دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگی بھی..... بنا سوچے سمجھے اپنے پروگرام کی ریکارڈنگ کے بعد بھی کئی دن وہاں گزار لیے تھے..... کیوں؟ وہ جتنا سوچتی اتنا بے بسی کا شکار ہونے لگتی۔ سنعان نے اسے ہمیشہ کی طرح ہپناٹائز کر دیا تھا۔ وہ واقعی جادوگر تھا۔
"پھر....." نورین کی پتلیاں یوں ساکت ہو گئیں..... جیسے جیتا جاگتا سنعان سامنے آ کھڑا ہو..... ان کی کافی پر سیاہ تہ سی جم گئی تھی۔ مگر وہ اسے پینا بھول کر حبہ سے مزید جاننے کی متمنی تھیں اور یہ پہلی بار تھا۔ وہ سننے کی شائق ہو رہی تھیں سنانے کی نہیں اور شاید پہلی بار ان کے تاثرات اختیار سے باہر ہوئے تھے۔
"پھر تم اس سے ملیں؟"
"نہیں....." حبہ کے تاثرات مایوس کن ہو گئے..... "کوشش تو بہت کی..... بٹ نہیں مل سکی۔"
"کہا تھا نا..... جھوٹ بول رہی ہیں۔ کسی اور کو دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہوں گی۔" شانزے کو اپنے انداز ے کی درستگی پر خود ہی پیار آیا۔
"میری آئی سائیڈ ٹھیک ہے شانزے وہ سنعان تھا اور میں نے وہاں لوگوں سے پوچھا بھی وہ زکریا آفندی کا بیٹا ہی تھا....." حبہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر گویا اپنے کہے میں وزن ڈالا' زکریا کے نام پر بے نام سی خاموشی نے کمرے میں جگہ بنالی۔
"کیا کر رہا تھا؟" پھر زینب نے دھیمی آواز میں پوچھ کر گویا خاموشی کو تار تار کیا۔

"جو متاثرہ خاندان تھے فلڈی ایریاز کے۔۔۔ ان کی مدد کے لیے آیا ہوا تھا۔"
"شو آف۔" عاشر کے لہجے میں تمسخر تھا۔ حبہ نے بے ساختہ ناگواری سے اسے دیکھا۔
"نہیں۔۔۔ وہ شروع سے ہی کافی نرم دل ہے۔ اپنے باپ سے بالکل مختلف۔" زینب بولی۔
"ہاں مگر پھر بھی۔۔۔ اپنے باپ جیسا بھی تھا۔" نورین جانے کیوں جز بز ہوئی تھیں اس کی تعریف پر۔ وہ خود کو سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔
"بڑا مغرور اور نخریلا تھا۔" عفیرہ نے ناک چڑھائی تھی۔
"وہ اب بھی ویسا ہی ہے۔" حبہ کے دل نے چپکے سے سرگوشی کی۔۔۔ اور وہ مارے گھبراہٹ کے یہاں وہاں دیکھنے لگی۔ دل کی سرگوشی کا عکس چہرے تک جا پہنچا تھا۔ کب سے اسے مرکز نگاہ بنائے حارث کو خوامخواہ بے چینی لاحق ہوئی۔
"کمال ہے۔۔۔ آپ نے دیکھ کر ان کو جانے کیسے دیا۔ سلام دعا تو کر لیتیں۔" شانزے کا شدت سے دل چاہ رہا تھا سنعان اس کے بھی سامنے آجائے بچپن کی دیکھی بھولی بسری صورت دماغ کی اسکرین پر واضح ہونے لگی۔ سب اس کی شکل سے متاثر ہوتے تھے اور شانزے کو وہ ویسے ہی اچھا لگتا۔ ہنستا ہوا، بولتا ہوا، کبھی خوش، کبھی مغموم۔۔۔ یہ الگ بات تھی۔۔۔ وہ اسے ہنستے اور خوش ہوتے کم ہی نظر آتا۔ وہ بلا کا کم گو اور سنجیدہ مزاج ہوا کرتا تھا۔
"اور نہیں تو کیا۔ ہماری کوئی جانی دشمنی تھوڑی تھی ان سے۔" کشف نے بھی شانزے کی ہاں میں ہاں ملائی۔
"کہا نا میں نے بہت کوشش کی۔ میں اس کے دوست کے ہوٹل بھی گئی۔ سوچ رہی تھی وہاں سے کوئی انفارمیشن یا وہ خود مل جائے گا۔ بٹ وہ سوئٹزرلینڈ روانہ ہو چکا تھا۔"
"تمہیں کیا پڑی تھی اس کے دوست کے ہوٹل جانے کی۔" حارث کا انداز و لہجہ کچھ ایسا جلا سڑا تھا کہ حبہ کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ خاصا کھول کر اس نے حارث کو دیکھا تھا۔
"او ہیلو۔۔۔" لحاظ مروت بالائے طاق رکھے وہ اپنی مخصوص بولڈ ٹون میں بولی تھی۔ "میں شوقیہ نہیں گئی تھی وہاں۔ جس ہوٹل میں میرا اور میری ٹیم کا Stay ہوا۔ بائی چانس سنعان کا دوست اس کا اونر نکلا۔۔۔" شاید دل میں چور تھا وہ یہ سب بتانے پر مجبور ہوئی۔ ورنہ کوئی اتنا ضروری نہیں تھا۔
"اچھا میں سمجھا۔۔۔ جتنے شوق سے تم اس کا ذکر کر رہی ہو۔ ہوٹل تو کیا تم اس کے گھر بھی چلی جاؤ گی۔" عاشر کا انداز ابھی بھی تمسخرانہ تھا۔ حبہ کا اشتعال مزید بڑھا۔
"قد بڑے ہو گئے تم دونوں کے لیکن سوچ وہیں ٹھہر گئی بچپن میں کہیں، تب بھی سنعان سے جیلس ہوتے تھے۔ اب بھی ہو رہے ہو۔" اس نے عاشر و حارث دونوں کے زخم کریدڈالے۔
"یہ صرف تمہارا خیال ہے۔۔۔" عاشر پہروں پہ پانی نہیں پڑنے دے رہا تھا۔ ہنوز دل جلاتی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ حبہ بات نہ بڑھانے کے خیال سے خاموش ہو گئی۔
"اچھا بتائیں نا۔ کیسے ہو گئے ہیں وہ؟" شانزے کا اشتیاق بچوں کو بھی مات دینے لگا۔
"ویسا ہی ہو گا۔۔۔ فارمی مرغا۔۔۔" حارث نے عاشر کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔۔۔ اور دونوں خوامخواہ ہنس دیے تھے۔
"وہ بہت کیوٹ ہوتا تھا۔" زینب نے کھلے دل کا مظاہرہ کیا۔
"اب بھی ہے۔" حبہ کے دل نے پھر سے سرگوشی کی ایک بھرپور اجلا نکھرا مرد آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔
"ہم سب اس کی گوری رنگت کے فین ہوا کرتے تھے۔ یاد ہے شانزے۔۔۔ یہ حارث باقاعدہ اسنک تھوپ کر

گھر سے باہر جایا کرتا تھا۔" شانزے، علیزہ اور معیز کو یقین کرنا محال ہو گیا۔ ٹھیک ٹھاک صاف رنگت کے حامل حارث پر یہ انکشاف تازیانہ بن کر پڑا۔ وہ اچھا خاصا تاؤ میں آیا۔ سچ کو ایسے ہی کڑوا نہیں مانتے۔

"سچی بھائی۔۔۔؟" علیزہ کی آنکھیں پھٹنے کے قریب تھیں۔

"پہلے عاشر سے پوچھو۔۔۔ یہ تو باقاعدہ لال گلابی لپ اسٹک بھی لگاتا تھا۔ اس کی جلن میں۔۔۔" حارث نے اپنے تئیں عاشر کا بھانڈا پھوڑنا چاہا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔

"ڈونٹ ٹیل۔" اس سے زیادہ انکشافات سننے کی ہمت نہیں تھی۔ گھر کے سوبر اور ڈیسنٹ نظر آتے لڑکوں کے یہ پول ذرا بھی قابل فخر نہیں تھے۔ یقین کر شانزے کو کچھ ہونے لگا تھا۔

"اینی وے۔۔۔" کشف کھڑی ہو گئی تھی۔ "دنیا واقعی بہت چھوٹی ہے۔" سب کو گڈ نائیٹ کہتی وہ لیونگ روم سے روانہ ہوئی آج ایک عرصے کے بعد وہ یوں سب کے بیچ آ بیٹھی تھی اگر حبہ، سنعان کا موضوع نہ چھیڑتی تو یقیناً اپنی چچیوں کا پسندیدہ موضوع وہ ہوتی۔

"ممی۔۔۔ آپ کیا سوچنے لگیں؟" کب سے بالکل ساکت و صامت کسی سوچ میں مدغم نورین، بے ساختہ چونکیں۔

"نہیں۔۔۔" انہوں نے خاصی گہری سانس لی تھی۔ نہ جانے ماضی کی غلام گردشوں میں کیا کچھ کھنگال آئی تھیں

"میں کیوں کچھ سوچنے لگی؟" کوشش کر کے مسکرانا بھی چاہا مگر ناکام رہیں کہ شاکڈ ہی اتنی تھیں۔

"سوچیے بھی مت۔۔۔ وہ یہاں نہیں آجائے گا۔" عاشر نے ماں سے زیادہ خود کو حوصلہ دیا۔ کسی زمانے میں اسے سنعان کی صورت سے تو کیا اس کے نام سے بھی چڑ محسوس ہوتی تھی۔ وہی حال اب بھی ہو رہا تھا۔

"اصولاً" ان کو یہاں آنا چاہیے۔" شانزے نے گویا خود کلامی کی۔

"اب تو میں بھی بے قرار ہو رہا ہوں ان کے دیدار کو۔" معیز کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

"میں بھی۔۔۔" علیزہ نے بھی ٹکڑا لگایا۔

"تم مجھ سے پورے ڈیڑھ سال بڑی ہو۔ تمہارے دماغ میں تو سنعان بھائی کی تصویر ہونی چاہیے۔" شانزے کو یقین نہیں آ رہا تھا علیزہ سنعان کو بھول سکتی ہے اچھی کوڑھ مغز تھی وہ بھی۔

"آپ بھی نا شانزہ آپی۔۔۔" معیز نے گویا شانزے کی عقل پر ماتم کیا۔ "بار بار کیوں یاد دلاؤں کہ ان کی یہ والی بلڈنگ۔۔۔" اتنا کہہ کر معیز نے اشاروں میں ہی "خالی ہے" کہہ کر جملہ پورا کیا۔ "اس لیے نہ دماغ کا جھنجھٹ اور نہ کوئی تصویر۔" مقصد علیزہ کو بھڑکانا تھا۔ مگر وہ ان کی طرف سے کان بند کیے سنعان کی تصویر بنانے میں سر دھن رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے نقش ابھرنے لگے تھے۔

"مزا نہیں آیا۔" معیز کو اپنا مذاق ضائع جانے کا اچھا خاصا ملال ہوا۔ شانزے مسکراتے ہوئے نورین کی طرف متوجہ ہوگی۔ جو زکریا آفندی کا ہی نہیں فائزہ کا بھی کچا چٹھا کھولنے میں مصروف تھیں۔

☆ ☆ ☆

"معتقیدت کو گئے دو ڈھائی گھنٹے ہو چلے تھے۔ ایک بھرپور دن نکل آیا تھا۔ چمکیلا اور شفاف، اماں بالکونی میں آبیٹھیں۔ خنک صبح کے بعد سورج کی نرم گرم شعاعیں بھلی لگ رہی تھیں۔ اس نعمت کا لطف آس پاس کے گھروں میں بھی لیا جا رہا تھا۔ اکثر بالکونیاں آباد تھیں۔

گزشتہ کچھ دن نارمل نظر آنے کی کوشش میں انہوں نے جو مشقت اٹھائی تھی۔ اس کے بعد سستانا حق بنتا تھا

اگرچہ دماغ ابھی بھی شل تھا۔ تاریکی میں ڈوبا لگ رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ وجود تپ رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھیں۔

"باجی۔۔۔ یہ بچوں کے ابا جی ہیں نا؟" جمیلہ کی چہکتی آواز ایک چھناکے کی طرح ان کے دماغ سے آٹکرائی۔ خوابیدہ تاریکی میں یک بیک چہرے بننے بگڑنے لگے۔۔۔ اس تصویر کا چہرہ عقیدت، تحریم اور شہریار کے معصوم بے ریا چہرے۔۔۔ اور بہت سے شناسا چہرے۔۔۔ بہت اپنے "بہت پیارے" ایک ایک کرکے آنکھوں میں اترنے لگے، دل میں ٹھہرنے لگے۔۔۔ اماں کی بند ہوئی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے تھے۔ آنسو یقیناً "بند بھی توڑ دیتے اگر جمیلہ نہ آجاتی۔

"باجی۔۔۔ چائے" حسب عادت بنا سوچے سمجھے اس نے "باجی" زور سے اور باجی کے چونک جانے پر چائے منہ ہی منہ میں شرمندہ ہو کر کہا۔۔۔ اماں کی پلکوں سے ماضی، پرانی قلعی کی طرح جھڑ گیا۔ انہوں نے خاموشی سے چائے کی پیالی پکڑی۔ جمیلہ نے انتظار کیا وہ کچھ بولیں۔۔۔ مگر وہ چپ رہیں تو ساتھ والی کرسی پر انگلیاں موڑتی ٹک گئی۔ باجی ضرورت سے زیادہ سنجیدہ لگ رہی تھیں۔ جمیلہ کو ان سے کوئی بات کرتے جھجک محسوس ہوئی۔

"بہت دن ہو گئے جمیلہ۔۔۔ اور باجی نے خود آغاز گفتگو کیا۔ جمیلہ سراپا سماعت بن گئی۔

"شہریار نے فون نہیں کیا۔۔۔ لگتا ہے ناراض ہو گیا ہے۔" ان کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"نہیں تو باجی۔۔۔" جمیلہ نے سختی سے ان کا کہا رد کیا۔ تصویر ملنے کے بعد سے وہ اسے خود سے دور محسوس ہونے لگی تھیں۔ اگرچہ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ ہنستی، حال احوال کرتیں۔ مگر جمیلہ دل کا کیا کرتی جسے وہم ہو گیا تھا باجی کی ناراضی کا۔ اور آج اس نے یہ ناراضی دور کرکے دم لینا تھا۔

سامنے والے لان میں بابا جی دھوپ کے مزے لے رہے تھے۔ ان کی طرف دیکھ کر خیر سگالی مسکرائے۔ اماں کو بھی اخلاقاً "مسکرا کر جواب دینا پڑا۔

"مجھے ان پر بڑا ترس آتا ہے۔ بے چارے کی کوئی اولاد نہیں۔ پیدا ہو کر دس مہینوں بعد مر جاتی۔ چار بچے پیدا ہوئے ان کے۔۔۔ پھر بھی اتنے بہادر ہیں۔ ان کی ووہٹی البتہ تھوڑی چڑچڑی اور خار باز ہے۔" بابا جی پر سے دانستہ نظریں ہٹاتے جمیلہ ان کی بابت بتانے لگی۔ اماں کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں تن گئیں۔

"پھر بھی جمیلہ۔۔۔ یہ دکھ قابل برداشت ہے۔" کہیں دور خلاؤں میں کھوئی وہ شاید ایسے ہی کہہ گئی تھیں۔ جمیلہ نے زیادہ توجہ نہیں دی۔

"اولاد کا ہونا بعض اوقات باعث آزار ہوتا ہے۔ اپنے آپ میں ایک موت۔۔۔ بے اولادی سہی جاسکتی ہے، جیتے جی موت نہیں۔۔۔" اور انہوں نے اپنی بات کی وضاحت یوں دی کہ جمیلہ کو چپ لگ گئی۔

"بے اولادی کا دکھ ایک بار کا ہوتا ہے۔ اس سے دل پھر بھی سکون میں آجاتا ہے۔ لیکن۔۔۔ اولاد۔۔۔ جسے اپنے وجود سے سینچ کر پیدا کیا جائے۔۔۔ موت کے منہ میں جا کر دنیا میں لایا جائے، جس کی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف پر سکھ، چین تیاگ دیا جائے۔۔۔ جس کے آرام کی خاطر اپنی نیند قربان کی جائے۔۔۔ وہ کچھ ہی عرصے بعد منہ پھیر لے تو کہیں سکون نہیں ملتا۔۔۔ کہیں آرام نہیں ملتا۔۔۔ ایسی روز روز کی موت سے وہی ایک دن کی موت اچھی ہوتی ہے نا۔۔۔"

"ایسے مت بولو باجی۔" جمیلہ کو دیر بعد کہنا پڑا۔ باجی کی باتیں اس کی سدھ بدھ ختم کر گئی تھیں۔ اور حواس تو شاید ان کے خود کے بھی معطل ہو رہے تھے۔ وہ جیسے اپنے آپ سے بولنے میں مگن تھیں۔

"تم کیا جانو جمیلہ۔۔۔ اولاد کا اجنبی ہو جانا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اجنبی بھی غلط۔۔۔ مجھے دشمن کہنا چاہیے۔۔۔ اولاد دشمن ہو جائے، نفرت کرنے پر آجائے تو زندگی بوجھ لگنے لگتی ہے۔ جینا مرنا ایک سا ہو جاتا

ہے۔" ان کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ جمیلہ کو سمجھ نہیں آیا وہ انہیں کیسے خاموش کرائے۔
"تحریم اور شہریار۔۔۔" ان کی آواز۔۔۔ بے ساختہ بھرا گئی۔۔۔ "دونوں مجھ سے ملنا یا بولنا گوارہ نہیں کرتے' دونوں کی لاتعلقی ہر روز میرے دل میں نیا چھید ڈالتی ہے۔ میں زخم زخم ہو گئی ہوں جمیلہ۔۔۔ میں تھکنے لگی ہوں۔"
"باجی نیچے چلو۔۔۔ آپ کی طبیعت خراب لگ رہی ہے۔" جمیلہ کو گھبراہٹ نے آلیا۔ باجی بہکی بہکی باتیں کر رہی تھیں۔
"میں انس لیتی ہوں' بول لیتی ہوں' لیکن میں مردہ ہوں' زندہ لاش۔"
"باجی۔۔۔ مت بولو۔۔۔ آپ کیوں ایسا بول رہی ہو؟ اللہ حیاتی رکھے آپ کے تینوں بچے آپ کے فرماں بردار ہیں۔ شہریار بھائی ہر وقت فون کر کر کے آپ کی عقیدت کی خیریت پوچھتے ہیں۔ بس تحریم باجی ناراض ہیں۔ پر ان کو بھی ایک دن احساس ہو جائے گا کہ وہ غلط ہیں۔ دیکھنا آپ کے پاؤں چھو کر معافی مانگیں گی۔" جمیلہ ان کے ہاتھ سہلاتی وہ خواب دکھانے لگی جو وہ سوتے جاتے دیکھنے کی عادی تھیں۔ وہ اور ان کے تینوں بچے۔۔۔ ایک آسودہ زندگی۔ کاش یہ ممکن ہو پاتا۔
"مجھے لگتا ہے۔۔۔ میں ایسے ہی ان کی نفرت سہتے سہتے مر جاؤں گی۔"
"باجی۔۔۔" جمیلہ نے بے ساختہ جھرجھری لی۔ "آپ بہت برا بول رہی ہو۔ میں نے ناراض ہو جانا ہے آپ سے۔"
"ختم ہو جاؤں گی ایک دن ان کے نزدیک میرا وجود بے معنی ہے۔ میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ دونوں کے نزدیک میں کب کی مر گئی۔۔۔" وہ بے آواز رو رہی تھیں۔ جمیلہ کے بھی آنسو بہہ نکلے۔
"انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا میرے وجود کے منوں مٹی تلے جانے سے۔۔۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہیں گے' لیکن۔۔۔ لیکن جمیلہ۔۔۔" وہ جمیلہ کی طرف ہراساں سی دیکھنے لگیں۔۔۔ جمیلہ نے دم سادھ لیا۔
"عقیدت رل جائے گی۔ وہ کہیں کی نہیں رہے گی' اس کی سب پناہیں ختم ہو جائیں گی۔"
"باجی آپ سلامت رہو' کیوں اتنی دل خراب کرنے والی باتیں کر رہی ہو۔" جمیلہ کی اونچی اونچی سسکیاں گونجنے لگیں۔
"وہ میرے بغیر نہیں جی پائے گی۔ سب اسے نگل جائیں گے' تحریم' شہریار' کوئی بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھنے کو نہیں آئے گا۔ جمیلہ۔۔۔" اماں نے اس کے کس کے ہاتھ پکڑے۔
"وعدہ کرو' تم عقیدت کا سایہ بنو گی۔ تم اس کی چھاؤں بنو گی' اسے ہر بری نظر سے بچاؤ گی۔" وہ اتنی آس اور امید کے ساتھ یہ وعدہ لینا چاہ رہی تھیں کہ جمیلہ کے انہیں دلاسا دیتے سارے جملے زبان پر آکر مردہ ہو گئے۔
"باجی ایسا نہ بولو۔"
"عقیدت بہت معصوم ہے۔ اسے دنیا والوں کی چالاکی نہیں آتی۔ اس کا زیادہ رویوں سے پالا نہیں پڑا۔ اس نے میری تمہاری محبت اور توجہ دیکھی ہے یا پھر اب تحریم کی حقارت۔۔۔ اسے قسم قسم کے رویوں کی سمجھ نہیں۔۔۔ تم نے اسے اکیلا چھوڑا تو وہ وقت سے پہلے ہار جائے گی' مر جائے گی۔"
"باجی۔۔۔ اللہ واسطے ہمت پکڑو' حوصلہ نہ ہارو' آپ کو میری عمر لگ جائے۔ میری جان حاضر۔۔۔ پر آپ خود سلامت رہو' بلی کے سر پر اللہ کے بعد آپ کی محبت کی چھاؤں نصیب ہو' بلی کو وہ آپ کے سائے میں زندگی کے نئے رنگ دیکھے۔۔۔ آپ خود اسے پڑھاؤ' لکھاؤ۔۔۔ اس کی شادی کرو۔" جمیلہ کا ایک ایک لفظ محبت و خلوص سے لبریز تھا۔

"شادی..." اس کے آخری جملے نے اماں کے چہرے کا سارا خون نچوڑ لیا۔ ان کے ہونٹ تک سفید ہو گئے۔
"ہماری بلی کی شادی... اللہ اس کے نصیب بھی تحریم باجی کی طرح کھولے... اویس بھائی جیسا... ان سے بھی اچھا کوئی ہماری بلی کا مقدر بنے" کن ہوئی بیٹھی اماں نے شدت کے ساتھ دل میں آمین کہا تھا۔ مگر وہ بظاہر گم سم نا دیر بیٹھی رہیں۔

"تم نے دیکھا بہن بھائی کی انتہا درجے کی نفرت و حقارت سہنے کے باوجود بھی چپ رہتی ہے۔ کبھی نہیں پوچھتی وہ ایسا کیوں کرتے ہیں' وہ اس سے کھنچے کھنچے کیوں رہتے ہیں؟ اور کافی دیر بعد وہ پھر سے بولیں۔ یہی ایک سوال تو اکثر اس کی نوک زبان پر بھی مچلتا ہے... وہ اکثر پوچھتے پوچھتے رہ جاتی ہے۔

"شہریار برسوں کا گیا لوٹ کر نہیں آیا... شادی کر کے اپنی دنیا وہیں بسا کے۔ اسے کیا پڑی ہے واپس آنے کی' کتنا دل کرتا ہے اس کے بچوں کو دیکھوں... پیار کروں' ان کی خوشبو' ان کا لمس محسوس کروں... جانتے ہوئے بھی کہ میری زندگی میں یہ ممکن نہیں۔ شہریار نے مجھے اپنی زندگی سے فارغ پرزے کی طرح خارج کر دیا ہے۔ اس کی اپنی منطق ہے۔ تحریم ایک شہر میں رہتے ہوئے اتنی دور' اتنی دور کہ قریب آنے کی کوئی امید ہی نہیں۔ خود تو کیا بچوں کو بھی نہیں ملنے دیتی۔ دنیا دکھاوے کے لیے بھی ماں' بہن کا منہ نہیں دیکھتی۔ یہ زندگی ہے میری جیتے جی مرنے والی..."

"تحریم باجی کو کیا شکایت ہے باجی...؟" بلا ارادہ جمیلہ کے منہ سے نکلا تھا۔ اماں کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ جمیلہ نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ کچھ نہ کچھ غلط اگل دیا تھا اس نے۔ اماں بالکل خاموش ہو بیٹھیں کھسیاہٹ مٹانے کی خاطر جمیلہ نے آس پاس دیکھنا شروع کر دیا۔ بابا جی نظروں کی زد میں آ گئے۔ وہ بڑی تشویش کے ساتھ ادھر ہی دیکھنے میں لگے تھے۔

"باجی... دیکھو ذرا مشکل نام والے بابا جی' ہم ہی کو دیکھنے میں مصروف ہیں۔" باجی نے توجہ نہیں دی وہ کیا کہہ رہی ہے تو اسے باقاعدہ انہیں بازو جھنجوڑ کر اس طرف متوجہ کرنا پڑا۔
"کیا کہتے ہوں گے پورا "خاندانِ جذبات" ہے..." جمیلہ کن انکھیوں سے انہیں دیکھتی ایک طرح سے شرمندہ کر رہی تھی۔ اور وہ ہو بھی گئیں۔ اماں نے بڑی پھرتی سے اپنے تاثرات کے سب اثرات مٹائے۔
"پہلے عقیدت یہاں رونے آ بیٹھتی تھی۔ اب ہم دونوں... بابا جی کے منہ کے نقشے بتا رہے ہیں یہ ابھی ابھی وجہ پوچھنے ہمارے گھر بھی آ جائیں گے۔" واقعی جمیلہ کا کہا سچ بھی ہو سکتا تھا۔ اماں نے خاصی مہارت کے ساتھ اپنی کیفیت کو اس رنگ میں ڈھالا کہ جوان کا خاصہ تھا۔
"میں تو کہتی ہوں ان کے آنے سے پہلے ہم خود ان کے گھر حملہ کر دیں۔"
"جمیلہ..." اماں کو یہ مشورہ خاص پسند نہیں آیا۔ انہوں نے گھر کا تھا۔
"باجی چلو نا... انکار نہیں کرو' ویسے بھی آج میرا کھانا پکانے کا موڈ نہیں... بابا جی اور ان کی بیگم کتنی بار ہمارے گھر کھانے کھا کے گئے۔ آج ہم ان کی دعوت اڑاتے ہیں۔"
"برا لگتا ہے..." اماں یوں منہ اٹھا کر جانے کے حق میں نہیں تھیں۔
"چلتے ہیں نا باجی" جمیلہ کی ضد اور اصرار اماں کو زیادہ دیر تک آنکھیں دکھانے پر مجبور نہیں کر سکے۔
"ان کی بیگم آنکھوں سے پکا پکا کر کھلا دیں گی۔" اماں نے ہنستے ہوئے حقیقت حال بتایا۔ بابا جی کی بیگم کچھ خاص خوش نہیں ہوتی تھیں ان کی یا شاید کسی بھی مہمان کی آمد پر۔
"خیر ہے... ایک کالی بوتل تو پلا ہی دیں گی... اتنی تو مروت ہو گی ان میں۔" اماں اور زور سے ہنس دیں۔ جمیلہ کے سر سے بوجھ اترنے لگا۔ اماں اصلی چولے میں آنے لگی تھیں چند منٹوں میں ان کی سواری سبکتگین کے گھر

جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
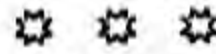
"ارے۔۔۔" یمنی نے کمرے میں جھانکا اور بے ساختہ دبی آواز میں چیخ ماری۔
"فری ہینڈ دیا تھا میں نے آپ کو۔ آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟" وہ بے یقینی سے کہتی اندر داخل ہوئیں۔ پیچھے صوفیہ بھی تھیں۔ دونوں کی مجموعی تیاری دیکھنے کے لائق تھی۔
"شکر کرو کپڑے تبدیل کر لیے۔" صوفیہ نے مسکرا کر کہا۔ فائزہ کی تیاری کا انہیں معلوم تھا وہ بس اتنی سی تیار ہوتی تھیں۔ کپڑے تبدیل کر لیے۔ بال بنا لیے۔ ویسے بھی لشم پشم تیار وہ جانے کن دنوں میں ہوتی تھیں۔ صوفیہ کو یاد تھا۔ شادی کے بعد وہ ٹھیک ٹھاک دلہن والے حلیے میں رہا کرتی تھیں۔ اوپر سے ان کا حسن بلا خیز۔۔۔ صوفیہ تو ان کے جلوؤں کی پرستار ہی ہو گئی تھیں۔ مگر یہ صرف چند روزہ بات تھی۔ بعد ازاں دلہناپا گھٹتے گھٹتے ختم ہو ہی گیا۔۔۔ صرف دلہناپا ہی نہیں فائزہ کا رنگ، روپ، رونق سب خزاں رسید ہونے لگا۔ وہ شادی کے اولین دنوں والا چنچل پن جیسے خواب ہو گیا۔ اس کے بعد آنے والا ہر نیا دن فائزہ کی آنکھوں کے دیے بجھانے لگا۔ وہ ایک زکریا کی ہونے کے لیے باقی دنیا سے کٹتی گئیں۔ ایک انسان کی خوشی و چاہ کی خاطر اپنا آپ مارتی گئیں۔
وہ کم عمر تھیں، شوخ و چنچل، خوش لباس و خوش مزاج تھیں۔۔۔ ایک انسان کی خاطر اپنا ہر رنگ اپنی ہر ادا مٹانے میں مستعد ہوئیں پر اپنے وجود کو نئی فائزہ کے رنگوں میں ڈھالنے میں بری طرح ناکام ہوئیں۔ صحیح معنوں میں وہ کھو کر رہ گئیں۔ خوش ادا و شوخ چنچل فائزہ کو انہوں نے خود دفن کیا۔۔۔ اور آج والی فائزہ وہ حالات و واقعات کی وجہ سے بن گئیں۔ سنعان کی پیدائش اور پھر اس کے بچپن کے دنوں میں کہ جب اسے ماں کی توجہ و محبت کی اشد ضرورت تھی۔۔۔ فائزہ کھو گئیں۔ ختم ہو گئیں۔۔۔!!!
صوفیہ کو یاد تھا۔۔۔ وہ ان دنوں جب ان کے گھر سنعان یا فائزہ کی خاطر آتیں تو فائزہ عجب حلیے میں ملتیں انہوں نے تین مختلف رنگوں کے شلوار قمیص دوپٹا پہن رکھا ہوتا۔ جنہیں استری کی شکل بھی دیکھنی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ ان کی کام والیوں کا حلیہ ان سے ہزار درجہ بہتر ہوا کرتا۔ اب یہ تو صوفیہ ہوتی تھیں کہ اندر کی کہانی سے ناواقف بھی ہوتیں تو بھی نکتہ چیں یا معترض ہونے کے بجائے بات کو اندر دبا لیتیں۔ لیکن کوئی اور کہاں یہ پردے رکھ سکتا تھا! فائزہ کی مجذوبیت یا ذہنی بدحالی سارے میں مشہور ہونے لگی۔۔۔ وہ گھر سے اور خود سے ہی نہیں اپنے اکلوتے بچے سے بھی بے گانہ رہنے لگیں۔ ایسے میں صوفیہ ہی تھیں جو سنعان کو اپنے ہاں لے جاتیں۔ یا زکریا خود ہی پہنچا آتے۔ وہ اولاد کے معاملے میں مالا مال تھیں۔ چھ بیٹے اور ایک بیٹی ہونے کے باوجود وہ سنعان کے لیے ماں جیسی ثابت ہوئیں۔ سنعان جب تک سوچنے سمجھنے کے لائق ہوا ہارون کے گھر خاموشی سے آتا جاتا رہا۔ مگر جیسے ہی ذہن وسیع ہوا۔۔۔ اسے اس سب نے بے زار کر دیا۔
چھوٹی سی عمر میں ہی اس نے جان لیا تھا وہ محروم بچہ ہے۔۔۔ اور اس کی محرومی صوفیہ آنٹی کے گھر جانے سے ختم نہیں ہو جاتی تھی۔ بلکہ مزید بڑھ جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے حالات سے سمجھوتا کرنا شروع کر دیا۔ مگر فائزہ سے یہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے خود کو مار تو دیا تھا۔ مگر وہ خود کو حالات کا عادی نہیں بنا پائی تھیں۔ صوفیہ کے نزدیک اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ ان کا اور سنعان کا تقابل کرتیں تو انہیں فائزہ ٹھیک ہی نظر آتیں۔ ایک جاندار، زندگی سے بھرپور، قوس و قزح کے ہر رنگ سے سجی فائزہ کا مرنا آسان تھا بدلنا مشکل جبکہ سنعان تو پیدا ہی مرے ہوئے، ویران، قبرستان ماحول میں ہوا۔ اسے حالات سے سمجھوتا کر لینے میں کیا مشکل آنی تھی۔
"ہرگز نہیں، آپ میک اپ ضرور کریں گی آج چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" یمنی کی پاٹ دار آواز صوفیہ کو

خیالات کے چنگل سے آزاد کرا آئی۔ انہوں نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ پھیر کر گویا وقت کی گرد جھاڑی تھی۔
"شرمندہ مت کرو عینی۔" انہوں نے عینی کو ٹوکا تھا۔ فائزہ شاید ہی میک اپ کروانے پر راضی ہوتیں۔
"چلیں نہیں کرتی۔ پر لپ اسٹک لگانے سے آپ مجھے نہیں روک سکتیں۔" عینی کی دھونس کامیاب رہی۔
فائزہ کی لپ اسٹک تو کیا ہی ملتی عینی کو پرس سے اپنی نکال کر انہوں نے فائزہ کے ہونٹ گل رنگ کر دیے اور فائزہ یوں نکھر گئیں گویا کہ سولہ سنگھار کر لیے ہوں۔
"ماشاء اللہ۔" صوفیہ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ایسے ہی تو وہ فائزہ کے جلووں کی پرستار نہیں ہوئی تھیں۔
"کیا بات ہے آپ تو چھپی رستم نکلیں۔ ایک لپ اسٹک لگانے پہ چمک اٹھیں۔ مزید میک اپ کیا تو قتل کرنے تک آجائیں گی۔" عینی نے سراہا۔
"لڑکی والوں نے تو آپ کو دیکھ کر اسٹیچو ہو جانا ہے۔ سنعان کو دیکھ کر جانے کیا حشر ہو۔" بغیر کسی کنجوسی کے عینی تبصرے کر رہی تھیں۔ تینوں آگے پیچھے چلتی کمرے سے باہر آگئیں۔ لاؤنج میں رضوانہ ہدایت لینے کے لیے منتظر کھڑی تھی۔
"یہاں سے ہمارے گھر' پھر وہاں سے آگے چلیں گے۔" وہ آگے کا لائحہ عمل بتانے لگیں۔ فائزہ یکلخت بے چین و بے قرار ہو گئیں۔
"میرا جانا ضروری ہے کیا؟" وہ بے ساختہ انگلیاں مسلنے لگیں۔ عینی نے ناتھا پیٹ ڈالا۔
"آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے ہمسائے کے لڑکے کے لیے لڑکی دیکھنے جا رہی ہوں۔۔۔ کمال کرتی ہیں فائزہ آنٹی۔"
"سنعان کو برا لگے گا۔" انہیں دھڑکا تھا۔ عینی بگڑ گئیں۔
"آپ یہ بتائیں۔۔۔ اسے اچھا کیا لگتا ہے؟ اتنا سڑیل اور آدم بے زار ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی مرضی پر چلے تو بن گیا وہ دلہا۔۔۔
اور ویسے ہارون ہے نا۔۔۔ بی بی سی لندن۔۔۔ اب تک بتا بھی چکا ہو گا اسے۔"
"پھر۔۔۔"
"پھر یہ کہ سنعان کو کوئی اعتراض ہوتا تو اب تک فون کھڑکا چکا ہوتا۔۔۔" فائزہ بجائے مطمئن ہونے کے اور زیادہ ہراساں نظر آنے لگیں۔ عینی نے انہیں بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھالیا۔ رسان سے کہنے لگیں۔
"آنٹی کیوں اتنی فکر کر رہی ہیں۔ اللہ کا نام لے کر بسم اللہ کریں۔ بہت اچھے لوگ ہیں اور اچھے لوگ بار بار نہیں ملتے۔ لڑکی دیکھنے پرکھنے میں ہر لحاظ سے ہیرا ہے۔ سنعان کے ساتھ کھڑی ہو گی تو دنیا پٹ سے بے ہوش ہو جائے گی ایسی چاند سورج کو مات دیتی جوڑی ہو گی۔۔۔" عینی آپا کے سمجھانے کے اپنے طریقے تھے۔ وقتی طور پر ہی سہی فائزہ بھی بے مہر خدشات بھول بھال گئیں۔
جب تینوں خواتین چلنے کو تیار ہو گئیں۔ عین اسی پل گیراج میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ فائزہ بے اختیار صوفے پر بیٹھتی چلی گئیں۔ صوفیہ نے گہری سانس لیتے ہوئے ان کی تقلید کی تھی اور عینی نافہم انداز میں دونوں کو استفہامیہ گھورنے لگیں۔ اور یقیناً" وہ وجہ بھی پوچھتیں اگر اسی وقت زکریا لیونگ روم میں قدم نہ رکھ لیتے۔ وہ یقیناً" کسی خاص وجہ کے تحت آفس سے اٹھ آئے تھے۔ طبیعت کی خرابی۔۔۔ یا کچھ بھی اور اب سلام کے بعد نظروں میں تولتے پوچھ رہے تھے۔
"کہیں روانگی ہے؟" ان کی سرسری اڑتی ہوئی نظر فائزہ پر آن ٹکی۔۔۔ وہ بالکل نئی لگ رہی تھیں۔ زکریا کی صرف آنکھیں ہی نہیں سکڑیں۔ ماتھا بھی شکن آلود ہو گیا۔

"ہم سنعان کے لیے لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں۔" عینی نے فخریہ بتایا۔ گویا ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے جا رہی ہوں

"اچھا۔۔۔" زکریا کے لہجے میں مخصوص کاٹ بھرا تمسخر عود آیا۔ "وہ اس لائق ہو گیا کیا؟" عینی کی مسکراہٹ فوراً" اڑنچھو ہوئی تھی۔ اگلی بات زکریا نے فائزہ کی طرف اشارہ کر کے کہی۔

"اور اس میں اتنی قابلیت کہاں سے آگئی کہ بیٹے کا رشتہ لینے چل دی۔" انداز سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔ جو شکل صرف لپ اسٹک لگانے کی وجہ سے نکھر گئی تھی۔ اسے مرجھاتے دیر نہیں لگی۔

"انکل ابھی تو ہم صرف دیکھنے جا رہے ہیں۔ پسند ناپسند تو بعد کی بات ہے۔" زکریا کے سامنے صوفیہ بھی بولنے سے گریز کیا کرتی تھیں۔ کیا پتا کب کیا منہ سے نکل جائے جو ان کی عدالت میں ہتک کے زمرے میں آجائے اور عینی بے خوف بولے جا رہی تھیں۔ صوفیہ کی گھورتی آنکھوں کی پروا کیے بغیر۔

"اس کا جانا ضروری ہے کیا؟" عینی کا رنگ فی الفور متغیر ہوا تو فائزہ آنٹی کو عدالت عالیہ کا بھی خوف تھا۔

"بھائی صاحب اصل میں تو انہی کا جانا ضروری ہے۔" صوفیہ نے شائستگی سے کہا۔

"سوچ لیں۔۔۔ بات بننے کی بجائے بگڑ نہ جائے۔" انہوں نے سراسر فائزہ پر چوٹ کی تھی اور فائزہ جیسے سن ہی نہیں رہی تھیں۔ نظریں جھکائے گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھتی رہیں۔

"لوگ یہ نہ کہیں پاگل عورت کی خدمت کے لیے لڑکی ڈھونڈی جا رہی ہے۔۔۔ سو کالے پیلا کر۔" عینی کا سارا جوش جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ زکریا انکل کے بارے میں جتنا سنا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ جو ہر دکھا رہے تھے۔

"ویسے تو اس کا بیٹا بھی کم پاگل نہیں کیوں ظلم کر رہی ہیں آپ انجان لوگوں پر۔۔۔ سوچ سمجھ کر جائیے گا۔" فائزہ پر ایک کڑی نظر ڈال کر زکریا وہاں سے چلے گئے۔ ماحول بوجھل ہو گیا تھا۔ عینی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی سنعان اور فائزہ اگر شادی کے موضوع سے بدکتے تھے تو کیوں بدکتے تھے۔۔۔ سنعان اور فائزہ کو پاگل کا درجہ دیے جانے والے زکریا خود بہت پاگل تھے۔۔۔ یہ کہنے کے لیے عینی کا دل تو بڑا چاہا مگر احترام مانع آگیا۔۔۔ اور اب وہ منہ لٹکائے بیٹھی تھیں کہ سارے پروگرام پر تو پانی پھر گیا تھا۔

"عینی تم گھر چلی جاؤ۔۔۔" صوفیہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھاتے ہوئے کہنا چاہا۔۔۔

"ممی۔۔۔" عینی منہ بسور کر رہ گئیں "میں نے ٹائم دے رکھا ہے ان لوگوں کو۔"

"منع کر دو بلکہ آئندہ کے لیے بھی ٹال دو۔ تم ہی کو ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کی جلدی رہتی ہے۔ یہ کام بھلا سنعان کی مرضی کے خلاف ہو سکتا ہے۔ تم جاؤ گھر۔ میں ابھی تمہاری آنٹی کے پاس ہوں۔ جس ٹائم آنا ہو گا بتا دوں گی۔" عینی کچھ ہی دیر بعد چلی گئیں۔ رکنے کا فائدہ نہیں تھا اور صوفیہ جان بوجھ کر فائزہ کے پاس رک گئیں۔۔۔ ان کے سامنے اس گھر کی کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ جانتی تھیں ان کے جانے کے بعد فائزہ نے عتاب میں آجانا ہے۔ یہ ذرا سی بات ان کا قصور بن جاتی ہے۔ برسوں پہلے تو سزائیں بھگتنے میں پتا نہیں چلتا تھا۔ مگر اب دم خم ختم ہو چلا تھا۔۔۔ وہ سزا سہنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اور بالآخر۔۔۔ اس کی زندگی میں رنگ گھلنے لگے۔

پہلے وحشت و کلفت۔۔۔ پھر خوف و جھجک اور اب کچھ بھی نہیں۔۔۔ یعنی شوق و کشش نہیں تو خوف و دہشت بھی نہیں رہا۔۔۔ وہ لگی بندھی روٹین کی طرح نئی زندگی کی عادت ڈالنے لگی۔ کالج میں جو پہلی چیز کشش کا باعث تھی۔۔۔ وہ مائدہ تھی۔ ایک اعلا خاندانی پس منظر رکھنے کے باوجود وہ خود بخود اگر عقیدت کی طرف مائل ہونے لگی

تھی تو حیرت کی بات تھی۔ عقیدت پہلے ممنونیت اور بعد ازاں جذبہ دوستی سے مغلوب اس کی طرف راغب ہوتی گئی۔ وہ بڑی بے ریا اور نیک فطرت لڑکی تھی اور عقیدت کی طرح سادہ مزاج بھی' دونوں کے ستارے سوچ سمجھ کر ٹکرائے۔۔۔ اس کے علاوہ بھی کالج میں دیکھنے اور سراہنے کے لائق بہت کچھ تھا۔

وزیرستان کی "پریشے" جس کے پاس کپڑوں کی اتنی ورائٹی نہیں تھی جتنی گاڑیوں کی تھی۔ اس کی لش پش آئے روز بدلتی گاڑیوں کی کالج میں دھوم تھی۔ اور دھوم تو اس کے ناخنوں پر ہمہ دم رہنے والی لال نیل پالش کی بھی بہت تھی۔ کئی لڑکیاں اس کی دیکھا دیکھی ناخنوں پر لال کیوٹکس لگا کر آنے لگیں۔ وہ کالج کی لڑکیوں کے لیے اسٹائل سمبل بن گئی۔ گوری چٹی خالص پٹھان نقوش کی حامل پریشے پر لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی فریفتہ تھیں۔

پھر کشمیر کی "سندس" تھی۔۔۔ اونچی لمبی' قندھاری انار کے رنگ سی۔۔۔ ٹھیک ٹھاک مردمار۔۔۔ جس کی شکل سے زیادہ درس مشہور تھے۔

"میں کہہ رہی ہوں نا۔۔۔ سب سے زیادہ خود غرض قوم ماں باپ کی ہوتی ہے۔ یہ اگر اولاد کو پالتے پوستے ہیں تو فرض نبھاتے ہیں اپنا۔ کون سا احسان کرتے ہیں کہ بعد میں پڑھانے کا قرض مانگنے لگتے ہیں۔" عقیدت نے سن کر اسے دور سے ہی سلام کرنے کی ٹھانی تھی۔ وہ بے تکلف ہوتی تو یقیناً "اخلاق خراب کرنے کا باعث بنتی۔

گلگت کا "عامر" بھی جلد ہی چہیتا بن گیا۔۔۔ صرف کالج والوں کا ہی نہیں۔ معروف ڈیزائنرز اور میک اپ آرٹسٹ پاور نبیل کا بھی کہ جو کسی کام کے لیے ان کے کالج آیا اور عامر کو ماڈلنگ کے لیے لے کر ٹلا۔ عامر کی نہ 'نہ' پہ کان دھرے بغیر اور پھر اپنے دفتر میں عامر کو جانے کون سے آسیب بھوت' پریت دکھائے کہ وہ اگلے روز جان' مال' عزت سب بچا کر بھاگ آیا۔ اور کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر کہتا نظر آیا کہ بیٹا شوبز کی فیلڈ لڑکیوں ہی نہیں لڑکوں کے لیے بھی خطرناک ہے۔۔۔

کلاس کا سی آر جازب۔۔۔ جس کی جاذبیت تو عقیدت کو نظر نہیں آئی ہاں مگر وہ اسے دیکھتا بہت تھا۔ کلاس میں' کینٹے میں' کاریڈور' گراؤنڈ جہاں کہیں نظر آتا گھورتا ہی نظر آتا۔۔۔

سرگودھا کی ثمرہ۔۔۔ کلاس کی سب سے پڑھاکو لڑکی سرگودھا کی صنم۔۔۔ جو قسمت سے ان کی جی آر بن گئی اور اب ناکوں چنے چبوانے پر آئی ہوئی تھی۔

لاہور کی ہی فاطمہ۔۔۔ خوب صورت کلاس کے امیر ترین لڑکوں میں سے ایک فاران کی آتے ہی دوست بن گئی تھی۔ اور جس کے مزاج پریشے کو دیکھ کر آسمان پر چلے جاتے۔۔۔ یوں کلاس میں پریشے اور فاطمہ نام کے دو گینگ بن گئے پھر درخشاں تھی آتے ہی "رانی مکرجی" کے لقب سے فیض یاب ہوئی۔ اپنے پروف کے ہر لڑکے کی دوست تھی اور وہ شاید واحد تھی جس نے دھڑلے سے ایسی دوستیاں پالیں۔۔۔ اور بدنام بھی نہیں ہوئی۔ گجرات کی ریشم۔۔۔ اور اس کا گروپ۔۔۔ حمنی لوگوں کا ہوسٹل فیلو تھا اور بقول مائدہ کے ہروقت ہوسٹل کو سر پر اٹھائے رکھتا تھا۔۔۔ اسی گروپ میں وہ کرسچن سونیا بھی تھی۔۔۔ شب دیجور جیسی سیاہ اور پراسرار۔۔۔ خود کو جاذب نظر بنانے کے وہ وہ جتن کرتی کہ اشتہار ہی بن جاتی۔

ایک بار رات کے جانے کس پہر جب چھاجوں چھاج مینہ برس رہا تھا اور ساری مخلوق نرم گرم لحافوں میں دبکی کتابیں رٹ رہی تھی۔۔۔ ایسے میں دو بدروحیں تھیں جو بے قرار ہوتی چکرا رہی تھیں۔ ایک انہی کے گروپ کی زنوبیہ اور دوسری کرسچن سونیا۔۔۔

مائدہ کے بقول جب لحافوں میں بھی ان کی قلفی جم رہی تھی زنوبیہ افسانوں کی ماری بارش دیکھنے کی چاہ میں ٹیرس پر جا ٹنگی جانے سے پہلے کئی کئی مشہور و معروف ڈائیلاگ جھاڑ گئی۔

"ذرا سنو۔۔۔ لگتا ہے بارش ہو رہی ہے' کیسی جادو بھری' سریلی آواز ہے۔۔۔ جیسے جھرنے بہہ رہے ہوں' جیسے

پائنیں بج رہی ہوں۔"

"بس کرو زنوبیہ۔۔۔ جھرنے پائنیں۔۔۔ سریلی۔۔۔ کا تو نہیں پتا پر ہماری حالت خوار ہو رہی ہے۔" مائدہ نے دہائی دی تھی۔

"یعنی تم لوگ نہیں آرہے ہو بارش دیکھنے؟" سب کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

"نہیں۔۔۔ ہمیں بھری جوانی میں خودکشی کا شوق نہیں۔" اور زنوبیہ منہ پھلاتی خود ٹیرس پر چلی گئی۔۔۔ اس کے بقول وہ جب بارش کا دیدار کر کے واپس روم کی طرف آرہی تھی تو دوسری بدروح ہال کمرے میں خود کو جانے کس جرم کی سزا دیتی نظر آئی۔ چہرہ بانہ۔۔۔ اور پیروں پر ابٹن یا بیسن لگائے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد زنوبیہ پر آشکار ہوا آنسہ سونیا صاحبہ چہرے کی جھاڑ پونچھ میں مصروف ہیں۔۔۔ آج کل اس کا دل کلاس کے ہر دلعزیز گٹارسٹ اور سنگر حماد پر آیا ہوا تھا اور وہ تن دہی سے اس کا جو نسب کھنگالنے میں سرگرداں تھی کہ کیا پتا اس کا ہم نسب ہو۔۔۔ اور چانسز دوستی سے آگے تک بڑھ جائیں۔

ان چیدہ چیدہ چہروں کے علاوہ بھی اکثریت کلاس میں شناسا اور نظر میں آجانے والوں کی تھی۔۔۔ ایک سوائے ان کے گروپ کے۔۔۔ رجا کو غم تھا ساری نکمیاں اس کے گروپ میں جمع ہو گئیں جو کلاس فیلوز تو کیا پروفیسرز کی نظر میں بھی شاید آئی ہوں۔

"کسی کو پتا بھی نہیں ہوگا ہم اس کلاس میں پڑھتے ہیں کہ نہیں۔" رجا سب کو لتاڑتے نہ تھکتی۔

مائدہ بھلے عقیدت جیسی دبو نہیں تھی مگر رجا جیسا اعتماد بھی نہیں تھا اس میں۔ وہ اگر کلاس کی گمشدہ اسٹوڈنٹس میں شمار ہوتی تھی تو عقیدت کی ہی طرح خوش اور مطمئن تھی۔ زنوبیہ کا تعلق صادق آباد سے تھا۔ وہ مائدہ کی روم میٹ تھی اور مائدہ خود کو خود ہی داد دیتے نہیں تھکتی تھی کہ وہ زنوبیہ کے ساتھ دن رات رہنے کے باوجود پاگل نہیں ہوئی۔ اس کے بقول زنوبیہ ون اینڈ اونلی پیس تھی۔ وہ ہوسٹل کو باپ کی جاگیر سمجھ کر رہ رہی تھی۔۔۔ پورا ہاسٹل گھومتی۔ جیسے مرضی آتی جاتی۔ اس کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ اگر سر پہ تیل چپڑا ہوا ہے تو انہی تیل لگے بالوں کے ساتھ کالج بھی چلی جاتی۔۔۔ جس کا مائدہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

آخر میں آجاتی تھی وہ ناچیز۔۔۔ عقیدت فاطمہ۔۔۔ مائدہ زنوبیہ کو ون اینڈ اونلی کہتی تھی اور رجا اسے۔ موسم بدل جانے سے وہ اب شال کی بجائے دوپٹا اوڑھے کالج آتی تھی اور اپنی بڑی بڑی سیاہ کھور آنکھوں میں بنا کوئی جذبہ سموئے ارد گرد کی دنیا کو دیکھتی رہتی اس کے کپڑے کم قیمت کے ہوتے۔ مگر اماں اور جمیلہ مل کر ان پر ایسی عرق ریزی کرتیں کہ وہ اپنی قیمت کو بھی شرمانے پر مجبور کر دیتے۔

"ایسا میں نے "رنگ جا" پہ دیکھا ہے۔" وہ پہن کر جاتی تو رجا بے ساختہ کہنے پر مجبور ہوتی۔

"تم نے "جنریشن" سے لیا ہے؟" ایک سوٹ دیکھ کر رجا نے پوچھا تھا اور وہ ہونق ہو گئی تھی۔ ایسے برانڈڈ کپڑوں والی بوتیکس کا اس کی زندگی میں کیسا گزر اس کے بتانے پر کہ اس کی اماں اس کے کپڑے ڈیزائن کرتی ہیں۔ رجا اور حمنی بے یقین رہ گئی تھیں۔

اس کا سراپا کسی سانچے میں ڈھلا ہوا لگتا تھا وہ جو اور جیسا پہنتی اس پر جچ جاتا۔۔۔ حمنی کو وہ آسٹریلین ماڈلز کے جیسی لگتی تھی۔ نازک اندام، سروقد۔ اس کا چہرہ گول تھا۔ اس گول چہرے پر وہ جب بالوں کی کس کر چوٹی بنائے سر پر دوپٹا ٹکا جاتی تو مائدہ الجھ پڑتی۔

"کیا ہے تمہیں۔۔۔ کوئی اور ہیئر اسٹائل نہیں بنا سکتی ہو تم۔۔۔ بالکل چپاں کر کے آتی ہو بال اور پھر بال (گیند) ہی لگتی ہو۔" اسے سمجھ نہیں آتی تھی وہ کیسا اسٹائل بنا کر جائے اور اس کے بعد مائدہ لوگوں کو مزید اعتراض کرنے کی ضرورت نہ رہے وہ ایک دن چپ چپاتے دھاگا لے کر جمیلہ کے سامنے جا بیٹھی تھی۔

"بلے بھائی۔۔۔" جمیلہ نے کئی منٹ تو آنکھیں مٹکانے میں لگا لیے تھے۔
"بنا دیتی ہو یا میں مائدہ سے بنواؤں؟" اس نے خالی خولی دھمکی دی تھی۔ ایسا کر کے اس نے مائدہ کے سامنے مذاق نہیں بننا تھا۔ جمیلہ نے شرافت سے دھاگا انگلیوں پر لپیٹا اسے دبوچا۔۔۔ اور لگی اپنے جوہر دکھانے۔ یہ دن کے کھانے کے بعد کا ٹائم تھا۔ اماں اس ٹائم حسب معمول سوئی ہوئی تھیں۔ اپنے تئیں عقیدت میدان صاف دیکھ کر جمیلہ کے پاس آئی تھی۔ اسے اماں کے سامنے یہ سب کرواتے بے طرح شرم محسوس ہوتی۔ مگر جب جمیلہ شروع ہوئی تو اس کی چھینکوں پہ چھینکیں ہر اکھڑے بال پہ ایک چھینک۔۔۔ آنکھوں سے پانی الگ۔۔۔ اس دن خدا خدا کر کے گہری نیند میں سوئی اماں ہڑبڑاتی جاگ آئیں۔
"کیا ہوا عقیدت۔۔۔ کیوں اتنا چھینک رہی ہو۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" جمیلہ نے دھاگا چھپا لیا تھا۔
"ٹھیک ہے باجی۔۔۔ بس ذرا الرجی ہو گئی۔" اس میں تو بولنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ دانت نکوس کر جمیلہ نے ہی بہانہ گھڑا۔ اماں۔۔۔ تشویش دکھاتی۔ واپس کمرے میں گئیں۔
دونوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ مگر اس دن عقیدت نے اپرلیس بنوا کر موم لیا۔ "بہت بری لگ رہی ہوں۔" بعد میں آئینہ دیکھتی وہ تادیر پریشان رہی۔
اس نے مائدہ کے کہنے پر آگے سے بالوں کا پف بنانا شروع کر دیا۔۔۔ یوں اوپر کے اٹھے بالوں کی وجہ سے چہرے کی شیپ بھی قابل برداشت ہو گئی۔
مگر یہ سب بے ضرر سی تبدیلیاں تھیں۔۔۔ رجا اور حمنی کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ وہ ماڈ اور اسٹائلش اسٹوڈنٹس کی اس بھیڑ میں ہمیشہ گم شدہ ہی رہے گی۔ مگر وہ کسی کی "نظر" میں آ گئی۔۔۔ اپنے اسی حلیے سمیت اماں کے سلے کپڑوں میں 'مائدہ کے بقول چپاں بالوں۔۔۔ اور بنا کاجل لگی آنکھوں کے ساتھ وہ حسن ضیا کے نظروں میں آ ہی گئی۔۔۔ وہ حسن ضیا جو ممانز بوائے تھا۔۔۔ اور جس کی کالج میں کیئر ٹیکر بننے کا ذمہ فائنل پروف کی افشاں کو ملا تھا۔۔۔ وہ افشاں جو زبردستی ان کے گروپ میں آ دھمکتی تھی۔۔۔!
"عقیدت فاطمہ" اسی حسن ضیا کی نظر میں آ ہی گئی۔

☼ ☼ ☼

اطلاعی گھنٹی کے بجنے پر وہ اپنے کمرے سے دوڑ کر باہر گیٹ تک گئی تھی۔ آنے والا "وہ" نہیں تھا شاید۔۔۔ ملازم نے گیٹ پر ہی سوال جواب کے بعد چلتا کر دیا۔ وہ اترا منہ لیے لاؤنج میں آ گئی۔ جہاں بھابھی کچن کے دروازے پر جمی کھڑی تھیں۔ اسے گہری نظروں کے ساتھ دیکھتی ہوئی۔
"کیا بات ہے فروغ ماہ۔۔۔ کچھ دنوں سے عجیب سی ہو رہی ہو۔۔۔ کچھ ہو گیا ہے کیا؟" سیما بھابھی کی آنکھیں ہی نہیں لہجہ بھی ذو معنی تھا۔۔۔
"کیا کچھ ہو گیا ہے؟" بھابھی کا تفتیشی ٹوہ لیتا انداز فروغ ماہ کو سخت برا لگا۔ اس کی ازلی رعونت عود آئی جواب دینے کے بجائے الٹا سوال پوچھ ڈالا۔
"وہ کچھ۔۔۔ جو اس عمر میں ہو جاتا ہے۔" باقی دونوں بھابھیوں کی نسبت سیما بھابھی اور اس کی عمر میں فرق کم تھا۔ اسی بات کا وہ ناجائز فائدہ اٹھا لیا کرتیں۔
"آپ کا دماغ خراب ہو رہا ہے؟" تیور بنا کر فروغ ماہ نے استفہامیہ پوچھا۔
"سارا دن چولھے کے سامنے کھڑے کھڑے دماغ ٹھیک کہاں رہ سکتا ہے۔" سیما بھابھی لگتا تھا آج اصل حقیقت اگلوانے کے چکر میں تھیں "پر تمہارا دماغ تو چولھے پاس نہ ٹھہر کے بھی کھسکا ہوا لگ رہا ہے۔۔۔ دروازہ

بجے تم دوڑ دوڑ جاتی ہو۔ فون چھنجھے تم پہلے لپکتی ہو۔۔۔ کچھ دن پہلے تک تو تم ہل کر پانی بھی نہیں پیتی تھیں۔ کجا کہ دروازے پر جانے لگیں۔۔۔ سچ معجزوں انہی دنوں ظہور میں آیا ہے۔" فروغ ماہ چپ سی ہو گئی۔ چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق سیما بھابھی کو گھورنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکی۔ جو ایکسرے کرتی نظروں سے اس کا جائزہ بھی لیتی جا رہی تھیں۔

"اب ایسے دیکھو نہیں، مجھے کہہ دو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" مصنوعی منمناہٹ کے ساتھ سیما بھابھی نے اسے مزید زچ کیا۔

"یحییٰ بھائی بہت دنوں سے آئے نہیں۔ ان کا انتظار ہے مجھے۔ انہی کے لیے گیٹ پر جاتی ہوں۔ انہی کا فون سننے کے لیے لپکتی ہوں۔ بچے یاد آ رہے تھے۔" سیما بھابھی کو کسی نہ کسی لائن تو لگانا تھا۔ فروغ ماہ نے یہ کہہ کر جان چھڑانی چاہی۔ سیما بھابھی جلتی پر تیل ڈالنے کے انداز میں ہنس دیں۔

"اللہ رے۔۔۔ بھائیوں کے لیے ایسی بے قراری۔۔۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔" بڑی شے تھیں وہ بھی۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟" بالآخر فروغ ماہ کا صبر جواب دے گیا۔ وہ ہلکا سا چیخی تھی۔

"یہی کہ کچھ تو ہوا ہے۔۔۔؟" انتہائی ڈھٹائی سے سیما بھابھی نے بات کو چیونگم کی طرح کھینچا۔۔۔ فروغ ماہ نے بڑی مشکل سے اشتعال دبایا تھا۔

"کیا کچھ ہوا ہے۔۔۔ آپ بتائیں؟"

"یہ کچھ ایسا جس نے تمہیں اپنا آپ بھلا دیا۔۔۔ کہاں تو آدھا دن تم ٹی وی دیکھتی تھیں اور آدھا دن آئینہ اب یا تو دروازہ دیکھتی ہو یا پھر فون۔۔۔ مرجھائی مرجھائی سی رہنے لگی ہو۔ ہونٹوں پر مردنی' آنکھوں میں ویرانی' چہرے پر بے رونقی۔۔۔ نہ بال سنوارنے کی فکر نہ اچھا پہننے اوڑھنے کا ہوش۔۔۔ جو تھوڑی بہت کام کی تھیں۔۔۔ اس سے بھی گئیں۔" سیما بھابھی لگتا تھا پرانے بدلے چکا رہی تھیں مذاق کے ریپر میں طنز لپیٹ کر۔ جو باتیں عام دنوں میں کرتے ہوئے زبان ہکلاتی تھی یا دل کانپتا تھا کہ فروغ ماہ جھٹ بھائیوں سے شکایت لگا دیا کرتی۔ وہ اس وقت کر رہی تھیں۔

"دیکھو تو ذرا وزن بھی اتنا کم ہو رہا ہے تمہارا اور یہ تب سے ہے جب تم گاؤں سے آئی ہو۔۔۔" سیما بھابھی کی بات زبان پر لے آئیں۔ کن انکھیوں سے فروغ ماہ کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ جس کے چہرے کی رنگت فوراً" بدلی تھی۔

"کہیں۔ کوئی سایہ تو نہیں ہو گیا ہے تم پہ۔۔۔" بڑے ڈرامائی انداز میں سیما بھابھی نے کہا تھا۔

"کہتی ہوں ابراہیم سے' کسی بابا' کسی عامل کا پتا کریں۔"

"بھائی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے بس تھکاوٹ ہو گئی ہے۔ اتنے دن جو گاؤں رہنا پڑا۔ آپ براہ مہربانی اپنے اندازے سنبھال کر رکھیں۔" شدید ترین جھنجلاہٹ سوار کیے فروغ ماہ نے گویا بھابھی کو اوقات میں رہنے کا حکم صادر کیا اور تن فن کرتی کمرے کی طرف چل دی۔ سیما بھابھی ساری جان سے کلس گئیں۔

"لڑکی کی بدلتی چال بتا دیتی ہے اسے کیا ہوا ہے اور تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔۔۔! کچھ دن گزرنے کی دیر ہے۔ خود بتانے کے لیے آؤ گی۔" بھابھی کی خود کلامی کچن میں جانے تک جاری رہی۔

☆ ☆ ☆

اپنے کمرے میں وہ مارے بے بسی کے روئے چلی جا رہی تھی۔ یہ کیسی لاچاری تھی کیسا جان لیوا جذبہ تھا کیسی

جنوں خیز محبت تھی کہ جو منہ کو آرہی تھی۔۔۔ کہیں سکون نہیں مل رہا تھا۔ کسی طور قرار نہیں آرہا تھا۔ دل و دماغ اختیار کھونے لگے تھے، وہ سارا دن بولائی بولائی رہنے لگی۔۔۔ چھوٹی سی عمر میں امی، ابو کو کھونے کی بعد وہ تینوں بھائیوں کے لیے ہاتھ کا چھالا بن گئی تھی۔ بھائیوں نے اسے کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھال کر رکھا ہوا تھا بہت پیار اور توجہ نے اس کے مزاج میں کسی حد تک خود سری پیدا کردی۔ وہ اپنے آگے کسی کو کسی لائق سمجھنے کی روادار نہیں تھی۔ چاہے وہ اس کی بھابیاں ہی کیوں نہ ہوں۔

ماں باپ کی دائمی جدائی ویسے ہی اس کے لیے گھاؤ تھی۔ بھائیوں نے یہ گھاؤ محبت کے پھائے رکھ کر بھرا تو وہ جیسے نارمل زندگی جینے لگی۔ مگر پھر بھائیوں کی شادی نے جیسے عدم تحفظ کی صورت حال پیدا کردی۔۔۔ سب سے پہلے گھر میں یاسمین بھابھی آئیں۔

فروغ ماہ کی جاگیر کی پہلی شراکت دار۔۔۔ وہ بھی بے حد حسین کہ ۔۔۔ وہ عورت ہو کر اس کے دام حسن میں الجھنے لگی تھی تو یحییٰ بھائی تو مرد تھے اور ان کے شوہر بھی۔ وہ کیونکر نہ غلام ہوتے یاسمین بھابھی بڑی رکھ رکھاؤ کی مالک تھیں۔ انتہائی پروقار سی۔ جتنی اہمیت و حیثیت یحییٰ بھائی فروغ ماہ کو دیتے تھے۔ اتنی ہی کی حقدار یاسمین بھابھی بھی ٹھہریں شاید اس سے بھی زیادہ کی کہ وہ نصف بہتر تھیں۔ فروغ ماہ کے اندر چپکے سے حسد پلنے لگا۔۔۔ اسے یاسمین بھابھی سے ”ان کے توبہ شکن حسن سے“ ان کی ہر چیز سے چڑ ہونے لگی۔ وہ خوامخواہ ان سے مقابلے پر اتر آئی۔

کبھی ان کی کسی بات پر اعتراض جڑتی تو کبھی کسی پر۔۔۔ وہ ایک اعلا خاندانی پس منظر رکھتی تھیں۔۔۔ بے حد ماڈ اور زمانے کے ساتھ چلنے والوں میں سے تھیں۔ فروغ ماہ ان کے اس ماڈ حلیے سے بھی بیر رکھنے لگی۔ اس ایک بات کو پکڑ کر اس نے کئی دنوں تک واویلا مچایا تھا۔

”محلے والے باتیں کرتے ہیں۔ یہ جہاں جاتی ہیں۔ ایسے ہی منہ اٹھا کر چلی جاتی ہیں۔ کوئی پردہ کوئی شرم نہیں۔“

یحییٰ بھائی نے درخور اعتنا نہ جانا۔ بھائیوں میں وہ سب سے زیادہ کھلے دماغ کے مالک تھے۔ لیکن اگر فروغ ماہ کا واویلا بڑھ جاتا تو پھر خاموشی اختیار کرلیتیں۔ اچھی بری کوئی بات بھی منہ سے نہ نکالتیں کہ جو فروغ ماہ کے جھگڑے کو وجہ کی صورت مل جاتی اور وہ موردِ الزام ٹھہرادی جاتیں۔ فروغ ماہ کو ان کی یہ خاموشی مزید سیخ پا کردیا کرتی۔ وہ انہیں گھنی میسنی اور نہ جانے کیا کیا اعلانیہ کہنے لگی۔ یاسمین کی وہی ایک چپ سو سکھ والی پالیسی برقرار رہی۔ یہاں تک کہ یحییٰ انہیں ہمراہ لے گئے۔ ان کی جاب کی وجہ سے مختلف شہر تبادلے ہوتے رہتے۔۔۔ اب یاسمین ان کے ہمراہ ہوتیں۔ سب کچھ بظاہر ٹھیک ہوگیا۔

وقتی طور پر ہی سہی۔۔۔ یاسمین فروغ ماہ کے ناقابل برداشت رویے سے دور ہوگئی تھیں۔ مگر خاص مواقع پر جب جب سسرال آتیں۔ فروغ ماہ کی کٹیلی نظروں کے نشتر وہی پرانے ہی ملتے۔ اگرچہ گھر میں دو اور بھابیوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ ان میں سے سب سے چھوٹے ابراہیم اور ان کی بیوی، فروغ ماہ کے ہمراہ رہتے تھے، باقی دونوں بھائی بہ سلسلہ روزگار اپنے بیوی بچوں سمیت دوسرے شہروں میں آباد تھے۔۔۔ اگرچہ فروغ ماہ ابھی بھی بھائیوں کی آنکھ کا تارہ تھی۔ تینوں بھائی اپنی اپنی جگہ پر اس کے لیے بہترین رشتہ تلاش کرکے اسے اپنے گھر بار کا کرنے کی فکر میں تھے۔

کون جان سکتا تھا، بھائیوں کی کوششیں پار لگنے سے پہلے فروغ ماہ کا دل خود کسی کے آگے ہار جائے گا۔ وہ اکھڑ، بدتمیز اور کوم بے زار لڑکی خود دل کے ہاتھوں مجبور ہو جائے گی۔ بھائیوں کی طرف سے سنبھال سنبھال کر رکھی جانے والی وہ کانچ کی گڑیا آج کل سخت اذیت میں تھی۔ کسی کی راہ دیکھتی آنکھوں میں دھول بسائے ہوئے تھی اور

جذبات کا ریلا اس قدر منہ زور ثابت ہوا کہ فروغ ماہ نے بے اختیار یحییٰ بھائی کے گھر کا فون نمبر ملا لیا۔۔۔۔ وہ یاسمین بھابھی کے یہاں پہلی بار۔۔۔ رہنے کی غرض سے جا رہی تھی۔ ایسے میں یاسمین بھابھی کو کسی بیوی کا درجہ دینے والی سیما بھابھی کو ان سے بے طرح ہمدردی محسوس ہوئی۔

"حفاظتی اقدامات کرلیں۔۔۔ شہزادی کی آمد کسی طوفان سے کم نہیں۔" یہی نہیں انہوں نے فون پہ یاسمین بھابھی کو خاصی سنجیدگی سے خبردار بھی کر ڈالا۔ یاسمین بھابھی ہنس دی تھیں۔

☼ ☼ ☼

لنکن سنٹر میں ان کی آوارگی کا یہ تیسرا گھنٹہ تھا۔ محض راحیل اور اس کی نوخیز دلہن کی خاطر اسے نیویارک کے چپے چپے چھاننے پڑ رہے تھے۔ اب یہ نہیں تھا راحیل خود ناواقف نیویارک تھا یا اسے فہد سے محبت بہت تھی۔ درحقیقت تو یہ مسز راحیل کی چاہ تھی۔ جو راحیل کی دلہن کو ایئرپورٹ سے پک کرنے کے بعد متعدد پل، سمندر اور ٹریفک کا اژدحام دیکھ لینے کے بعد ابھی بھی ان کے کام آ رہی تھی۔

اس وقت اوپن ایئر میوزک کنسرٹ کا سا ماحول تھا۔ درختوں کی چھاؤں میں بنے اسٹیج کے سامنے دھری کرسیوں پر بنے ٹھنے، صاف ستھرے کپڑوں میں بیٹھے بوڑھے مرد و خواتین لوک موسیقی پر سر دھن رہے تھے اور یہ بوڑھے اتنے بوڑھے تھے کہ رعشہ زدہ ہو رہے تھے۔

مسز راحیل پورے نیویارک کو پی جانے کے چکروں میں تھیں شاید۔ اس جگہ کو بھی نہ بخشا۔ شوہر سمیت یہاں آ بیٹھی ناک تک بے زار ہوا فہد آخری رو کی کرسیوں میں ایک پر جا ٹکا۔

نیویارک کی لوک موسیقی سے اسے کیا شغف ہو سکتا تھا بھلا؟ سامنے کاؤبوائے ڈریس میں 'بڑا سا ہیٹ سر پہ جمائے' ڈرنک کرتا' جاہل نظر آتا گلوکار اس پر اتنا ضرور اثر انداز ہوا کہ وہ حالت وجدان میں جانے لگا۔۔۔ اور شاید پوری طرح سے نیند میں بھی چلا جاتا اگر ساتھ والی کرسی پر ڈھیر ہوئے سیاہ کوٹ میں تھرتھلی نہ مچتی۔

"تم نے میری تصویر اتاری؟" یہ وہی تھی۔۔۔ سبز آنکھوں والی کبھی پونی ٹیل لہرا کر جاگنگ کرتی تو کبھی راک فیلر سنٹر میں ہلڑ مچاتی۔ فہد ایک دم سیدھا ہوا۔

"نہیں تو۔"

"جھوٹ مت بولو۔۔۔ مجھے فلیش کی روشنی محسوس ہوئی ہے۔"

"وہاں سے کھینچی گئی ہوگی۔" فہد نے مسکراتے ہوئے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"بدتمیز۔" وہ جز بز ہوئی۔

"میں دیکھ رہی ہوں تم میرا پیچھا کر رہے ہو۔"

"واٹ۔" فہد کو دھچکا سا لگا۔

"میں جہاں جاتی ہوں تم میرے پیچھے آ جاتے ہو۔۔۔" اپنے امریکن لہجے میں وہ الزام لگا رہی تھی' وہ بھی ڈنکے کی چوٹ پہ۔

"اور ایسا میں بھی کہہ سکتا ہوں۔"

"تم کہنا چاہ رہے ہو۔ میں تمہارا پیچھا کر رہی ہوں؟" وہ شاکڈ ہوئی تھی۔ فہد نے کندھے اچکا لیے۔

"یو بیڈ انڈین۔۔۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔ "اب تم یہ کہو گے کہ تم انڈین نہیں پاکستانی ہو۔" فہد نے بے اختیار منہ کھول کر اسے دیکھا۔ وہ خالصتاً "اردو" میں بولی تھی۔

"نہیں میں نہیں کہوں گا۔" فہد نے دھیمی آواز میں کہنے کے ساتھ نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کیوں تم پاکستانی نہیں ہو؟" فہد نے محسوس کیا۔ یہ گویا بائیو ڈیٹا جاننے کی ادا تھی۔
"نہیں۔"
"انڈین ہو۔"
"نہیں۔" اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اپنے تئیں وہ نشانے لگا رہی تھی۔ مگر فہد نے اسے الجھا دیا تھا۔
"پھر۔۔۔؟" قدرے جھجک کر اس نے استفہامیہ کہا تھا۔ مگر فہد نے کندھے اچکا ڈالے۔ گویا وہ نہیں بتا سکتا تھا یا نہیں بتانا چاہتا تھا۔
"نان سینس۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور ساتھ والی کرسی پر موجود قدرے ادھیڑ عمر خاتون سے مخاطب ہوئی

"خالہ۔۔۔ آپ نے یہ بور سی موسیقی سن لی ہو تو گھر چلیں؟" خاتون نے گھور کر اسے دیکھا۔
"تم بہت بدتمیز ہو۔۔۔" خالہ منہ بنائی کھڑی ہوئیں۔
"وہ میں ہوں۔" اس نے بدتمیزی کا ثبوت بھی دے ڈالا۔ کچھ ہی دیر میں دونوں خالہ' بھانجی۔۔۔ وہاں سے رخصت ہوئیں۔ جانے سے پہلے بھانجی نے مڑ کر فہد کو ضرور دیکھا تھا۔ نظروں میں ایسا تاثر تھا جیسے کہہ رہی ہو "پھر ملیں گے" فہد نے فوراً "رخ موڑ لیا۔
رنگین آنکھوں اور بھورے بالوں والی وہ خوش نظر لڑکی چلی گئی۔ مگر اتنا احسان کر گئی کہ ماحول پر خوشگوار تاثر چھا گیا۔ جو موسیقی کانوں پر بج بج کر کان بہرے کر رہی تھی۔ وہ ایک دم بھلی لگنے لگی۔ فہد لطف لے کر سننے کے بھرپور موڈ میں آیا ہی چاہتا تھا کہ ادھر سے راحیل اینڈ بیگم چلے آئے۔
"چلیں فہد بھائی یہاں تو بدروحیں گا رہی ہیں۔" فہد کا دل چاہا فوراً" کہے۔
"تو کیا آپ پٹھانے خان اور ریشماں کا سوچ کر یہاں آبیٹھی تھیں؟" مگر چپ چاپ ان کے پیچھے ہولیا۔
ناشتے کے برتن سمیٹتی جمیلہ کی آدھی توجہ اس پر تھی۔ وہ لاؤنج کی دیوار پر لگے چھوٹے سے آئینے کے سامنے کھڑی تھی اور اتنی دیر سے کھڑی تھی کہ جمیلہ کو کھدبد ہونے لگی۔ وہ اپنے بالوں میں ابھی نہ جانے کون سا اسٹائل بنانا چاہ رہی تھی کہ جو بن کے ہی نہیں دے رہا تھا۔
"بی بی۔۔۔ باجی بنا دیں گی۔ تم خود کیسے چٹیا بنا سکو گی؟" دروازے میں سے جھانکتی جمیلہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ روزانہ اماں سے بال بنواتی تھی۔۔۔ آج معلوم نہیں خود کیوں ہلکان ہو رہی تھی۔ جمیلہ کے کہے پر کان دھرے بغیر ہنوز لگی رہی۔ جمیلہ تجسس کے ہاتھوں مجبور پاس آ کھڑی ہوئی۔ آنکھیں سکوڑے بغور اسے دیکھنے لگی۔ جو آگے سے کچھ بال لے کر انہیں تھوڑا سا اوپر کر کے کلپ لگانا چاہتی اور پھر مایوس ہوتی چھوڑ دیتی۔
"کیا ہے۔۔۔؟" بالوں نے کچھ ایسا تھکا ڈالا کہ وہ عادت کے برخلاف جمیلہ پر ہلکا سا چلا اٹھی۔
"دیکھ تا بھی منع ہے کیا؟" جمیلہ نے خفا خفا سی شکل بنائی۔ عقیدت الگ رو نکھی ہو رہی تھی۔ جب سے مائدہ نے سر کے ساتھ چپکے بالوں کی طرف دھیان دلایا تھا وہ کچھ زیادہ ہی کانشس ہو گئی تھی۔
"میں کوشش کروں؟" ہنوز اس کے سر پر کھڑی جمیلہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"میں کرلوں گی۔" اس کے لہجے میں رکھائی تھی۔
"تب تک تمہارا جہاز بھی آجائے گا۔۔۔" جمیلہ کا اشارہ رکشا کی طرف تھا۔ عقیدت نے بے ساختہ کلائی پر موجود گھڑی دیکھی۔ واقعی رکشا آنے کا ٹائم ہو چلا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جمیلہ یا اماں سے وہی مشہور زمانہ چٹیا بنوالی جائے۔۔۔ جو اس حد تک کس کر باندھی جاتی تھی کہ اس کا ماتھا کہاں سے کہاں جا پہنچتا تھا۔
"تم مجھے تھوڑا سا بتا دو کیسے بال بنا رہی تھیں۔ جب تک رکشا نہیں آتا ہے۔ میں بھی کوشش کرلوں۔" اس

نے کچھ سوچا۔۔۔ اور پھر باقاعدہ اشارے کر کر کے بتانے لگی۔
"تھوڑے سے بال آگے سے لو۔۔۔ انھیں ہلکا سا اوپر اٹھا کر یہیں کلپ یا پن لگا دو۔ پھر پیچھے سے چٹیا کرو۔۔۔"
یوں جس اسٹائل کو بنانے میں اس کے بازو لٹک گئے۔ جمیلہ نے وہ نہایت مہارت سے چٹکیوں میں بنا دیا۔
"واہ۔۔۔ ماشاءاللہ۔۔۔ بلی تیرے چہرے کے تو نقشے بدل گئے۔" جمیلہ کے سراہنے کا اپنا طریقہ تھا۔ عقیدت کو شرم نے آلیا۔ وہ بڑے طریقے سے سر پر دوپٹا جمانے لگی۔
"باجی۔۔۔ باجی۔۔۔ آؤ دیکھو نا۔ اپنی بلی تو ابھی سے ڈاکٹر لگ رہی ہے۔"
"پاگل ہو گئی ہو۔" عقیدت کو نہیں پتا تھا یہ ذرا سی تبدیلی گھر میں یوں بھونچال لے آئے گی۔ اماں جس بھی کونے میں تھیں فوراً "نکل آئیں۔ عقیدت کا مارے شرم سے منہ سرخ ہو گیا۔ یوں اپنا آپ اماں کو خصوصی طور پر دکھا کر تعریف وصول کرنا اپنے آپ میں نیا تجربہ تھا۔ اماں اور اس کے بیچ یہ والی بے تکلفیاں خال خال ہی رونما ہوتی تھیں۔
"ماشاءاللہ۔۔۔ ماں صدقے۔۔۔" اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے دل میں اتار لینے کی حد تک مشتاق نظروں سے دیکھتی اماں کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ عقیدت یک ٹک انھیں دیکھے گئی۔
"باجی ویسی لگ رہی ہے نا۔۔۔" جمیلہ نے ماں بیٹی کے ارتکاز میں ارتعاش پیدا کیا تھا۔
"ویسی کیسی؟" لحظے بھر کو جمیلہ کی طرف دیکھنے کے بعد اماں پھر سے اسے بغور دیکھنے لگیں۔
"وہ جو پی ٹی وی کے پرانے دور میں آتی تھیں۔۔۔ وہ۔۔۔ جو ڈراموں کا بتاتی تھیں کہ اب یہ والا ڈراما لگ رہا ہے۔"
"اناؤنسرز کی بات کر رہی ہو؟"
"ہاں وہی۔۔۔ خبریں پڑھنے والی۔" اماں کے قہقہے گونج اٹھے۔ ذرا سا دھیان لگا کر دیکھا جاتا تو عقیدت کے ہیئر اسٹائل کے سرے اسی دور کی پی ٹی وی کی پیداوار خواتین سے ملتے نظر آتے۔
"جی نہیں جمیلہ صاحبہ۔۔۔ میری شہزادی اس وقت بہت حسین لگ رہی ہے۔ صحیح معنوں میں ڈاکٹر لگ رہی ہے۔" قہقہے کو اڑھ لگا کر اماں نے دیکھا اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں انہوں نے اس کا چہرہ تھام کر فرط جذبات سے کہا۔ عقیدت کو کافی تسلی ہو گئی۔
"ویسے۔۔۔ میرا بچہ اب بڑا ہو گیا ہے۔ اپنی ماں کی مدد کے بغیر بال بنا لیے۔۔۔ وہ بھی اتنے اچھے۔" انہوں نے عقیدت کا ماتھا چوما تھا۔
"یہ میں نے بنائے باجی۔۔۔ کمال ہے۔" جمیلہ نے مصنوعی منہ لٹکایا "آپ کا بچہ اتنا ہی ہے۔ کوئی بڑا نہیں ہوا۔ منہ اندھیرے یہ اس شیشے کے سامنے کھڑی تھی۔ دو منٹ اور لگ جاتے تو رونا شروع کر دینا تھا اس نے۔"
"واہ جمیلہ۔۔۔" اماں ہنستے ہوئے سراہ رہی تھیں۔ "تم تو ہر فن مولا ہو۔"
"میرا ارکشا۔۔۔!" نہ جانے اور کون کون سی مثالیں دی جاتیں۔ عقیدت کو چیخ کر موضوع بدلنا پڑا۔
"واقعی دیر لگا رہا ہے۔ میں فون کر کے پوچھتی ہوں۔" اماں ہاتھ پیر پھیلائے کمرے کی طرف لپکیں۔۔۔ عقیدت نے سکون کا سانس لیا۔۔۔ جبکہ جمیلہ بڑی ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ اس نے ہلکا سا سر کو خم دے کر اشاروں میں ہی وجہ پوچھ ڈالی۔ وہ بھی کڑے تیوروں کے ساتھ۔
"میں سوچ رہی ہوں۔ تم نے بال ایسے بنائے کیوں؟ وجہ کیا ہوئی؟ مطلب۔۔۔ ضرورت کیوں پڑی۔" بنا بنا کر بولتی جمیلہ اسے ذرا نہیں اچھی لگی۔ پتا نہیں کیوں اداکاریاں کر رہی تھی۔
"نائمہ کی وجہ سے۔" ناچار جواب دیا کہ شاید جمیلہ کی زنبیل کا منہ بند ہو جائے۔ مگر اس میں سوالات کے پہاڑ

موجود تھے۔

"ماٸیں مائدہ کی وجہ سے کیوں؟" جمیلہ کو حقیقتاً" حیرت ہوئی۔

"وہ کہتی ہے۔ مجھ پر وہ چپاں بال اچھے نہیں لگتے۔" مائدہ کی ہی طرح اس نے چپاں کے "پاں" کو لمبا کھینچ کر کہا۔

"چپاں۔۔۔؟" جمیلہ نے اس سے بھی زیادہ "پاں" کو لمبا کھینچ لیا۔

"مطلب۔۔۔ اس اسٹائل میں بال میرے سر سے چپک جاتے ہیں۔" نہ جانے کیوں وہ وضاحتیں دے رہی تھی حالانکہ دل اور دماغ پر اب رکشا چھایا ہوا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" جمیلہ نے ہونٹ بگاڑے تھے۔۔۔ دفعتاً" رکشا کی پھٹ پھٹ گونجی۔ اس سے زیادہ جمیلہ مستعد ہوگئی۔ اس کا بیگ اپنے کندھے سے لٹکا اسے ہمراہ لیے گیٹ تک بھاگی۔ پیچھے اماں نے بھی تقلید کی۔ اسے روزانہ رکشا تک چھوڑ کے آنا دونوں نے ذمے داری بنالیا تھا۔ ابھی بھی وہ جب تک رکشا پر بیٹھ کر روانہ نہیں ہوگئی۔ اماں اور جمیلہ گیٹ پر ایستادہ رہیں۔

☼ ☼ ☼

اس نے آج اماں کے ہاتھ کا سلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ بنفشی رنگ کی پرنٹڈ قمیص۔۔۔ جس کے دامن کے مرکز میں کٹ تھا۔ یعنی شرٹ نیچے سے اوپن تھی۔ سیاہ اور گلابی رنگ کی دیدہ زیب لیس اوپر سے شروع ہوتی نیچے کٹ تک جارہی تھی۔ ساتھ میں سیاہ ٹراؤزر۔۔۔ اور دونوں رنگوں کے امتزاج میں رنگا سر پر سجا جارجٹ کا دوپٹا۔ جس کے چہار اطراف سیاہ ربن لگا تھا۔۔۔ لگ ہی نہیں رہا تھا یہ سوٹ گھر کا سلا ہے۔۔۔ کمال کی فٹنگ اور صاف ستھری سلائی۔ سونے پہ سہاگہ اس کا ہیئر اسٹائل مائدہ نے ہی نہیں۔۔۔ زنوبیہ اور حمنی نے بھی دیکھتے ہی توصیفی ڈونگرے برسائے۔

"تمہارا تو فیس کٹ ہی بدل گیا۔" مائدہ نے وہی بات کی۔ جو جمیلہ نے "چہرے کا نقشہ بدل گیا" کی صورت کہی تھی۔ عقیدت نے دل ہی دل میں مزا لیا۔

"یہ بھی تمہاری امی نے سیا؟" رجا عجیب بے نیاز انداز میں پوچھ رہی تھی۔ عقیدت نے محض اثبات میں سر ہلایا۔

"تم لوگوں کو بوتیک کھول لینا چاہیے۔" اس بار اس کا چہرہ بے تاثر رہا۔

"چلو چلو بچہ لوگو۔۔۔ D.H چلو۔۔۔ ڈیڈ باڈیز آگئیں۔" رانی مکرجی اعلان کرتی بھاگتی آرہی تھی۔ یا ہر موجود سبھی لڑکے لڑکیاں تتر بتر ہوگئے۔ ان کا گروپ بھی D.H کی طرف جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈائی سلیکشن ہال میں پانچ ڈیڈ باڈیز لائی گئی تھیں۔ جن کے گرد مختلف بیجز کے لڑکے لڑکیوں کا جمگھٹا تھا۔ ڈیڈ باڈیز کے دیکھنے کا اثر مختلف اسٹوڈنٹس پر مختلف انداز سے ہو رہا تھا۔ کچھ حالت جوش میں تھے تو کچھ حالت مدہوش میں۔ خاص طور پر لڑکیاں بری طرح سے دہشت زدہ ہو رہی تھیں۔

"تو کیوں نہیں جارہا؟" دور کونے میں کھڑے سی آر جازب نے حسن ضیا سے کہا تھا۔ جس کے منہ پہ بارہ بجے ہوئے تھے۔

"مجھے ڈر ہے تو ان کے قدموں میں آجائے گا؟" جازب قدرے شریر ہوا۔ حسن ضیا نے توجہ نہیں دی۔۔۔

"میری فیلنگ عجیب ہو رہی ہے الٹی آنے والی۔" ڈیڈ باڈی کے گرد بھیڑ لگائے اپنے بیج کے لڑکے لڑکیوں کو

دیکھ کر حسن نے کچھ دیر بعد کہا تھا۔

"عجیب چوں چوں کا مربا ہو یار۔۔۔ لڑکیوں والے احساسات ہو رہے ہیں تیرے۔"

"تو جا۔۔۔ تو کیوں کھڑا ہے' جا تو جائزہ لے آ۔۔۔" جاذب اس اجازت کے انتظار میں تھا۔ اگلے پل وہ بھی بھیڑ کا حصہ بن گیا۔

حسن ضیا سخت اکتاہٹ سے یہ سب دیکھنے لگا تھا۔۔۔ کسی بیچ کی کوئی لڑکی بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہاں کا شور الگ نوعیت کا ہو گیا تھا۔ پریشے بھی ایک طرف زرد رنگت لیے بیٹھی نظر آئی۔ جی آر صاحبہ لگتا تھا ڈیڈ باڈی کی پوری ہسٹری جاننے کی متمنی تھی۔ اس کا شوق قابل دید تھا اور پھر یوں ہی آوارہ گردیاں کرتے کرتے نظر وہاں تک کا سفر کر گئی جہاں وہ گلاب کا پھول بنی کھڑی تھی۔ پہلی نظر کا تاثر بس یوں ہی تھا۔ عام سا۔۔۔ حسن نے ایک بار پھر باقی ہال کی طرف نظریں گھمائی تھیں اور پھر اس کی طرف۔۔۔ دوسری نظر کچھ دیر ٹھہر گئی۔۔۔ وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔ بے حد ہراساں سی گویا معاملہ زندگی اور موت کا ہو۔۔۔

حسن نے سر جھٹک کر پھر سے جاذب لوگوں کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کی۔ مگر اب کہاں؟ توجہ بٹ چکی تھی۔ تیسری نظر اسیر ہو چکی تھی۔ وہ ارد گرد کو فراموش کیے صرف اسے دیکھنے میں محو ہوا۔ اسے شاید جگہ نہیں ملی تھی۔ اس کے والی ڈیڈ باڈی کے گرد لڑکے لڑکیاں امڈے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر دور سے ہاتھ مسلتی اس بھیڑ کو دیکھتی۔۔۔ پھر آگے بڑھ کر اس کا حصہ بننے کے لیے ہلکی سی کوشش کرتی اور ناکامی کی صورت میں منہ لٹکائے پھر اسی مخصوص جگہ پر جا ٹھہرتی۔ حسن کی نظریں اس کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہی تھیں۔ وہ بڑی دلچسپی' شوق سے کسی اہم سبق کی طرح اسے دیکھے جا رہا تھا۔

اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے ایڑھیاں اٹھا اٹھا کر وہ کوشش کرتی۔۔۔ اور کچھ نظر نہ آنے پر پھر سے روتی صورت بنائے کھڑی ہو جاتی۔۔۔ حسن کے لیے اسے دیکھنا کسی مشغلے سے کم ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اتنی معصوم' اتنی دل نشین لگ رہی تھی کہ ہر منظر پر حاوی نظر آ رہی تھی۔ اور حسن ضیا۔۔۔ جس نے کلاس کی حسین ترین لڑکیوں کو ایک کے بعد دوسری بار دیکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ اسے بڑے دل سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ اور وہ اپنی ہی دھن میں رو دینے کو تھی۔۔۔ کہ اس کا بیچ مائنڈہ لوگوں سے الگ تھا۔ اور وہ ڈیڈ باڈی کا جائزہ لینے کے تجربے سے محروم رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اسے ایئرپورٹ سے لینے ہارون آیا تھا اور اب دونوں اس کی گاڑی میں ہارون کے ہوٹل کی طرف رواں دواں تھے۔ حالانکہ ہارون نے کہا بھی تھا۔

"گھر چلو یار۔۔۔ فائزہ آنٹی مس کررہی ہوں گی۔"

"فریش ہوکے۔" اس کے مختصر جواب کے بعد ہارون کے مزید اصرار کی راہ مسدود ہوگئی تھی۔۔۔ جانتا تھا اس نے کہہ دیا تو کہہ دیا۔

"یاد آیا۔۔۔" ہارون کی آواز کچھ زیادہ جوشیلی تھی۔ سنعان نے نافہم انداز میں اس کی طرف گردن موڑی۔۔۔ وہ اسے بڑی شرارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ویسے ہو بڑے وہ تم۔۔۔" اب پتا نہیں وہ کون سی۔ پھلجھڑی چھوڑنے کے چکر میں تھا۔ سنعان گہری سانس لیتا ونڈ اسکرین کی جانب متوجہ ہوا۔ ہارون کی بات سننے میں اسے چنداں دلچسپی نہیں تھی۔

"جانتا ہوں جانتا ہوں۔۔۔ تجھے میری بات سننے میں ذرا دلچسپی نہیں لیکن بیٹا سننی پڑے گی۔۔۔ نہیں تو میرا پیٹ پھٹ جائے گا۔"

"کال پہ بتا دیتے۔۔۔" پیٹ پھٹ جانے کا سن کر سنعان نے ازراہ ہمدردی کہا تھا۔

"بتا تو دیتا پر تیرے مکھڑے کے رنگ دیکھنے سے محروم رہ جاتا۔۔۔" سنعان نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

"یار میں سرپرائز دینے کے چکر میں تھا۔" ہارون منمنایا۔۔۔ سنعان کو ہلکی سی الجھن نے آگھیرا۔

"ہمارے سامنے بڑے آدم بے زار' بڑے خشک مزاج بنے پھرتے ہو اور اندر خانے یہ حالات ہیں۔۔۔ اچھا بچو۔" سنعان کو اندازہ تھا بات کرنے سے پہلے ہارون ایسے ہی تمہید باندھے گا۔ وہ واقعی بے زار ہونے لگا۔

"یار انسان کی زبان میں بتا۔۔۔" تھکاوٹ اس پر ہارون کی لن ترانیاں۔۔۔ سنعان اکتانے لگا۔

"انسان کی زبان؟" ہارون نے خاصے صدمے سے اسے دیکھا۔۔۔ بعض اوقات وہ زیادتی کرجاتا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔۔۔ جو بولے قبول۔۔۔" مصنوعی آہ بھرتے ہارون نے کہنا شروع کیا۔

"وہ جو "نجات ٹی وی چینل" کی مشہور اینکر ہے۔ حبہ سلمان۔۔۔ وہ تیری تلاش میں۔۔۔ تیرے قدموں کے نشان ڈھونڈتی ہوٹل آگئی تھی۔" سنعان کے ذہن میں کسی حبہ سلمان کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ برابر نافہم تاثرات کے ساتھ ہارون کو دیکھتا رہا۔

"تجھے دیکھنے' تجھ سے ملنے کے چکر میں اس نے ہوٹل کو اندر باہر سے ہلا ڈالا۔ دن میں پچاس پچاس تو کالیں کرتی ہے کہ مہاراج آئے؟"

"کون حبہ سلمان۔۔۔؟" سنعان کی آنکھوں میں ہلکی سی بھی شناسائی کی رمق نہیں تھی۔ ایک لمبی سی سانس لینے کے بعد۔۔۔ اسے بغور دیکھتا ہارون دھیمی آواز میں بتانے لگا۔

"حبہ سلمان۔۔۔ سلمان غوری کی بیٹی۔۔۔ غوری منزل کی رہائشی۔۔۔ یاد ہے نا غوری منزل؟" اور سنعان کے تاثرات بدلنے لگے۔ اسے غوری منزل نہیں بھولی تھی۔ اسے غوری منزل میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنے وہ خوب صورت سے تین پورشنز یاد تھے۔۔۔ اسے کریتی یاد تھیں۔۔۔ اسے بچپن کی وہ دنیا نہیں بھولی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

طوبیٰ احسن
عید کا جوڑا

"سنیے آج میں درس میں گئی تھی۔" فائزہ اپنے شوہر شاہد سے مخاطب تھی۔

"اچھا۔" شاہد نے بے توجہی سے کہا۔

"سن تو لیں۔" فائزہ نے شاہد کی بے توجہی محسوس کرتے ہوئے ذرا ناراضی سے کہا۔

"سن تو رہا ہوں۔ بھئی میں کان سے سنتا ہوں۔" شاہد کے ہاتھوں میں موبائل تھا اور نگاہ مستقل موبائل پر مرکوز تھی۔ وہ گیم کھیل رہا تھا یا پھر میسج پر کسی سے بات ہو رہی تھی۔

"یہ موبائل تو میری سوکن بن گیا ہے۔" فائزہ کو غصہ آگیا اور وہ چیخ کر بولی۔

"دل چاہتا ہے کہ اسے گلی میں پھینک دوں ہر وقت اسی پر نظریں جمائے رہتے ہیں کبھی میری طرف بھی دیکھ کر بات کر لیا کریں۔"

"تم کو کیا دیکھیں۔" شاہد نے ہنس کر شرارت سے کہا۔

"دیکھی ہوئی چیز کو دیکھنے کا کیا فائدہ۔" فائزہ کے غصے کا اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے اب مجھ سے بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔" فائزہ بے حد خفا ہو گئی اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

"اوہو!" شاہد نے پشیمان ہو کر فائزہ کو آواز دی۔

"یار کیا ہوا میں مذاق کر رہا ہوں اور تم ناراض ہو گئی ہو۔" فائزہ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ چاروناچار شاہد کو اٹھنا ہی پڑا۔

"ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتی ہو میں تو مذاق کر رہا تھا۔" وہ فائزہ کو صفائی دیتے ہوئے بولا۔

"یہ مذاق تھا تو انتہائی واہیات۔" فائزہ کے غصے کا گراف لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا۔

"اچھا چلو معاف کر دو۔" شاہد فائزہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے اندر لے آیا۔

"تم کیا کہہ رہی تھیں اب بتاؤ بندہ دونوں کان اور آنکھیں کھولے دل و جان سے ہمہ تن گوش ہے۔"

"اگر مجھ سے بات کرتے ہوئے موبائل کو ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہو گا۔" فائزہ نے دھمکی دی۔

"میری توبہ۔" شاہد نے دونوں کانوں کو مسخرے پن سے ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو فائزہ کو ہنسی آگئی۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں پڑوس میں درس میں گئی تھی۔ وہاں یہ بات ہوئی کہ عید کی تیاری رمضان سے پہلے کرنی چاہیے۔ تاکہ رمضان میں یکسوئی سے عبادت کر سکیں اور روزوں میں بازاروں کی خاک نہ چھاننی پڑے۔ ویسے بھی اس سال گرمی کے روزے ہیں میں بھی سوچ رہی ہوں کہ جو بھی خریداری کرنی ہے اسی ہفتے کر لوں تاکہ رمضان میں بازار کے چکر نہ لگانے پڑیں۔" فائزہ نے شاہد کو تفصیل سے اپنی بات سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو کر لو! اس میں کیا مضائقہ ہے۔" شاہد نے خوشدلی سے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر پیسے۔" فائزہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"پیسے؟" شاہد نے بغور دیکھا "تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"مطلب یہ کہ مجھے اس کے لیے پیسے چاہئیں۔"

"پیسے چاہئیں" شاہد کا موڈ بگڑ گیا۔ "میں ساری تنخواہ مہینے کے شروع میں تمہارے ہاتھ میں رکھ دیتا ہوں تم کو سب پتا ہے۔ اب تم کو کس بات کے پیسے چاہئیں۔"

"بھئی عید کی خریداری کے لیے مجھے الگ سے پیسے چاہئیں۔" فائزہ نے ضدی لہجے میں مطالبہ کیا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ میرے پاس کوئی الگ سے پیسے نہیں ہیں۔" شاہد نے جھنجلا کر کہا۔

"ویسے بھی تم کو پتا تو ہے کہ اس مہینے گاڑی خراب ہو گئی تھی کتنا پیسہ لگ گیا ہے اس میں۔"

"ایک تو یہ گاڑی۔۔۔" فائزہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"ہر مہینے کتنا پیسہ کھا جاتی ہے۔"

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ عیش بھی تو تم ہی کرتی ہو مہارانی صاحبہ۔" شاہد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیسا عیش؟" فائزہ بھڑک اٹھی۔

"مہینے میں دو بار بچوں کو پارک لے جاتے ہیں۔ یا

پھر امی کے ہاں چھوڑ دیتے ہیں عیش تو میں اسے مانوں جب باہر کھانا کھلانے لے کر جائیں۔"

"جتنی چادر ہو اتنے ہی پاؤں پھیلانے چاہئیں اچھا کھا رہے ہیں 'اچھا پہن رہے ہیں لاکھوں لوگوں سے بہتر ہیں۔"

"اچھا خیر" فائزہ واپس اپنے موضوع کی طرف پلٹ آئی۔

"مجھ کو پیسے چاہئیں ہر صورت۔ عید کی خریداری کے لیے" فائزہ نے ضدی لہجے میں کہا۔

"دماغ خراب ہے کیا۔" شاہد نے غصے سے آگ بگولا ہو کر کہا۔

"چوری کروں 'یا پھر ڈاکا ڈالوں۔"

"کسی سے ادھار لے لیں۔" فائزہ شاہد کو غصہ آتا دیکھ کر صلح جو لہجے میں بولی۔

"تم لے لو۔" شاہد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "مشورہ بی بی سے ادھار۔"

"کون مشورہ بی بی؟" فائزہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

"وہی تمہاری درس والی باجی" شاہد نے چمک کر کہا۔

"ان کو کچھ مت کہیں۔" فائزہ برامان گئی "ان کا کیا قصور؟"

"ان کا ہی تو قصور ہے۔" شاہد نے جھلا کر کہا "انہوں نے ہی تمہارے دماغ میں یہ خناس بھرا ہے۔"

"ان بے چاری نے تو ہمارا فائدہ سوچا" فائزہ منمنائی۔

"کان کھول کر میری بات سن لو" شاہد نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

"نہ میرے پاس ایکسٹرا پیسے ہیں اور نہ میں کسی سے ادھار لوں گا۔ تم خود یا تو کسی سے قرض لے لو۔ یا پھر رمضان میں عید کی تیاری کر لینا۔" فائزہ چپ چاپ اس کی شکل تک رہی تھی۔

"اور یہ بھی سمجھ لو کہ اگر ہم سارا سال اس بات کی پلاننگ کریں یا پھر چھوٹی سی کمیٹی عید کے نام کی ڈال لیں۔ تو ممکن ہے کہ اگلے سال ہم رمضان سے پہلے عید کی خریداری کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اس سال تو ممکن نہیں۔" شاہد کے صفا چٹ انکار پر فائزہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"اب چپ کر کے آرام سے گھر میں بیٹھ جاؤ۔"

اور واقعی فائزہ چپ کر کے آرام سے گھر میں بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

ارادہ تھا کہ جیسے شاہد کو تنخواہ ملے گی فوراً" ہی بازار چلی جائے گی لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ رمضان کے پہلے عشرے میں ہی بخار نے آگھیرا۔ وہ تین دن بستر میں ہی گزر گئے بخار تھا کہ اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ڈاکٹر کے ہاں جا کر اینٹی بائیوٹک کا کورس کیا پھر جاں بخشی ہوئی لیکن ابھی آزمائش ختم نہ ہوئی تھی کہ چھوٹے بیٹے کو بخار نے جکڑ لیا۔ ڈاکٹر کے ہاں چکر لگا لگا کر دن گزرتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ پندرہ روزے گزر گئے۔ سولہواں روزہ تھا۔ سحری کر کے نماز پڑھ کر آرام کے ارادے سے لیٹی ہی تھی کہ آنکھ لگ گئی کیا دیکھتی ہے کہ عید کا پہلا دن ہے۔ تمام لوگ زرق برق کپڑے پہنے اس کی ساس کے گھر میں جمع ہیں۔ ساری نندیں 'دیورانی' جٹھانی 'سب لوگ اعلا قسم کے زرق برق لباس پہنی ہوئی ہیں اور وہ خود ایک کونے میں اداس بیٹھی ہے۔ اس کی جٹھانی اس کے قریب آتی ہے۔ تو دیکھتی ہے کہ وہ (جٹھانی) نہایت عمدہ لباس پہنے ہوئے ہے اور اپنے معمولی کپڑوں کو دیکھ کر اس کی نگاہ جھک گئی۔ جٹھانی اس سے پوچھ رہی ہے کہ۔

"فائزہ کیا ہوا اس عید پر نئے کپڑے کیوں نہیں پہنائے" ابھی وہ جواب دینے ہی والی تھی کہ آنکھ کھل گئی دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ماتھے پر پسینے کے قطرے اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ کتنی دیر چت لیٹی چھت کو دیکھتی رہی پھر یکایک اس کو خیال آیا کہ یہ ایک خواب تھا تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔ یہ ایک خواب تھا۔" وہ بار بار

خدا کا شکر ادا کر رہی تھی اچانک ہی اس نے پکا ارادہ کر لیا۔

"میں آج عید کا جوڑا لینے ضرور جاؤں گی۔"

چونکہ ارادہ پکا اور عزم پختہ تھا لہٰذا فوراً" ہی اٹھ کر گھر کے کاموں میں لگ گئی۔ جلد از جلد گھر صاف کیا' برتن دھوئے اور بچوں کو نہلا دھلا کر شاہد کے ساتھ ہی امی کے ہاں روانہ کر دیا۔ وہ بے چارے جز بز ہوتے رہے۔ لیکن اس کے اصرار کے آگے ہاں کرتے ہی بن پڑی۔

لگے ہاتھوں پڑوس کی سیما سے بات کرلی کہ ایک بجے تک ظہر پڑھ کر بازار چلیں گے۔

"واقعی اگر ارادہ پختہ ہو تو سب کام آسان ہو جاتا ہے۔" اس نے خوشی سے سوچا۔

ڈیڑھ بجے تک دونوں نکل کھڑی ہوئیں۔ سیما کے بقول "وہ اسے ایک ایسے بازار کی طرف لے کر جائے گی جہاں کپڑے سستے' عمدہ اور پائیدار ہوتے ہیں۔ دھل کر بھی رنگ خراب نہیں ہوتا۔ خرابی صرف یہ ہے کہ بازار دور بہت ہے۔ گھنٹہ سے زیادہ کا تو صرف راستہ ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" فائزہ نے اطمینان سے کہا۔

"راستہ بے شک لمبا ہو لیکن اگر کپڑا عمدہ' بہترین اور سستا ملتا ہو تو دور جانے میں حرج نہیں۔"

دونوں رکشا میں سوار ہو گئیں باتیں کرتے کرتے راستے کا پتا ہی نہیں چلا اور گھنٹہ بھر کا راستہ جلد ہی طے ہو گیا۔ مل بھی کافی بن گیا۔

"کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔" فائزہ مطمئن تھی۔

"زری پلازہ" کے نام سے یہ مارکیٹ فائزہ نے پہلی بار دیکھی تھی۔

"اس کے تین حصے ہیں۔" سیما نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"گراؤنڈ فلور' میز نائن فلور اور فرسٹ فلور' میز نائن فلور میں کپڑا سستا ہے' گراؤنڈ فلور میں مہنگا اور فرسٹ فلور میں کراکری' بیڈ شیٹ' کشن اور پردے وغیرہ ملتے ہیں۔"

"چلو پھر میز نائن پر ہی چلتے ہیں۔" فائزہ نے جھٹ سے فیصلہ کیا۔

"لیکن تم ایک نظر گراؤنڈ پر بھی مار لینا پھر فیصلہ کرنا" سیما نے مشورہ دیا۔

"کیسا فیصلہ۔" فائزہ نے حیرانی سے کہا۔

"بھئی خریدنے کا اور کیسا" سیما مسکرا کر بولی۔

دونوں خراماں خراماں چلتی ہوئی اندر مارکیٹ میں داخل ہوئیں۔ فائزہ کو پہلی دکان سے ہی سوٹ پسند آ گیا۔ قیمت بھی مناسب تھی اور رنگ بھی پسند کے مطابق تھا۔ وہ تو خریدنے ہی والی تھی کہ سیما نے ٹھوکا دیا اور آنکھ سے اشارہ کیا۔

"ارے کیا پہلی دکان سے ہی خرید لوگی۔" سیما نے ڈپٹ کر لیکن آہستگی سے کہا۔

"پہلے گھوم پھر کر دیکھ تو لو ہو سکتا ہے اندر جا کر کوئی اور چیز پسند آجائے جو اس سے اچھی اور کم قیمت ہو۔"

"ہاں واقعی۔" فائزہ سیما کی عقلمندی' فراست اور دور اندیشی کی قائل ہو گئی۔

"میں تو واقعی بے وقوف ہوں۔" اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا اور سیما کے پیچھے چل دی۔ اندر داخل ہوئی دیکھا تو دکانیں ہی دکانیں۔ تھیں کپڑا ہی کپڑا فیصلہ کرنا دو بھر ہو گیا گرمی بے حد تھی چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہہ رہا تھا۔

دکاندار بھی گرمی کی وجہ سے بے حد بد تمیز اور چڑچڑے ہو رہے تھے نہ تو پیسے کم کرتے تھے اور نہ ہی زیادہ مال دکھاتے تھے۔

"لینا ہے تو لو ورنہ جاؤ۔" فائزہ تو سخت پریشان ہو گئی۔ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا۔ جو چیز پسند آتی وہ سیما کو نا پسند ہوتی' کسی کی قیمت اپنی جیب سے باہر ہو جاتی' آخر فائزہ بالکل بے زار ہو گئی گرمی تھی اور حلق بھی سوکھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ حلق میں کانٹے پڑ گئے ہوں۔ چلتے چلتے ٹانگیں بھی جواب دینے لگیں۔

"بس میں تو تھک گئی" فائزہ نے تھک ہار کر کہا۔

"مجھ سے اب چلا کیا بولا بھی نہیں جارہا۔"

"چلو ایک نظر گراؤنڈ فلور پر بھی دیکھ لو۔" سیما نے کہا۔

فائزہ منع کرنے ہی والی تھی کہ اب اس کے اندر چلنے کی ہمت نہ تھی۔ لیکن سیما آگے بڑھ گئی ناچار فائزہ کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

گراؤنڈ فلور پر کیا پہنچے سارا پسینہ یک لخت غائب ہو گیا رگ وپے میں ٹھنڈک سرایت کرنے لگی گرمی کا جیسے نام ونشان ہی ختم ہو گیا ہو' سیڑھیوں پر بھی ایک خوشگوار ہوا جسم وجان کو معطر کر رہی تھی۔ دراصل یہاں اے سی کی ٹھنڈی ہوا نے سب کے موڈ خوشگوار کر دیے تھے۔

ساری ہی دکانوں کا جائزہ لیا۔ خوبصورت دکانیں' دیدہ زیب ملبوسات' لیکن قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی۔

"یہ لوگ اے سی کا بل بھی ہم سے ہی وصول کریں گے۔" فائزہ نے تنفر سے کہا۔

"پھر تو وہ ٹھیک ہے۔ میزنائن فلور کم از کم اشیاء کی قیمت اپنی جیب سے باہر تو نہیں۔"

"چلو پھر اوپر چلتے ہیں۔" سیما تو جیسے اسی بات کی منتظر تھی۔

دوبارہ میزنائن فلور پر پہنچے انتہائی گرم ہوا جسم سے ٹکرائی' پھر وہی گرمی اور گھٹن فائزہ کو ایسا لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

"میں تو کہتی ہوں کہ اسی دکان پر چلتے ہیں جو سب سے پہلے دیکھی تھی۔ وہاں سوٹ بھی پسند آ گیا تھا۔ اور دکاندار بات بھی تمیز سے کر رہا تھا۔"

مقام شکر تھا کہ سیما کو یہ بات سمجھ میں آ گئی اور وہ راضی ہو گئی۔

اب وہ والی دکان ڈھونڈنی تھی' لیکن دکان کا نمبر یاد تھا نہ ہی دکاندار کی شکل' دکان مل ہی نہیں رہی تھی چلتے چلتے فائزہ کی ٹانگیں شل ہو گئیں ایسا لگتا کہ جیسے ابھی گر پڑے گی۔

ایک جگہ اسے اسی دکان کا شبہ ہوا بالکل وہی تھی دوڑ کر دکان کے قریب پہنچی پیچھے مڑ کر دیکھا تو سیما غائب تھی۔

"حد ہو گئی۔" فائزہ کوفت' بے زاری کی انتہا پر تھی۔ نہ جانے سیما کہاں چلی گئی آگے بڑھ کر اور دائیں بائیں دیکھا سیما کا کہیں پتا نہ تھا۔

"اب یہ نئی مصیبت" فائزہ کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔ کتنی دیر وہاں کھڑی رہی۔ آخر کار موبائل نکالا اور سیما سے رابطہ کیا۔

"کہاں ہو تم" دوسری طرف سے سیما کی جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔

"بھئی ہم جس گلی میں چل رہے تھے۔ اسی کے اختتام پر کھڑی ہوں۔"

"سیدھی طرف الٹی طرف" سیما نے سوال کیا۔

"الٹی طرف"

"شکر ہے؟" فائزہ نے سکھ کا سانس لیا سامنے سے سیما نظر آتی دکھائی دی۔

"کہاں چلی گئی تھیں" سیما نے قریب آتے ہی درشتی سے کہا۔

"ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں تھک کر چور ہو گئی۔"

"میں تو یہیں تھی۔" فائزہ کو بھی غصہ آنے لگا۔

"تم ہی کہیں گم ہو گئی تھیں۔"

جلدی جلدی سوٹ خرید اسیما کا تو موڈ آف تھا ایک طرف منہ بنائے کھڑی تھی بچوں کے کپڑے بھی جلدی سے لے لیے۔

ناحق پھر پھر کر اپنے آپ کو تھکایا فائزہ کو افسوس ہونے لگا۔ پہلی ہی دکان سے خریدتی اور گھر واپس چلی جاتی اس نے افسوس سے سوچا اب تو حال یہ تھا کہ ٹانگیں بری طرح دکھ رہی تھیں۔ حلق سوکھ رہا تھا جسم پسینے سے شرابور اور سر چکرا رہا تھا۔

جلدی جلدی باہر نکلے' رکشا والے سب ہی نخرے کرنے لگے۔

"اتنی دور بھئی ہم اتنی دور نہیں جائیں گے۔"

سیما جس کو بھی اپنا پتا بتاتی۔ سب کانوں کو ہاتھ لگاتے۔

"اتنی دیر میں تو روزے کا ٹائم ہو جائے گا۔"

سیما ہی رکشا والوں سے لڑ رہی تھی۔ پیسے طے کر رہی تھی کم کرا رہی تھی۔ فائزہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی تو بولنے کی ہمت ہی نہ تھی۔ دونوں ہاتھوں میں سامان پکڑے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بہت ہی بھاری بوجھ اٹھایا ہوا ہو۔ چلنے سے قدم انکاری تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابھی گر پڑے گی۔

بڑی مشکل سے ایک رکشا والا ڈبل کرایا لے کر چلنے پر راضی ہوا۔ دونوں بیٹھیں' بیٹھنے کے باوجود فائزہ کی حالت ٹھیک نہ تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ بار بار سوکھے لبوں پر زبان پھیرتی۔ آنکھیں بند کیے بے دم بیٹھی تھی۔ راستہ اس قدر طویل ہو گیا تھا جیسے شیطان کی آنت' ختم ہی نہ ہو تا تھا۔

جیسے ہی گھر کے قریب پہنچے تو اذانوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں فائزہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

روزہ کھل گیا تھا اور شاہد اذانوں سے آدھا گھنٹہ پہلے کام سے واپس آتے تھے۔ نہ جانے وہ کہاں کھڑے ہوئے ہوں گے' اس نے پشیمان ہو کر سوچا سیما مطمئن تھی اور فائزہ کو اس کی وجہ بخوبی معلوم تھی اس نے سیما کو روزہ کھلنے سے آدھا گھنٹہ قبل ہی پانی کی بوتل بیگ سے نکال کر پانی پیتے ہوئے دیکھا تھا۔

"میں ہی خوار ہوئی۔" فائزہ نے کلس کر سوچا تھا گھر پہنچی اور جاتے ہی بستر پر گر پڑی' سخت برا حال تھا۔ نہ جانے شاہد کہاں تھے۔ اس نے بند آنکھوں سے سوچا۔

"کاش کوئی مجھے پانی لا دے۔" اس نے آہ بھر کر سوچا۔ گھر تو پہنچ گئی تھی لیکن اب اٹھنے کی ہمت نہ تھی۔

"فائزہ فائزہ تمہیں کیا ہو گیا۔" شاہد کھڑا دیوانوں کی طرح پکار رہا تھا۔ شاہد اس کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا' خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"پانی پہلے مجھے پانی پلا دیں۔" وہ پپڑی زدہ لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔

"دروازہ کھلا ہوا تھا اور تم یہاں اس حالت میں پڑی ہو' آخر تمہیں ہوا کیا ہے۔" وہ ازحد متفکر اور بدحواس ہو گیا تھا۔

فائزہ خاموشی سے اسے تکتی رہی بولنے کی ہمت کہاں تھی۔ سامنے شاپر میں پڑا ہوا عید کا جوڑا مسکرا مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہی منظر عید کا پہلا دن اور فائزہ اپنی ساس کے گھر دعوت میں شریک تھی۔ ساری نندیں' دیورانی' جیٹھانی سب زرق برق ملبوسات زیب تن کیے ہوئے ہیں اور فائزہ جی ہاں فائزہ بھی خوبصورت اور دلکش لباس پہنے ہوئے تھی۔

اس کی جٹھانی اس کے قریب آئی اور بولی۔

"فائزہ تمہارا جوڑا بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔ کہاں سے لیا ہے۔"

فائزہ مسکرا کر بتانے لگی مگر دل ہی دل میں اسے گزرا ہوا وہ دن یاد آ گیا اپنی حالت یاد آئی تو خوف سے جھرجھری سی آ گئی۔

☼ ☼

ناولٹ
قندیل فاطمہ

رات کے آخری پہر میں بھی اسٹار کلب پوری طرح جاگ رہا تھا۔ تیز میوزک 'تھرکتے بدن' بے حال ہوتے جسم اور چھلکتے جام۔ سب ہی کچھ تو تھا وہاں پھر میرے ساتھ ایسا کیوں؟ میں جو اسی ماحول میں پیدا ہوئی ۔اسی ماحول میں پروان چڑھی۔ اسی میں جوان ہوئی پھر آج ایک دم اچانک یہ سب برا کیوں لگ رہا ہے؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ یہ سب سوچ سوچ کر رما کے اعصاب شل ہو رہے تھے جب مہوز نے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا جوابا" وہ ایک تیز نگاہ اس پر ڈال کر کلب سے باہر آگئی۔ لان میں آکر اس نے گہرے گہرے سانس لے کر اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ باہر آکر اس کے تنے ہوئے اعصاب کو کچھ سکون ملا۔ اپنے بیگ سے گاڑی کی چابی نکالی اور زن سے گاڑی نکال کر لے گئی۔ مہوز اس جگہ حیرت زدہ کھڑا یہ سب کارروائی دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر دوبارہ اسی ماحول میں گم ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"انسان جو چاہے پالے یہ ضروری نہیں ہے۔ آج ہمارا نظریہ یہ ہو گیا ہے کہ پیسے سے دنیا کا ہر کام کیا جا سکتا ہے۔ مگر ایک ذات ایسی ہے جس کی مرضی کے آگے سب ارادے سب نظریے ہیچ ہیں تقدیر پر کسی کا زور نہیں چلتا اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے ارادے کے درمیان حائل ہے۔" حضرت علیؓ کا قول ہے۔" میں نے اپنے ارادوں کی شکست سے اپنے رب کو پہچانا۔ تو ثابت ہوا انسان اپنی تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے دعا کو اہمیت دی کہ اگر بندہ دعا کرے صدق دل سچائی اور خلوص کے ساتھ تو تقدیر کا لکھا بھی بدل جاتا ہے۔"

خواتین بڑے انہماک اور ادب کے ساتھ پروفیسر ارمین فاطمہ کا درس سن رہی تھیں کہ ایک خاتون نے سوال کرنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے سر کے اشارے سے اجازت دی۔

"پروفیسر صاحبہ میرا سوال یہ ہے کہ جب اللہ تقدیر بنا دیتا ہے تو وہ تو حکمت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ تو ہمیں ہماری ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے تو وہ ہماری قسمت میں تلخ حالات کیوں لکھ دیتا ہے؟"

جواب میں پروفیسر صاحبہ بڑی متانت سے مسکرائیں پھر گویا ہوئیں۔

"اللہ تعالیٰ انسان سے اس کی ماں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔ وہ آزماتا ہے اگر میں اس پر سخت حالات مسلط کر دوں تو کیا وہ صبر کرتا ہے؟ یا واویلا مچاتا ہے اور اگر میں اسے خوشحال کر دوں تو کیا وہ شکر ادا کرتا ہے یا اسے اپنی ذہانت اور قابلیت پر محمول کرتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر دوڑائی تو گھڑی شام کے چھ بجا رہی تھی۔ انہوں نے دعا کی اور درس کا وقت ختم ہو گیا۔

مسز عشرت ایاز کو اللہ تعالیٰ نے دولت 'شہرت' اچھی اولاد اور سب سے بڑھ کر پیار کرنے والا دل دے رکھا تھا۔ وہ ہر کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے گھر میں ہفتہ وار چھوٹی سی محفل کا اہتمام کیا تھا۔ انہوں نے پروفیسر ارمین فاطمہ سے گزارش کی تو وہ مان گئیں۔ پروفیسر صاحبہ ایک پرائیویٹ کالج میں اسلامیات کی ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ تھیں اور دوپہر میں وہ ترجمہ و تفسیر کی کلاس بھی لیتی تھیں' اسی لیے انہوں نے شام ساڑھے چار سے چھ بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔ یہاں خواتین کے علاوہ کالج اور اسکول کی جوان لڑکیاں بھی بہت شوق اور عقیدت سے آتی تھیں جو ایک خوش آئند بات تھی۔

☼ ☼ ☼

"رما بیٹا اب اٹھ بھی جاؤ دوپہر کا ایک بج گیا ہے۔ میری جان رات کو اتنی دیر کہاں لگا دی۔" رما جاگ رہی تھی کسلمندی سے بستر میں پڑی تھی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ "آپ رات جلدی گھر آگئی تھیں؟"

"ہاں بیٹا فنکشن جلدی ختم ہو گیا تھا۔ تمہارے ڈیڈی کو بزنس کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی جانا تھا۔

سو ہم نے سوچا کہ گھر چلے جانا چاہیے خیر تم فریش ہو جاؤ میں ناشتا لگواتی ہوں۔" وہ کافی دیر غائب دماغی سے سوچتی رہی پھر سر جھٹک کر واش روم میں گھس گئی۔ نہانے سے طبیعت کافی بہتر ہو گئی۔ نیچے آکر اس نے ناشتا کیا اور ماما سے اپنی دوست کا کہہ کر باہر نکل آئی۔

کافی دیر بلا مقصد سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے ہوئے اس کی نظر فیول سگنل پر پڑی تو وہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس نے گاڑی موڑلی۔ آج اس کا ذہن کسی بھی ایک نقطے پر نہیں رک رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی کو بے مقصد اور فضول سمجھ رہی تھی۔ کچھ کرنے اور کر گزرنے کی خواہش اس کے دل میں کلبلا رہی تھی مگر وہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اسی سوچ میں گھر آگیا۔

گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے وہ اندر جانے کی بجائے لان میں آگئی۔ آج مطلع کچھ ابر آلود تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور اس کے اعصاب پر اچھا تاثر ڈال رہی تھیں اچانک اس کے دل میں پکوڑے کھانے کی خواہش جاگی تو اندر چلی آئی۔ کچن میں بوا برتن دھو رہی تھیں۔ اس نے بوا سے پکوڑوں کی فرمائش کی۔ بوا نے پکوڑے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ چپ چاپ ان کی کار روائی دیکھنے لگی۔ جب پکوڑے تیار ہو گئے تو وہ چلی کیچپ اور پکوڑوں والی پلیٹ اٹھا کر لان میں آگئی۔ اتنے دنوں سے اس کے ذہن میں جو عجیب قسم کی فرسودگی چھائی ہوئی تھی وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔

رما کا تعلق ہائی سوسائٹی سے تھا۔ اس کے والد سراکس کا کاروبار کرتے تھے اور ان کا بزنس کئی شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ رما کا ایک ہی بھائی تھا فارن کنٹری میں ہونے کی وجہ سے بعض اوقات آٹھ سے دس دس ماہ تک وہ اپنی شکل نہیں دکھاتا تھا۔ رما اس وقت اس دنیا میں آئی جب اس کے ڈیڈی زوار ملک کو ایک بیٹی کی شدید خواہش تھی۔ کیونکہ ان کی اپنی بہن سب سے بڑی تھیں۔ شادی کے بعد یو کے چلی گئی تھیں

دو بھائی تھے جو گاؤں میں اپنے بابا کی زمینوں کا کام سنبھالتے تھے۔ زوار ملک شہر کی سب سے اچھی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے جہاں ان کی دوستی اکنامکس ڈپارٹمنٹ کی نیہا سے ہو گئی پھر یہ دوستی محبت میں اور محبت شادی میں بدل گئی۔ زوار ملک اتنے خود سر نہ تھے مگر نیہا کی ماں کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ اس شادی میں اپنے گھر والوں کو بھی نہ بلا سکے۔ اس کے بعد وہ نیہا کو لے کر گاؤں بھی گئے مگر وہاں ان کا اچھا استقبال نہ ہوا۔ خود نیہا جو ہائی کلاس کی دل دادہ تھیں انہیں گاؤں جانا اتنا پسند نہ آیا۔ اس لیے کبھی کبھار زوار ملک چکر لگا آتے۔ نیہا اس کے بعد کبھی نہیں گئیں۔ رما کی پیدائش زوار ملک کے لیے ایک خوش خبری تھی۔ وہ اسے اپنی جان سے بھی عزیز رکھتے اور اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کرتے۔ گریجویشن کرنے کے بعد رما نے پڑھائی چھوڑ دی۔ کیونکہ جس ماحول میں وہ رہتی تھی وہاں کسی بھی قسم کی پابندی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ لہٰذا وہ باؤنڈ ہو کر نہیں پڑھ سکتی تھی۔ ان کی فیملی میں بوائے فرینڈز سے ملنا' عریاں لباس پہننا' نائٹ کلب جوائن کرنا بالکل معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ گھر میں ہر قسم کی سہولیات کے علاوہ ملازموں کی پوری ٹیم ہمہ وقت خدمت کے لیے موجود رہتی تھی۔ ایسے حالات میں انسان کا بگڑ جانا کوئی حیرت ناک بات نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"مسلمان اپنے ہی مذہب کے بارے میں عجیب خیالات اور واہموں کا شکار ہیں۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو جتنی آسانیاں اور سہولیات اس دین میں ہیں کہیں اور نہیں ملتیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کے پڑھے' نہیں تو لیٹ کر بھی پڑھ سکتا ہے۔ اگر کوئی روزہ نہیں رکھ سکتا تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے جیسا کہ قرآن پاک میں حکم ہے

"اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔"

اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے کتنی آسانیاں پیدا کردی ہیں۔ اسلام بہترین دین ہے اور اس دین کی اشاعت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سونپی۔

آپ میں سے کوئی سیرت طیبہ پر روشنی ڈالے گا۔"

درس میں شریک ایک لڑکی نے ان کی اجازت سے سیرت محمدی پہ روشنی ڈالی۔

پروفیسر صاحبہ نے اس اسٹوڈنٹ کا نام پوچھا۔ نام بتول تھا۔

☆ ☆ ☆

"سیماب بیٹا! مجھے ایک گلاس پانی پلانا۔"

"ابھی لایا دوا۔" یہ کہتے ہوئے سیماب پانی لے کر دوا کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"جیتے رہو بیٹا!" پانی پی کر وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھیں۔

"بیٹا ذرا میرا بی پی چیک کرنا مجھے لگ رہا ہے جیسے لو ہو رہا ہو۔"

"ارے دوا آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اتنی کیوٹ اور اسمارٹ سی تو ہیں ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ آپ بالکل ٹھیک ہیں پھر بھی آپ کی تسلی کے لیے میں چیک کرلیتا ہوں۔" اس نے بی پی چیک کیا۔

سیماب زوار ملک کے چھوٹے بھائی احتشام ملک کا بیٹا تھا۔ اس کی دو بہنیں تھیں ایک کی شادی ہو چکی تھی اور دوسری شہر میں ایک کالج ہاسٹل میں رہتی تھی۔ وہیں تعلیم حاصل کر رہی تھی اور سیماب کے چچا آفتاب ملک کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بیٹیاں بڑی تھیں سو ان کی شادیاں ہو گئیں اور بیٹے چھوٹے تھے ابھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کے دادا کے انتقال کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ ان کی دوا اب ان کی یادوں کے سہارے زندگی گزار رہی تھیں۔ وہ اپنے بڑے بیٹے زوار ملک کو بھی بہت یاد کرتی تھیں وہ کبھی کبھار ایک دن کے لیے آجاتے پھر واپس چلے جاتے۔

☆ ☆ ☆

"اگر آپ فرائض کی بات کرتی ہیں تو یہ بعد کی بات ہے آپ پہلے حقوق کی بات کریں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

"اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔" یہاں ایک بات واضح کرنا ضروری سمجھوں گی۔ ایک ہوتا ہے نیکی کرنا اور اس کے بدلے میں ویسی ہی نیکی مل جائے تو حساب برابر ہو جاتا ہے۔ لیکن احسان وہ نیکی ہوتی ہے جو کی جانے والی نیکی سے بڑھ کر ہو۔ والدین نے ہمارے ساتھ نیکی کی انہوں نے ہمیں جنم دیا۔ ہماری پرورش کی پھر سب سے مشکل کام انہوں نے ہماری تربیت کی ہمیں اچھائی اور برائی کا الگ الگ راستہ دکھایا۔ بدلے میں ہم نے تو ان کی نیکی کا بدلہ ہی نہیں اتارا تو ہم ان پر احسان کیسے کر سکتے ہیں۔ احسان چکانے کا ادنیٰ سا موقع مل سکتا ہے بشرطیکہ اگر نیت خالص ہو۔ والدین کی خدمت کرکے ان کے دکھ سکھ میں مدد کرکے ان کے لیے دعا کرکے۔ ان کی خواہشات کو پورا کرکے ان کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چل کے انسان اپنی آخرت سنوار سکتا ہے۔"

"کسی کے ذہن میں کوئی سوال ہو تو بلا جھجک پوچھ لے۔" اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے پروفیسر ارمین نے کہا۔ تو بتول نے سوال کرنے کی اجازت مانگی۔ پروفیسر ارمین فاطمہ نے اسے اجازت دی۔

"مرد تو ساری زندگی اپنے والدین کی خدمت کر سکتا ہے کیونکہ اسے کہیں نہیں جانا ہوتا لیکن لڑکی تو شادی کے بعد سسرال چلی جاتی ہے وہاں سو بکھیڑے ہوتے ہیں وہ اپنے والدین کی خدمت کیسے کر سکتی ہے؟"

وہ گویا ہوئیں۔ "یہ بات صحیح ہے کہ مرد ساری زندگی خدمت کر سکتا ہے کیونکہ اسے کہیں نہیں جانا ہوتا مگر یہاں یہ بات کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ آج کے معاشرے میں مرد ماں کی بجائے اپنی بیوی کو ہی حیات کا کل سرمایہ سمجھتا ہے۔ وہ دولت کمانے میں اور اپنی بیوی کے ناز نخرے اٹھانے میں اور اپنے بچوں کو اعلا سے اعلا تعلیم دلوانے میں اس قدر مصروف ہے کہ اسے اپنی ماں سے دو گھڑی بات کرنے کی بھی

فرصت نہیں ہے۔ ایسے میں بے چاری ماں یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ چاہے بیٹا ہو یا بیٹی وہ شادی کے بعد رخصت ہو ہی جاتے ہیں۔ بیٹی نظروں سے او جھل ہو کر اور بیٹا نظروں کے سامنے رہنے کے باوجود نظر نہیں آتا۔ اب بیٹی کا یہ فرض بنتا ہے چاہے وہ اپنے سسرال چلی جائے وہ اپنی ماں کو نہ بھولے۔ اگر وہ بیمار ہو تو اس کی تیمارداری کرے۔ اگر اسے کسی کام میں مدد کی ضرورت ہو تو اپنی مصروفیات کے باوجود اسے انکار نہ کرے۔ لڑکی کی ایک ماں وہ بھی تو ہوتی ہے جو اسے اپنا پلا پلایا جوان بیٹا دیتی ہے۔ وہ اس کی خدمت کرے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے جیسا اپنی ماں سے کرتی تھی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسے ماں کے قدموں والی جنت نہ ملے۔" پھر پروفیسر صاحبہ نے کلاس برخاست کردی۔ مسز عشرت انہیں ان کی گاڑی تک چھوڑنے آئیں۔

☼ ☼ ☼

"ماما! میں کلب جا رہی ہوں شاید دیر ہو جائے میرا انتظار نہ کیجیے گا۔ میں لیٹ ہو جاؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ عجلت میں چابی لیے باہر نکل گئی کیونکہ وہ مقررہ وقت سے لیٹ ہو گئی تھی۔ کلب میں رنگ و بو کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ وہی تیز میوزک اور پھر وہی بکواس۔ ایک دم اس کا دل پھر اچاٹ ہونے لگا مہوز نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ یہ سب بالکل اچانک ہوا وہ بے اختیار ہی اس کے گلے لگ گئی۔

"او کم آن یار! تم تو سب سے آگے آگے ہوتی ہو آج کیوں کھڑی ہو۔" پھر وہ بھی اسی رقص و سرور کی محفل کا حصہ بن گئی۔ اس نے ایک جام چڑھالیا۔ پھر دوسرا اور جب تیسرا تو مہوز جھومتا ہوا اس کے پاس آ گیا وہ بھی ٹھیک ٹھاک مے نوشی کر چکا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتے لفظوں سے کہا۔

"رما... او... رنہ پیو تم نے خود ڈرائیو کر کے جانا ہے۔" رما نے اس کی بات ان سنی کردی اور تیسرا گلاس بھی چڑھالیا۔ وہ خود کو اس کیفیت سے نکالنا چاہ رہی تھی اس نے فرار کی راہ یہ تلاش کی۔ تقریباً چار بجے کے قریب وہ کچھ ہوش میں آئی پھر بھی وہ جھوم رہی تھی۔ گاڑی تک پہنچی چابی گھمائی اور پھر آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتے ہوئے نکل کر لے گئی۔ آدھے راستے کے قریب اس کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ ڈرنک اس کے لیے نیا نہیں تھا لیکن جو اس نے آج پی وہ بہت مہنگی ڈرنک تھی اور اتنی زیادہ مقدار میں اس نے پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ وہ عین سڑک کے درمیان میں تھی جب اس کی گاڑی ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرائی پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

☼ ☼ ☼

"شکر ہے زوار بیٹا تم نے اپنی شکل تو دکھائی۔ تم تو مجھے بھول ہی گئے ہو اگر نیہا نہیں آئی تو اپنے بچوں کو تو مجھ سے ملوادو ان کی شکل ہی نہیں دیکھی میں نے۔ اب تو کافی بڑے ہو گئے ہوں گے۔"

"ہاں ماں جی بڑا بیٹا ماسٹرز کرنے کے بعد باہر چلا گیا وہیں بزنس سنبھالتا ہے اور چھوٹی بیٹی بی اے کرنے کے بعد آج کل فارغ ہے۔ یہاں قریب ہی ایک قصبے میں ایک شخص سے بزنس کے سلسلے میں ملنا تھا تو سوچا آپ کو دیکھتا جاؤں۔ ماں جی دراصل بات یہ ہے کہ نیہا نے اپنی اولاد کی پرورش اپنے طریقے سے کی ہے مجھے بزنس کے سلسلے میں اکثر شہر شہر گھومنا پڑتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنے بچوں سے ملنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اسی لیے کبھی انہوں نے بھی آپ کے بارے میں جاننے کی یا آپ لوگوں سے ملنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔"

"ارے بہو! زوار بیٹے کے لیے کھانا لاؤ، دیکھو تو سہی تھکا ہوا سا لگ رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں دفع کرو اس بزنس کو۔ کتنی اولاد ہے تمہاری جس کے لیے ابھی تک جان مار رہے ہو۔ اپنی اولاد کی فکر کرو۔ اسے اچھائی کا راستہ دکھاؤ۔ انہیں سمجھاؤ کہ ماں کے نقش قدم پر چلو گے تو کامیاب نہیں ہو گے۔ انہیں اللہ کا راستہ دکھاؤ۔ بیٹا یہ سب کچھ یہیں رہ جانا ہے خالی ہاتھ

جاتا ہے' خالی ہاتھ۔"

ماں جی کی باتیں آج زوار ملک کو کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ ان کا حرف حرف سچ تھا۔ وہ پہلی بار اس نہج پر سوچ رہے تھے۔ وہ خود بھی دولت کے پیچھے بھاگ بھاگ کر تھک گئے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ پہلی فرصت میں اپنے اکلوتے بیٹے کو کہیں گے کہ سارا بزنس وائنڈ اپ کر کے وطن واپس آجائے۔

"بیٹا کن سوچوں میں گم ہو کھانا کھاؤ نا!" ان کے سامنے پلیٹ میں ساگ' مکھن' اچار اور دیسی گھی میں چپڑی ہوئی روٹیاں رکھی تھیں۔ ساتھ میں ٹھنڈی لسی تھی۔ "بیٹا اس ہاٹ پاٹ میں چکن بھی ہے۔ میں نے سوچا شہر کے کھانے کھا کھا کر تم بے زار ہو گئے ہو گے اس لیے ابھی ساگ کو تڑکہ لگوایا ہے۔"

انہوں نے جی بھر کے کھانا کھایا۔ آج کچھ زیادہ ہی کھا لیا ورنہ وہ آفس میں سینڈوچ یا برگر لیتے تھے۔ بلاشبہ بوا کھانا اچھا بناتی تھیں مگر جو انہوں نے آج کھایا تھا وہ ان سب کھانوں سے بہترین تھا کیونکہ اس میں اپنے گاؤں کی خوشبو تھی۔ ماں کے ہاتھ کا ذائقہ تھا۔ وہ ممنون نظروں سے اپنی ماں جی کو دیکھ رہے تھے۔

"ماں جی یہ سیماب بیٹا کہاں ہے۔"

"بیٹا وہ شہر گیا ہے بتول کو لینے اس کے بی اے کے پیپرز ہونے والے ہیں اس لیے تاکہ وہ گھر بیٹھ کر تیاری کر لے' وہاں تو سہیلیوں کی باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔"

"آفتاب بھائی الگ گھر میں کیوں چلے گئے؟ یہ اتنی بڑی حویلی کیسے خالی خالی سی لگ رہی ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"بس بیٹا یہ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ چھوٹی بہو کی بڑی بہو سے ان بن ہو گئی بات بالکل معمولی سی تھی لیکن شاید وہ اسی انتظار میں تھی اس نے کھٹ سے الگ ہونے کا فیصلہ سنایا اور دونوں بیٹوں کو لے کر میکے چلی گئی۔ پھر مجبوراً" آفتاب کو الگ گھر لینا پڑا۔" ماں جی بڑے دکھ سے بتا رہی تھیں۔ اس پر زوار ملک خود بھی شرمندہ سے ہو گئے وہ ماں جی سے اپنے رویوں کی معافی مانگنے لگے۔ ماں جی نے فوراً" انہیں گلے لگایا۔

"بیٹا اس میں تمہارا کیا قصور۔ اچھا اب تم جا کر سو جاؤ پھر صبح جلدی جانے کا واویلا مچاؤ گے۔"

"نہیں ماں جی اب میں جلدی نہیں جاؤں گا۔ میں دو تین دن آپ کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں نہیں بیٹا میں تو چاہتی ہوں تم ہمیشہ میرے پاس رہو۔ تم کیا جانو میں تمہیں کتنا یاد کرتی ہوں اور تمہارے لیے کتنی دعائیں مانگتی ہوں۔" انہوں نے ان کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

"ماں جی آپ کی دعاؤں کی مجھے ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔"

"جاؤ اب سو جاؤ گیارہ بج گئے ہیں۔ گاؤں میں تو نو بجے ہی آدھی رات کا گمان ہوتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ڈائننگ روم سے اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئیں اور زوار ملک اپنے بیڈ روم کی طرف۔ کمرے میں آکر خوش گوار حیرت کا احساس تب ہوا جب انہیں بغیر ٹیبلٹ لیے نیند آگئی اور وہ پر سکون سو گئے۔

☼ ☼ ☼

رما کی ماں نیہا حسین و خوب صورتی کا شاہکار تھیں۔ جب وہ جوان تھیں ہر شخص انہیں ستائش بھری نظروں سے دیکھتا تھا۔ کچھ ایسا تھا ان کے چہرے پر کہ جو ایک بار دیکھتا وہ دوبارہ دیکھنے پر مجبور ہو جاتا۔ انہیں اپنی خوب صورتی کا احساس تھا جس نے انہیں حد سے زیادہ روڈ اور پراؤڈ بنا دیا تھا۔ وہ شہر کی سب سے اچھی یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں اور ظاہر ہے وہاں ہر امیرزادہ بڑے شوق سے داخلہ لیتا تھا اور وہ ہر قبول صورت شخص کو جو ان سے دوستی کی پیشکش کرتا بڑے ہی گھٹیا طریقے سے دھتکار دیتی تھیں۔ جیسے ہمدانی کے ساتھ ہوا۔

"مس نیہا! آپ یہاں بیٹھی ہیں میں آپ کو پوری یونیورسٹی میں دیکھ کر آرہا ہوں۔" نیہا نے "ہمہ" ہائے کہا اور دوبارہ اپنے نوٹس بنانے میں مصروف ہو گئی۔

"چھوڑو اس پڑھائی کو یہ تو جان لے کر ہی۔

چھوڑے گی۔ چلو کینٹین کی طرف چلتے ہیں۔"

"اگر زیادہ بھوک لگی ہے تو اکیلے ہی چلے جاؤ مجھے آج یہ کام ضرور کرنا ہے۔ کل میں نے اسائنمنٹ جمع کروانی ہے۔" نیہا نے چند لمحے قلم روک کر کہا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ہمدانی نے وہاں سے اٹھ جانا مناسب سمجھا۔

دو دن بعد اسے پھر نیہا یونیورسٹی کے پارک میں ملی۔ وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ اس نے وہاں بیٹھنے کی اجازت مانگی جو اس کی سہیلی نے دے دی۔ وہ دونوں پریکٹیکل لائف کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں۔

"پریکٹیکل لائف قسمت کی پڑیا ہے اگر اچھی نکل آئے تو زندگی سہل ہو جاتی ہے اور اگر نہ نکلی تو بہت مشکل۔" نیہا کا خیال تھا یہ انسان پہ منحصر ہے کہ وہ کیسی زندگی گزارتا ہے۔ اگر لڑکی اپنے شوہر کو قابو میں کر لے تو زندگی بہت آسان ہو سکتی ہے۔ اور شوہر کو بیوی صرف اپنی اداؤں اور دولت سے قابو کر سکتی ہے۔ محبت صرف کتابی بات ہے۔ ہمدانی نے ان کی بات میں مداخلت کی۔

"نیہا تمہاری سوچ بہت حد تک غلط ہے۔ رباب کی بات کسی حد تک ٹھیک ہے کہ واقعی پریکٹیکل لائف قسمت کا کھیل ہے۔ بیوی شوہر کو محبت سے تسخیر کرتی ہے خدمت سے، صبر سے، برداشت سے اس کا اور اس کی فیملی کا بہت خیال رکھ کر۔ پھر شوہر بیوی کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور وفا شعار بیوی اسے گھٹنے ٹیکنے نہیں دیتی۔ پھر زندگی کی گاڑی بہت اچھے طریقے سے چلتی ہے۔ ادائیں اور دولت صرف وقتی دھاک بٹھاتی ہیں بعد میں سب ختم ہو جاتا ہے۔"

"مجھے تمہاری بات سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔ کیا عورت باندی ہے؟ کیا مرد کو اللہ نے اختیار دیا ہے کہ وہ جیسا چاہے عورت سے کام لے؟ جس طرح چاہے اسے چلائے؟ کیا عورت بے زبان جانور ہے؟ وہ بول نہیں سکتی؟ چپ چاپ سہنے کے لیے پیدا ہوئی ہے؟ نہیں ہمدانی صاحب نہیں۔ تعلیم نے عورت کو شعور دیا ہے تاکہ وہ اپنے حقوق کے لیے لڑے۔ ہر وقت گھرداری، کھانا بنانا، بچے پیدا کرنا اور ان کی تربیت کرنا؟ کیا یہی ہے عورت کی زندگی۔" نیہا نے بڑی سختی سے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"ہمدانی تم ایک فضول سوچ رکھنے والے مرد ہو۔ تم عورت کو باندی بنا کر رکھنے کے قائل ہو۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی بھی تمہیں اپنی بیٹی دینے پر تیار ہو گا۔"

"اور اگر میں تمہیں یہاں ابھی تمہاری دوست رباب کے سامنے پروپوز کروں تو۔" اس نے نیہا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تو میں یعنی نیہا سلطان اپنی دوست رباب کے سامنے ہی تم سے کہتی ہوں کہ تم ایک عام سی شکل و صورت اور عام سے ذہن رکھنے والے شخص کے ساتھ میں یونیورسٹی میں چند گھنٹے نہیں گزار سکتی اور تم ساری زندگی گزارنے کی بات کرتے ہو اور ہاں! آج کے بعد مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ چلو رباب یہاں بیٹھنا اب فضول ہے۔"

وہ اپنے ڈپارٹمنٹ کی طرف چل پڑیں اور ہمدانی کو ایک دم نیہا سے سخت نفرت محسوس ہوئی۔ ہمدانی ایک دراز قد اسمارٹ جسم، تیکھے اور سجیلے نقوش اور سانولے رنگ مگر پرکشش چہرے کا مالک تھا۔ اسے ایک دم سے اپنے سانولے رنگ سے نفرت محسوس ہوئی، وہ اپنی دوست کے سامنے اس کی اتنی تذلیل کر گئی اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی وہ اٹھ کر جائے اور نیہا کے خوب صورت چہرے کو جلا دے۔ اس دن کے بعد سے ہمدانی بہت ریزرو ہو گیا تھا وہ نہ صرف نیہا بلکہ یونیورسٹی کی کسی بھی لڑکی سے بات کرنا گوارا نہیں کرتا تھا شاید اس نے ایک ہی تجربے کو اپنے لیے کافی سمجھ لیا تھا۔

نیہا اور رباب کینٹین میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں جب ایک انتہائی ہینڈسم اور خوب صورت لڑکا ان کے قریب ایک ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔ نیہا اس کی ڈیشنگ پرسنالٹی سے دل ہی دل میں مرعوب ہوئی

لیکن اس نے رباب پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ فطری طور پر وہ ایک خود پسند لڑکی تھی۔ اسے اپنے علاوہ کسی سے محبت نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ اس کا ذاتی قول تھا۔ اس لڑکے نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا اور ویٹر سے سینڈوچز لانے کو کہا۔ رباب نیہا سے بولی۔

"نیہا دیکھو کتنا خوب صورت ہے۔ ڈریسنگ بھی زبردست ہے۔ کافی ٹھیک ٹھاک گھرانے کا سپوت لگتا ہے۔"

"ہاں! چھوڑو چائے پیو اگلا پیریڈ بھی اٹینڈ کرنا ہے۔" اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

پھر اگلے دن رباب نے اسے بتایا کہ وہ اس کے کزن شانی کا دوست ہے۔ ان سے دو سال سینئر ہے گاؤں میں رہتا ہے اور اب شاید ہوسٹل میں ایڈمیشن لے لے اور اس کا نام بھی اس کی طرح کافی خوب صورت ہے۔ نیہا جو ظاہری طور پر بڑے عام سے انداز میں اور دل میں کافی دلچسپی سے اس کی گفتگو سن رہی تھی جب اس کا نام بتانے لگی تو پوری طرح متوجہ ہو گئی اس بات کو رباب نے بھی محسوس کیا۔

"تم رک کیوں گئیں بتاؤ نا! کیا نام ہے اس کا۔" نیہا نے بے تابی سے پوچھا۔

"زوار ملک!" رباب نے اسے بتایا۔

رباب اپنی کسی دوست کے پاس گئی ہوئی تھی اور نیہا اپنے ڈپارٹمنٹ کے باہر سیڑھیوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب رباب اپنے کزن شانی اور ان کے دوست زوار ملک کے ساتھ آ گئی۔ رباب ان کا تعارف کروانے لگی۔ "نیہا ان سے ملو یہ ہیں میرے کزن شانی اور یہ ان کے دوست زوار ملک۔" نیہا نے دونوں کو ہائے کہا۔ زوار ملک یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھنے لگے وہ بھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر رباب نے کھنکھارتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو دونوں شرمندہ سے ہو گئے۔ رباب نے تعارف کرایا۔

"نیہا! یونیورسٹی میں میری سب سے اچھی اور اکلوتی دوست ہے یہاں آ کر یوں لگتا ہے جیسے ہم صدیوں سے اکٹھے رہ رہے ہوں۔" پھر وہ سب کینٹین کی طرف چل دیے۔

اس کے بعد نیہا اور زوار ملک ساتھ ساتھ نظر آنے لگے۔

"نیہا! جب میں نے یونیورسٹی میں قدم رکھا تو مجھے نہیں پتا تھا کہ میں بھی کسی کو پسند کروں گا کیونکہ ہر جگہ مجھے ہی پسند کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن جب تم پہلی بار مجھے کینٹین میں رباب کے ساتھ نظر آئیں تو میرے دل نے گواہی دی کہ زوار تمہارے علاوہ بھی دنیا میں کم خوب صورت لوگ نہیں ہیں۔" زوار سراہ رہا تھا اور وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

ایک شام جب وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں ڈنر کر رہے تھے۔ زوار ملک نے نیہا کو پرپوز کر دیا جو اس نے دل کی گہرائیوں سے قبول کیا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے مخملیں ڈبیا نکالی اس میں سے ڈائمنڈ کی رنگ نکال کر اس کے نازک سے ہاتھ میں پہنا دی۔

اس نے اپنے گھر والوں سے بات کی۔ وہ زوار ملک کو جانتے تھے پھر نیہا کی امی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تو انہوں نے جلدی شادی پر زور دیا۔ ایک خوب صورت اور یادگار سی شام میں نیہا سلطان دلہن بن کر نیہا زوار ملک کے روپ میں زوار ملک کے گھر کی رونق بن گئی۔

✿ ✿ ✿

فون کی پانچویں گھنٹی پر انہوں نے نیند سے بوجھل اعصاب کو جھٹکا دے کر ریسیور کان سے لگا لیا۔ "ہیلو! مسز زوار! آپ کی بیٹی رما کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ شدید زخمی ہیں آپ پلیز ابھی پہنچیں۔" پھر وہ انہیں ہسپتال اور کمرے کا ایڈریس سمجھانے لگا۔ نیہا جو ابھی کچھ نیند میں تھیں ایکسیڈنٹ کا سن کر پوری طرح بے دار ہو گئیں۔ وہ ریش ڈرائیو کرتی ہوئیں صرف دس منٹ کے اندر ہسپتال پہنچ گئیں۔ ریسپشنسٹ سے مطلوبہ کمرے کا پوچھتے ہوئے وہ بھاگیں تو وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ رما کی حالت سیریس ہو گئی تھی اس لیے اسے I.C.U میں شفٹ کرنا پڑا۔ نیہا

بے آواز رو رہی تھیں۔ ان کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ انہوں نے پرس میں سے موبائل نکالا اور کال ملانے لگیں۔ کافی دیر سے بیل جا رہی تھی مگر وہ ریسیو نہیں کر رہے تھے۔ وہ مزید پریشان ہو گئیں وہ دل ہی دل میں اپنے رب کو یاد کر رہی تھیں اپنی بیٹی کی زندگی اور سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ پھر ایک لیڈی ڈاکٹر I.C.U سے باہر آئی۔ وہ فوراً" اپنی جگہ سے اٹھیں اور تقریباً" بھاگتے ہوئے وہ ان سے ملیں۔

"میں رہا کی ممی ہوں۔ کیسی ہے میری بیٹی؟ وہ کیسے ٹرک سے ٹکرا گئی؟ اسے یہاں کون لے کر آیا۔" انہوں نے جواب کا انتظار کیے بغیر ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ پلیز دعا کریں' فی الحال وہ خطرے سے باہر ہے مگر اس کی ایک ٹانگ میں فریکچر ہے اور چہرے پر بھی خراشیں آئی ہیں۔ بازو کی ہڈیاں بھی کافی متاثر ہوئی ہیں۔ آپ شکر کریں کہ اس کی جان بچ گئی ورنہ جس قدر شدید ایکسیڈنٹ تھا خدانخواستہ۔"

"پلیز ڈاکٹر صاحبہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ پلیز آپ اسے بچالیں۔"

"گاڑی کافی ڈیمج ہو چکی تھی۔ اتفاق سے ایک نیک دل لڑکا اس وقت وہاں سے گزر رہا تھا وہی رہا کو ہاسپٹل لے آیا۔" ڈاکٹر نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں تسلی دینے کے انداز میں بتایا۔

"ہم نے رہا کے پرس میں سے موبائل نکالا اس پر آپ کا نمبر دیکھ کر آپ کو کال کی۔ اس وقت وہ I.C.U میں ہے۔ آپ حوصلہ رکھیں دعا کریں اسے ہوش آجائے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر آگے بڑھ گئیں۔ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں ڈاکٹر کو جاتا ہوا دیکھنے لگیں۔ پھر انہوں نے زوار ملک کے موبائل پہ رابطہ کیا۔ اس بار انہوں نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

"ہیلو!"

"ہیلو زوار! میں نیہا بات کر رہی ہوں۔ زوار رہا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے وہ I.C.U میں ہے۔ زوار رہا کو بچالو زوار میں مر جاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ___ ادھر زوار ملک اتنی صبح صبح اس قدر بری خبر سن کر حواس باختہ ہو گئے۔

"نیہا ہمت کرو۔ دعا کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ میں ابھی آرہا ہوں۔"

انہوں نے موبائل آف کیا اور فوراً" واش روم میں گھس گئے۔ باہر آئے تو سیدھا اماں جی کے کمرے کی طرف بھاگے۔ وہ قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول تھیں۔ وہ بڑی عجلت میں اندر داخل ہوئے۔

"اماں جی! رہا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ مجھے ابھی شہر پہنچنا ہے مجھے اجازت دیں۔"

اماں جی حیرت اور پریشانی سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"کیسے ہوا یہ سب کیسے ہوا۔ تمہیں کس نے بتایا۔" مارے پریشانی کے ان کی آواز ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"اماں جی ابھی نیہا کا فون آیا تھا وہ کہہ رہی تھی کہ میری رہا I.C.U میں ہے۔" یہ کہتے ہوئے ان کی اپنی آواز بھیگ گئی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اماں جی کے سامنے بیٹھ گئے اور روتے ہوئے کہنے لگے۔

"اماں جی ہمیں معاف کر دیں۔ اماں جی میری بیٹی کی زندگی کے لیے دعا کریں۔ پلیز اماں جی میں ان سب کو لے کر بہت جلد دوبارہ آؤں گا۔"

اماں جی نے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر ان کا ماتھا چوما اور کہنے لگیں۔

"بیٹا! میں تو ہر وقت تم سب کے لیے دعا کرتی رہتی ہوں۔ جاؤ فی امان اللہ۔" وہ فوراً" باہر آئے گاڑی اسٹارٹ کی اور شہر کے لیے عازم سفر ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

"اب اٹھ بھی جاؤ صبا ایک تو تمہیں جگانا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ بندہ کھیتوں میں ہل چلا لے وہ آسان ہے بہ نسبت تمہیں جگانے کے۔"

"اچھا اچھا!" صبا جمائی روکنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی اٹھی۔

"چلو اٹھو کر ناشتا بناؤ۔ آج مجھے یہ اسائنمنٹ مکمل کر کے سبمنٹ کروانی ہے۔ کیونکہ بھائی لینے آ رہے ہیں۔ مجھے آج ہی گاؤں جانا ہے۔" "ویسے بتول گاؤں کی زندگی بڑی ہی زبردست ہے۔ چھوٹے چھوٹے کچے مکان، مٹی کے چولہے۔ نلکے کا صاف شفاف پانی، جھینگروں کی آوازیں، چھپ چھپ کرتے ٹیوب ویلوں میں نہاتے ہوئے بچے، فصلوں پر کام کرتے مرد، عورتیں، تمام فکروں اور پریشانیوں سے آزاد پر سکون زندگی۔ کتنا تھرل ہے نا! کتنا چارم ہے گاؤں کی زندگی میں۔ بے لوث محبتیں ہیں۔ حسد، ضد، عناد یہ سب کچھ تو شہری زندگی کا خاصہ بن چکا ہے۔ ایک دوسرے کے مقام و مرتبے کو دیکھ کر جلنا اور اس سے چھیننے کی کوشش میں لوگ اپنی ہی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔"

صبا نے ایک جذب کے عالم میں گاؤں کی زندگی کا نقشہ کھینچا۔ جواب میں تیزی سے اسائنمنٹ بناتی بتول نے رک کر اس کی آنکھوں میں واضح نظر آنے والے خلوص کو دیکھا۔

"صبا جو تصور تمہارا گاؤں کی زندگی کے بارے میں ہے وہ کسی حد تک درست ہے، بالکل درست نہیں ہے۔ گاؤں میں بجلی، گیس، پانی کی سہولیات نہ ہوں تو وہ جنگل لگتا ہے۔ جہاں جانوروں کا گزارا تو ہو سکتا ہے انسانوں کا نہیں۔ وہاں انسان تمام فکروں سے آزاد نہیں ہوتا۔ وہاں بھی شہروں کی طرح ماؤں کو اپنی جوان بیٹیوں کے گھر بسانے کی انھیں جہیز دینے کی فکریں ہوتی ہیں۔ وہاں بھی لوگ ایک دوسرے کی اچھی فصل دیکھ کر رشک و حسد کے ملے جلے تاثرات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہاں بھی لوگوں کو معاشی تنگدستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور میری طرح تعلیم کے پیچھے بھاگنے والی لڑکیوں کو شہر کا رخ کرنا پڑتا ہے۔"

صبا اور بتول روم میٹ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھی دوستیں بھی تھیں۔ صبا کا تعلق خوشاب سے تھا۔ وہاں تعلیم کا رجحان لوگوں میں کافی کم تھا اس لیے وہ ہاسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے لگی۔ ناشتے کے دوران بتول کہنے لگی۔

"صبا! دُدا بتا رہی تھیں کہ سیماب بھائی کل شام سے نکلے ہوئے ہیں رات انھوں نے اپنے کسی دوست کے ہاں گزارنی تھی اور صبح کو مجھے پک کرنا تھا اب بارہ بج گئے ہیں، وہ ابھی تک نہیں آئے۔"

"آجائیں گے تم اپنی پیکنگ تو مکمل کر لو۔"

"وہ میں نے رات ہی کر لی تھی۔ تم بتاؤ تم کب گھر جا رہی ہو؟" اس نے چائے کا آخری سپ لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں بھی آج کل میں چلی جاؤں گی کیونکہ اب پڑھنے کے دن ہیں اور تمہارے بغیر یہاں مزہ ہی نہیں آئے گا۔"

"آج چلو گی درس لینے مسز عشرت کے ہاں۔" صبا نے بتول سے پوچھا۔

"ہاں اگر بھائی لینے نہ آئے تو ورنہ نہیں لے سکوں گی۔" بتول بولی۔

"تو تم اپنے بھائی کو فون کر کے پوچھ لو۔ کیونکہ آج میرا بھی دل چاہ رہا ہے درس لینے کو۔" "اچھا میں ابھی فون کرتی ہوں۔" پھر وہ اگلے ہی لمحے سیماب سے بات کر رہی تھی۔

"ہیلو بھائی السلام علیکم! میں بات کر رہی ہوں بتول۔ میں ٹھیک ہوں بھائی آپ کیسے ہیں۔ دُدا بتا رہی تھیں آپ کل شام سے آئے ہوئے ہیں۔ ابھی تک ہاسٹل نہیں آئے۔ کیا؟ ایکسیڈنٹ کس کا۔ اوہ تو پھر اب وہ ٹھیک تو ہے۔ آج شام سات بجے تک، چلیں ٹھیک ہے میں تیار رہوں گی او کے اللہ حافظ۔"

"کیا ہوا بتول کس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا؟" صبا نے بے تابی سے پوچھا۔

"یار وہ بھائی اپنے دوست کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستے میں ایک لڑکی رات کے وقت بالکل اکیلی ڈرائیو کر رہی تھی اس کی گاڑی کسی تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا گئی۔ پھر بھائی اسے ہسپتال لے گئے۔ اب وہ فارغ ہوئے ہیں تو وہ اپنے دوست کی طرف گئے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ شام کو چلنا ہے۔ ہمیں درس لینے کا وقت

مل گیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے صبا سے کہا۔

☆ ☆ ☆

تین گھنٹے کی مسلسل ڈرائیو کے بعد زوار ملک بہت تھک چکے تھے۔ ہسپتال کے پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد وہ اندر پہنچے۔ ریسپشنسٹ سے مطلوبہ کمرے کا پوچھ کر وہ اندر داخل ہوئے۔ کمرہ خالی تھا۔ صوفے پر نیہا بیٹھی تھیں۔

"زوار تم کب آئے؟"

"ابھی آیا ہوں سیدھا ہسپتال۔ میری رما کیسی ہے۔"

"شکر ہے اللہ کا رما اب خطرے سے باہر ہے اسے آج روم میں شفٹ کرنا ہے۔ صرف اس کے ہوش میں آنے کا انتظار ہے۔"

"تم نے ناشتا کیا ہے؟ کچھ کھایا ہے۔"

"نہیں!" انہوں نے جواب دیا اور ساتھ ہی پوچھا۔ "تم نے کچھ کھایا ہے۔"

"نہیں! میری تو بھوک ہی اڑ گئی ہے۔"

"زوار ڈاکٹر کہہ رہی تھی اس کے ہوش میں نہ آنے کی وجہ ڈرنک ہے جو اس نے بہت زیادہ مقدار میں پی تھی اور اسی کی وجہ سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔"

"ہاں نیہا قصور ہمارا ہے اور سزا ہماری اولاد کو مل رہی ہے۔ ہم نے انہیں کبھی غلط اور صحیح راستے کے متعلق بتایا ہی نہیں۔ رما کو یہاں تک کون لایا؟"

اچانک انہیں یاد آیا۔

"ایک لڑکا پتا نہیں کیا نام ہے اس کا، وہ رما کو یہاں چھوڑ کر گاڑی بھی ورکشاپ لے گیا۔ صرف چابی دینے اور ورکشاپ کے بارے میں بتانے آیا تھا اور اتنی ہی جلدی چلا گیا۔ میں نے جاتے جاتے اس کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگا۔ آنٹی آپ میرا نہیں اللہ کا شکر ادا کریں جس نے مجھے وہاں بھیجا۔ اگر میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی کرتا۔ مجھے اس کا نام پوچھنے کا ہوش رہا ہی نہیں۔

بوا نے ناشتا بنا کر بھیجا تھا وہ ایسے ہی پڑا ہے آپ تھکے ہوئے ہیں۔ ناشتا کر لیں پھر گھر جا کر تھوڑی دیر آرام کر لیں۔"

"میں یہیں ٹھیک ہوں آؤ دونوں مل کر ناشتا کرتے ہیں۔" انہوں نے واش روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

مسز عشرت کے گھر آج کافی رونق تھی۔ ان کے اپنے رشتہ دار دوسرے شہر سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے بچوں نے کافی اودھم مچا رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ جب ساری خواتین جمع ہو گئیں تو پروفیسر امین فاطمہ صاحبہ بھی آ گئیں۔ آج وہ کافی خوب صورت لگ رہی تھیں انہوں نے بی پنک کلر کا نفیس کڑھائی والا سوٹ پہنا تھا جس کے گھیرے پہ ڈارک گرے کلر کی پانچھ

لگی ہوئی تھیں اور انہوں نے گرے کلر کا ہی اسکارف لیا ہوا تھا۔ وہ بلاشبہ کافی پیاری لگ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا گاؤن اتارا اور خواتین والے کمرے میں آ گئیں سب سے پہلے ایک چھوٹی سی بچی نے کافی خوش الحانی سے تلاوت قرآن پاک کی۔ پھر دو لڑکیوں نے مل کر نعت پڑھی اور پروفیسر صاحبہ کا درس شروع ہوا۔

"میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ ہمارا دین ہمیں فتنہ و فساد سے بچاتا ہے ہمیں اخلاقیات کا درس دیتا ہے۔ آج جتنے بھی فتنے پیدا ہو رہے ہیں اس عورت نے خود پیدا کیے ہیں۔ خوب صورت لگنے کے لیے اس نے اپنے لباس کو مختصر کر دیا ہے پھر اس نے مردوں جیسا چست لباس یعنی پینٹ شرٹ پہن کر مرد اور عورت کی تفریق ختم کرنے کی کوشش کی۔ زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے بہانے نقاب و حجاب کو اتار کر پھینک دیا ہے۔ آج کی عورت کو قرآن پاک کا وہ حکم نہیں یاد آتا جس کا ترجمہ ہے "اور اپنے گھروں میں ٹکی رہو۔" حضرت عائشہ بھی تجارت کرتی تھیں مگر وہ یہ کام اپنے گھر میں پردے میں رہ کر کرتی تھیں۔ ٹھیک ہے عورت کو اپنی صلاحیت کو منوانا چاہیے لیکن اس کے ساتھ اسے اس اہم مقصد سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ جس کے لیے اسے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے اور وہ ہے اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت 'شہرت کمانے پارٹیز اٹینڈ کرنے' سوشل ورکس یہ سب کام خواتین کو اس اہم مقصد سے منحرف کر رہے ہیں۔ آخر میں دعا یہ کروں گی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح مسلمان عورت بن کر زندگی گزارنے کی توفیق دے اور ہماری آنے والی نسلوں کو دین کا سیدھا راستہ دکھائے (آمین)"

پروفیسر صاحبہ نے درس ختم کیا تو انہیں کونے میں اداس سی بیٹھی ایک خاتون نظر آئیں۔ انہوں نے مسز عشرت سے پوچھا کہ "یہ کون ہیں؟ انہیں پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔" مسز عشرت نے ادھر دیکھا تو حیرت سے گنگ رہ گئیں۔ ان کے پاس جا کر کہنے لگیں۔

"نیہا یہ تم ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے۔" ان کے پوچھنے کی دیر تھی کہ نیہا روتے ہوئے مسز عشرت کے گلے لگ گئیں۔ نیہا پارٹیز' فنکشنز اور گیٹ ٹوگیدرز کی جان سمجھی جاتی تھیں۔ وہ بہت زندہ دل عورت تھیں۔ انہوں نے زندگی بھر کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا تھا جو چاہا پا لیا۔ مسز عشرت بھی کبھی ان پارٹیز میں شریک ہوا کرتی تھیں مگر گزشتہ تین چار سالوں سے انہوں نے ان کاموں سے توبہ کر لی تھی۔ مسز عشرت کے شوہر ایاز اور زوار ملک آپس میں بزنس پارٹنر تھے۔ لیکن بعد میں مسز عشرت کے کہنے پر انہوں نے بزنس میں سے اپنا شیئر نکال لیا تھا۔ اب وہ دونوں اپنا اپنا بزنس کر رہے تھے اس لیے ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا تھا۔ جب مسز عشرت نے پہلی بار محفل کروائی تو انہوں نے شوق سے اپنے سارے حلقہ احباب کو دعوت دی۔ مگر کسی نے بھی ان کی دعوت کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور کوئی بھی شریک نہ ہوا البتہ نیہا نے مسز عشرت سے کہا کہ۔

"تمہارے اندر بوڑھی روح سما گئی ہے جو تم اب اس زندگی سے توبہ کر رہی ہو۔"

اب وہی نیہا جو اپنی ڈریسنگ اور خوب صورتی کی وجہ سے کافی مشہور تھیں۔ سادہ سے شیفون کے سوٹ میں 'میک اپ سے بے نیاز چہرے اور اڑی اڑی رنگت کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھیں۔ نیہا نے چند لفظوں میں رما کے ایکسیڈنٹ کے متعلق بتایا تو وہ انہیں پروفیسر صاحبہ کے پاس لے گئیں۔ وہ کہنے لگیں۔

"میں نے آپ کو پہچان لیا۔ ایک بار میں رما کو لینے کالج آئی تھی جب آپ اپنی گاڑی نکال رہی تھیں وہاں ہماری رسمی سلام دعا ہوئی تھی۔ میری بیٹی نے بھی آپ کے کالج سے ہی گریجویشن کیا ہے اور اب وہ۔۔۔"

اس سے آگے ان سے بولا نہیں گیا۔ مسز عشرت نے انہیں ساری بات بتائی تو وہ تاسف سے سر ہلانے لگیں۔

"آپ پلیز میری بیٹی کے لیے دعا کریں۔ ایک بار وہ ٹھیک ہو جائے تو میں اسے ضرور اسلام کا راستہ بتاؤں گی۔ اسے آپ کے پاس بھیج دوں گی۔ پلیز آپ اس کے لیے دعا کریں۔" انہوں نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"مسز زوار آپ پلیز پریشان نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب ٹھیک کر دے گا آپ حوصلہ رکھیں اور اس کے پاس جائیں۔ اسے اس وقت آپ کی ضرورت ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر جانے لگیں تو نمہا بھی ان کے پیچھے پیچھے اپنی گاڑی کی طرف چل دیں۔ لیکن بیٹھنے سے پہلے انہوں نے اپنے سر اور کندھوں کو دوپٹے سے اچھی طرح کور کیا۔ انہوں نے اپنا یہ روپ گاڑی میں لگے بیک ویو مرر پر دیکھا تو انہیں بہت انوکھا لگا۔

☆ ☆ ☆

"بتول! تم سے کوئی ملنے آیا ہے کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ میں نے اسے گیسٹ روم میں بٹھایا ہے، جلدی سے آجاؤ۔" ہاسٹل کے خانساماں نے ایک ہی سانس میں اسے بتا کر واپسی کا رخ کیا۔ بتول نے اپنی پیکنگ کو فائنل ٹچ دیا اور باہر نکل آئی۔

"السلام علیکم بھائی! کیسے ہیں آپ؟"

"وعلیکم السلام بہنا تم سناؤ کیسی ہو؟" اس نے اسے پیار سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "آئی ایم سوری! آپ کو انتظار کرنا پڑا۔" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تم بتاؤ اب کتنی دیر لگاؤ گی تیار ہونے میں۔" انہوں نے اس سے پوچھا۔

"بھائی میں بالکل تیار ہوں۔ بس پانچ منٹ میں آ رہی ہوں۔" اس نے چٹکی بجائی اور یہ جا وہ جا اور پھر اگلے چند منٹوں میں وہ سامان گاڑی میں رکھ کر گاؤں کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ڈاکٹر صاحب! ریما کو کب ہوش آئے گا؟" نمہا نے بڑی امید سے ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ان شاء اللہ! اچھی امید رکھیں آپ پریشان نہ ہوں۔"

ریما کی حالت اب خطرے سے باہر تھی اور اسے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ میں زبردست فریکچر ہو گیا تھا جس پر اب پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ اس کے بازوؤں پر بھی کافی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چہرے پر بھی خراشیں لگی تھیں۔ ایک بازو میں لگی ڈرپ اسے قطرہ قطرہ کر کے گلوکوز فراہم کر رہی تھی۔ نمہا سے اپنی بیٹی کی بے بسی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ سو وہ جب سے پرائیویٹ روم میں شفٹ ہوئی تھی وہ اسے دیکھ کر روئے جا رہی تھیں۔

عشاء کی اذان ہوئی تو وہ وضو کر کے جائے نماز پر کھڑی ہو گئیں۔ نماز پڑھ کر انہوں نے کافی عاجزی اور گریہ وزاری سے اپنے رب سے دعا مانگی۔ جب جائے نماز تہ کی تو ان کے دل کو سکون ملا تھا۔ ابھی وہ تسبیح پڑھ کر اپنی بیٹی پر پھونک مار رہی تھیں جب آندھی طوفان کی طرح اشمل کمرے میں داخل ہوئی۔

"آنٹی! میری جان سے پیاری دوست موت سے لڑتی رہی آپ نے مجھے خبر تک نہیں کی۔ اب بھی اگر انکل مجھے راستے میں نہ مل جاتے تو شاید آپ مجھے خود سے کبھی نہ بتاتیں۔ کیا یہ صرف آپ کی ہی بیٹی ہے، نہیں آنٹی یہ میری دوست ہی نہیں میری بہن بھی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ بے اختیار اس کے ماتھے کی طرف جھک گئی اس کے پٹیوں میں جکڑے ہوئے سر کو چومتے ہوئے بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

"یہ سب کیسے ہوا آنٹی؟"

"بس بیٹا تقدیر انسان کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کافی دنوں سے میں دیکھ رہی تھی ریما کچھ خاموش سی ہو گئی تھی، پتا نہیں کیا بات تھی اس نے میرے ساتھ شیئر نہیں کی۔ تمہارے ساتھ کی تھی؟" انہوں نے اشمل سے پوچھا۔

"نہیں آنٹی وہ تو دو تین دنوں سے مجھ سے ملی ہی نہیں، نہ ہی ہمارا فون پر رابطہ ہوا۔ میں بھی ایک

فنکشن کی تیاریوں کے سلسلے میں کچھ مصروف تھی۔ ٹائم ہی نہیں ملا۔ آپ نے حنان بھائی کو فون کر کے رما کے ایکسیڈنٹ کے متعلق بتایا ہے؟" اس نے نیہا سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا! جب سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے میرے تو حواس ہی ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ میرا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا۔ صرف ایک ہی بات دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے کہ میری جان جلدی سے ہوش میں آجائے۔" انہوں نے جذباتی ہو کر جواب دیا۔

"ابھی زوار آتے ہیں تو ان سے کہتی ہوں کہ حنان کو فون کریں۔" پھر کچھ دیر بعد زوار ملک اور بوا کمرے میں داخل ہوئیں۔ بوا رات کا کھانا لے کر آئی تھیں اور اپنی بچی کو دیکھنے بھی کیونکہ نیہا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بوا کے ساتھ گزارا تھا۔ جب ہوش سنبھالا تو بھائی پاس تھا۔ ماما اور ڈیڈی اپنے فنکشنز اور بزنس میں مصروف رہتے تھے۔ تو دونوں بہن بھائی کی خوب دوستی ہو گئی تھی پھر جب بھائی باہر چلا گیا تو وہ گھر میں بوا کے ساتھ اور باہر اشعل کے ساتھ دکھائی دینے لگی۔ اس کے علاوہ اس کا ایک بوائے فرینڈ مہوز جو کافی حد تک اس میں انٹرسٹڈ تھا اس کے ساتھ بھی بہت دوستی تھی۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے جب رما نے کراہنا شروع کر دیا۔

"ماما... ڈیڈی" سب اس کی طرف دوڑے۔

"رما میری جان کیسی ہو؟"

"ماما میں کہاں ہوں؟" "بیٹا تم ہسپتال میں ہو۔" انہوں نے جواب دیا۔ پھر رما کو ساری بات یاد آنے لگی۔ جب اس نے ڈرنک کی اور جب اس کی گاڑی بے قابو ہو گئی اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔

"ماما میری ٹانگ میں بہت درد ہو رہا ہے ماما برداشت نہیں ہو رہا۔ پلیز ماما کچھ کریں۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"بیٹا ہمت کرو، حوصلہ رکھو تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔" نیہا نے فوراً اشعل کو بھیجا کہ وہ ڈاکٹر کو بلا کر لائے جب تک ڈاکٹر آئے رما اپنی ماما کے ہاتھوں میں بے قابو ہو رہی تھی۔ وہ درد کی شدت سے چلا رہی تھی۔ اس کے بازو اور کمر پر اندرونی چوٹیں آئی تھیں جو اب اس کی تکلیف میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے فوراً کچھ میڈیسن لکھ کر دیں۔ زوار ملک نسخہ لے کر فوراً چل پڑے۔ ڈاکٹر نے نرس کو انجکشن دینے کا کہا اور نیہا کو تسلی دے کر باہر آگئے۔

✡ ✡ ✡

"آگئی میری گڑیا!" بتول کی ماما زیبا احتشام نے اٹھ کر اپنی بیٹی کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"ترس گئی تھی تمہاری صورت دیکھنے کو اور تمہیں اپنی ماں کی پروا ہی نہیں ہے۔ خالی اداس گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اور تم شہر جا کر اپنی ماں کو بھی بھول گئی ہو۔"

"ارے امی بھلا میں آپ کو بھول سکتی ہوں آپ تو ہر وقت میرے ذہن پہ چھائی رہتی ہیں۔" اس نے لاڈ سے ان کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے کب سے ان کے ہی لاڈ پیار ختم نہیں ہو رہے۔ مجھے کوئی پوچھ ہی نہیں رہا۔ کہاں ہیں میری سگی دوّا میں ان سے اپنے اگنور کیے جانے کا انصاف مانگتا ہوں۔ دوّا میری پیاری دوّا آپ کے لاڈلے اور اسمارٹ سے پوتے کی اہمیت آپ کی نالائق ترین پوتی نے گھٹا دی ہے۔ میرا خیال ہے اسے گاؤں لا کر میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے چلو دشمن جان تمہیں واپس ہاسٹل چھوڑ آؤں تم تو آستین کا سانپ نکلیں۔" دونوں ماں بیٹی اپنے بیٹے کی اتنی لمبی دہائی پہ ہنس ہنس کر دوہری ہو گئیں اور دوّا بھی اتنی دیر میں منظر عام پر آگئیں۔

"پہلے ہی اتنے دنوں بعد شکل دکھائی ہے اس نے تمہاری تو روز دیکھتے ہیں۔"

دوّا نے بتول کے سر پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

"تو جی یہ غاصب میرا یہ والا ووٹ بھی لے گئی۔ میرے اللہ میں کس سے انصاف مانگوں یہاں تو ج

صاحبان طرم کا ہی ساتھ دے رہے ہیں۔" سیماب نے لہجے میں انتہائی بے چارگی سموتے ہوئے کہا۔

"ہی ایک مشورہ دوں آپ بھائی کی شادی کر دیں بچی ان کی بیگم انہیں اتنی توجہ دیں گی کہ آئندہ سے کبھی بھی اہمیت گھٹانے والی بات ہی نہیں کریں گے۔"

بتول نے ہنستے ہوئے بھائی کو تنگ کرنے والے انداز میں کہا۔

"ارے ارے دشمن جاں اب تم دشمن آزادی بھی ہو گئیں۔ کیوں میری آزادی کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہو۔ اگر میں نے شادی کروائی نا تو تمہیں بالکل لفٹ نہیں کرواؤں گا بلکہ ایسا کروں گا کہ تمہیں بھی سسرال بھجوا دوں گا ہر طرف امن وامان کی فضا نظر آئے گی۔" اس نے مزے لیتے ہوئے اپنی بات کو مکمل کیا۔

"ارے بہو! بچوں کے لیے کھانا گرم کر دو یا آج باتیں کر کر کے ہی پیٹ بھرنے کا ارادہ ہے۔" دوا نے بہو سے کہا۔

"ویسے میں سوچ رہی ہوں کہ اب تمہیں بھی کھونٹے سے باندھ دینا چاہیے۔"

"دوا یہ کیا ظلم کرنے والی ہیں آپ۔ ابھی تو میں نے بزنس میں بابا کا ہاتھ بٹانا ہی شروع کیا ہے ابھی تو مجھے الف بے کا بھی نہیں پتا۔" اس نے مدد طلب نظروں سے بتول کی طرف دیکھا۔ جواب میں وہ ہری جھنڈی دکھا گئی۔

"دغا باز تمہیں تو بعد میں پوچھوں گا۔" سیماب نے دل ہی دل میں کہا۔ اتنے میں زیبا کھانا لے آئیں تو وہ دونوں ہاتھ منہ دھونے واش روم میں گھس گئے۔

✡ ✡ ✡

"بیٹا تھوڑا سا پانی لو۔ اب کتنا روؤ گی؟ اللہ پہ بھروسہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" نیہا سوپ کا پیالہ ہاتھ میں لیے کب سے رما کو پلانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ روئے جا رہی تھی۔

"مما درد کم نہیں ہو رہا۔ مجھے کوئی ٹیبلٹ دے دیں۔ میری برداشت جواب دے گئی ہے۔"

"نہیں میری جان پہلے ہی تم دو دنوں کے بعد مکمل ہوش میں آئی ہو اب مزید سونا ٹھیک نہیں ہے۔ جب تمہیں نیند آئے تو سو جانا۔" انہوں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"ماما کیوں ہوا میرے ساتھ ایسا؟ سب ڈرنک کرتے ہیں، کلب جوائن کرتے ہیں پھر صرف میرے ساتھ کیوں۔" رما نے نیہا سے کہا۔

"بس بیٹا اللہ کو ہمارا امتحان مقصود ہے۔ غلطی ہماری ہے ہم نے کبھی تمہیں دین کی روشنی دکھائی ہی نہیں اور سچ بات بتاؤں رما! میں نے زندگی میں جو چاہا حاصل کر لیا شاید اسی لیے کبھی اللہ کو یاد کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جب میں خود دین کی روشنی سے ناواقف ہوں تو اپنی اولاد کو کیسے دکھا سکتی ہوں اور اب تو لگتا ہے ہمارے ستارے گردش میں ہیں۔ یہاں تمہارا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور ادھر زوار نے حسان کو یو کے فون کر کے کہا کہ سارا بزنس وائنڈ اپ کر کے وطن واپس آجاؤ۔ تو کہنے لگا ڈیڈی! اب تو یہ بالکل ناممکن ہے۔ کیونکہ میں یہاں شادی کر چکا ہوں اور میری بیوی میری لائف پارٹنر ہونے کے ساتھ ساتھ بزنس پارٹنر بھی ہے۔ اس کا فورٹی پرسنٹ کا شیئر ہے اور ہم یہاں بڑی مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ رما کے ایکسیڈنٹ کا سن کر افسوس ہوا میری طرف سے اس کی طبیعت پوچھیے گا ہماری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ جولیا بہت کیئرنگ وائف ہے۔ میں نے پہلے اسے مسلمان کیا پھر شادی کی۔ ہم نے ابھی تک ہنی مون نہیں منایا۔ شاید میں اسے لے کر پاکستان کے ناردن ایریاز کی طرف آؤں۔ رما بیٹا یہ کہہ کر اس نے خود ہی لائن ڈسکنکٹ کر دی اور زوار ملک تب سے پریشان اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے ہیں۔ صبح سے کوئی پانچویں بار کافی کا مگ پی چکے ہیں۔ مجھے تو ان کی فکر ہو رہی ہے۔" انہوں نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"ماما میں کب گھر جا سکوں گی؟" اس نے پرامید

لہجے میں نیہا سے پوچھا۔

"بس بیٹا تمہاری تکلیف کم ہو جائے تو ہم گھر چلے جائیں گے۔" اور پھر اگلے دو روز میں نیہا رما کو لے کر گھر آ گئیں۔ گھر میں چھائی ہوئی افسردگی اور اداسی ایک دم چھٹ گئی۔ نیہا جب رما کو وہیل چیئر پر بٹھا کر لاؤنج میں لے کر آئیں تو ہر آنکھ خوشی اور غم کے ملے جلے تاثرات سے اشک بار تھی۔ خود نیہا اپنی بیٹی کی بے بسی پر رو دیں۔ رما کے ایکسیڈنٹ نے سب کو بدل کے رکھ دیا تھا۔

"میری گڑیا آ گئی! گھر میں رونق سی لگ گئی ہے میری سویٹ ہارٹ کتنا اداس ہو گیا تھا میں تمہارے بغیر۔" زوار ملک نے رما کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی اب آ گئی ہوں اور اب اس اندھیر دنیا میں واپس نہیں جاؤں گی۔ میں اپنے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگوں تو کیا مل جائے گی؟ ڈیڈی مجھے بتائیں وہ کس طرح اپنے گناہ گار ترین بندوں کو معاف کرتا ہے۔ ڈیڈی میں نے تو آج تک اسے نہیں پکارا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ میں چلتی پھرتی، سوتی جاگتی کھاتی پیتی صرف اس کے حکم سے تھی۔ اپنی مرضی سے تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اب میں ٹانگیں ہونے کے باوجود نہیں چل سکتی۔ اس کی مرضی کے آگے بے بس ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور اس کے لبوں سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ زوار ملک کی سماعتوں کو حیران کرنے کے ساتھ ساتھ مطمئن بھی کر رہا تھا۔ انہوں نے شفقت سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"میری چھوٹی سی گڑیا نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھیں۔"

"ڈیڈی جو دن میں ہسپتال میں بے بسی اور لاچاری کے گزار کر آئی ہوں انہوں نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ سارا دن بیڈ پہ لیٹ کر سوچنے کے علاوہ تو کوئی کام نہیں تھا۔" نیہا چائے لے آئیں تو سب چائے پینے لگے۔

اذان ہوئی تو زوار ملک مسجد کی طرف چل دیے انہیں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنا تھا اور نیہا بھی وضو کرنے واش روم میں چلی گئیں۔ رما یہ سب کچھ حیرت اور خوشی سے دیکھنے لگی۔

✡ ✡ ✡

"کیسی ہو اشمل؟ ____________

بتاؤ آج فارغ ہو؟ شام میں آؤٹنگ پہ چلیں ٹھیک ہے تم تیار رہنا۔ میں تمہیں سات بجے پک کروں گا۔ او کے بائے۔"

اور شام سات بجے وہ اس کے گھر کے دروازے پہ کھڑا ہارن دے رہا تھا۔

"بس بھی کرو ساری کالونی کو خبر ہو گئی ہے کہ مابدولت معوذ صاحب تشریف لا چکے ہیں۔" اشمل نے گاڑی کا فرنٹ ڈور بند کرتے ہوئے کہا۔

"یار خواتین کی بننے سنورنے والی عادت اگر چھڑوا دی جائے تو ان کا کیا بنے۔ آئینہ بے چارہ تھک جاتا ہے مگر مجال ہے جو تم لوگ خود کو آئینے میں دیکھ دیکھ کر تھکتی ہو۔ ویسے آپس کی بات ہے اچھی لگ رہی ہو۔" اس کے آخری فقرے نے اس کی جلا دینے والی باتوں پر پانی ڈال دیا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے مسکرانے لگی کہ یہ معوذ تھا جو رما کے سامنے اسے لفٹ نہیں کرواتا تھا اب اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ اشمل نے کن انکھیوں سے اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ ڈارک بلیو کلر کی شرٹ کے ساتھ بلیک جینز کی پینٹ، سلیقے سے بال بنائے ہوئے وہ عام دنوں سے زیادہ ہینڈسم اور پروقار لگ رہا تھا۔

"اس طرح دیکھو گی تو ضرور نظر لگ جائے گی۔" اس کی بات پر وہ خجالت سے مسکرائی اور ونڈ اسکرین کی طرف دیکھنے لگی۔

"ویسے کہاں جانے کا ارادہ ہے۔" اس نے معوذ سے پوچھا۔

"شکر ہے منہ میں زبان ہے ورنہ میں سمجھا کہ آج مسکرا مسکرا کر ٹوتھ پیسٹ کا کمرشل کرنے کا ارادہ ہے پہلے لانگ ڈرائیو پھر ڈنر اور پھر آئس کریم پھر چھٹی۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"مہموز تم رما سے ملے؟"

"ہاں! میں رما سے ملنے اس کے گھر گیا تھا وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ جب میں وہاں گیا تو اس نے فوراً" اپنے قریب پڑا اسکارف سر پہ رکھ لیا اور کہنے لگی آؤ مہموز تم کہاں تھے اتنے دن سے تمہیں میرا بالکل خیال نہیں آیا میں زندہ بھی ہوں کہ مر گئی ہوں۔ میں نے کہا نہیں رما ایسی بات نہیں ہے میں ڈیڈ کے ساتھ بزنس میں کچھ زیادہ ہی مصروف تھا۔ میں ان دنوں کہیں بھی نہیں جاسکا۔ سچ بتاؤں تو یہ تھوڑا سا سچ بھی تھا۔ چائے پی کر میں واپس آنے لگا تو رما کہنے لگی۔ کچھ دیر تو اور رکو ابھی تو ہم نے باتیں ہی نہیں کیں۔ میں تو لیٹ کر اکتا گئی ہوں ابھی ایک ماہ مزید اسی پلاسٹر میں رہنا ہوگا۔" مگر میں جان چھڑا کر چلا آیا یار اب

رما کی خاطر میں اپنی زندگی تو خراب نہیں کرسکتا نا! اب ایک ماہ وہ پلاسٹر میں رہے تو میں اس کی پٹی سے تو نہیں لگا رہوں گا اس کا نہیں تو میرا تو زندگی پر حق ہے نا۔ اس نے اپنا حلیہ ہی بدل لیا ہے دقیانوسی شلوار قمیص اور سر پہ مڈل کلاس کی لڑکیوں کی طرح اسکارف" یہ سب بتاتے ہوئے وہ شدید غصے میں تھا۔

اشمل اس کی ساری بات سن لینے کے بعد تاسف سے سرہلانے لگی۔

"وہ بہت چڑچڑی سی ہوتی جارہی ہے اور اس نے بلکہ اس کی پوری فیملی نے اس واقعہ کا بہت اثر لے لیا ہے اپنا آپ بدل کے رکھ دیا ہے ایسی بھی کیا آفت آگئی تھی۔" اشمل کے لہجے میں عجیب سا گھمنڈ تھا۔ اس نے بھی رما کو بدلتے دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیا تھا اور سب سے اچھی بات تو اس کے لیے یہ تھی کہ مہموز جسے اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا وہ اس کا ہوگیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ اس کا راستہ صاف ہوگیا تھا۔ پھر انہوں نے ایک خوب صورت ریسٹورنٹ کے باہر گاڑی پارک کی اور شاندار سا کینڈل لائٹ ڈنر کیا۔ آئس کریم کھا کر تقریباً" رات بارہ بجے وہ اپنی منزلوں کی طرف چل دیے

✡ ✡ ✡

"اس میں کون سی پریشانی والی بات ہے یہ مہتاب سے کھو ہے جائے تمہیں۔"

"نہیں ددا مجھے بھائی کے ساتھ نہیں جانا یہاں میری کوئی دوست نہیں ہے اب کس کے ساتھ فصلیں دیکھنے جاؤں؟" اس نے ددا کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ادھر ساتھ والے گھر میں نئے لوگ آئے ہیں ان کی ایک بیٹی تمہاری عمر ہی کی ہے چار سال پہلے اس نے میٹرک کیا ہے کیا بھلا سا نام ہے اس کا؟" انہوں نے کچھ سوچتے ہو کہا ہاں۔ ارم! اسے لے جاؤ۔"

"لیکن ددا میری اس سے کوئی جان پہچان ہی نہیں ہے۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان والی بات ہو جائے گی۔" اس نے ایک اور بہانہ پیش کیا۔

"میں ابھی رضیہ کو بھیج کر بلواتی ہوں اسے۔ اتنی اچھی بچی ہے۔ آجاتی ہے کبھی کبھار مجھ سے ملنے وہ بھی اکیلی ہے۔ بڑی دونوں بہنوں کی شادیاں ہوگئیں اور بھائی صبح کے گئے رات گھر آتے ہیں۔ وہ جب بور ہوتی ہے تو ادھر آجاتی ہے۔ رضیہ میری بات سنو۔" ددا نے جھاڑ پونچھ کرتی رضیہ کو بلایا۔

"جی بیگم صاحبہ!" رضیہ فوراً" آگئی۔

"ساتھ والے گھر سے ارم کو بلا کر لاؤ اسے کہو کہ میں نے بلایا ہے۔"

"اچھا جی ابھی بلاتی ہوں۔" کہہ کر وہ چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ارم آگئی تو وہ دونوں کچھ حیران ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

"اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ تم ہو تو کبھی رضیہ کو نہ بھیجتی بلکہ خود آتی۔ کیسی ہو؟ اور یہاں کیسے پہنچ گئیں۔" ددا جو حیران حیران نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ایک

دم بتول کی نظر پڑی تو کہنے لگی۔

"سوری ددا! میں تعارف کروانا بھول گئی۔ میں اور ارم ایک ہی اسکول میں پانچ سال اکٹھے پڑھے ہیں۔ جب کالج ایڈمیشن کی باری آئی تو اس کی دونوں بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ اس کی امی نے اس کی پڑھائی ختم کروادی۔ اس کے بعد میرا اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا اور اب اچانک دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے آؤ اپنے کمرے میں چلتے ہیں۔ فصلوں پر پھر کبھی چلیں گے۔"

"نہیں یار آج ہی جانا ہے باہر کیونکہ موسم اچھا ہو رہا ہے اور بہار کی وجہ سے سرسوں پہ پیلے پھول کمال کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ چلو چلیں۔"

وہ دونوں باہر نکل آئیں۔ موسم واقعی غضب کا ہو رہا تھا۔ ہلکے ہلکے بادل اور ٹھنڈی ہوائیں' پانی بھرنے جاتی عورتیں' بارش کا انتظار کرتے بچے' اور بطخوں کی ایک لمبی قطار جو پگڈنڈی کی سائیڈ پر تیر بھی رہی تھیں اور چل پھر بھی رہی تھیں۔ وہ باتوں باتوں میں کافی دور نکل گئی تھیں۔ جب بارش نے کن من شروع کی تو دونوں بھاگم بھاگ گھر والے راستے پر چل پڑیں۔ ابھی گھر کافی دور ہی تھا جب بارش نے زور پکڑ لیا وہ دونوں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگیں۔ ایسے موسم میں دور نکلنے کی غلطی وہ کر چکی تھیں اب واپس کیسے جایا جائے؟ اتفاق سے ایک گاڑی ان کے پیچھے آ کر رکی۔

"ایکسکیوزمی گرلز کین یو ہیلپ می؟ مجھے یہاں کسی کے ایڈریس کی تلاش ہے۔" اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر بتول کی طرف بڑھایا۔

"احتشام ملک!" وہ ایک دم حیران رہ گئی۔

"یہ تو میرے پاپا کا کارڈ ہے آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"

"آپ ان کی بیٹی بتول تو نہیں ہیں؟"

"جی مگر آپ کون ہیں؟"

"میں آپ کی پھپھو کا سب سے چھوٹا بیٹا احمر ہوں۔"

پھر وہ اسے ساتھ لئے گھر آ گئی۔

"آپ اندر آئیں پلیز میں گیٹ کھلواتی ہوں۔"

ارم اپنے گھر پہنچ چکی تھی لیکن یہاں شناسائیوں کے پل طے ہو رہے تھے۔ اس نے گیٹ کھلوایا اور وہ گاڑی لے کر پورچ میں داخل ہو گئے۔

"ددا آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" اس نے ددا کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کون ہے بیٹا؟"

"نانو السلام علیکم! کیسی ہیں؟"

"معاف کرنا بیٹا میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔"

"ارے نانو میں آپ کی بیٹی مہو کا سب سے چھوٹا بیٹا احمر ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ کا ایڈریس ڈھونڈ کر یہاں تک آیا ہوں۔" اس نے ان کے قریب بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میری مہو کی نشانی' میرے لعل! اپنی نانو کو بھول ہی گئے۔ اتنے چھوٹے سے تھے جب تمہیں دیکھا تھا اور اب ماشاء اللہ جوان ہو گئے ہو۔ ارے بیٹا! یہاں کیوں کھڑی ہو؟ کھانا لگواؤ ٹیبل پر میں اور احمر آ رہے ہیں۔" انہوں نے حیران سی بتول کو دیکھ کر کہا۔

"جی ابھی لگواتی ہوں ددا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی اس کی مہو پھپھو تو یوکے میں رہائش پذیر تھیں ان کے بیٹے کی اچانک آمد نے حیران کر دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے کوئی کسی کو زبردستی اسلام قبول نہیں کروا سکتا۔ دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ جس شخص کا دل کرتا ہے وہ روشن ہدایت کو حاصل کر لے اور جو نہیں چاہتا وہ نہ کرے۔ کوئی بھی اسے زبردستی مجبور نہیں کر سکتا اور اللہ تعالیٰ جس کے نصیب میں ایمان لکھ دیتا ہے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت کا راستہ نہیں دکھا سکتا۔ اب آپ سب یہاں موجود ہیں علم حاصل کر رہی ہیں تو اس میں بھی اللہ کی رضی ہے جس نے آپ کو ہدایت دی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے کہ "اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کر

دیتا ہے۔ "تو آپ سب اپنے مقدر پر نازاں ہوں کہ اللہ نے آپ کے ساتھ بھلائی کی اور آپ کو دین کی سمجھ عطا کی۔ ابھی صبا بیٹی نے سوال کیا ہے کہ شراب کا اسلامی معاشرے کو خراب کرنے میں کتنا ہاتھ ہے؟ تو میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کو ام الخبائث کہا ہے۔"

ربا جو اسٹک کے سہارے چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی تھی ایک کرسی پر بیٹھی تھی اس نے سوال کرنے کی اجازت مانگی۔

"پروفیسر صاحبہ! اگر کوئی شراب نوشی کرتا ہو اور پھر اس سے ہمیشہ کے لیے توبہ کرلے تو کیا اللہ تعالیٰ اس کے اس کبیرہ گناہ کو معاف کردے گا؟" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ پروفیسر ارمین فاطمہ نے جواب دیا۔

"شراب پینے والے شخص کی نماز، دعا چالیس دن تک قبول نہیں ہوتی اگر وہ عادی پینے والا ہو تو! لیکن اگر کوئی صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے کے مصداق اگر کوئی شخص سچے دل سے توبہ کرلے آئندہ کبھی اس گناہ کا ارتکاب نہ کرے تو اللہ کی صفات ہی رحمن ور حیم ہیں وہ غفور ہے وہ ودود ہے (پیار کرنے والا) وہ اپنے بندوں کے کبائر و صغائر سے در گزر فرماتا ہے، اگر توبہ میں سچا خلوص ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو معاف نہ فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صغائر کے ساتھ ساتھ کبائر سے بچنے کی بھی توفیق عطا فرمائے، جن گناہوں کو ہم عام طور پہ چھوٹا اور ہلکا سمجھتے ہیں ان سے بھی اللہ ہمیں بچائے آمین ثم آمین۔"

☼ ☼ ☼

"زیبا ارے کہاں ہو۔"

"آئی ماں جی!" زیبا نے کچن سے آواز لگائی۔ وہ چائے بنا رہی تھیں۔ کپوں میں انڈیل کر ایک کپ پڑھائی میں جتی بتول کو پکڑایا اور اپنا اور ماں جی کا کپ لے کر وہ ان کے کمرے میں چلی گئیں۔

"لیں ماں جی، چائے پئیں۔"

"جیتی رہو بیٹا ابھی مجھے چائے کی بہت طلب محسوس ہو رہی تھی۔ تم میری سب سے اچھی بہو ہو میری کوئی نیکی شاید میرے رب کو پسند آگئی جو مجھے تم جیسی بہو ملی ورنہ بڑی بہو نے نہ تو کبھی اپنی شکل دکھائی نہ بچوں کو آنے دیا اور چھوٹی بہو زبان دراز نکلی۔" انہوں نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ جواب میں زیبا خاموش رہیں۔

"بہو میں تم سے ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو تو؟"

"ارے ماں جی! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔ میں کیوں برا مانوں گی بھلا؟"

"بہو احمر خوبرو اور پڑھا لکھا لڑکا ہے کیوں نہ ہم اس سے اپنی بتول کا رشتہ کردیں۔" زیبا کو بھی احمر بہت اچھا لگا تھا۔ بہت دھیمے اور شائستہ لہجے میں بات کرنے والا اور بڑوں کا احترام کرنے والا یہ لڑکا انہیں اپنی بتول کے لیے پہلی نظر میں ہی بھا گیا تھا اور اب ماں جی نے ایسا کہہ کر ان کے دل کی بات کردی تھی۔

"ماں جی بتول آپ کی بیٹی ہے۔ آپ جہاں چاہیں اس کی شادی کردیں مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ آپ ہی ہماری بڑی ہیں۔ شام کو احتشام آئیں گے تو ان سے بات کرلیجیے گا مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" انہوں نے ماں جی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"جیتی رہو بیٹا اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے اور اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔ مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی امید تھی۔" انہوں نے اپنی بہو کا ماتھا چوم لیا۔

"بیٹا ذرا سیماب سے کہو مجھے زوار کا نمبر ملا دے۔ سنا ہے ربا ہاسپٹل سے گھر آگئی ہے۔ میں ذرا بات کرلوں اس سے جیسی بھی ہے میری پوتی ہے میرا خون ہے۔ میں یوں غیریت نہیں برت سکتی۔" انہوں نے زیبا سے کہا۔

"جی ماں جی میں ابھی سیماب کو بھجواتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئیں۔ تھوڑی دیر بعد دادا زوار ملک

سے فون پر بات کر رہی تھیں۔

٭ ٭ ٭

"اشمل آج تیار رہنا میرے گھر والے تمہیں میرا پابند کرنے آرہے ہیں۔"

"اچھا جناب اگر میں پابند نہ ہونا چاہوں تو۔"

"تو میں تمہیں شوٹ کردوں گا۔"

"کیوں میں نے بدولت کی شان میں کیا گستاخی کر دی جو مجھے شوٹ کا حکم سنایا جارہا ہے۔"

"اور ہاں میری پسند کا کلر پہننا اور اچھی طرح تیار بھی ہو جانا۔ ایسے سر جھاڑ منہ پہاڑ نہ پہنچ جانا ان کے سامنے پھر وہ سب میری چوائس کو روئیں گے۔"

"کتنے سارے احکامات نہ جاری کرو کہ میں مکر ہی جاؤں۔" "اب میں نیٹ پہ بیٹھ رہا ہوں تم بھی آن لائن ہو جاؤ او کے بائے!" مہوز اور اشمل نے بڑے ہی خوش گوار موڈ میں فون بند کیا۔ من چاہا ہم سفر مل جانے پر اشمل کا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور مہوز بھی کچھ کم خوش نہیں تھا۔ اسے بھی اشمل بائے فیس اور بائے نیچر اچھی لگی تھی' تب ہی اس نے اس کی طرف دوستی کا قدم بڑھایا تھا۔ اور پھر اس شام مہوز کے گھر والے نہ صرف اشمل کو پسند کر کے رنگ پہنا گئے تھے' بلکہ شادی کی ڈیٹ بھی فکس کر گئے تھے اور اب دونوں طرف شادی کی تیاریاں زور پکڑتی جارہی تھیں۔ مہوز اور اشمل اکٹھے شاپنگ کرتے پائے جاتے تھے اور یوں ہمہ وقت ساتھ رہنے کی وجہ سے ان میں ذہنی ہم آہنگی ہو گئی تھی۔

٭ ٭ ٭

رما کا پلاسٹر اتر چکا تھا اور زوار ملک اسے لان میں چلنے کی پریکٹس کروا رہے تھے جب اچانک سیماب آگیا۔ اس نے گیراج میں گاڑی کھڑی کی اور لان کی طرف چلا آیا۔

"سیماب میرے بیٹے!" زوار ملک اس کے گلے سے لگ گئے۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم یہاں میرے گھر۔"

"جی ہاں تایا جان بات ہی کچھ ایسی تھی کہ مجھے خود آنا پڑا۔" اس نے لان میں پڑی ہوئی چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"خیر تو ہے ناں' جی کی طبیعت تو ٹھیک ہے اور باقی سب۔"

"ارے تایا جان بالکل خیریت ہے بلکہ ایک خوش خبری ہے! ہم نے بتول کا رشتہ مہو پھپھو کے بیٹے احمر سے طے کر دیا ہے۔ یو کے میں اس کے پاپا سے بھی بات ہو گئی ہے وہ بھی خوش ہیں اور وہ لوگ ایک سال تک اپنا بزنس وائنڈ اپ کر کے وطن واپس آرہے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے تمہیں بہت مبارک ہو۔" اس کی نظر ایک طرف خاموش بیٹھی رما پر پڑی جسے اس نے خوشی میں یکسر نظر انداز کیا ہوا تھا۔

"انکل یہ تو وہی لڑکی ہے' جس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ میں انہیں ہسپتال چھوڑ کر آیا تھا۔ یہ یہاں کیسے؟"

"بیٹا وہ تم تھے؟ تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔ یہی ہے تو ہے میری بیٹی رما۔"

"اوہ آئی ایم سوری! میں نے انہیں پہلے کبھی دیکھا جو نہیں تھا۔ اب کیسی ہیں آپ؟" اس نے رما سے پوچھا۔

"جی کافی بہتر محسوس کر رہی ہوں۔" رما کے چہرے پر خراشوں کے تھوڑے بہت نشان رہ گئے تھے جو اس کی سفید رنگت اور نازک سے نقوش پر نمایاں تھے۔ سیماب نے ایک نظر اسے دیکھا پھر زوار ملک سے محو گفتگو ہو گیا۔ رما نے اس سچویشن میں خود کو مس فٹ محسوس کیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اندر چلی گئی۔

کھانے کے دوران سیماب نے نیہا سے کہا۔

"آنٹی پلیز گاؤں چلیں نا! سب آپ لوگوں کو بہت یاد کرتے ہیں۔ احمر بتا رہا تھا کہ حسان اسے یو کے میں اکثر ملتا رہتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بہت خوش ہے اور بزنس بھی اچھا چل رہا ہے۔"

"ہاں میری اس سے فون پہ بات ہوتی رہتی ہے۔ میں تو اسے کہتا ہوں کہ واپس آجاؤ مگر وہ مانتا ہی نہیں

ہے۔" زوار ملک نے تاسف سے کہا۔

"پھر بتائیں نا! آنٹی میں واپس جا کر کیا کہوں؟ ہم سب بتول کی منگنی کی رسم کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری پہلی خوشی میں آپ بھی شریک ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا ہم ضرور آئیں گے۔" نیہا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سچ آنٹی آپ آئیں گی نا!" سیماب کو حیرت ہو رہی تھی۔ نیہا آج تک اپنے سسرال نہیں گئی تھیں۔ ان کی کایا پلٹ خوش کن تھی۔

"بالکل بیٹا کب ہے منگنی ہم ایک دو دن پہلے پہنچ جائیں گے۔"

"پرسوں ہے جمعہ کے روز آپ آج ہی چلیں۔"

"ٹھیک ہے ہم آج شام کو ہی گاؤں کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔" نیہا نے کہا تو رما نے حیرت سے اپنی ماما کی طرف دیکھا۔ جن کے چہرے پر گاؤں کا نام سنتے ہی بل پڑ جاتے تھے آج کتنے مزے سے کہہ رہی تھیں کہ وہ گاؤں جائیں گی۔

جب وہ گاؤں پہنچے تو ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ نیہا اپنی ساس، دیور، دیورانی اور اس کے بچوں سے بڑے اچھے طریقے سے ملیں۔ انہیں ان کے گفٹس دیے۔ چھوٹی دیورانی صرف رسم کے وقت ہی شریک ہوئی تھی پھر واپس چلی گئی۔ نیہا نے اپنی ساس سے اپنے پرانے رویے کی معافی مانگی تو ان کی ساس نے انہیں اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے بے حد پیاری ہو کیونکہ میرے زوار کی بیوی ہو۔ تمہیں نہیں پتا مجھے زوار اپنی ساری اولاد میں سب سے پیارا ہے۔" یہ سن کر نیہا شرمندہ ہو گئیں کہ ناحق وہ اتنے پیارے رشتوں سے اتنا عرصہ دور رہیں۔ زوار ملک ان دونوں کو دیکھ کر مطمئن اور خوش ہو گئے۔

"رما آؤ تمہیں کھیتوں کی سیر کرواؤں۔" بتول نے چہکتے ہوئے کہا۔ رما نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، جہاں محبت اور چاہت کا رنگ نمایاں نظر آ رہا تھا۔

اس نے اس کی خوشی کے دائمی ہونے کی دعا کی۔

"ہاں چلو لیکن میں زیادہ چل نہیں سکوں گی بس تھوڑا سا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دونوں باتیں کرتی چلی گئیں۔ رما کو بھی یہ سب اچھا لگ رہا تھا وہ بھی خاموشی سے دور تک چلی گئی راستے میں بتول کو اس کی دوست ارم مل گئی۔ بتول نے رما سے اس کا تعارف کرایا۔ رما تھک گئی تھی کہ ان لوگوں کو سیماب کی گاڑی نظر آئی جو ابھی فارم ہاؤس سے واپس آ رہی تھی۔ اس نے اشارہ کیا تو وہ گاڑی لے کر آ گیا۔ بتول نے سیماب کو رما کے بارے میں بتایا تو اس نے فوراً گاڑی کا فرنٹ ڈور اس کے لیے کھول دیا بتول ۔ ارم کے ساتھ باتوں میں مشغول تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد سیماب نے رما سے کہا۔

"اگر میں تمہیں کہوں کہ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا مجھے اس وقت لگا کہ شاید تمہیں میرے لیے ہی بنایا گیا ہے تو شاید تمہیں جھوٹ لگے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کزنز ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے انجان تھے۔ جو خوبیاں میں اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتا ہوں وہ تم میں موجود ہیں۔ میں نے تمہیں سلیو لیس شرٹ' ٹائٹ پینٹ میں دوپٹے سے بے نیاز بے ہوش دیکھا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم نے ڈرنک کی ہوئی ہے تمہارے چہرے پر کچھ تھا جس نے مجھے متاثر کیا تھا اور میں نے دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دیکھو میری دعا قبول ہو گئی۔

اب تمہارا بدلا روپ مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔ کیا تم مجھ سے شادی کرنا پسند کرو گی؟" اس نے اتنا اچانک سوال کیا کہ وہ پہلے تو کچھ بول نہ سکی پھر کہنے لگی۔

"میرے بارے میں فیصلے کا حق میرے والدین کو ہے آپ ان سے پوچھ لیں' ویسے آپ کے ساتھ بھی گزارا ہو ہی جائے گا۔" اس نے شرارت سے کہتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ سیماب کے چہرے پر خوشی کے کئی رنگ اتر آئے۔

بتول کا گریجویشن مکمل ہو گیا اور زیبا بھی تھوڑے سے پس و پیش کے بعد اس رشتے کے لیے مان گئیں کیونکہ وہ اپنا بیٹا اپنی انا اور ضد کی وجہ سے کھو چکی تھیں۔ وہ رما کو نہیں کھونا چاہتی تھیں۔ شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی۔ بتول اور سیماب کی شادی ایک ساتھ کرنے کا ارادہ تھا کیونکہ زیبا کو بتول کے بعد گھر سونا سونا لگتا تھا سو اس نے پہلے ہی انتظام کر لیا۔ احمر کے گھر والے یو کے سے آ چکے تھے۔ شادی کے دن رما اور بتول بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ رما' سیماب کے ساتھ رخصت ہو کر گاؤں آ چکی تھی اور خواتین کے جھرمٹ میں تھکی ہوئی لگ رہی تھی پھر زیبا اسے اس کے کمرے تک چھوڑ آئیں۔ تھوڑی دیر بعد سیماب اس کے روبرو تھا اس نے نازک سا بریسلٹ اس کی کلائی میں پہناتے ہوئے کہا۔

آج اک اور ہی ڈھنگ کرتے ہیں
جیون تیرے سنگ کرتے ہیں
ہونٹ وہ باتیں کہہ نہیں پاتے
جو آنکھوں کے رنگ کرتے ہیں
چپ چپ گم صم رہنے والے
اپنے آپ سے جنگ کرتے ہیں
سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا
پچھتاوے پھر تنگ کرتے ہیں

"تم اس فیصلے پر خوش ہو نا؟" سیماب نے پوچھا۔

"یہ فیصلہ میرا نہیں میرے پیرنٹس کا ہے اور مجھے کبھی بھی ان کے فیصلے پر پچھتانا نہیں پڑے گا۔ آپ کو مجھ سے بھی کوئی شکایت نہ ہو گی۔" رما کے اظہار نے طمانیت کا احساس دو چند کر دیا تھا۔

☼ ☼

گڑی شاہو کی گڑیا

رابعہ افتخار

"خاندان میں ایک سو ایک لڑکیاں ہیں 'موٹی' تیلی، لمبی، ناٹی گوری، کالی۔۔۔ مگر مجال ہے جو سیف علی کو کوئی پسند آئی ہو ارے میں تو کہتی ہوں کہ ذات برادری کے چکر سے نکل کر غیروں میں لڑکی ڈھونڈنے کی مہم شروع کرو۔" تائی اماں نے چنے کی دال صاف کرتے ہوئے رائے دی "امی نے اثبات میں بہت زور سے سر ہلایا وہ تو پہلے ہی چاہتی تھیں کہ لڑکی غیر خاندان کی ہو اور بے تحاشا خوب صورت ہو۔

"کوئی گھر ایسا نہیں خاندان کا جس کی لڑکی کو اس نظر سے دیکھا جا رہا ہو...." تائی امی نے دال کا تھال ایک طرف رکھ کر اپنی عینک اتار کر دوپٹے کے پلو سے صاف کی امی نے پھر زور سے سر ہلایا۔

"ابھی ایک گھرانہ رہتا ہے بہو.... اور ہاں چھوٹی بہو.... یہ خیال دل سے نکال دو کہ میں اپنے اکلوتے پوتے کے لیے کوئی غیر خاندان برادری کی بہو لاؤں گی' ارے نہ خاندان کا پتا' نہ ذات پات کا' نہ طور طریقے اور سلیقے کا پتا.... جو بھی ہے' ہمارے خاندان کا سلیقہ مشہور ہے' جوان لڑکیاں تو ایک طرف' بوڑھی عورتیں بھی صفائی ستھرائی اور طریقے سلیقے سے ابھی تک پھرتی سے کام کرتی ہیں۔" دادی نے گاؤ تکیے سے پشت لگاتے ہوئے کہا۔ امی نے پہلو بدلا برآمدے میں بیٹھے سیف نے اسی تیز رفتاری سے جوتے پالش کرنے کا کام جاری رکھا۔

"رمضان کا مہینہ شروع ہونے والا ہے میں سوچ رہی تھی کہ لاہور کا چکر لگا آئیں' شاید یہاں ہمارے سیف کا دل مان جائے" دادی نے آنکھیں موند لیں۔

"لب لاہور میں کون ہے؟" امی کے اردگرد خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"ارے بھول گئیں' تمہاری اکلوتی نند کی نند (ثریا کی نند بانو) گوجرہ شاہو میں رہتی ہے' میری تایا زاد کی بہو بھی ہے' ڈبل رشتہ داری ہے' خاندان برادری ایک ہے' سنا ہے اس کی ایک بیٹی ہی ہے اور اولاد نہیں ہے بے چاری کی اور یہ بھی سنا ہے کہ لڑکی نے بی اے کیا ہوا ہے۔" دادی کا جوش دیدنی تھا۔

"اف اماں.... گوجرہ شاہو.... ہمارا ایک معیار ہے اماں کیا کہیں گے لوگوں کو کہ بارات لے کر کہاں جانا ہے؟ گوجرہ شاہو؟" امی نے ناگواری سے منہ بنایا۔

"رمضان سے پہلے جا رہے ہیں ہم سب اور ہاں سیف تم بھی ساتھ چلو گے' فی الحال وہاں جا کر یہ نہیں ظاہر کرنا کہ رشتے کی نیت سے آئے ہیں' تمہاری پھپھی بتا رہی تھی کہ ابھی تک کہیں بات بھی نہیں چلی" دادی نے سیف کو مخاطب کیا۔

"جی اچھا دادی...." اس نے اثبات میں سر ہلا دیا وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے بہت پیار کرتی ہیں وہ لڑکی کو دیکھ کر جب ایک بار نفی میں سر ہلائے گا تو وہ وجہ بھی نہیں پوچھیں گی۔ اس نے سامان سمیٹا اور اپنے کمرے میں گھس گیا۔ موبائل کی اسکرین پر انعم کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو...."

"کہاں تھے سیف؟"

"کچھ نہیں یار.... دادی کوئی پلان بنا رہی تھیں' خاندان کا آخری نمونہ بچا ہے' اسی کو دیکھنے اور ریجیکٹ کرنے جا رہے ہیں ہم' اس کے بعد کوئی حریف نہیں ہوگا' میدان بالکل صاف ہوگا۔" وہ ہنسنے لگا' دوسری طرف سے انعم کی ہنسی سنائی دی۔ اس کی ہنسی بھی اس کی طرح پیاری تھی۔

"جا کہاں رہے ہو اپنے خاندان کی بوڑھیوں کے ساتھ؟" اس کے لہجے میں طنز اور تمسخر کا عنصر ہمیشہ ہی رہتا تھا' سیف کو اس کی محبت میں یہ سب برا نہیں لگتا تھا' انعم اس کی کالج فیلو اور اب کولیگ تھی کالج کے زمانے سے ہی وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔

"گوجرہ شاہو.... پھپھو کی نند ہیں ثریا آنٹی' انہی کی بیٹی ہے۔"

"آر یو شیور کہ یہ تمہارے خاندان کی آخری لڑکی ہے جسے تم دیکھنے جا رہے ہو۔" انعم کے لہجے میں خوف تھا۔

"ہوں.... دادی کے بقول آخری ہی ہے۔"

"تمہاری دادی.... عجیب سرپھری اور دقیانوسی خاتون لگتی ہیں مجھے۔" انعم نے چڑتے ہوئے کہا' سیف نے "ہوں۔" کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ خود بھی تھک گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آخری بار دادی کے ساتھ جائے گا' اگر وہ انعم سے شادی کے لیے نہ مانیں تو وہ کورٹ میرج کی دھمکی دے کر اپنی بات منوا لے گا۔

"کب جا رہے ہو؟"

"شاید۔ اس ویک اینڈ پر۔۔۔ دو دن کے بعد۔" سفید نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"او کے۔۔۔ پھر بات ہوگی۔" نعم نے فون رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

جون کی تپتی ہوئی دوپہر تھی امی سو رہی تھیں اور ابا دکان سے نہیں آئے تھے۔ وہ پائپ لگا کر فرش دھو رہی تھی' کچن میں رات کے کھانے کے لیے قورمہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ ممانی کا فون آیا تھا' وہ اپنے میکے والوں کے ساتھ آرہی تھیں۔ اس کے گھر میں ہر وقت صفائی رہتی تھی' اسی لیے مہمانوں کی آمد کا سن کر کوئی ہڑبونگ نہیں مچی تھی۔ سارے گھر میں دھلی ہوئی چادریں' صوفہ کشن صاف ستھرے پردے۔۔۔ غرض کہ ہر شے چمک رہی تھی۔ صفائی کا کام مکمل کرکے اس نے میٹھے میں فرنی بنانے کا ارادہ کرلیا۔ ممانی نے بتایا تھا کہ ان کے میکے والے رمضان سے پہلے ہی عید کی شاپنگ کے لیے لاہور آئے ہیں' گرمیوں کی وجہ سے روزہ رکھ کر عید کی خریداری کرنا مشکل تھا۔

اس نے فرنی بنا کر فریج میں رکھی اور چٹنی کے لیے پودینہ' ٹماٹر اور ہری مرچیں صاف کرنے لگی۔ ابا کی کریانے کی دکان تھی جو اچھی چلتی تھی۔ وہ گھر کے تین ہی افراد تھے گزر اوقات اچھی ہو جاتی تھی مگر مکان کی حالت اب پہلے جیسی نہ رہی تھی' اپنے دیگر رشتہ داروں کی طرح وہ امیر کبیر لوگوں میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ ابا کے پاس ایک اسکوٹر تھا جب کہ باقی سب رشتہ داروں کے پاس گاڑیاں تھیں۔ اس کے لیے آنے والا ہر رشتہ ان کی مکان کی حالت دیکھ کر واپس ہو جاتا کالج میں ایک دو کلاس فیلوز اس کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر اپنے بھائیوں کے رشتے کے سلسلے میں آئی بھی تھیں مگر گھر کے درودیوار سے ٹپکتی سفید پوشی کو دیکھ کر واپس ہو گئیں۔

شام کی اذان سے کچھ ہی دیر پہلے مہمانوں کی آمد ہوئی تھی۔ وہ لوگ شاید سیدھے ادھر ہی آئے تھے۔ ممانی تو پہلے بھی آتی جاتی رہتی تھیں البتہ ان کے میکے والے پہلی مرتبہ آئے تھے۔ ممانی کی بڑی بھابھی جو قدرے فربہی مائل تھیں اور عینک لگاتی تھیں زرینہ آنٹی بڑی خوش اخلاق خاتون تھیں' چھوٹی بھابھی صاعقہ آنٹی خاموش طبع تھیں' دادی بھی اچھی لگیں۔ ان کے ساتھ اس خوبرو نوجوان کو دیکھ کر گڑیا نے اپنا دوپٹا قرینے سے سر پر جمایا تھا۔ وہ بھی نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ وہ لوگ پہلی مرتبہ آئے تھے۔ بہت پھل فروٹ لے کر آئے تھے۔ امی نے انہیں بیٹھک میں بٹھایا تھا۔ وہ پہلے بادام کا شربت لے کر گئی' زرینہ آنٹی نے دو گلاس چڑھائے۔

"مزا آگیا' اب کہاں ملتی ہیں ایسی فرحت بخش چیزیں۔۔۔ نہ جانے کب سے بوتلوں میں بند شراب کی بھن پلا دیتے ہیں مہمانوں کو۔" وہ ہنسنے لگیں۔

"جی میں اور امی گھر میں ہی بناتے ہیں۔" اس نے سب کے خالی گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ماشاء اللہ۔۔۔" دادی نے تعریفی نظروں سے دیکھا دادی کی نظریں اسے کھٹک رہی تھیں مگر یہ گماں بھی نہ گزرا کہ وہ کس نیت سے اسے دیکھ رہی ہیں۔

چائے کے ساتھ بھی اس نے گھر کے بنے دہی بڑے اور سموسے رکھے تھے۔

"لڑکی تو اچھی ہے۔" زرینہ نے سرگوشی کی۔ صاعقہ نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر بھابھی یہ بھی تو دیکھیں نا کہ مکان کتنا پرانا ہے اور لڑکی خود بھی کچھ اتنی خاص نہیں ہے' آج کل کی لڑکیوں والی کوئی بات نہیں ہے۔" صاعقہ نے دل کی بات کردی۔

"ممانی آپ نے بھی بہت دنوں بعد چکر لگایا ہے۔ آپ کی ساری قمیصیں تیار ہیں اور وہ بیڈ شیٹ کی جھالر بھی لگ گئی ہے۔" گڑیا نے چائے سرو کرتے ہوئے کہا تو صاعقہ کا ماتھا ٹھنکا۔

"تم لوگوں کے کپڑے سیتی ہو؟" انہوں نے اتنی حیرت سے پوچھا جیسے وہ پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ "تم چوری کرتی ہو؟"

"جی۔۔۔ بس اپنوں کو ہی پتا ہے کہ میری سلائی

بہت اچھی ہے اسی لیے ۔۔۔ غیروں کے نہیں ستی ' وقت اچھا گزر جاتا ہے۔" وہ وضاحت دینے لگی۔ سیف علی نے گھر کے درودیوار اور چائے کے لوازمات کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اس لڑکی کے سلیقے کو سراہا تھا۔

"جس گھر میں بھی جائے گی اجالا کردے گی؟ جنت بنا دے گی۔" لیکن فی الحال تو مجھے انکار کی کوئی وجہ سوچنی پڑے گی۔ لڑکی خوش شکل بھی ہے۔ خوش اخلاق بھی اور سلیقہ شعار بھی۔۔۔" وہ اس کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے انکار کی وجہ سوچنے لگا۔

"ارے گڑیا تو ماشاء اللہ ہر کام میں طاق ہے 'بس اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔" ثریا نے گڑیا کو ساتھ لگاتے ہوئے دل سے دعا دی۔

"آمین۔" تائی زرینہ اور دادی نے مکمل کر آمین کہا تھا۔

رمضان المبارک میں چند ہی دن رہ گئے تھے۔ وہ لوگ کھانا کھا کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

"ارے رات تو رکیں 'اتنی دور آئے اور جانے کے لیے بھی تیار ہو گئے۔" امی نے انہیں روکنا چاہا' اسی لمحے اس نے باورچی خانے کی چوکھٹ پر کھڑے ایک لمحے کو نظریں اٹھا کر سیف علی کو دیکھا' وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ گڑیا کا دل ایک عجیب انداز سے دھڑکا تھا۔ سیف علی نے نظریں جھکالیں۔

"بس جی 'عید پر آئیں گے اگر ثریا کی طرف چکر لگا تو' بہت مہمانوں نوازی کی آپ نے شکریہ 'کبھی ہماری طرف بھی چکر لگائیے گا۔" زرینہ آنٹی نے جاتے جاتے خوشدلی سے کہا۔ امی نے اثبات میں سرہلا دیا۔ وہ لوگ چلے گئے 'گڑیا کی آنکھوں میں انتظار کے دیپ جل اٹھے۔

"پہلے تو کبھی نہیں آئے ممانی کے میکے والے۔" اس نے ان کے جانے کے بعد برتن دھوتے ہوئے جان بوجھ کر بات چھیڑی دل میں جو خیال گیا تھا شاید وہ امی سے ایسا کوئی ذکر کر گئے ہوں۔

"ہاں میں بھی یہ ہی سوچ رہی ہوں 'نہ کوئی مقصد سمجھ میں آیا نہ کوئی اور وجہ ۔۔۔ خیر شاید ویسے ہی ثریا بھابھی کے ساتھ آ گئے ہوں۔۔۔ تم اپنے ابو کے لیے کھانا نکال کر آرام کرو تھک گئی ہو گی۔" امی وضو کر کے اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ دل میں خاموشی سی چھا گئی۔

☆ ☆ ☆

"بھئی مجھے تو لڑکی بہت پسند ہے 'سلیقہ شعار' خوش اخلاق اور سب سے بڑھ کر اچھی خاصی خوش شکل ہے" دادی بہت خوش تھیں۔ وہ انعم کو ٹیکسٹ کر رہا تھا۔

"اس مرتبہ تو میرے دل کو بھی بات لگتی ہے مگر اماں ۔۔۔ گڑھی شاہو اور پھر کیا کہیں گے سب کو کہ کس مکان میں رہتے ہیں 'ہمارے معیار کے نہیں وہ لوگ" صاعقہ کی سوئی وہیں اٹکی تھی 'اسی نکتے کو سیف نے بھی پکڑ لیا۔

"تم تو بس دولت کے معیار اور اینٹ پتھروں سے بنے مکانوں میں ہی پھنسی رہنا۔" اماں نے پہلو بدلا۔

"کیوں سیف کیسی لگی تمہیں لڑکی؟" زرینہ تائی نے بڑی امید بھری نظروں سے سیف کی سمت دیکھا۔

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں تائی 'آج کل کے دور میں بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ میرے دوست کولیگ وغیرہ کیا کہیں گے 'حد کی سفید پوشی ہے۔۔۔ کل شام آپ لوگ میری ایک کولیگ کے ہاں چل رہے ہیں لے دیکھنے گل کالونی میں ۔۔۔ اس کے والد انگلینڈ میں ہیں کئی سالوں سے 'بہت بڑی کوٹھی ہے 'گاڑی ہے پڑھے لکھے اور ماڈرن لوگ ہیں۔" وہ ہمت کر کے بول ہی پڑا۔ صاعقہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ دادی کے چہرے پر پھیلے رنگ یکدم پھیکے پڑ گئے۔

"اچھا ہی ہوا میں نے وہاں کوئی ایسی امید بھری بات نہیں کی ورنہ ۔۔۔ بے چاری بچی کی دل آزاری ہی ہوتی۔" دادی نے سر جھکا لیا۔ زرینہ تائی بھی وہاں سے اٹھ گئیں۔

"ہم کل شام کو تیار رہیں گے 'اچھا ہے تایہاں بات

بن جائے تو عید پر تمہارا نکاح کروں میں۔" صاعقہ خوشی سے سیف کو ساتھ لگاتے ہوئے بولیں ' دادی کو ان کی یہ خوشی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔

☼ ☼ ☼

بہت بڑا ڈرائنگ روم تھا۔ بے تحاشا قیمتی ڈیکوریشن پیس رکھے تھے اور اتنی زیادہ تعداد میں تھے کہ کسی ڈیکوریشن کی دکان کا گمان ہوتا تھا۔

"لڑکی نہیں آئی ابھی تک۔" دادی نے سیف سے پوچھا لڑکی کی والدہ بھی نوکر کے ہمراہ چائے کی ٹرالی لیے اندر آگئیں۔

"انعم نے بہت ذکر کیا تھا سیف کا' بہت عرصے سے جانتی ہے سیف کو' البتہ آپ لوگوں کا کبھی ذکر نہیں کیا اس نے۔" اس کی والدہ کے منہ سے ایسی باتیں سن کر دادی نے ناگواری سے پہلو بدلا۔

"آپ لیں نا۔۔۔ چائے بھی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" سیف نے دیکھا ٹرالی میں تمام چیزیں بازار کی تھیں۔ ان کے گھر میں تو ہر شے گھر پہ ہی تیار کی جاتی تھی یہاں تک کہ پزا کیک بھی زرینہ تائی کمال کا بناتی تھیں۔

"میری انعم بہت نازو نعم سے پلی ہے' میں نے اسے شہزادیوں کی طرح رکھا ہے' کبھی گھر کا کام کاج نہیں کروایا۔ اسے بھی اپنی خوب صورتی کی بہت فکر رہتی ہے' بہت لاڈلی ہے ہماری۔" وہ انعم نامہ کھولے بیٹھی تھیں اور وہ غائب تھی۔

"انعم ہے کہاں؟" صاعقہ سے اب اور انتظار نہیں ہو رہا تھا بازاری باسی سموسے اور مرجھایا ہوا کیک کھاتے ہوئے ثریا کے ہاتھ کا ذائقہ یاد آرہا تھا۔

"بس آتی ہی ہو گی۔" وہ ان کے آگے بسکٹ کرتے ہوئے بولیں' دو گھنٹے کے انتظار کے بعد انعم آ ہی گئی۔

"کیسی ہو بیٹی' آؤ یہاں میرے پاس بیٹھو۔" دادی نے اپنے ساتھ جگہ بنائی۔

"جی ٹھیک ہوں۔۔۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب دے کر سیف کے پاس ہی بیٹھنا مناسب سمجھا' وہ دادی سے نظریں چرانے لگا۔

"انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہم شادی کی تاریخ لینے آئے ہیں اور رشتہ لے کر رسم پوری کرنے بھی' معاملات تو طے ہیں دونوں کے درمیان۔" دادی نے کسی لگی لپٹی رکھے بغیر سیدھی بات کی۔ انعم نے گھور کر پہلے ان کی طرف اور پھر سیف علی کو دیکھا۔

"تو آپ یہاں زبردستی آئی ہیں' رسم پوری کرنے تو پھر ٹھیک ہے امی آپ ڈیڈی سے فون پر بات کر کے اپنی مرضی کی ڈیٹ انہیں بتا دیں' جب ان کی مرضی اور خوشی شامل نہیں تو ہم تو اپنی خوشی پوری کریں۔" وہ جو خاموشی سے آ بیٹھی تھی' بولی تو زرینہ' صاعقہ اور دادی حیرت سے پھٹی آنکھوں سے سیف کو دیکھتی رہ گئیں۔

"انعم تم خاموش رہو۔۔۔" اس کی والدہ نے کچھ ڈرتے ہوئے بیٹی کو مخاطب کیا۔

"نہیں بیٹی' بچی کو بولنے دو' وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہے آپ اپنی مرضی کی ڈیٹ بتا دیجیے گا' ہم انعم کی ہر خوشی پر رسم پوری کریں گے اور فکر مت کرو بیٹا میں یہاں زبردستی نہیں آئی' سیف کی ہر خوشی میری خوشی ہے' تم سے شادی کر کے وہ خوش رہے گا مجھے اور کیا چاہیے۔" دادی نے مسکراتے ہوئے بڑی نفاست سے بات کو سمیٹا اور چلنے کی اجازت چاہی۔ واپسی کے سفر پر سب ہی خاموش تھے' البتہ ایک دو دن میں ہی گھر میں بڑی خاموشی سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں عید کے بعد شادی کی تاریخ رکھی جانی تھی۔ سیف کی خوشی میں کسی نے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا تھا۔ وہ اسی میں مطمئن تھا۔

☼ ☼ ☼

پہلی سحری کی برکت اور خوشی ہی نرالی ہوتی ہے' وہ بھی روزہ رکھنے کے بعد فجر کی نماز ادا کر کے جائے نماز پر بیٹھی ہاتھ اٹھائے سب کے لیے خیر مانگ رہی تھی جب ایک چہرہ چھم سے نظروں کے سامنے آگیا۔

"اُفوہ۔۔۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں سیف علی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے

آجاتا ہے۔۔۔ یا خدا۔۔۔ وہ تو مہمان تھا' مسافر تھا' چند گھنٹوں کے لیے اپنے گھر والوں کے ساتھ میرے گھر آیا تھا پھر نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ وہ لوگ یہاں یونہی نہیں آئے تھے۔۔۔ بھلا گز ہی شاہو کی سادہ سی گھر میں رہنے والی پرانے خیالات کی ثریا کو کوئی اس نظر سے کیوں دیکھے گا اور اگر دیکھے گا بھی تو کیوں پسند کرے گا۔۔۔ یا خدا میرے حق میں بھی بہتر ہی کرنا بے شک تو بہتر کرنے والا ہے' آمین' اس نے جائے نماز تہ کر کے رکھی اور قرآن شریف کی تلاوت کرنے لگی' صبح کی تلاوت کا مزا سارا دن محسوس ہوتا تھا۔

☼ ☼ ☼

رمضان المبارک کا آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا' عید کی تیاریاں پورے عروج پر تھیں' ابو کے جاننے والے اس کے رشتے کے لیے بھی آئے تھے مگر دو دن بعد ہی ان کے لڑکے نے انکار کر دیا تھا' اس کا غم غلط کرنے کے لیے اس مرتبہ ابو نے پورے تین جوڑے لے کر دیے تھے وہ بھی سب کچھ بھلائے ان کی سلائی میں مصروف تھی عید کے لیے گھر کی نئے سرے سے سیٹنگ کی تھی' صفائی کر کے سارے گھر کے پردے تبدیل کیے' عید کے لیے ابو کو راشن کی لسٹ بھی بنا کر دی گئی۔

"پتا نہیں اس کے نصیبوں میں کیا ہے؟ کب تک اس کے لیے آنے والے رشتے ہماری سفید پوشی کو وجہ بنا کر انکار کرتے رہیں گے۔" امی ابو کے ساتھ دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھیں' اسے آتا دیکھ کر ابو نے انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"کل چاند رات بھی ہو سکتی ہے ثریا' تم رات کو جلدی کام نمٹا لینا' میں تمہیں بازار لے چلوں گا' تم چوڑیاں اور مہندی لے لینا۔" ابو نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں ابو ضرورت نہیں' میرے پاس چوڑیاں بھی ہیں اور مہندی بھی۔" اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اسے خوش دیکھنا چاہ رہے ہیں' اس کے جواب سے وہ افسردہ سے ہو گئے تھے۔

"بھئی چوڑیاں اور مہندی لگوانے تو تم جاؤ گی' کیا پتا یہ عید اس گھر میں تمہاری آخری عید ہو' اگلی عید تم اپنے گھر میں کرو۔" ممانی نہ جانے کب آئی تھیں۔

"ممانی آپ؟" وہ انھیں دیکھ کر اٹھ گئی۔

"ہاں افطاری کے بعد بازار گئی تھی' سوچا ملتی جاؤں۔۔۔ ثریا ذرا پانی لے کر آنا۔۔۔" انھوں نے امی کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے اٹھایا۔

"ثریا اس کے سامنے ایسی باتیں مت کیا کرو' پچھلے دنوں ایک دو رشتے آئے' انکار ہو گیا بہت فکر رہتی ہے اس کی۔" امی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرنے لگیں۔

"تم فکر نہ کرو' ایک رشتہ ہے میری نظر میں' وہ لوگ آنا چاہ رہے ہیں' بس عید کے بعد میری بھاوج کے لڑکے سیف کی شادی ہے۔۔۔ ارے وہی جو آئے تھے یہاں' بس شادی پر ہی تمہاری بیٹی دکھاؤں گی لڑکے والوں کو' مجھے یقین ہے کہ رشتہ ہو جائے گا' انھیں ایسی ہی سیدھی سادی لڑکی چاہیے۔" ممانی اس کے آتے ہی خاموش ہو گئیں۔ اس نے سیف کی شادی کا ذکر سن لیا۔ دل میں کچھ ٹوٹ سا گیا نہ کوئی آس تھی نہ امید پھر بھی وہ انتظار لگائے بیٹھی تھی۔

"سیف کی شادی کہاں ہو رہی ہے' اچھا شریف لڑکا ہے۔" امی نے ان کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے تم چائے بنا لائیں۔۔۔ ہاں سیف کی شادی اس کی کسی کولیگ سے ہو رہی ہے' سنا ہے پسند کا چکر تھا' خیر تم پریشان نہ ہو' اللہ بہتر کرے گا' عید کے فوراً بعد شادی ہے تب ہی میں بات چلاؤں گی' رمضان کا مہینہ ہے بہت بابرکت مہینہ ہے' ابھی گرمی اور سفر کی وجہ سے بات نہیں کرتی' شادی پر ہی بات چھیڑوں گی۔" ممانی امی کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگیں' وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

"کیا ہو جائے گا ممانی' آج کل کے دور میں مجھ جیسی گھریلو اور سیدھی لڑکی کو کون پسند کر سکتا ہے؟"

وہ دل ہی دل میں سوچتی برتن دھونے کھڑی ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

عصر کا وقت تھا۔ وہ سب انعم کے ہاں پہلی عید کی چیزیں دینے گئے تھے سیف چونکہ گاڑی چلاتا تھا اس لیے وہ بھی اندر جا بیٹھا۔ انعم چند لمحوں کے لیے آئی' اس کا ہاتھ میں موبائل تھا اور وہ مسلسل موبائل پر ٹیکسٹ کرنے میں مصروف تھی' سیف کو حیرت ہوئی وہ تو اس کے سامنے بیٹھا تھا پھر وہ کسے ٹیکسٹ کرنے میں مصروف تھی۔

"ہم تمہاری عیدی لے کر آئے تھے بیٹی' ہو سکتا ہے رات میں چاند نظر آجائے اور کل عید ہو جائے' میں دعوت دینے بھی آئی تھی۔ عید کے پہلے روز ڈنر آپ ہمارے ہاں کریں گے۔" دادی نے بہت محبت سے اسے مخاطب کیا۔ وہ سیف سے جڑی ہر شے سے محبت کرتی تھیں۔

"عیدی ـــ؟" اس نے حیرت سے چیزوں کی طرف دیکھا۔

"یعنی ابھی سے میری پسند کا مرڈر کر دیا آپ لوگوں نے ـــ خیر ـــ تھینکس اور عید کے پہلے روز تو میرا اور سیف کا باہر ڈنر کرنے کا پروگرام تھا' ہے نا سیف؟"

اس نے براہ راست سیف کو مخاطب کیا تھا۔ دادی نے شرم سے نگاہیں ہی جھکالیں۔ صاعقہ اور زرینہ بھی ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگیں۔ سیف کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا' وہ بنا کچھ کہے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کچھ بھی کہے بغیر گاڑی کی چابی اٹھالی۔

"کیا ہوا؟" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم بہت ہی ڈرپوک ہو سیف' زندگی ہم نے گزارنی ہے تم اپنے گھر کی خواتین کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ ہم نے پہلے سے ڈنر کا پروگرام بنا رکھا تھا۔"

"بس کرو انعم ـــ میں نے کئی مواقع پر تمہیں آزمایا' تمہارے لہجے کی تلخی' بدسلیقگی' بداخلاقی ـــ میں تمہاری محبت میں برداشت کرتا رہا مگر سچ تو یہ ہے کہ تم میری محبت کے قابل ہی نہیں' میں سمجھتا تھا کہ جب میرے گھر والوں سے تمہارا رشتہ بن جائے گا تو تم احترام کرنا سیکھ جاؤ گی مگر نہیں ـــ اور یہ جو تم نے میرے ساتھ ڈنر کا پروگرام سیٹ کیا تھا وہ بھی میں نے تمہیں آزمایا تھا انعم ـــ ہمارے رشتے کے بعد یہ ہماری پہلی عید تھی' اگر ہمارا کوئی پروگرام سیٹ تھا پھر بھی تمہیں میرے گھر والوں کا مان رکھنا چاہیے تھا' یہ مت بھولو انعم کہ ناخن کبھی جلد سے الگ نہیں ہو سکتے' میں بھی کبھی اپنے گھر والوں سے الگ نہیں ہو سکتا' تمہیں تو اتنی بھی عقل نہیں کہ ہونے والا شوہر سامنے بیٹھا ہے اور تمہیں موبائل سے ہی فرصت نہیں نہ تم نے آج تک اپنے ہاتھ سے بنی کوئی چیز پیش کی ہے اور نہ اس گھر میں تمہارا کوئی سلیقہ دکھائی دیتا ہے۔ پیسے کے بل پر نوکروں سے کام کروانا تو ہر کسی کو آتا ہے مگر اصل سلیقہ تو عورت کے اپنے ہاتھ سے کیے کاموں سے دکھائی دیتا ہے انعم' میں نے بچپن سے آج تک اپنے گھر کی عورتوں کو صفائی ستھرائی سے لے کر کچن تک کا ہر کام خود ہی کرتے دیکھا ہے' ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی وہ عورت پسند تھی جو گھر کے کام خود کرے۔ اپنی پیاری بیٹی کو بھی یہ ہی تلقین کی تھی انہوں نے' میں نے اپنے گھر میں اس سنت کی پیروی ہوتے دیکھی ہے انعم' اس میں بہت برکت ہے اور میں اپنے گھر کی برکت ختم کرنا نہیں چاہتا' ایسا نہیں ہے کہ ہم نوکر افورڈ نہیں کر سکتے مگر ہم بے برکتی بھی افورڈ نہیں کر سکتے ـــ چلیں دادی۔" سیف نے تو کمال ہی کر دیا تھا' وہ تینوں اس کے ایک ہی اشارے پر کھڑی ہو گئیں' پہلی مرتبہ صاعقہ نے بھی بیٹے کی سوچ کو دل سے سراہا تھا۔

"شاباش بیٹا' آج مجھے محسوس ہوا کہ میرا سیف مردوں جیسے فیصلے کر سکتا ہے۔" دادی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ہم تو تمہاری خوشی میں خوش تھے بیٹا۔"

"اچھا ہوا تمہاری سوچ کا مجھے پہلے ہی پتا چل گیا تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بہو نہیں ملازمہ چاہیے تھی۔" انعم جھٹ سے اٹھ گئی اس کی والدہ

کے تیور بھی بگڑے دکھائی دینے لگے۔
"اپنے گھر کے کام تو نصیبوں والیاں کرتی ہیں بیٹی، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیاری بیٹی بھی کرتی تھیں ہم تو ان کے قدموں کی خاک بھی نہیں۔" دادی نے سمجھانا چاہا۔
"لو۔۔۔ اینف۔۔۔ اپنے مطلب کی مرتبہ یہ سب اور سنت یاد آجاتی ہے۔" وہ جانے کے لیے تیار تھی۔
"اور ہاں انعم عید کے بعد تمہیں کارڈ مل جائے گا میری شادی پر ضرور آنا اپنی پسند سے شادی کر رہا ہوں میں اچھی طرح ٹھوک بجا کر آزمایا ہے میں نے لڑکی کو۔۔۔ پوری اتری ہے میرے معیار پر۔" وہ اتنی بڑی بات کہہ رہا تھا۔ وہ تینوں حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔
"ہونہہ۔۔۔" انعم جوتی بجاتی وہاں سے نکل گئی۔
وہ سب گاڑی میں آبیٹھے۔ "افطاری راستے میں ہی کرنی پڑے گی، سفر لمبا ہے، رات کا کھانا لاہور میں کھائیں گے، آپ اپنی انگوٹھی سے ہی کام چلا لیجیے گا، پھر عید کے بعد نکاح رکھ لیں گے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ آج ہی نکاح کرلیں گے۔۔۔" وہ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکیں۔ عید کا سامان جو انعم کے لیے لائے تھے بد دلی سے گاڑی میں رکھا۔
"راستے میں سے اس کے حساب سے کچھ چیزیں اور لے لیں گے۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
"ہم جا کہاں رہے ہیں سیف؟" صاعقہ نے حیرت سے پوچھا۔
"گڑھی شاہو۔۔۔ پسند تھی نا آپ کو گڑیا اور مجھے اس کے ہاتھ کے سموسے اور دہی بڑے، بہت اچھے لگے تھے۔۔۔ اور وہ خود بھی اچھی ہے دادی۔۔۔ ہے نا۔" وہ مسکرا رہا تھا اور اس کی اس بات پر ان تینوں نے ہی شکر ادا کیا تھا۔
"اس کا سلیقہ اور اخلاق ہر شے پر بھاری ہے امی اور ہم فخر سے کہیں گے کہ ہم گڑھی شاہو سے "ہیرا" چرا کر لے گئے۔" اس نے ماں کو مخاطب کیا۔
"میں سمجھ گئی ہوں سیف کہ اصل امیر وہی ہے جس کا اخلاق اچھا ہے، جو دوسروں کے دل جیتنا جانتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ گڑیا نے مہمان نوازی اور اخلاق سے ہمارے دل جیت لیے تھے، حالانکہ وہ بے چاری تو جانتی بھی نہیں تھی کہ ہم اسے کس نظر سے دیکھتے گئے ہیں۔
"چلیں آج جان جائے گی۔" وہ گنگناتے ہوئے گاڑی چلانے لگا۔

☆ ☆ ☆

چاند نظر آگیا تھا۔ ابو اسے بازار چلنے کو کہہ رہے تھے مگر وہ انکاری تھی امی بھی اسے کہہ رہی تھیں۔
"دل بہل جائے گا گڑیا۔ چوڑیاں لے آؤ، مہندی لگوالو صبح عید ہے بیٹی۔"
"چھوڑیں امی اتنی بھیڑ ہوتی ہے، ابو کہاں میرے ساتھ خوار ہوں گے۔۔۔ میں چائے بناتی ہوں، آپ صحن میں چارپائیاں بچھا کر لگائیں، میں آتی ہوں تو مل کر بیٹھتے ہیں، باتیں کرتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔ ابھی وہ چائے بنا کر لائی ہی تھی کہ دروازے پر گاڑی کا ہارن سنائی دیا، دروازے پر دستک ہوئی تو دل عجیب سے انداز سے دھڑک اٹھا۔
"ارے آپ لوگ؟" امی نے دروازہ کھولا، انہیں دیکھ کر وہ حیران بھی تھیں اور امید بھی تھی کہ شاید وہ گڑیا کے لیے کسی اچھے گھر کا رشتہ لے کر آئے ہوں۔
سیف اور صاعقہ گاڑی سے ڈھیروں سامان لے کر آئے تھے۔ امی ابو حیرت سے سب منظر دیکھ رہے تھے، مٹھائی کی ٹوکری، پھلوں کے شاپر، کپڑے، جیولری سینڈلوں کے ڈبے، بیکری کا سامان۔۔۔ وہ حیرت سے سب دیکھ رہی تھی سیف نے بنا پوچھے ٹرے میں سے دودھ پتی کا کپ اٹھالیا۔ اس نے مزید حیرت سے اسے دیکھا۔
"ڈرائیو کر کے تھک گیا۔۔۔" اس نے وضاحت پیش کی۔
"ثریا کے ہاں شادی کا کارڈ دینے آئے ہوں گے۔" ابو نے اندازہ لگایا۔

"کس کی شادی بھائی صاحب؟ ہم تو اپنے سیف کے لیے آپ کی گڑیا کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں' بڑے ارمان اور امید کے ساتھ۔" دادی اور امی نے ان کے آگے ہاتھ باندھ دیے دودھ پتی کا ذائقہ ذہن میں تراوٹ بن کر اتر رہا تھا۔

"جی... مگر... ہم نے تو سنا تھا کہ..." وہ خوش بھی تھے اور حیران بھی۔

"غلط سنا تھا آپ نے' دراصل سیف سے جلد بازی میں ایک غلط انتخاب ہو گیا۔ یہ بھی لڑکی کو اتنا زیادہ نہیں جانتا تھا ایک دو مرتبہ ان کے گھر گئے تو اندازہ ہوا کہ وہ ہمارے معیار کی نہیں' سیف نے ہی گڑیا سے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ بھئی سچ تو یہ ہے کہ آپ کی بچی بہت باسلیقہ' خوب صورت اور خوش اخلاق ہے' اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو..." دادی نے بڑی امید بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ سر جھکا گئی۔

"نہیں بس جی بھلا ہمیں کیا اعتراض ہوگا اور خوشی تو اس بات کی ہوئی کہ آپ نے سیف کے پہلے رشتے کے بارے میں سچ سچ بتا دیا۔" ابو بھی بے حد خوش تھے۔

"تو اجازت ہے؟" صاعقہ نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتارتے ہوئے پوچھا' سیف نے سب کی نظر بچا کر ابرو چڑھا کر اس کی سمت دیکھا' امی ابو نے ایک ساتھ "جی ضرور" کہہ کر اجازت دی تھی۔

"یہ ہماری خاندانی انگوٹھی ہے۔" انہوں نے اس کی انگلی میں سیف کے نام کی انگوٹھی پہناتے ہوئے جتایا۔ وہ شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا گئی۔

"ابھی تمہیں تکلیف دیں گے' بہت بھوک لگی ہے راستے میں سے اس نے الم غلم کھلا کر افطار کروایا' تم کھانا کھلا دو پھر تمہارے لیے چوڑیاں اور مہندی لے کر آئے تھے۔ تم آرام سے مہندی لگوا لینا' زرینہ بہت اچھی لگا لیتی ہے۔" دادی چارپائی پر سکون سے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"جی میں ابھی کھانا لگاتی ہوں۔" وہ دل میں بجتے شادیانوں کو ان سے چھپاتی وہاں سے اٹھ گئی۔ خدا نے کتنی قریب ہو کر اس کی دعا سنی تھی۔

"جلدی کرو بھئی' ابھی تو تمہیں میرے نام کی مہندی بھی لگانی ہے۔" وہ نہ جانے کب پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔

"جی... جی۔" اس کی گھبراہٹ اور شرم و حیا چہرے کو گلال بخش رہی تھی' سیف کو اس کا چہرہ دنیا کا سب سے خوب صورت چہرہ لگا تھا۔

"تو یہ گڑھی شاہو میں تمہاری آخری عید ہے... گڑیا... ویسے تمہارا نام کیا ہے گڑیا؟" وہ جاتے جاتے پلٹا' لہجے کی شوخی اس کی خوشی کی غماز تھی۔

"گلنار... گلنار نام ہے میرا۔" اس نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

"واہ... کیا خوب صورت نام ہے بالکل تمہاری طرح سچ تو یہ ہے کہ جب پہلی مرتبہ آیا تھا تب ہی دل یہیں کہیں بھول گیا تھا اور شادی کے بعد تمہارے ہاتھ کی بنی چیزیں کھانے کی خوشی منگنی کی خوشی سے زیادہ بڑی ہے۔" وہ پانی کا گلاس لے کر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"گڑیا... بھئی جلدی کرو۔" باہر سے امی کی آواز آئی تھی۔

"گڑیا..." اس نے اس کا نام زیر لب دہرایا تھا۔

"او کے مسز گڑیا... لو میرا مطلب ہے مستقبل کی مسز گلنار سیف علی... صبح عید ملیں گے' عیدی دیں گے آپ کو' آپ کی آخری عید ہے گڑھی شاہو میں' یادگار ہونی چاہیے' سب مل کر منائیں گے..." وہ بہت خوش تھا اور اس کے باہر نکلتے ہی گڑیا رب کا شکر ادا کرتے رو پڑی... یہ خوشی کے آنسو تھے۔ عید کے چاند نے بادلوں کی اوٹ سے اسے دیکھا اور دعا دیتے ہوئے مسکرانے لگا۔ صبح کی عید اس کے لیے واقعی خوشیاں لائی تھی۔ سب کو کھانا کھلا کر اسے شکرانے کے نوافل بھی ادا کرنے تھے' وہ جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

☆ ☆

رفاقت جاوید

تیسرا حصہ

"شیریں! ایک غلط فہمی کی بنیاد پر اپنا سہاگ اپنی عزت اور سکون کیوں برباد کرنے لگی ہو۔ یہ عقلمندی نہیں سراسر پاگل پن ہے۔ تم ان معصوم بچوں کو بن باپ کے خوشیاں کیسے فراہم کر سکتی ہو۔ چاہے تم ان کی آغوش دنیا کی ہر نعمت سے ہی کیوں نہ بھر دو؟ بچوں کو باپ کے رشتے کی محرومی کا احساس کبھی چین نہیں لینے دیتا۔ اور بد قسمتی سے بچے اپنی ماں پر بھی اعتماد اور بھروسہ کھو دیتے ہیں۔" حدیقہ پیکنگ کرتی ہوئی

مکمل ناول

شیریں کے پاس بیٹھ کر سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ کئی بار اس نے اس کے ہاتھ کام کرنے سے روکے تھے۔

"نا ممکن ہے۔ اس نے مجھے کس بل بوتے پر تھپڑ رسید کیا۔ مجھے اس کا جواب دے سکتی ہو۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"تمہارے پاس میرے اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں۔ کیونکہ یہ آگ تمہاری لگائی ہوئی ہے۔ یہ سارا ڈرامہ کھیلنے سے پہلے یہ تمام باتیں سوچ لی ہوتیں تو آج نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔"

"میں نے خرم کے ہاتھوں کئی دفعہ تکلیف اٹھائی ہے۔ اپنی توہین پر جس احساس ندامت سے دوچار ہوا کرتی تھی۔ اس کا بیان ہی مشکل ہے۔ خود ہی اپنے دل کو سمجھوتے اور صلح کی جانب مائل کر کے خرم کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لیا کرتی تھی۔ تمہارے ساتھ ہارون کا معاملہ ہی فرق ہے۔ وہ دس دفعہ تم سے معافی مانگ چکے ہیں۔ درگزر کرو شیریں۔ ایسی فطرت کے مرد کسی خوش بخت عورت کے حصے میں آیا کرتے ہیں۔ ان کی قدر کرنا سیکھو۔ اور ہنسی خوشی زندگی گزارو۔" حدیقہ نے نہایت اپنائیت سے کہا۔

"ضرور معاف کر دیتی۔ اگر مسئلہ ہم دونوں کا ہوتا۔ تمہاری دخل اندازی نے میرے ہنستے بستے گھر کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اب تم دونوں کو کھلی چھٹی ہے۔ عیش کرو۔" شیریں نے زہر آلود لہجے میں کہا۔ "اس نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ میں اپنے نام کے ساتھ ایسے مکار اور بے وفا کا نام لکھنے میں بھی کراہیت محسوس کرتی ہوں۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"شیریں! تمہیں اور تمہارے بھائی کو سمجھانا بالکل بے کار ہے۔ تم دونوں کا دماغ جس شک کی طرف چل پڑا ہے۔ اس نے اندھا اور بہرہ کر دیا ہے۔ تم دونوں کی سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی ہیں۔ شیریں مجھے تمہارا گھر اور بچوں کی خوشیاں بچانے میں محض ایک ہی راہ سجھائی دے رہی ہے کہ میں پاکستان واپس چلی جاؤں۔ خرم بھی جاب لیس ہیں وہ ویسے بھی واپس جانا چاہتے ہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"وہ تمہیں طلاق دینا چاہتا ہے۔ وہ وقت گزر گیا جب وہ تمہارے ساتھ پاکستان جانے کی خواہش کر رہا

تھا۔ تم نے یہاں اپنی رنگ رلیوں کے سامان کر لیے ہیں۔" وہ زہر خند سے بولی۔

"شیریں تمہاری وجہ سے میری زندگی میں نہ شیرینی رہی نہ ہی سکون۔ کیا سوچے گی میری ماں کہ اس کی بیٹی پیدائشی ہی اتنی بدنصیب کیوں ٹھہری؟ وہ تو پہلے ہی اک زندہ لاش تھیں۔ اب میری طرف کی خوش کن رپورٹوں پر انہوں نے اپنے دل و دماغ کو موت کی تاریکیوں سے باہر نکال کر جینے کی تمنا کی ہے۔ میری اولاد کو خوش آمدید کہنے کی خاطر اجڑے ہوئے گھر کو پُررونق اور آباد کر لیا ہے۔ وہ ہر وقت میری خوشحال زندگی پر سرشار ہو کر ہر وقت میرے لطن کی دعائیں کرتی ہیں۔ تم لوگوں کے سلوک سے وہ ایک بار پھر زندہ درگور ہو جائیں گی۔ شیریں اپنے بھائی کو سمجھاؤ کیونکہ وہ تمہاری کسی بات کو نہیں ٹالتا۔ تمہاری ہر بات پتھر پر لکیر اور حرف آخر ہے اس کے لیے میری بات کا یقین کرو۔ ہارون میرے ایک بھائی اور ہمدرد

کے علاوہ کسی اور رشتے میں مقید نہیں ہیں۔ ہمارے درمیان کسی قسم کے عہدوپیمان ہیں نہ ہی مستقبل کے کوئی منصوبے ہیں۔ ہمیں اپنے گھروں کی سلامتی چاہیے۔" وہ اس کے پاؤں پکڑ کر زاروقطار رونے لگی۔

"میں ہارون کے بدلتے ہوئے تیور اور رویے کو کیسے فراموش کرکے تمہاری بات پر یقین کرلوں۔ میں عورت ہوں۔ جو دوسری عورت کی خباثت کو پل بھر میں پہچان جاتی ہے۔ میں نے تو بہت زیادہ ٹائم لیا تمہیں پہچاننے میں۔" وہ اسے دھکا دیتے ہوئے بولی۔

"جاؤ یہاں سے۔ لیوی آلون۔"

"حدیقہ!" ہارون نے دروازے میں کھڑے ہو کر تمام باتیں سن لیں۔ وہ زور سے گرجا۔

"حدیقہ اگر تم میں خودداری اور غیرت نام کی کوئی چیز موجود ہے تو زہر کھا کر مرجاؤ۔ مگر اس عورت سے التجائیں اور فریادیں کرکے خود کو اتنا نہ گرادو کہ تمہیں خود سے گھن آنے لگے۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ جو عورت اپنے شوہر پر بغیر کسی ثبوت کے تہمت لگائے۔ اس سے چھٹکارا بہتر ہے۔ شیریں میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔"

حدیقہ چیخی۔ "واپس لیں اپنے الفاظ۔ یہ کھیل یا مذاق نہیں۔"

"تم خاموش رہو۔" وہ بھی زور سے چیخا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ شیریں ہکابکا دیکھتی رہ گئی۔ اسے اس کے اس ردعمل کی توقع ہرگز نہ تھی۔ وہ تو اپنی سوچ کے مطابق اسے راہ راست پر لانے کی دھمکی دے رہی تھی۔ پاکستان واپسی اس کے بغیر کیسے ممکن تھی؟ وہ اسے سوئی کے ناکے سے نکال کر اس کا ہر خم نکال دینا چاہتی تھی۔ اس کو نصیحت آموز سبق دے کر زندگی بھر کے لیے اس کی نظروں کو نیچا کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ وہ کبھی خواب میں بھی حدیقہ کا تصور نہ کرسکے۔ مگر وہ کیا کہہ گیا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"تمہارا نشہ اور سحر اس کو جنونی اور دیوانہ بنا گیا۔ ہائے اسے اپنے یہ دو معصوم بچے بھی نظر نہ آئے۔ کیا اندھا کردیا ہے تم نے اسے۔ کہاں ہے خرم اسی پل تمہاری بھی چھٹی کرواتی ہوں۔ وہ تو کب سے تیار تھا۔ میرے سمجھانے پر رکا ہوا تھا۔ اف مجھے نیکی اور بھلائی کا یہ اجر ملا۔ تم نے یہ صلہ دیا ہے مجھے۔" وہ اول فول بک رہی تھی کہ خرم اندر آگیا۔

"خرم اپنی بیوی کو تم اسی وقت طلاق کیوں نہیں دیتے۔" شیریں نے روتے ہوئے کہا۔

"میں جذباتی فیصلے کرنے والا ہوتا تو اس کو کب کا فارغ کرچکا ہوتا۔ وقت بہت بڑا منصف ہے' اس کا انتظار کرو۔" خرم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"صبر کرو۔ شام ڈھلنے سے پہلے ٹکٹو گھر لوٹ آئے گا۔ فکر کیوں کرتی ہو؟ یہ اپنا ملک نہیں کہ کسی کے گھر میں بن بلائے مہمان بن کر گھس جاؤ اور جی بھر کو خاطر داریاں کرالو۔ یہاں کوئی بھی بھوکا پیاسا سڑک کے کنارے دم توڑ دے۔ کوئی پلٹ کر نہ دیکھے گا۔ یہاں کوئی پرسان حال نہیں۔ نفسانفسی کے اس عالم میں شیطانیت عروج پر ہے۔ وہ واپس آجائے گا۔ اب اس سے منہ ماری مت کرنا۔ حالات کو سنوارنے کا ذمہ میں خود اٹھاتا ہوں اور سنو حدیقہ بیگم کوئی غلط گیم نہ ڈال دینا بیچ میں۔"

"میری طرف سے آپ اپنا دل صاف کیوں نہیں کرلیتے؟ شک اور وہم نے۔۔۔ کتنی ہی قیمتی زندگیوں کے روشن مستقبل تاریکیوں کے حوالے کردیے ہیں یہ لمحہ فکریہ ہے۔ سب غصہ تھوک کر بھلائی کے رستے کا کھوج لگائیں۔ خرم آپ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے سزا سنا دیجیے۔ مجھے ان بچوں کی خاطر ہر طرح کی سزا منظور ہے۔" وہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

"ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے کے بعد تمہاری عقل ٹھکانے کیوں آگئی؟ اس میں بھی کوئی چال ہے۔" خرم نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

"ہارون کی واپسی کے بعد تم اپنی سزا خود تجویز کروگی۔ اگر میری بہن کا گھر اجڑ گیا تو تمہیں کچا چبا

جاؤں گا۔"

"خرم میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ اسے ابھی اور اسی وقت طلاق دے کر گھر سے نکال دو۔ میں اس کے وجود کو ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کر سکتی۔" شیریں نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف۔ اسے طلاق دینے کا مطلب سمجھتی ہو کیا؟" خرم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ تو حدیقہ کمرے سے باہر نکل گئی کہ کہیں بیچ بچ خرم کھڑے کھڑے اسے الوداع ہی نہ کر دے۔

"میں مزید کچھ بھی جاننا نہیں چاہتی خرم۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"عقل سے سوچو۔" خرم نے آہستہ سے کہا۔ "میں اسے بیڑیوں سے رہا نہیں کروں گا۔ یہ ڈاکو منٹس میں میری رہے گی۔ آزاد اور بے مہار چھوڑ دیا تو نجانے کتنے گھروں کو برباد کر دے اور دوسرا ہارون کو پانے کے تمام رستوں پر نکاح پہرے دار بن جائے گا۔ میری ناسمجھ اور بھولی بھالی بہنا۔" وہ ذو معنی الفاظ میں بولا تو شیریں خاموش ہو گئی۔ خرم ہارون کا انتظار کرنے لگا۔ حدیقہ نے اپنا اٹیچی تیار کیا اور بغیر کچھ کہے باہر نکل گئی۔

"خود ہی واپس آئے گی۔ ذرا باہر کی دنیا کو پرکھ لے۔" خرم بڑبڑاتے ہوئے اٹھا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ تیزی سے میٹرو کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو وہ چکرا سا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی والی حدیقہ گھوم گئی۔ جس کو حاصل کرنے کے لیے اس نے کیسے کیسے طریقوں سے پاپڑ بیلے تھے۔ آج اس نے اسے کس آسانی سے جانے دیا۔ نہ روکا نہ احتجاج کیا۔ بس اسے جانے دیا۔

"اب ہارون واپس نہیں آئے گا خرم۔ تم نے حدیقہ کو روکا کیوں نہیں؟" شیریں کے لہجے میں شک تھا۔

"اس سوسائٹی میں انہیں مل کر رہنے سے اب کوئی روک نہیں سکتا۔ دونوں ہی نکل گئے اپنی ایک منزل کا تعین کر کے۔"

"حدیقہ اسپتال کے ہاسٹل کے سوا کہیں نہیں جائے گی۔ میں اس کی فطرت سے بخوبی واقف ہوں۔ اس وقت ہارون کی واپسی ضروری ہے۔ مجھے حدیقہ کی فکر ہے نہ ہی پروا ہے۔ جاتی ہے تو جائے خس کم جہاں پاک مگر طلاق دے کر آزادی نہیں دوں گا۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔

"اگر ہارون واپس نہ آیا تو۔" وہ فکر مندی سے بولی۔

"بھئی فکر کیوں کرتی ہو؟ ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ آئے گا نہیں تو کہاں جائے گا" بولو۔ حدیقہ کے ساتھ ہاسٹل میں رہنے سے تو رہا۔" وہ بھی فکر مند تو ہو ہی گیا تھا۔ مگر بہن کے سامنے بے فکری کا اظہار کر کے اسے مطمئن و پر سکون رکھنا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"خرم۔ وہ تو نہیں آیا' اب کیا ہو گا؟" شیریں روتے ہوئے بولی۔

"مرد ایک بار گھر چھوڑ جائے تو پھر وہ زندگی بھر واپس نہیں آیا کرتا۔ میں ہمیشہ سے تمہیں یہ نصیحت کرتا آیا ہوں کہ ہارون کو زیادہ پریشرائز مت کیا کرو؟ جب اپنی مردانگی دکھانے پہ آیا تو پھر اسے تمہاری' ان بچوں کی اور نہ ہی اپنے خاندان کی عزت کی پروا رہے گی' وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ رہتا تھا۔ میں تمہارے سلوک کی وجہ سے ہمیشہ خائف رہنے لگا تھا۔"

"یعنی مطلب یہ ہوا کہ اس شادی کے ٹوٹنے میں میرا ہاتھ ہے۔ خرم ابھی تو ہارون کو گئے چند دن ہوئے ہیں۔ تم مجھے موردِ الزام ٹھہرانے لگے۔ میری باقی ماندہ زندگی کا انجام مجھے نظر آنے لگا ہے۔" وہ غصے سے بولی۔

"ایسی بات ہرگز نہیں ہمیں اتنے المناک حادثے کے بعد اپنا موازنہ کرنا چاہیے۔ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنا چاہیے۔" وہ نرمی سے بولا۔ "تو کیا آج حدیقہ بھی پارسا ہو گئی ہے؟" وہ تنک کر بولی۔

"ہرگز نہیں۔ آدم کو حوا نے ورغلا کر جنت سے

— نکلوا دیا تھا۔ سو فیصد قصور حدیقہ کا ہے۔ اسے مردوں کو پھانسنے کے ہتھکنڈے آتے ہیں۔ یہ آرٹ نرس اپنی ٹریننگ میں ہی سیکھ لیتی ہے۔ اسے میں ہی نہ سمجھ سکا۔ کس کس نے سمجھانے کی کوشش نہ کی تھی۔ مگر میں ہی چغد نکلا۔" لہجے میں پچھتاوا تھا۔

"اب ایسی باتیں کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ میرا خیال ہے۔ ہم واپس جانے کی تیاری کو مکمل کرتے ہیں۔ ہم اس ملک میں آباد ہونے نہیں برباد اور ذلیل و خوار ہونے آئے تھے' مقدر میں یہی لکھا تھا' ان حالات سے بچاؤ کیسے ہوتا؟" وہ افسردگی سے بولا۔

"وہ جب بھی ہارون سے شادی کرنا چاہے گی۔ خلع لینے کی حق دار ہے۔ اپنا حق ڈنکے کی چوٹ پر وصول کرکے تمہیں ری جیکٹ کردے گی۔ اس سے پہلے یہ بہتر نہیں کہ تم اسے لٹک لگاؤ۔ تاکہ وہ عمر بھر تڑپتی رہے۔"

"مجھ پر بھروسا رکھو۔ صرف میاں اور بیوی کا رشتہ ہی اعتماد کی مضبوطی پر استوار نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ہر رشتے میں اعتماد اور بھروسا ضروری ہے۔ آج کے بعد تم اس موضوع پر بات نہیں کروگی۔ میرے آخری الفاظ اپنی ڈائری میں لکھ لو۔ تاکہ تمہیں یاددہانی رہے کہ اگر ہارون تمہاری زندگی سے نکل گیا تو میں حدیقہ کے نوٹس کا انتظار کروں گا۔ صاف ظاہر ہوجائے گا کہ اب وہ شادی کے چکروں میں ہیں۔ میں پھر بھی اس کی خواہش پوری نہیں ہونے دوں گا۔ ہاں اپنے طور پر وہ یہاں کے قانون کے مطابق یک طرفہ فیصلہ لے کر اس سے شادی کرلیتی ہے تو اس کا علاج ہم دونوں کے پاس نہیں ہے۔" وہ اپنی منطق جھاڑے جارہا تھا۔

"دیکھو تم اس نامعقول لڑکی سے اپنے چہرے پر طمانچہ کھانے کے لیے تیار بیٹھے ہو۔ بہت بے غیرت اور بے شرم انسان ہو۔ مجھے تمہیں بھائی کہتے ہوئے ہتک محسوس ہونے لگی ہے۔ اب مجھے سمجھ آئی ہے کہ تم ایک کمزور اور سخت لاغر قسم کے شوہر تھے کہ بیوی نے دن دہاڑے تمہاری بہن کے سہاگ پر ڈاکہ ڈالنے میں ہلکی سی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی اور اک کمزور شوہر اپنی بیوی کو زدوکوب کرکے خود کو اک قوی اور مضبوط ہونے کا یقین دلانے میں اپنی دلی اور ذہنی تسکین و تسلی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ مجھے اب سمجھ آئی ہے کہ ہارون نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا کس سے سیکھا ہے۔" وہ غصے سے بولے جارہی تھی۔

"شیریں۔ شاید تم درست ہی کہہ رہی ہو۔ کیونکہ میری تربیت میں ماں کا قصور ہے۔ انہوں نے اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی توجہ کا مرکز رکھا۔ میں تمہارے بغیر قدم اٹھانے کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا۔ تمہاری موجودگی اسکول سے لے کر اب تک مجھے وقتی طور پر مضبوط بناتی رہی۔ میری خوداعتمادی کو عارضی ہی جلا بخشتی رہی۔ میں روبوٹ کی مانند تم دونوں کے اشاروں پر چلتا رہا۔ میری سوچ اپنی تھی نہ ہی میں کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا تصور کرسکتا تھا۔ کیونکہ میں ایک کمزور اور محتاج بیٹا اور بھائی تھا۔ خاوند کی صورت میں اسٹرانگ بننے کی کوشش کی۔ مگر اس میں بھی میری فطری کمزوری کی جھلک نمایاں تھی۔ حدیقہ کے بجائے بہن میرے تمام حقوق کی وارث سمجھی گئی۔ جو تم نے کہہ دیا میں نے ہنستے ہوئے احتراماً" قبول کرلیا۔ آج تم نے مجھے کمزور مرد کا طعنہ دے کر میری سوچ کے بند دریچوں کو کھول دیا ہے۔ مگر اب اس کا کیا فائدہ؟" احساس زیاں سے وہ تڑپ اٹھا۔

✲ ✲ ✲

حدیقہ ایمرجنسی وارڈ میں ڈاکٹر جوبرٹن کے ساتھ راؤنڈ پر تھی کہ ایک اور مریض زندگی اور موت کی کشمکش میں جلا وارڈ میں پہنچ گیا۔ گو کہ اس کا سر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مگر وہ لاکھوں میں بھی اپنی شناخت رکھتا تھا۔ حدیقہ نے اس کی بند آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پکارا۔

"ہارون بھائی آنکھیں کھولیے۔ آپ ہم سب کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔" وہ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اس کا ٹمپریچر لینے لگی۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ موت کے دہانے پر کھڑا بے پروا اور بے بس۔

وہ گلے شکوے بھول کر اس کی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ معمہ حل کرنا مشکل نہ رہا کہ وہ اتنے عرصے سے اس اسٹیٹ میں ایک ٹیکسی چلا کر گزر اوقات کر رہا تھا۔۔ ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے آج وہ اس کے سامنے تھا۔ شیریں کے ناروا سلوک کی وجہ سے وہ اس اسٹیٹ میں آکر سیٹل ہو گئی تھی۔ چھوٹی سی نہایت حسین اسٹیٹ میں اس کی جاب وہاں سے بہت بہتر تھی۔ کموڈیشن کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ٹرانسپورٹیشن بھی بہترین تھی۔ یہاں اس نے خرم کے لیے جاب بھی ڈھونڈلی تھی۔ مگر اسے انفارم کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اسے ڈر تھا خرم اسے شیریں کے۔۔۔ کہے میں آکر طلاق نہ دے دے۔

ماما کو ان حالات کی قطعاً خبر نہ تھی۔ وہ اپنی جگہ مطمئن اور خوش ہر اتوار اس سے اسکائپ پر گھنٹوں بات کرتیں۔ مگر حدیقہ اس کے پاس آنے کی ہامی نہ بھرتیں۔ انہیں نجانے آج بھی شوہر کے واپس آنے کی کیوں امید تھی؟ شاید وہ خود کو بے وقوف بنا کر کسی امید پر اپنی زندگی میں خوشیاں بھرنا چاہتی تھیں۔

حدیقہ ماں کو اسی مسرور کیفیت میں رکھنے کے لیے اپنی اصل زندگی کے بارے میں بتانے سے گریز کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس دکھ کو وہ برداشت نہ کر سکیں گی۔

رات بھر وہ ہارون کے پاس رہی۔ بیتے ہوئے لمحوں کی یادوں نے بے کل و بے قرار کر دیا۔ کئی بار آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ صبح کتنی حسین تھی۔ جب اس کی پکار پر ہارون نے آنکھیں کھول کر اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ نگاہوں کا انجانا پن بدستور قائم تھا۔ اس نے اپنی مخصوص مسکان سے اپنا نام بتایا۔۔۔ تو اس نے غور سے اسے دیکھا اور نگاہوں میں آشنائی۔۔۔ اور دوستی کی لہر دوڑ گئی۔

"ہارون بھائی آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ کچھ سوچنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے نا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے بولی۔ "اللہ کا شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔" ہارون نے مسکراہٹ سے جواب دینے کی کوشش کی۔ جو ناکام رہی۔ کیونکہ سر میں اک درد کی ٹیس نے اس کے چہرے کے تاثرات بدل دیے تھے۔ "بولنا منع ہے۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔

"میں آج سے چوبیس گھنٹے آپ کے پاس ہوں۔ بس آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں۔ جلد از جلد صحت یاب ہو کر گھر جائیں۔" وہ ذرا سا مسکرایا اور دو آنسو اس کے گالوں پر پھسل کر اس کے دکھی دل کی سرگزشت بیان کر گئے۔ جن کو حدیقہ نے نظرانداز کر دیا۔ کیونکہ اس وقت ماضی کریدنے سے سوائے انگاروں کے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ تھی۔ یہ بات حقیقت پر مبنی تھی کہ اگر ہارون اس کا ساتھ نہ دیتا تو نجانے آج یہ کس حال میں کہاں ہوتی۔ حدیقہ احسان فراموش نہ تھی۔ اس نے اسے صحت اور زندگی کی جانب گامزن کرنے میں دن رات ایک کر دیے۔ سر کی تمام پٹیاں کھل چکی تھیں۔ صرف ٹانگ ابھی تک پلاستر میں جکڑی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ ہارون کی صحت بحال ہوتی گئی اور اب وہ اسپتال سے ڈسچارج ہو رہا تھا۔

"آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔"

"کس رشتے، ناتے سے۔ تم نے ایک مخلص اور ہمدرد دوست ہونے کا ثبوت دے دیا ہے۔ مجھے چلنے پھرنے اور سوچنے سمجھنے کے قابل بنایا۔ مجھ میں زندہ رہنے کی امنگ ڈالی۔ میرے ہونٹوں پر آہوں کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی۔ سارا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے حدیقہ۔ کیا میں اس بیتے ہوئے مشکل وقت میں تمہاری مہربانیوں اور نوازشوں کو بھول سکتا ہوں۔ میری اس عطا کردہ زندگی کے ایک ایک لمحے پر تمہارا حق ہے۔ تمہارا دل جب بھی مجھے پکارے گا۔ مجھے حاضر پاؤ گی۔ میں تمہارے آس پاس ہی موجود ہوں گا۔"

"میں نے جس مقدس رشتے کی ڈور آپ سے باندھ رکھی ہے۔ اس کے واسطے ہی رک جائیں اس بندھن کی لاج رکھ لیں۔" وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

"تم نہیں سمجھو گی۔ تمہارے اور میرے درمیان کسی بھی خونی رشتے کی مطابقت نہیں ہے۔ ان منہ بولے رشتوں کے ٹوٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اکٹھے رہتے ہوئے مانوسیت اور ملکیت کے اس درجے تک نہ پہنچ جائیں کہ شیریں اور خرم کے تمام شکوک و شبہات سچائی سے دامن گیر ہو کر ہمیں جھوٹا، دغاباز اور فریبی قرار دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ میں یہ سوچ کر خائف ہو جاتا ہوں۔" وہ اسے اونچ نیچ سمجھانے لگا تھا۔

"آپ کو خود پر اعتماد نہیں جبکہ مجھے اپنی ذات پر بھرپور بھروسہ ہے۔ میں نے آپ میں ایک ہم راز دوست کے ساتھ بھائی کے رشتے کو بھی ہمہ گیر پایا ہے۔" وہ یک دم ہی حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہم کتنے کمزور انسان ہیں۔ ہر وقت کسی نہ کسی سہارے کے متلاشی رہتے ہیں۔" وہ بہت رنجیدہ سا نظر آنے لگا۔

"یس یو آر رائٹ۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی چھا گئی۔ اک طویل توقف کے بعد ہارون نے اک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میں کبھی کبھی تم سے بہت متاثر ہو جاتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" وہ جاننا چاہ رہی تھی۔

"تم ان گنت خوبیوں کا شاہکار ہو۔ تم نہیں جانتیں اپنے بارے میں کہ تم کیا ہو؟"

"جھوٹی تعریفوں سے مجھے خوش کرنے کی کوشش مت کریں اگر مجھ میں ایک بھی خوبی خرم کو نظر آجاتی تو وہ مجھے یوں دھتکار کر ہمیشہ کے لیے مجھ سے تعلق نہ توڑ لیتا۔" وہ پژمردہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اس کی آنکھوں پر ماں اور بہن نے جو پٹی باندھ رکھی ہے۔ وہ دیکھنے اور محسوس کرنے سے نابلد ہے۔ مگر اب ان باتوں کا کیا فائدہ؟ وقت تو گزر گیا۔ اپنے پیچھے لاتعداد دکھ اور حسرتیں چھوڑ گیا۔ بے وجہ اور بے مقصد ہم دونوں اس کی گرفت میں آگئے۔" وہ خاصا پریشان نظر آنے لگا۔

"ہارون بھائی! آپ کو پاکستان واپس جا کر نئی جاب کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات کرنی چاہیے۔ آپ کے لیے تو وہاں کا ہر در کھلا ہے۔ ہر طرح کی بے جا پابندیاں تو مجھ پر لاگو ہیں۔ میں یہاں اکیلی سروائیو کر سکتی ہوں، لیکن وہاں مجھ پر زمانہ انگلیاں اٹھائے گا۔ میری اپنی ماں ہی میرا جینا دو بھر کر دے گی۔" وہ بھی پریشان ہو گئی۔

"مجھے لگتا ہے ہارون بھائی۔ میں پردیس کی ان ہی گلیوں کی دھول بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گی۔ میرا انجام کبھی بھی تابناک ستارے کی مانند نہیں ہو سکتا۔"

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں تمہارا وہ سائبان ہوں جو بوقت ضرورت فقط ستانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حدیقہ تم خود کو کبھی تنہا نہ سمجھنا میں ہوں نا۔" وہ ابھی بھی سنجیدہ تھا۔

"آپ کے جو احسانات مجھ پر ہیں ان کے بارے میں بھی سوچ کر پریشان ہو جاتی ہوں مزید آپ کو کیوں تنگ کروں گی۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔

☆ ☆ ☆

"شیریں تمہیں واپس آئے سال ہونے کو آیا۔ کہاں رہ گیا ہارون۔ مجھ سے تم دونوں کوئی راز چھپانے کی کوشش کر رہے ہو اور حدیقہ خرم کے ساتھ واپس کیوں نہیں آئی؟ میں کب تک اس کی ماں سے خرم کو چھپائے رکھوں گی۔ اس سرپھری پاگل بڑھیا کو اس کی بیٹی کہاں سے دوں گی۔" ماں جی روزانہ سوالات کی ایک پوٹلی کھول کر بیٹھ جاتیں اور دونوں آئیں بائیں شائیں کرتے رہ جاتے۔

آخر ایک دن شیریں نے تمام روداد ماں کے گوش گزار دی۔ تو وہ بے اختیار ہو کر بولیں۔

"مجھے تمہاری باتوں میں شک کی بو آ رہی ہے۔ بے شک حدیقہ میرے پاس رہنے کی مخالفت کرتی تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ بد کردار تھی۔ وہ بہت نیک اور پاکیزہ بچی تھی اس کی اپنے خاوند کے ساتھ

رہنے کی خواہش جائز تھی۔ یہ اس کا حق تھا۔ دوسرا ہارون جیسے لڑکے اس زمانے میں چراغ لے کر ڈھونڈے سے نہ ملیں۔ تمہاری اور خرم کی خوشی کی خاطر اپنی ماں کو اکیلا چھوڑ کر چل پڑا تھا جبکہ اسے وہاں بے روزگاری اور محتاجی کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس نہ لوٹا اس طرح غائب ہو جانے میں تمہارا بھی قصور ہے۔ ایسے مرد اگر برداشت نہیں کر سکتے تو وہ بے الزام تراشی اور ان کے کردار پر تہمت۔ بہت برا کیا تم نے۔"

"آپ نے بھی ہر ماں کی طرح مجھے قصوروار ٹھہرا دیا۔" شیریں رونے لگی۔

"میری زندگی کے تجربات کے عکس ہیں یہ۔ تم نے ایک قیمتی ہیرا کھو دیا ہے بدبخت۔" ماں جی بھی رونے لگیں۔

"تم نہیں جانتیں کہ تہمت اور الزام تراشی کا انجام آخر بے گناہوں کی یکجائی پر ہو کر رہتا ہے۔ تم دونوں نے انہیں اس رستے کا پتا بتا کر عقل مندی نہیں کی۔ اب وہ نکاح کے بغیر رہیں یا شادی رچا کر رہیں۔ انہیں نہ تم روک سکتی ہو نہ خرم۔" ماں آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"میں خاندان بھر میں کیا منہ دکھاؤں گی؟ جس دن یہ راز افشا ہو گیا۔ دونوں گھرانوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔"

"ہم اسی لیے آپ کو حقیقت بتانے سے ہچکچا رہے تھے۔" شیریں نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔

"تم کب تک چھپائے رکھتیں۔ ایسی باتیں کبھی پوشیدہ رہتی بھی ہیں۔ بے وقوف کہیں کی۔ شک میں اپنی زندگی کی خوشیوں کو داؤ پر لگایا تو تھا بچوں کو بھی جیتے جی کنویں میں دھکیل دیا۔ آج تم میری نظروں سے گر گئی ہو شیریں۔ تم نے تو ایک جاہل ان پڑھ عورت کا رول ادا کر کے میری تربیت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ مسلسل بولے جا رہی تھیں اور شیریں سر جھکائے سننے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"حدیقہ مجھے خرم سے ضروری بات کرنی ہے۔" ماں نے اصرار کیا۔

"وہ ابھی ڈیوٹی سے واپس نہیں آئے۔" وہ ہمیشہ کی طرح بہانہ بنانے لگی۔

"تم ایک سال سے مجھے بے وقوف بنائے جا رہی ہو۔ حدیقہ تم نے تو میرا منہ کالا کر کے رکھ دیا ہے۔ آج خرم کی ماں کی باتیں سن کر مجھے تم پر شدید غصہ آ رہا ہے۔ تمہاری ماں نے اپنے شوہر کے نام پر زندگی گزار دی۔ تم نے اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے نند کے خاوند کو ترجیح دی۔ حدیقہ اگر تم میری بیٹی ہو تو ڈوب مرو۔" حدیقہ تو غصے میں چیخے جا رہی تھیں۔

"مجھے علم تھا آپ مجھے ہی گناہ گار ٹھہرائیں گی۔ میری ایک نہیں سنیں گی۔" وہ خفگی سے بولی۔

"تم نے ایسی ہی حرکت کی ہے۔ اب تمہیں عقل مند کہوں کیا؟"

"تم میرے لیے آج سے مر گئیں اور میں تمہارے لیے۔ اسی دن کے لیے تو میں نے تمہیں پیدا کر کے پروان چڑھایا تھا کہ دنیا کے سامنے میرا سر ہی نیچا کر دو۔ کاش تم پیدا ہوتے ہی مر جاتیں تو آج مجھے شرمندہ ہونا نہ پڑتا۔ مجھے ایک سوال کا جواب دو۔ کیا تم اپنی ماں کی تڑپ اور سسکیوں کو بھول گئی تھیں یا اپنے حسرت زدہ بن باپ کے بیتے ہوئے بچپن کو فراموش کر دیا تھا کہ ان پر ظلم کرتے ہوئے تمہیں رتی بھر خیال نہ آیا۔ بھلا تم اس زیادتی کا کیا جواب دے سکتی ہو۔ میں قصوروار ہارون کو نہیں ٹھہراؤں گی عورت کی چال بازی، چالاکی اور فریب مرد کو بے وقوف بنا دیتی ہے۔ وہ بھی پھر ہارون جیسا شریف النفس مرد۔ اس کو جال میں پھنسانا تم جیسی عورت کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا کیوں کہ تم میں وہ جراثیم وافر مقدار میں موجود ہیں۔" حدیقہ فون پر پورے زور سے چیخ رہی تھیں۔ حدیقہ سکتے کے عالم میں مری ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا آپ میری سچی اور اصلی کہانی نہیں سنیں گی کہ

خرم کی طرح آپ فقط اپنی سوچ اور حتمی اور آخری فیصلے پر قائم رہیں گی۔ وہ میرا شوہر تھا کمزور اور بے حس۔ آپ تو ماں ہیں میری نس نس کی گہرائیوں کی پہچان رکھنے والی۔" وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

"مجھے تمہارے رونے پر نہ ترس آرہا ہے نہ ہی مجھے تمہاری من گھڑت کہانی پر یقین آئے گا۔ شیریں کی کہانی اور خرم کا تم سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور پھر تمہارا اور ہارون کا وہاں رک جانا کس بات کی نشاندہی کررہا ہے۔ کیا تم مجھے احمق سمجھتی ہو۔ تم نے مجھے اپنے باپ سے بھی بڑھ کر ذلیل و خوار کردیا ہے۔ مجھے مار ڈالا ہے تم نے۔ مجھے مار ڈالا ہے تم نے۔" وہ چیختی چلاتی فون بند کر گئیں۔ حدیقہ نے اس کے بعد بیسیوں فون کیے مگر جواب ندارد۔

اسی کشمکش میں کئی مہینے گزر گئے۔ کوشش کے باوجود اسے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ ورنہ وہاں کو تمام داستان سنانے پہنچ جاتی۔ ہارون کا ویزہ ری نیو ہو رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ مجبور اور بے بس تھا۔ وہ ہر بار اپنی ماں کو جلدی آنے کا دلاسا دے کر بہلا لیتا۔ بچوں کا دادی سے رابطہ کٹ چکا تھا۔ شیریں پہلے ہی ساس سے بے پناہ نفرت کرتی تھی۔ اب ان سے مراسم رکھنے کا اسے کوئی جواز نظر نہ آتا تھا۔

ہارون اسٹور پر جاب کررہا تھا۔ سیٹل ہونے کی صورت میں وہ بچوں کو تعلیم کے لیے یہاں بلانے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اسی تمنا میں اس کی زندگی کی تمام خوشیاں پنہاں تھیں۔ ان حالات میں ایک حدیقہ ہی تھی جس سے وہ بات کرلیتا تھا مگر وہ اس سے زیادہ میل ملاقات نہیں کرتا تھا۔ وہ حدیقہ کو ہمیشہ چھوٹی بہن کا درجہ دیتا آیا تھا۔ بھائیوں جیسی ہمدردی اور لگاوٹ تھی اس کی ہر حرکت میں' ہر وقت اس کا سایہ بن کر رہتا اور وہ بھی اس کے ساتھ خود کو محفوظ تصور کرتی۔ معاملے میں گڑبڑ اور ان دونوں میں دوری اور فاصلے شیریں کے رویے کی وجہ سے تھے۔ وہ بھی اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا اسے فون کرنے سے گریز کرنے لگی تھی۔ آج جب ماں نے بھی ایک نہ سنی اور خوب درگت بنادی تو اسے اس بھری دنیا میں واحد ہارون نظر آیا اس نے اسے روتے ہوئے فون کیا تو وہ اپنی جاب سے چھٹی کے بعد سیدھا اس کے پاس اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔ حدیقہ کا چہرہ زرد اور آنکھیں سرخ ہورہی تھیں جن میں غصے کے ساتھ بے پناہ درد اور بے بسی بھی تھی۔

"میں جو تمہارے ساتھ ہوں پھر یہ رونا دھونا کیسا؟" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"مجھے دیکھو۔ جس کی تمام متاع حیات لٹ گئی۔ پھر بھی زندہ ہوں اور مسلسل اسٹرگل کیے جارہا ہوں۔ اچھے دنوں کا منتظر ہوں بس اسی امید نے میرے وجود میں حد درجے کی ہمت و حوصلہ بھر دیا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہارون بھائی۔ آپ نہیں جانتے جب ماں کی ممتا میں کمی آجائے تو دل پر کیا گزرتی ہے۔ مجھے ایسے گمان ہوتا ہے جیسے کسی نے میرے جسم کے ہر حصے کو بچھو کے ڈنک لگا کر قیمہ بنادیا ہے۔ آج میرے سر سے ماں کا سایہ بھی اٹھ گیا۔" وہ بے بسی سے بولے جارہی تھی۔

"میں پیدائشی ہی بد نصیب ہوں ہارون بھائی۔"

"ماں کبھی بھی اولاد سے خفا نہیں ہوتی۔ چند دنوں کی بات ہے دیکھنا ان کا فون آجائے گا۔ اپنا دل مضبوط رکھو۔" اس نے تسلی دی۔

"ہارون بھائی! آپ میری ماں کی فطرت کو نہیں جانتے۔ انہوں نے مجھے دھمکی نہیں دی وہ فیصلوں پر عمل کرنے والی خاتون ہیں اور جسے چھوڑنا چاہیں پل بھر میں چھوڑ سکتی ہیں۔ دوبارہ اس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی تک نہیں۔ بہت سی مثالیں ہیں میرے سامنے۔ والدین اور خاندان سے کنارہ کشی کی تو کبھی پچھتاوا تک نہ ہوا کبھی دوبارہ اپنے تعلقات استوار کرنے کی کوشش نہ کی۔ پاپا چھوڑ کر چلے گئے تو کبھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش تک نہ کی۔ انہوں نے اس دنیا سے قطع تعلق کیا تو دوبارہ اس میں بسنے کا تصور ہی نہ کیا۔ اب مجھے ان کی باتوں میں جو تبدیلی محسوس ہوئی تھی وہ فقط میرے بچوں کی پیدائش کی امید سے آئی

تھی۔ اس لیے میں نے ان سے اپنا کوئی دکھ شیئر ہی نہ کیا۔ اب اچانک اتنے بڑے انکشاف کو وہ ہضم ہی نہیں کر پائیں اک شاک تھی یہ خبر۔ کم از کم اپنی زندگی میں تو مجھے معاف نہیں کریں گی۔"

"اس مسئلے کا حل نکالنا پڑے گا۔۔۔ تم فکر مت کرو۔ تھوڑا وقت گزر جانے کے بعد تمام معاملات اپنی جگہ لے لیں گے۔ ابھی خاموشی میں ہی عافیت سمجھو۔" وہ اس کی پریشانی کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ تھی کہ روئے جارہی تھی۔

"مجھے آنٹی کا نمبر دو۔ میں ان سے بات کرتا ہوں۔" وہ فکر مندی سے بولا۔

"فون کر کے مزید حالات بگاڑنے کی ضرورت نہیں۔" وہ بمشکل بولی۔ "جب کسی انسان کو جان لیوا بیماری لاحق ہو جائے تو موت کا خوف شب و روز کا سکون برباد کر دیتا ہے مگر جب اس بیماری کے سامنے تمام حیلے ناکام ہو جاتے ہیں تو اس بیماری سے ہی لگاؤ ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کی پروا نہیں رہتی۔ موت کا ڈر اور اندیشہ ختم ہو جاتا ہے۔ میں بھی ٹھیک تو ہو جاؤں گی تھوڑا وقت درکار ہے' لیکن بیماری میری جان لے کر دم لے گی۔"

"خواہ مخواہ دل کو روگ لگا بیٹھی ہو۔ خرم جس سے تم نے ٹوٹ کر پیار کیا ہے اس کی بے وفائی اور ناانصافی کو تم نے ہنس کر برداشت کر لیا۔ اب بھی صبر سے کام لو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ماں کا پیار ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ ہر مشکل وقت میں اس سائے میں ستا کر نئے سرے سے زندگی کی شروعات کر دی جاتی ہے۔ ہارون بھائی آج کے دکھ نے تو میری کمر ہی توڑ دی ہے۔" وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

"نجانے عورتوں کی آنکھوں سے پانی کے چشمے کہاں سے ابل پڑتے ہیں۔ میں فرمائش تو کیا آزمائش میں بھی آنکھوں سے ایک قطرہ نہیں نکال سکتا۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ چشمے کب سوکھ پائیں گے؟" وہ قدرے شرارت سے بولا۔

"آپ کو شرارت سوجھی ہوئی ہے۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"کیا آپ محسوس کرنے کی قوت رکھتے ہیں کہ میرے دل و دماغ پر کیا گزر رہی ہے۔"

"جانتا ہوں۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "اگر تمہارے ساتھ بیٹھ کر رونے سے کرب کی شدت کم ہوتی ہے تو مجھے ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ بتاؤ کہ ہم دونوں کے آنسو صاف کرنے والا کون ہو گا۔"

"آپ نے درست فرمایا ہے۔" وہ سر جھکائے بولی۔

"کھانا کھا کر سونے کی کوشش کرو۔ میں اب چلتا ہوں ذرا سی بھی طبیعت مضمحل ہوئی تو فون کر دینا تکلیف میں مضطرب نہ ہوتی رہنا۔" اس نے فکر مندانہ انداز میں کہا اور گھر سے نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

رات بھر کی بے داری سے سر چکرا رہا تھا۔ وہیں لیٹے وہ سسکیاں بھرتی دھیرے دھیرے نیند کی ہمجولی بن گئی اور آنکھ اس وقت کھلی جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے اور دروازے پر مخصوص دستک ہوئی۔ وہ چونک کر ہڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔ اسے صبح کا گمان ہوا جیسے ملگجی روشنی کے بعد سورج طلوع ہونے والا ہو۔ وال کلاک کو دیکھ کر تیزی سے بیڈ سے اتری۔

"یہ تو شام کا وقت ہے' اف اتنا لمبا سو لیا۔ اسپتال سے بھی غیر حاضری' ہارون بھائی کال کر رہے ہوں گے۔" وہ سوچ رہی تھی کہ ڈور بیل بجی۔ اس نے غیر ارادی طور پر دروازہ کھول دیا۔ ہارون نے تشویش سے اسے گھورا۔ وہ ابھی تک نائٹ سوٹ میں تھی آنکھیں ابھی بھی بیدار ہونے کی غمازی کر رہی تھیں۔

"تم ٹھیک تو ہو۔" وہ بے اختیار بولا۔

"ابھی تو ٹھیک ہوں۔" وہ آنکھیں ملتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تو پھر آج اسپتال سے چھٹی کیسے کر لی؟" وہ حیرت

سے بولا۔

"نجانے کیوں؟" وہ مختصراً بولی۔

"رت جگا منایا ہوگا۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور آنکھیں جھکالیں۔

"اگر تم نے بیمار پڑنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو مجھے صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتیں؟ میں خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہا ہوں۔" وہ ایک دم ہی افسردہ ہو گیا۔ وہ خاموش رہی۔

"میں تمہیں بہت بہادر لڑکی سمجھتا تھا۔ تم تو بالکل ہی کمزور نکلیں۔ تمہاری کمزوری' بزدلی اور کم ہمتی نے تمہیں یہ دن دکھایا ہے۔ سب کچھ کھو جانے کے بعد بھی تم میں زمانے سے ٹکر لینے کی جرات و سکت پیدا نہیں ہوئی۔ اپنے اندر گٹس پیدا کرو اور خود غرض ہو جاؤ۔ اپنی زندگی میں خوشیاں بھرنے کے بارے میں سوچو۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"کیسے؟"

"جنہوں نے تمہارا سکون برباد کرکے تمہیں رلایا ہے انہیں ایسے فراموش کردو ان کی یادوں کو سینے سے ایسے کھرچ کر نکال دو جیسے تمہاری زندگی میں کبھی ان کا دخل تھا ہی نہیں اگر تم یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتیں تو میری ایک ریکویسٹ قبول کرلو۔ ذرا اپنی وصیت بتادو کہ تمہیں دفن کہاں کروں؟ خرم کے پہلو میں کہ ماں کے چرنوں میں۔" وہ بے زاری سے کہتے ہوئے ہنس پڑا۔

"ہائے خدا نہ کرے۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "میری زندگی بھی ان دونوں کو لگ جائے ہارون یہ آپ نے بہت گھٹیا بات کی ہے۔ آئی لو خرم۔ آئی مس خرم اینڈ ماں۔"

"افسوس کہ خرم ابھی تک تمہارے دل کے نہاں خانوں میں بستا ہے تم میں اگر رتی بھر بھی اپنی عزت اور وقار کا پاس ہے تو اس کی یاد میں گھلنا چھوڑ دو۔ اس کی ماں نے اب تک اس کے لیے اپنی پسند کی لڑکی ڈھونڈ بھی لی ہوگی۔ اس کی شادی کا کارڈ طلاق کی صورت میں نازل ہوا تو پھر سنبھل نہ پاؤگی بہتر ہے کہ ابھی سے ہر طرح کے حالات سے سمجھوتہ کرکے اپنی زندگی کی نئی راہ تلاش کرو۔ تم میں کسی چیز کی کمی ہے کیا؟ جو خود اعتمادی کو تیاگ چکی ہو۔" وہ قدرے سختی سے بول رہا تھا۔

"میں نے خرم سے پیار کیا ہے ہارون بھائی۔ بے شک خاوند کا پیار بہتی ندی ہے ڈھلتی چھاؤں ہے۔ چاند کا گھٹنا اور سورج کا اترنا ہے پھر بھی مجھے اپنی محبت پر یقین ہے۔ اپنی وفا پر بھروسہ ہے۔" وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ "ایک دن اسے احساس ضرور ہوگا۔"

"تمہارا علاج میرے پاس نہیں۔"

"دنیا ہنسنے والوں کا ساتھ دیتی ہے ہارون بھائی۔ بالآخر رونے والوں کا کوئی ساتھی نہیں رہتا کوئی ہمدرد اور غم گسار بن کر اس کے درد و دکھ کو بانٹنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کا انجام تنہائی اور اکیلا پن ہے ہارون بھائی۔ آپ بھی مجھ سے تنگ آگئے ہیں آج مجھ پر وہ وقت ہے جب سایہ بھی ساتھ چھوڑ کر پرایا ہو جاتا ہے آپ کو قصوروار نہیں ٹھہراؤں گی۔" اس کے لہجے میں خفگی نمایاں تھی۔

"حدیقہ تم جانتی ہو کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دن سے میرے دل میں تمہارے لیے بے پناہ پیار اور انس ڈال دیا تھا۔ مجھے ہمیشہ تم سے ہمدردی رہی ہے۔ تمہاری بے پناہ عزت و احترام کیا ہے میں نے۔ پھر تم نے فوری طور پر یہ فیصلہ کیسے سنا دیا کہ میں تمہیں چھوڑ جاؤں گا۔" وہ اضطرابی انداز میں بولا۔

وہ مارے ندامت کے خاموشی سے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کا موازنہ کرتے ہوئے بولی۔

"ہارون بھائی لگی چاہتا ہے ان آڑی ترچھی پھیلی ہوئی لکیروں کو کھرچ کر مٹا دوں اور پھر اپنی پسند اور مرضی کے مطابق ان کو سیدھا کردوں۔"

"کوشش کروگی تو کامیاب ضرور ہو جاؤگی۔ جو لوگ اپنے نصیب بدلنے پر یقین نہیں رکھتے وہ اپنی تمام عمر آہ

وقفوں میں بتا دیتے ہیں۔ میں یہی راز تو تم پر افشا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے تمہیں اس بھری دنیا میں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ تم بھی انہیں بھلا کر اپنی بقیہ زندگی کے بارے میں اپنا من پسند فیصلہ کرو۔ اب نہ تو کوئی بندہ بشر تمہیں روکنے والا ہے۔ نہ ہی تمہیں انکار یا اعتراض کرنے کی ضرورت ہے خود کو سنبھالو۔ کل کی صبح تمہاری نئی زندگی کی کرنیں لے کر طلوع ہو۔" ہارون نے اس کا سر سہلایا۔

"الوداع کہہ دو اس رونے دھونے کو اس تڑپ اور کسک کو پچھتاووں اور حسرتوں کو۔"

"ہارون بھائی اگر آپ میری زندگی میں نہ آتے تو میں کب کی مر گئی ہوتی۔ آپ نے ہر مشکل گھڑی میں میرے وجود میں روح پھونک کر مجھے نئی زندگی بخشی۔ آج کے بعد وہی کروں گی جیسا آپ چاہتے ہیں۔"

"ہر انسان اپنے دکھوں کا مداوا خود ہی کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ تم بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن اپنے ہر رنج والم پر غالب آجاؤ گی۔ بس معمولی سی کوشش ہے کہ تم کسی طریقے سے اس فیز سے نکل آؤ۔"

"بہت بہت شکریہ ہارون بھائی۔" لہجہ تشکر آمیز تھا۔

"آئندہ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

"گڈ گرل۔" ہارون نے مسکرا کے کہا۔

☆ ☆ ☆

"خرم! میں نے تم جیسا بے حس اور بے فیض بھائی اس روئے زمین پر نہیں دیکھا۔ کچھ خبر ہے کہ تمہاری بیوی کہاں ہے؟ کیسی ہے؟" شیریں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تمہیں تو میں ہمیشہ سے ہی ناداں، بے وقوف اور نجانے کیا کچھ نظر آتا ہوں۔"

"تمہاری حرکات جو ایسی ہی ہیں۔" اس کی تلخی قائم تھی۔

"تم نے اپنی طرف کبھی غور کیا ہے ذرا گریبان میں جھانک کر تو دیکھو۔" وہ بھی غصے میں ہی بولا۔

"تم مجھے بلیم نہیں کر سکتے۔ میرا گھر برباد ہونے میں تمہاری کمزوریاں اور کوتاہیاں نمایاں ہیں ورنہ تمہاری بیوی کی یہ مجال نہ ہوتی کہ میرے شوہر کو ایسا ہاتھ میں کیا کہ توبہ بھلی۔ اور تم ہو کہ اسے طلاق دینے پر رضا مند ہونے میں نہیں آرہے۔" وہ پھر چیخی۔

"شیریں بڑے بھائی کی عزت واحترام کا دھیان رکھ کر بات کرو۔ پہلے ہی میرا بچہ بہت پریشان ہے۔ اوپر سے تم ہر دوسرے دن یہی قصہ لے بیٹھتی ہو بیٹیاں اپنے ہی گھروں میں بستی بھلی لگتی ہیں اب میری عمر ہے کیا تمہاری اور بچوں کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی۔ پھر طرہ یہ کہ بڑے بھائی سے تمہاری ایک پل کے لیے نہیں بنتی۔ ہر وقت کا کوسنا ڈانٹ پھٹکار بھائی کہاں سہتے ہیں۔" ماں نے بیٹی کو ڈانٹ دیا۔

"ماں جی آپ نے بھی بھائی کی طرح نظریں بدل لی ہیں۔ میں اس دن کو کیسے واپس لے آؤں جب میں نے طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔" وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔

"معمولی سی بات سمجھاؤ تو فوراً" مگر مچھ کے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔" ماں نے مضطرب ہو کر کہا۔

"ماں جی! آپ کے لیے سب کچھ خرم ہی ہے۔ میں آپ پر بوجھ جو بن گئی ہوں۔ اب میری حیثیت نوکرانی سے بھی کم ہے اور میرے بچے یتیم اور لاوارثوں جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔" وہ روئے جا رہی تھی۔

"بچے دودھیال رخصت کر کے خود سکون سے رہو کل کو یہی بچے تمہیں مورد الزام ٹھہرا کر باپ سے جا ملیں گے۔ میری بات یاد رکھنا میری زندگی کے تجربات و مشاہدات نے مجھے یہ ہی کچھ سکھایا ہے۔" ماں نرمی سے اسے سمجھانے لگی۔

"مجھے آپ کی سمجھ آگئی ہے۔ مجھے سر سے اتارنا

چاہتی ہیں آپ۔ خرم تم بھی خاموش بیٹھے ہو کہاں گیا تمہارا پیار؟" وہ تاسف سے بولی۔

"پیار تو میری نس نس میں ابھی بھی موجود ہے بس حالات کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ تم بہت نامعقول باتیں کرنے لگی ہو۔ سوچا تھا دونوں بہن بھائی مل جل کر بقیہ زندگی ہنسی خوشی سے گزارلیں گے مگر میں نے نوٹ کیا ہے کہ تمہاری جیسی بہن کے ساتھ اپنی تمام تر زندگی گزارنے کا منصوبہ خاصا بے وقوفانہ تھا۔ میں تمہیں ہرگز قصوروار نہیں ٹھہراتا۔ ہر ذی روح اپنی پسند اور اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی کے ساتھ انصاف کرنے کا تمنائی ہوتا ہے۔ میں بھی اسی طرح سے سوچنے لگا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"تم خود موازنہ کرو کہ ہارون کس قدر لونگ انسان اور تمہاری بے انتہا قدر کرنے والا شوہر تھا۔ حدیقہ کا کردار تمہارے سامنے ہے' حد درجے کی فرماں بردار اور خدمت گزار بیوی' بھابھی اور بہو ثابت ہونے کے باوجود میں اسے قابل عزت مقام کیوں نہ دے سکا؟ کبھی اس بارے میں تم نے سوچا ہے۔"

"آج اس کی جدائی میں ہر نقص اور برائی مجھ میں نظر آنے لگی ہے۔" وہ تلملا اٹھی۔

"اب مجھے سمجھ آگئی ہے کہ تم نے اس کو طلاق دے کر فارغ کیوں نہیں کیا؟"

"شک کی دنیا سے باہر نکل آؤ البتہ تمہاری سوچ اور سلوک نے مجھے نیا سبق جو سکھا دیا ہے۔ اگلی زندگی کے لیے کافی کارگر ثابت ہوگا۔"

"تم شادی رچا سکتے ہو۔ ہارون اور حدیقہ یک جان ہوسکتے ہیں۔ میرے لیے بتاؤ کہ کیا حکم ہے؟ میں ان دو بچوں کے ساتھ کہاں جاؤں؟ عمر کے اس حصے میں میں اکیلی رہنے کے قابل بھی نہیں۔ تم نے اور ماں جی نے بھی رویہ بدل لیا ہے ان کا ددھیال مجھے منہ تک نہیں لگاتا۔ میں نے بھائی کی محبت میں کسی کو لفٹ کرانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ آج میں کس قدر تنہا ہوکر رہ گئی ہوں۔" وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

"شیریں رونا بند کرو۔ ہمت سے کام لو۔ خرم جو کہہ رہا ہے اس میں کافی حد تک سچائی ہے۔ بہن بھائی کا پیار اگر گھروں کو تباہ کررہا ہے تو ایسے پیار سے دستبردار ہونا بہتر ہے مگر اب تو دیر ہوگئی کاش۔۔۔ گیا وقت واپس آجائے اور ہم اپنی اپنی زندگی خود سے سنواریں۔ ایک دوسرے کی زندگی میں دخل اندازی کرنے کے نتائج ایسے ہی بھیانک اور پچھتاووں اور آہوں کا حصہ ہوتے ہیں۔" ماں کی آواز بھرا گئی۔

"اس بربادی میں میری بھی برابر کی شراکت ہے۔ میں نے شیریں کے پیار میں حدیقہ کو کبھی بہو نہ سمجھا۔ اسے اپنی خدمت کرنے والی ایک نرس سمجھا اگر بہو یا بیٹی کا درجہ دیا ہوتا تو وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر کبھی نہ جاتی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس گھر میں اس کی حیثیت ایک نرس اور آیا کے سوا کچھ نہیں۔"

"آپ بھی اسی کے گن گانے لگی ہیں۔ اب تو اسے واپس لانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔" وہ ترش رخ سے بولی۔

"کاش ایسا ہوجائے۔ کاش وہ ہمیں معاف کرکے واپس آجائے۔ میرے آنگن کو پھولوں کی مہکار سے معطر کردے۔ اس سونی فضا کو معصوم قہقہوں سے گل گلزار بنادے۔ مگر ایسا ہوگا نہیں ہم ماں بیٹا کس منہ سے اس کے سامنے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کریں گے۔" ماں آج سچ بولنے پر تل گئی تھیں۔

"آپ ایسی بدکردار عورت کو واپس لانا چاہتی ہیں جس نے آپ کے داماد کو ورغلا کر بیٹی کا سہاگ چھین لیا۔" شیریں حیرت و دکھ سے بولی۔

"یہ بھی مجھے الزام تراشی ہی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تو دونوں ہی ایسے گھناؤنے کردار کے مالک نہیں لگتے۔ اللہ معاف کردے ہم سب کو۔" وہ تاسف سے بولیں۔

"شیریں تم تو پڑھی لکھی دنیا کی اونچ نیچ میں پروان چڑھی ہو۔ مگر افسوس کہ پرلے درجے کی ناقابل فہم واقع ہوئی ہو کیا ایک ان پڑھ اور جاہل عورت تم سے بہتر نہیں ہے۔ جس نے شوہر کی خامیوں سے سمجھوتا

کیا۔" ماں نے قدرے خفگی سے کہا۔
"وہ ان پڑھ تھی۔ شوہر کی محتاج تھی۔ پردہ پوشی اور صبر کے سوا اس کے پاس چارہ ہی نہ تھا۔ میں ایسے شوہر کو کیونکر معاف کرتی جو خود اس کی ایک ایک پائی کا محتاج تھا۔ زہر کا گھونٹ پی کر گھر کیسے بچا سکتی تھی، ناممکن تھا ماں جی۔" وہ غصے اور دکھ سے بولی۔
"کیا عورت کی تعلیم اور اپنے گھر کی خوشحالی میں اس کا رول اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شوہر کو جو مقام باری تعالیٰ نے بخش رکھا ہے اس سے انکار کرکے وہ عزت و شان اپنے لیے منتخب کرلے۔ مجھے تو تمہیں پاؤں پر کھڑا کرنے پر ندامت اور پچھتاوے کا احساس ہونے لگا ہے۔" ماں ابھی بھی خفا ہی تھیں۔
"ٹھیک ہے ماں جی۔ میں آپ کے پاس نہیں رہوں گی۔ مجھے اپنے مقام کا احساس دلانے کا بہت بہت شکریہ اور خرم ہم نے اسپتال کے لیے جو مل کر زمین خریدی ہے وہ بھی الگ کردو تم جانو اور تمہارا کام۔ میں سروائیو کرلوں گی ان تمام کھوکھلے اور خود غرض رشتوں کے بغیر۔" وہ آخری فیصلہ سنا کر رونے لگی۔
"اگر تم ایسا چاہتی ہو تو مجھے اعتراض ہے نہ ہی انکار کرتا ہوں۔" خرم نے برجستہ جواب دیا۔
"پیسہ تو ویسے بھی رشتوں میں نفرت کی دراڑ ڈال دیتا ہے۔"
"میرے پاس وہاں کی نیشنلٹی ہے واپس چلی جاؤں گی اور اتنے ڈالرز کما کر لاؤں گی کہ اس شہر کا سب سے بڑا اسپتال میرا ہوگا۔" وہ ہمت و حوصلے سے بولی تو خرم اس کا منہ دیکھتا رہ گیا کیونکہ ایسا خواب تو ان دونوں نے مل کر دیکھا تھا۔
رات بھر وہ سو نہ سکا کیونکہ وہ اسپتال کی خریدی ہوئی زمین کی تقسیم کرنے کے حق میں ہرگز نہ تھا اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ وہ شیریں کو فارغ کرسکتا۔ عجیب ہی شش و پنج میں گھرا ہوا کروٹیں بدلتے رات گزار دی مگر کوئی فیصلہ نہ کرپایا۔ ناشتا کیے بغیر وہ اسپتال چلا گیا وہاں بھی اس کی بے چینی اس کے چہرے اور حرکتوں سے عیاں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے دل کا حال کسی سے شیئر کرکے مشورہ لینا چاہتا تھا۔ ماں کو وہ اس قابل سمجھتا نہ تھا۔ شیریں سے ویسے بھی دل کھٹا ہو چکا تھا۔ اپنے حقیقی ساتھی سے کنارہ کشی اور ناراضی زوروں پر تھی وہ کس کے پاس جاتا۔ ہر انسان کو مسرت و الم کے لیے ایک سہارا چاہیے ہوتا ہے۔ جس سے وہ محروم تھا۔ اس میں اس کی اپنی نالائقی، ہٹ دھرمی اور نادانی تھی کہ وہ تمام رشتوں کو حقیقی اور اصلی مقام دینے میں ناکام رہا تھا۔ وہی بہن جو اس کی آنکھ کا تارا تھی اس سے بدظن ہو گئی تھی۔ بہن سے بے تحاشا پیار کا یہ انجام ہوا تھا کہ اب ہر بار معمولی گفتگو کا انجام لڑائی جھگڑے پر ہوتا اور کئی ہفتے اس کی زد میں آجاتے تھے ماں کے سرد رویے اور بیٹے کی طرف داری سے بیٹی میں غصہ بھر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"خرم بچے ابھی تک گھر نہیں پہنچے۔" ماں جی نے فکرمندی سے کہا۔
"آپ فکر نہ کریں۔ ہوسکتا ہے شیریں نے انہیں لے لیا ہو اور باہر لنچ پر لے گئی ہو۔" خرم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے اطلاع کردیتی۔ میرا دل سخت پریشان ہے۔ شیریں کا موبائل بھی آف ہے۔" وہ سخت فکرمند تھیں۔
"ہارون کی کوئی اطلاع ہے تمہیں، کہیں وہ واپس تو نہیں آگیا۔"
"اگر واپس آگیا ہے تو بہت اچھی بات ہے ہم بچوں کو باپ سے دور رکھنے کی غلطی نہیں کرسکتے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"مگر یہ تو طریقہ نہیں ہے بچوں سے ملنے کا کہ اسکول سے ہی لے اڑے۔" ماں روہانسی ہو گئیں۔
"ماں جی آپ حوصلہ رکھیں جب سے بچے پاکستان آئے ہیں ددھیال میں انہیں جھانکنے کی اجازت تک نہ تھی ان کی دادی اس غم و دکھ میں بیمار پڑ گئی تھی مگر

شیریں کے دل میں معمولی سی نرمی تک نہ آئی۔ آڑوس پڑوس کی منت سماجت اور لعن طعن کا بھی ہم پر رتی بھر اثر نہ ہوا۔ اب اگر اس کا باپ انہیں لے گیا ہے تو اس میں قصور ہم سب کا ہے ہم نے خود ہی تو انہیں ایسا کرنے پر مجبور کردیا ہے۔" وہ کھری کھری سنا رہا تھا کیونکہ اندر کا ضمیر جو بےدار ہوچکا تھا۔

"اس مسئلے کا حل سوچو اس قسم کی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ شیریں کا پتا کرو اس کا موبائل آف کیوں ہے؟" ماں بے قراری سے بولیں۔

"ہوسکتا ہے شیریں آپریشن تھیٹر میں ہو۔ آپ دعا کریں میں خود اسکول جاکر معلوم کرتا ہوں کہ بچوں کو ہمارے بغیر کسی کو لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔" وہ بھی فکر مند ہوگیا۔

"آپ ماسی کو ان کی طرف بھیجیں ابھی اور اسی وقت تمام حالات پتا چل جائیں گے۔ کم از کم تسلی تو ہوجائے گی کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک کہا ہے تم نے۔ میں ابھی معلوم کرواتی ہوں کہ ہارون نے یہ حرکت کی یا اس کی ماں نے۔ بھلا کوئی ماں سے بچے یوں بھی چھین سکتا ہے۔" انہوں نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد تمام ماجرا کھل کر سامنے آگیا۔ ہارون تو واپس نہیں آیا تھا۔ امریکا سے اس کا بڑا بھائی اور بڑی بہن بمعہ اہل و عیال کے آئے ہوئے تھے۔ غالباً" یہ حرکت ان ہی کی معلوم ہورہی تھی فوراً" شیریں کو حالات سے مطلع کیا گیا تو وہ سیدھی سسرال چلی گئی۔ بچے ماں کو دیکھ کر بھاگتے ہوئے اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ ساس اور نند کے سامنے اس نے انتہائی صبر کا مظاہرہ کیا۔ جیٹھ کو بھی برا بھلا کہنے کے بجائے بہت سمجھ داری سے کام لیا۔ بچے ڈھیروں تحفوں کے ساتھ ماں کے ساتھ واپس آگئے۔ اب وہ روزانہ اپنے کزنز سے کھیلنے کے لیے بضد ہونے لگے مگر شیریں انہیں وہاں جانے کی اجازت نہ دیتی۔

اب شیریں کو دھڑکا تو لگ ہی گیا تھا۔ راتوں کی نیندیں رخصت ہوگئیں۔ ہر آہٹ پر وہ چونک جاتی جیسے ہارون نے اس کے ہاتھ سے تمام متاع حیات چھین کر اسے بے دست و پا کردیا ہو۔

سوچ بچار کے بعد وہ واپس جانے کی تیاری کرنے لگی۔ تاکہ اس کے بچے مغربی تہذیب کے قانون کے مطابق اس کے پاس مکمل آزادی سے زندگی گزار سکیں اور دوسرا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ ہارون کو ڈھونڈ لیتی ہارون تعلیم یافتہ باپ ہونے کے ساتھ بے حد پیار کرنے والا انسان بھی تھا۔ بے روزگاری اور بےکاری کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں تھا۔ کسی پر بھی وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ دھوپ کے سائے کی مانند ڈھل کر اپنا مقام بدلنا اس کی فطرت ہے۔ یہ خبر سب کے لیے خاصی دھماکا خیز تھی کہ وہ کسی کمپنی میں کام کررہا ہے اور حدیقہ اکثر شام کو اس کے ساتھ نظر آیا کرتی ہے۔ کیا وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی اور ان کا آپس میں کیا تعلق تھا اس کا کسی کو علم نہ تھا۔

خرم نے بھی اسے سرسری طور پر روکنے کی کوشش کی جب اس نے محسوس کیا کہ شیریں حتمی فیصلہ کرچکی ہے وہ خود ڈاکٹر ہونے کے ساتھ کینیڈین نیشنلٹی ہولڈر بھی ہے پھر وہ ان خطرات اور ناسازگار فضا میں رہ کر اپنے بچوں کی شخصیت کو کیونکر تباہ برباد کرے۔ بھائی سے جو پیار تھا وہ بھی جھاگ کی مانند غائب ہوگیا تھا۔ ماں سے بھی شکوے و شکایتیں زوروں پر تھیں۔ سسرال کی جانب سے بھی بچوں کو حاصل کرنے کے تمام ہتھکنڈے استعمال ہونے لگے تھے۔ کس کے سہارے وہ اس معاشرے میں سانس لے سکتی تھی لہٰذا اس نے جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔

☼ ☼ ☼

"ہارون بھائی! یہ تو گولڈن چانس ہے۔ اگر ہم دونوں اس کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ رننگ کمپنی ہے خسارے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس ذرا ہمت کی ضرورت ہے مانا کہ چھلانگ بہت اونچی ہے۔" حدیقہ نے گہری سوچ بچار کے بعد ہارون کو مشورہ دیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اتنی بڑی رقم کا انتظام کرنا کوئی مذاق تو ہے نہیں۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

"ناامیدی کفر ہے۔ ہم دونوں مل کر پیسوں کا انتظام کریں گے تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا آپ کو علم ہے کہ نیک نیتی سے کام کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ مدد کرتا ہے نیت کرنا ہمارا کام ہے۔ آگے باری تعالیٰ پر چھوڑ دیں اس میں ہمارا نہ تو دخل ہے نہ ہی اتنا بڑا حوصلہ ہے کہ کچھ کر گزریں۔" وہ تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"میں نے بھیا اور اماں جی سے رقم کے بارے میں بات تو کی ہے ان کی طرف سے مالی و اموشنل سپورٹ کی کمی تو ہرگز نہیں۔ مگر یہ کام اکیلے بندے کا نہیں۔" وہ بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔

"میں جو تیار ہوں میرا شیئر ڈال لیں۔ میں نوکری بھی کروں گی اور یہ کمپنی بھی جوائن کر سکتی ہوں۔ ہارون بھائی ویسے کتنا مزا رہے گا ہم دونوں ہی باس ہوں گے ان گنت ورکرز کے۔" اس کے لہجے میں بے پناہ خوشی تھی۔

"تمہارے پاس اتنی رقم کا ہونا ناممکن ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میری وائٹ کالر جاب نہیں کہ ٹیکس دینے کے بعد ہینڈ ٹو ماؤتھ رہ کر ہی زندگی گزار دوں۔ میری زندگی بے حد سادہ اور سہل ہے ایک کمرے کی رہائشی ہوں۔ لنچ اسپتال سے فری ملتا ہے۔ رات کا کھانا عموماً گول کر جاتی ہوں۔ کچھ پیسے پہلے اماں کو بھیج دیتی تھی انہوں نے گھر بنوا لیا ہے اب وہ بھی مجھ سے ناراض ہیں۔ شاپنگ اور بننے سنورنے کے تمام شوق و جذبے خرم کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے تھے اس لیے جو بھی کمایا اس مقصد کے لیے بچالیا کہ جب خرم کے اور میرے درمیان حائل شدہ دیواریں زمین بوس ہو جائیں گی تو میں اپنی تمام تر جمع شدہ پونجی خرم کی خواہش کی نذر کرکے داد وصول کرلوں گی ان کے دل کی ملکہ بن جاؤں گی مگر اس وقت آپ کو ضرورت ہے تو پہلے آپ کی باری پھر خرم کی۔" وہ خوشی سے بول رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ کل وکیل کے پاس جا کر بات کرتے ہیں۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"ڈن۔" حدیقہ نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ڈن۔" اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "اتنا بڑا فیصلہ عورت کے مشورے کے بغیر کرنا کس قدر مشکل لگ رہا تھا۔ تم نے تو میری ہر مشکل کو آسان اور بے جا اندیشوں سے چھٹکارا دلا کر پرسکون کر دیا ہے۔ حدیقہ میں نے جب بھی اپنا کام اللہ پر چھوڑا ہے وہ چٹکی بجاتے پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے میں جو اک طویل عرصے کے لیے جاب لیس رہا اس کی وجہ میرا غرور و تکبر تھا۔ مجھے اپنی ڈگریوں پر بڑا مان تھا کہ دنیا کے کسی حصے میں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ جب میں نے معمولی سی نوکری پکڑلی اور میری "میں" کو دھچکا لگا اور میں صبر کر گیا تو رزق کے دروازے مجھ پر وا ہو گئے۔ آج اللہ نے تمہیں میرا وسیلہ بنا کر بھیج دیا۔ یو آر سو گڈ حدیقہ اتنی عقل مند اور دور اندیش ہونے کے باوجود ایک مرد کے ہاتھوں دھوکہ کھا گئیں حیرت کی بات ہے۔"

"بات یہ ہے کہ اس عمر میں ہر لڑکی احمق اور نادان بننا پسند کرتی ہے، بہت سے عیبوں پر چشم پوشی نہ کرے تو تاحیات کنواری ہی رہ جائے دوسرا سچ بتاؤں اس رشتے میں لالچ و طمع کی آمیزش بھی ناکامی کا سبب بنی پھر برکت اور رحمت کا دخل کیسے ہوتا؟" وہ ہنستے ہوئے سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"آج کی حدیقہ دوسروں کی شاطرانہ چالوں کی سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے اور خوش فہمیوں کی اڑان میں زخموں اور پچھتاووں سے نکلنے کی سچائی و حقیقت کو بھی بخوبی جانتی ہے اور دل میں کسی کو پالینے کا لالچ بھی نہیں رکھتی۔"

"اس کی تو مجھے خبر ہو چکی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں نے ایک سبق تو سیکھ ہی لیا ہے کہ چھوٹی موٹی عورتیں تاحیات بے وقوف بنتی ہیں۔ ایسے کردار ہمیں اس آزاد اور برابری کے حقوق کا پرچار کرنے والی

اس سوسائٹی میں بھی جگہ جگہ نظر آئے ہیں۔ خرم میرے ہوش و حواس پر ایسے مسلط رہتا ہے جیسے وہ مجھ سے دور گیا ہی نہیں اس امید پر زندہ ہوں کہ واپس نہیں لوٹے گا تو کہاں جائے گا۔ ماما معاف نہیں فرمائیں گی تو سکون سے کیسے جی پائیں گی۔ ہارون بھائی آپ دعا کریں یہ ہجر وصال کا روپ دھار لے۔" وہ مسرت بھرے لہجے میں بولی۔

"یادیں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ پھر بھی میں نے اپنی عزت نفس کو مد نظر رکھتے ہوئے صبرو تحمل اور امید و بیم کی دنیا میں اک طویل خاموشی اختیار کرلی ہے ہر لمحہ انتظار یار اور ہر آہٹ پر چونکنا معمول بن گیا ہے۔ مگر پھر بھی آج کی حدیقہ نے دوسروں کی مسکراہٹ میں اپنے لیے خوشیاں ڈھونڈنا چھوڑ دی ہیں اگر دوسرے میرے بغیر پرسکون اور مطمئن ہیں تو میرا رد عمل بھی کچھ ایسا ہی ہونا چاہیے جس کے لیے میں ہر وقت کوشاں رہتی ہوں کہ کہیں پھسل کر خود کو اتنا ہی ذلیل و خوار نہ کروں کہ خود سے آنکھ ہی نہ ملا سکوں۔ او ہو بات کہاں سے شروع ہوئی تھی کس جانب مڑ گئی۔"

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

"ہارون بھائی کل سے آپ سنجیدگی اور دل جمعی سے اس کام پر دھیان دینا شروع کریں۔ جس میں ہم دونوں کے لیے بے پناہ کامیابیاں پوشیدہ ہیں' وہ با اعتماد نظر آرہی تھی۔

"تم درست کہہ رہی ہو۔ میری ایک بات پر ذرا غور کرنا۔ تم جن خوش فہمیوں میں اپنی زندگی گزار رہی ہو یہ سراب سراسر دھوکا دینے والا ہے تڑپ کر مر جاؤ گی اس دن جب خرم کی طرف سے بے وفائی کا سندیسہ وصول کرو گی۔"

"ہارون بھائی! میں نے خرم سے پیار ہی نہیں عشق کیا ہے۔ اس عشق کی طاقت میں خرم کی ہر زیادتی کو سہہ گئی۔ ورنہ فیصلہ تو کب کا ہوچکا ہوتا۔" اس کے لہجے میں صداقت تھی۔

"حدیقہ ایک دن بہت پچھتاؤ گی۔ گزرا وقت لوٹنے سے رہا۔ تم اپنے بارے میں سوچو تمہاری عمر بڑھ رہی ہے آگے جارہی ہے۔" وہ نرمی سے بولا۔

"میں آپ کی بات کا مطلب سمجھتی ہوں۔ بے وفائی میری فطرت میں ہی نہیں میری ماما کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ وہ آج بھی پاپا کے لیے دروازہ کھلا رکھتی ہیں میں انہی کی بیٹی ہوں ہارون بھائی۔ خرم کے بغیر کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔" اس کا لہجہ مستحکم تھا۔ وہ اس وفا کی پتلی کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

دسمبر کی یخ بستہ صبح نمودار ہوئی۔ خرم شب بیداری کی وجہ سے ابھی تک سویا ہوا تھا۔ ماں آہستگی سے اس کے کمرے میں گئیں۔ اسے سوتا دیکھ کر وہیں کھڑی اسے تکنے لگیں۔ دل سے ہوک سی اٹھی۔ اس بھری جوانی میں احساس تنہائی سے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ ماستا دہائی دینے لگی۔ میں جلد از جلد اپنے بچے کے لیے دلہن لے کر آؤں گی۔

کاش میں نے پہلے ہی عقل مندانہ فیصلے کیے ہوتے تو آج نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ لے دے کے دو بچے نصیب ہوئے وہ بھی بدبخت ہی نکلے۔ دونوں کے ہنستے بستے گھر پل بھر میں اجڑ گئے۔ ہائے کسی حاسد کی نظر ہی کھا گئی ہے میرے گھر کے سکون و چین کو اور خوشیوں کو نگل لیا ہے حاسدوں نے اب پریشانی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ گناہ گار میں ہوں۔ دونوں بچوں کی یکجائی میں کس قدر خود غرضی کو مد نظر رکھا ہے میں نے۔ جب سب کچھ اجڑ گیا تو دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے جب انسانی فطرت کو پس پردہ ڈال کر اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جائے تو انجام روح فرسا اور بھیانک ہی ہوا کرتا ہے۔ وہ اس کے بے سکون چہرے کو دیکھ کر پچھتاوؤں اور حسرتوں کے سمندر میں غوطہ زن ہوگئی تھیں۔ انہوں نے اختیار ہوکر اس کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت ملائمت سے کہا۔

"بیٹا ٹائم دیکھو کیا ہورہا ہے؟ اٹھ جاؤ میرے چاند۔"

"ماں جی!" خرم اک معصوم بچے کی طرح کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔ "آج اسپتال نہیں جاؤں گا۔"

"اچھا تم آرام کرو۔" ماں نے اس کا کمبل درست کیا اور باہر نکل گئی۔ سامنے سے شیریں سے ٹکراؤ ہو گیا۔

"لاڈلے صاحب آج اسپتال نہیں گئے۔" وہ طنز سے بولی۔

"شاید طبیعت درست نہیں۔ میں نے پوچھا نہیں۔" ماں نے اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔

"ظاہر ہے طبیعت ناساز ہوگی میرے جانے کا سن کر۔" وہ پھر طنزیہ لہجے میں بولی۔

"کیوں طنز کے یہ نشتر چلا کر ہمیں مجروح کرتی ہو۔ تمہارے تو دونوں ہاتھ بھرے ہوئے ہیں وہ بے چارا تنہا کس کے سہارے زندگی گزارے گا۔ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ تو ہے نہیں کہ میں نصیحتوں اور وصیتوں کے درس کھول دوں۔" وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"اس کی بیوی کی وجہ سے میرا گھر برباد ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑا انصاف والا ہے۔ ماں جی آپ کے لاڈلے کا گھر بھی کبھی آباد نہ ہوگا۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"مان لیا کہ ہم مجرم ہیں۔ میں سزا کے لیے حاضر ہوں۔ سناؤ مجھے میری غلطیوں، کوتاہیوں اور بے جا خواہشوں کی سزا۔ اور جاؤ جا کر اپنا گھر بسالو۔ میری اور بھائی کی جان بخش کر مجھ پر احسان عظیم کرو۔ باقی رہی میری سزا تو میرے لیے تمہاری ناراضی اور جدائی ہی سزائے عظیم ہے۔ جس کو سہتے ہوئے میں اس دار فانی سے بہت جلد کوچ کر جاؤں گی۔" وہ زار و قطار رونے لگیں۔

"ماں جی! مجھے معاف کر دیں۔ غم میں نہ جانے مجھ سے گستاخی اور نافرمانی کیوں سرزد ہو جاتی ہے؟ مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ خفگی اور بددعائیں مجھے ذلیل و خوار کر دیں گی۔" وہ وہیں پر ماں کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"ماں جی آپ نے ہمارے لیے بہتر ہی سوچا تھا۔ کیا

میں اپنے بچوں کے لیے کوئی بھی غلط فیصلہ کرنے کا تصور بھی کر سکتی ہوں۔ ہرگز نہیں۔ ہم نصیب ہی ایسے لکھوا کر لائے ہیں اس میں آپ کا کیا قصور؟"

"اٹھو یہاں سے۔ مجھے مزید پریشان نہ کرو۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"میری جان میری روح کا سکون و چین۔ دونوں بہن بھائی ایک ہو کر اپنی زندگی میں درپیش آنے والے مسائل کو حل کرو دنیا کو تماشا دکھا کر خود کو بے عزت و ذلیل کرنا مناسب نہیں۔ چچے پہ تمہارا سسرال بستا ہے۔ جس دن ان کے کان میں تم دونوں کی نااتفاقی کی بھنک پڑ گئی۔ وہ بچے چھین کر لے جائیں گے۔"

"ان بچوں کی خاطر ہی تو یہاں سے بھاگ رہی ہوں ماں جی۔ میں اپنے جسم کے ٹکڑوں کو خود سے جدا نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنی تمام تر زندگی ان کے نام کر دی ہے۔" وہ ملے جلے جذبات میں بولیں۔

"بیٹا تم کیوں نہیں سمجھتیں؟ وہ بہت تنہا ہے۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولیں۔

"ماں جی آپ کیوں بھول گئی ہیں کہ میں آپ کی وہی شیریں ہوں۔ جس کا نام لیتے ہوئے آپ کے منہ سے دعائیں نکلا کرتی تھیں۔ یہ دونوں معصوم اب آپ کی توجہ سے بھی محروم ہو گئے۔ یہ وہی بچے ہیں ماں جی جن کے آرام کی خاطر آپ نے راتیں انہیں بہلاتے ہوئے گزاری تھیں۔ اب کیا ہو گیا؟ کہ میں بالکل ہی آپ کی اور خرم کی نظروں سے گر گئی ہوں۔ ایسا سلوک تو گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ جیسا آپ نے مجھ سے روا رکھا ہے۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"بیٹا تمہیں غلط فہمی ہے سب۔ تم تو مجھے پہلے سے بھی پیاری ہو گئی ہو۔ کیونکہ میں عورت ہونے کے ناتے جانتی ہوں تمہارے دکھ اور درد کو تمہاری محرومیوں اور ناکامیوں کو پھر کیوں تلخ مزاج بن گئی ہو۔ اک ان پڑھ عورت اور پڑھی لکھی میں یہی تو فرق ہوتا ہے کہ پڑھی لکھی عورت زندگی کو ہر زاویے سے دیکھنے کی اہلیت رکھتی ہے اسے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا آتا ہے وہ اپنی زندگی کو شک و شبے کے حوالے نہیں کر دیتی۔ خرم کے بارے میں دل صاف کر لو اور میری دعا ہے کہ ہارون جلد تم سے مل جائے وہ تمہارا ہی ہے اور تمہارا رہے گا۔" وہ سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"میرا دل اس کے لیے کیسے صاف ہو سکتا ہے؟ جس کی بیوی نے میرا گھر اجاڑ دیا اور ایک بے مثال خاوند کو اپنے ہاتھوں میں ایسا لیا کہ اسے مجھے چھوڑ کر جاتے ہوئے رتی بھر ہچکچاہٹ نہ ہوئی۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے درد و کرب سے بولی۔

"بیٹا کہیں تو تمہاری بھی غلطی ہو گی۔ ہارون جیسا لڑکا ایسی حرکت کر جائے مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ سوچتے ہوئے ناقدانہ انداز میں بولیں۔

"بس ماں جی آپ کو تو اپنی بیٹی میں دنیا بھر کے نقص نظر آنے لگے ہیں کیونکہ آپ کے در پر جو آ بیٹھی ہوں اب آپ کی اور آپ کے بیٹے کے پیار کی اصلی صورت سامنے آئی ہے۔ اپنے خاوند کا سہارا تھا تو میں کس قدر اہم تھی۔ وہ کیا گیا۔ گلیوں کے تنکوں سے بھی حقیر ہو گئی ہوں۔" وہ ابھی بھی روئے جا رہی تھی۔

"تم ذرا ٹھنڈی پڑو تو کچھ کہوں۔ بس ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو تمہانے یہ عادت تم نے کہاں سے لی ہے۔" وہ خفگی سے بولیں۔

"آپ میری کوئی بات سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔ بتائیں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ آپ کو میری سمپل سی بات سمجھنے میں اتنی مشکل کیوں درپیش ہے۔ ہم دو ہیں تو زمانہ ہمارے ساتھ ہے۔ اسے کہیں وہ میرے ساتھ واپس کینیڈا جانے کا پروگرام بنا لے اس صورت میں ہمارے لڑائی جھگڑے اختلافات بھی ختم ہو جائیں گے۔ بقیہ زندگی بھی اسکون و اطمینان سے گزر جائے گی۔" وہ سمجھاتے کے انداز میں بولی۔

"تو میرا کیا ہو گا؟ کیا اولاد اس دن کے لیے پروان چڑھاتے ہیں کہ بوڑھے کمزور اور لاغر والدین کو ٹھکانے لگائیں اور یہ جا وہ جا ہو جائیں۔" ماں غصے سے بولیں۔

"کم از کم مجھے تم سے ایسی توقع ہرگز نہ تھی۔ بیٹی تو

ماں کا اٹوٹ ساتھ ہوتی ہے۔ ماں کے دکھوں کو وہی تو محسوس کرنے کی ان دیدنی طاقت سے ہمکنار رہتی ہے۔ میرا بڑھاپا تو ذلیل ہی کر ڈالا ہے اولاد نے۔"

"آپ کو ساتھ لے جائیں گے ماں جی۔" شیریں ایک دم سے نرم پڑ گئی۔

میں اپنا گھر اپنا ماحول اپنے عزیز و اقارب چھوڑ کر تم لوگوں کے ساتھ چل پڑوں دن بھر منہ اٹھائے شام کا انتظار کروں۔ یہ زندگی تو نہ ہوئی۔" وہ طنز سے بولیں۔

"واہ بھئی واہ یہ خوب کہی ہے تم نے۔ پڑھ لکھ کر ہی گنوا بیٹھی ہو اپنی ضد اور خود غرضی میں بھائی کو اور مجھے اپنا نوالہ بنالو۔ یہی چاہتی ہو نا بہت خود غرض ہو گئی ہو۔ آج کے بعد ایسی بکواس مت کرنا۔ خود کو تو برباد کر ہی بیٹھی ہو۔ اب میرے بڑھاپے اور بھائی کی جوانی کو تباہ کر ڈالو۔" ماں جل کر بولیں۔

"تمام مسائل آپ سے شروع ہوتے ہیں اور آپ پر اختتام پذیر ہوتے ہیں اگر آپ دور اندیش ماں ہوتیں تو آج ہم دونوں بہن بھائی زندگی کے اس موڑ پر کھڑے نہ ہوتے۔" وہ جل کر بولی اور کمرے میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆
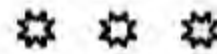
"حدیقہ مبارک ہو۔ آج سے ہم اس کمپنی کے مالک ہیں۔" ہارون نے خوشی سے مغلوب ہو کر کہا وہ سکتے کے عالم میں گنگ ہو چکی تھی۔

"تھینک یو حدیقہ۔ تم ہمت نہ کرتیں تو کچھ بھی ہونے والا نہیں تھا۔ ورنہ میں اس کمپنی میں تھرڈ کلاس ملازم ہی رہتا۔" وہ تشکر آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔

"آج اس کمپنی میں ہمارا پہلا مبارک دن ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاک نام سے کام شروع کرتے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"مجھے ابھی بھی یقین نہیں آرہا۔ دو فقیر آج اس کمپنی کے مالک کیسے بن گئے۔ آج بھی ہر ایک کی زندگی میں معجزات ہوتے ہیں فقط غور و فکر کی ضرورت ہے۔"

"باہمی اتفاق' بے غرض میل ملاپ اور سچی لگن میں کامرانی و شادمانی پوشیدہ ہے حدیقہ بیگم یہ اصول کبھی نہ بھولنا۔" وہ چھیڑتے ہوئے بولا۔

"جانتی ہوں۔ جانتی ہوں یاد دہانی کی قطعاً" ضرورت نہیں۔" وہ بھی خوشگوار لہجے میں بولی۔

"شیریں اور خرم اسپتال بنانے کا خواب دیکھ سکتے ہیں تو ہم کیوں پیچھے رہیں؟ بلکہ خواب ہم نے ان کے بعد دیکھا تعبیر میں ہم سبقت لے گئے۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"ایک ہفتے بعد میں مکمل طور پر آپ کو جوائن کرلوں گی۔ مجھے ہاسٹل چھوڑ کر اپنے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونا ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے کرایہ دیتے ہوئے بے پناہ تکلیف ہوگی۔"

"بہت کنجوس ہو۔ توبہ استغفار۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"ایسی نہ ہوتی تو آج اس کمپنی کے اونر کیسے بنتے؟" وہ فخر سے تن گئی۔

"تم تو سونے کا محل تعمیر کروا سکتی ہو اس طریقے سے۔ کتنا بد قسمت ہے خرم۔ ایسی بیوی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ انمول تحفہ ہوتی ہے۔ بے قدروں پر جان چھڑکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے حدیقہ۔ کس حصول کی توقعات پر اپنی جوانی گزار رہی ہو۔" وہ افسردہ ہو گیا۔

"میرا پیار ہے وہ میرا عشق ہے وہ میرا سب کچھ ہے۔" وہ نرمی سے بولی۔

"یہاں پر آکر بے وقوف عورت بن جاتی ہو۔" وہ مسکرانے لگا۔

"میں آپ کی طرح جذباتی ہرگز نہیں۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اور گھر سے نکل گئے۔ بیوی کو تو چھوڑو وہ معصوم بچے بھی نظر نہ آئے۔ کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے۔" وہ پژمردہ سی ہو گئی۔

"مجھے برا بھلا کہنے سے پہلے ماضی کے تمام حالات کو ایک بار کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ اس وقت تمہاری یادداشت گھاس چرنے جا چکی ہے۔" وہ بے حد نارمل لہجے میں بولا۔

"شیریں جیسی ڈکٹیٹر بیوی کے ساتھ ایک دن گزارنا بھی مشکل ہے۔ میں نے تو سات آٹھ سال گزار لیے۔ انعام کا حقدار ہوں۔ اور تم ہو کہ قصوروار مجھے ٹھہرا رہی ہو۔"

"آپ پر محض جذباتی ہونے کا الزام ہے۔ سچ ہے کہ آپ کی برداشت لاجواب اور لاثانی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"معاف کرنے کا اجر بہت اچھا ہے۔ کیا آپ شیریں کو واپس نہیں لا سکتے۔" وہ حسرت بھرے لہجے میں بولی۔

"ہاں ضرور لا سکتا ہوں اگر وہ بدل گئی ہو۔ ہاں بچے ہر وقت میرے ذہن اور قلب پر چھائے رہتے ہیں۔ انہی کی خاطر تو سب کچھ کر رہا ہوں تاکہ انہیں یہاں کی تعلیم دینے کے قابل بنا سکوں۔ ایک نہ ایک دن بچے ضرور میرے پاس ہی آئیں گے۔ شیریں کی رضامندی سے۔ آخر ان کا باپ ہوں بے حد پیار کرنے والا۔ اپنے بچوں کے مستقبل کو بہتر اور کامیاب بنانے میں ہر وقت کوشاں رہتا ہوں۔ ہاں البتہ شیریں سے مجھے بہت سی شکایتیں ہیں۔"

"یعنی آپ ان کے شکوک کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے بھی ایسا کچھ نہیں کریں گے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"تہمت کی جو مہر ہم دونوں کی پیشانی پر ثبت ہو چکی ہے۔ وہ بھلا کیسے مٹ سکتی ہے۔ خوش فہمیوں کی دنیا میں بسیرا کرنے والی عورتیں بھی حد درجہ کی عاقبت نا اندیش اور احمق ہوتی ہیں تمہاری طرح۔ ذرا منہ سے نکلی ہوئی بات کی واپسی کر کے دکھاؤ۔ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو آگے کے بجائے پیچھے کی جانب رخ کر کے دکھاؤ۔ تو میں تمہاری ہر بات مان جاؤں گا۔" وہ نرمی اور سختی کے ملے جلے جذبات میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر یہاں پچویشن بالکل مختلف ہے کیا خبر شیریں نادم ہو۔" وہ اپنی بات پر جمی ہوئی تھی۔

"تم اپنے دل کی دنیا سے باہر تو نکل کر دیکھو۔ دل ایک آئینے کی مانند ہے۔ جس میں اپنا چہرہ نیت کے مطابق کبھی دھندلا اور میلا اور کبھی شگفتہ اور حسین نظر آتا ہے۔ مگر افسوس کہ تم خود کو ہمیشہ بہت مثبت اور پرسکون پاتی ہو کیونکہ نیت اور ارادوں میں فتور نہیں۔ لوگ ایسے نہیں ہوتے۔ ان کے دل کی غلاظت میں وہ دوسروں کو بھی اپنے جیسا ہی تصور کیا کرتے ہیں۔ تم نے زندگی کے نشیب و فراز میں رہ کر بھی کچھ نہ سیکھا۔ مجھے نصیحتیں کرنے سے پہلے اپنے ماضی میں جھانک لو تو شاید مستقبل کے لیے تم کسی بہت بڑے المیے سے بچ جاؤ۔" وہ بہت سنجیدہ تھا۔

"دل کی نرمی تو خدا تعالیٰ کی دین ہے۔" وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ "اس نرمی کا خمیازہ بھگتو۔ میں اس میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔ وہ خفگی سے بولا۔ اور باہر نکل گیا۔

(باقی آئندہ)

غزالہ جلیل راؤ

زندگی کیا ہے؟ شاید ساحل کی ریت کی مانند جو مٹھی میں آتے ہی ہاتھ سے پھسل جاتی ہے یا پھر صحرا کا سراب جو دور سے کچھ اور نظر آتا ہے اور قریب سے کچھ اور تب ہی تو کسی نے کہا ہے کہ زندگی بلبلہ ہے پانی کا اور بلبلے کی حیثیت کیا ہے، ہوا کا کوئی بھی جھونکا اسے مٹا سکتا ہے مگر اسی ایک لمحے کو ہم کل کائنات سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اس کے سامنے ایک بہت بڑا نشان تھا۔

سوالیہ نشان۔۔۔؟

خاموش سوالیہ نشان؟ جیسے کوئی غریب شخص دسمبر کی کہر آلود رات میں بے سروسامانی کے عالم میں فٹ پاتھ پر گھٹنے سینے کے ساتھ لگائے ہوئے گردن آگے کو جھکی ہوئی، پینٹھ گول، مرا پڑا ہو۔ بالکل سوالیہ نشان کی طرح۔

خاموش، اکیلے پن پر نوحہ کناں۔

اکیلے پن کا ایک اپنا درد ہوتا ہے۔ کسی کے ساتھ ہونے کے باوجود اس خاموشی کا درد بالکل مختلف قسم کا ہوتا ہے۔ یہ محض درد ہی نہیں تھا کچھ اور بھی تھا۔ کچھ بہت بوجھل اور بے حس۔

مینا تھی شنید کی دوسری بیوی جو ان دونوں کے بیچ دیوار بن کر کھڑی رہی تھی پورے پانچ سال تک۔

انابیل سوچ رہی تھی اس سوالیہ نشان کو کیسے فل اسٹاپ کا نشان لگائے۔ وقت بہت ظالم شے ہے جو کبھی پکڑ میں نہیں آتا۔

کیا آج وہ اس کے سامنے کھڑی نہیں ہوئی۔۔۔؟

اس کے سامنے تو پوری زندگی ایک سوالیہ نشان رہی تھی۔

اور اب ان دونوں کے بیچ اس کی جگہ کہیں نکل آئی تھی تو کہاں؟ گیلی لکڑیوں کے دھوئیں جیسی اداسی چاروں جانب سے بھرنے لگی۔

رات لمحہ بہ لمحہ بیت رہی تھی کسی نل کے منہ سے "ٹپ ٹپ" کر کے گرتی ہوئی پانی کی بوندوں کی مانند۔ بے سہارا ٹپکتی ہوئی بوندیں جن کے بارے میں کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا ان کے ٹپکنے کا احساس کبھی رات کی خاموشی میں بہت شدت کے ساتھ ابھر کر آتا ہے۔ صاف اور تیکھا چمکدار اور نوکدار کبھی خاموشی میں کھو جاتا ہے، رات کی اور بہت سی آوازوں کے مانند جو ہوتی بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتیں اتنی لگاتار ہوتی ہیں اور یکساں کہ ان کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ لگتا ہے جیسے پانی کی بوندیں سینے کے اندر کہیں ٹپک رہی ہوں، جیسے ایک بہت بڑا سا بادل، دل کے اندر اتر گیا ہو اور اب "ٹپ ٹپ" برس رہا ہو۔

رات بیت رہی تھی۔ کتنی عجیب بات ہے وہی وقت ہوتا ہے جواب اس لمحے بیت ہی نہیں رہا تھا وہی وقت ہوتا ہے جس کو کل واپس نہیں لایا جا سکتا۔

رات کی تاریکی میں دبے پاؤں چلتا ہوا کوئی چہرہ پاس آ کھڑا ہوتا ہے اس چہرے کے کئی اینگل، کئی رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں کئی رنگوں میں گھرا ہوا چہرہ۔

شنید کو جب انہوں نے دیکھا تو یوں لگا جیسے کچھ دیر پہلے دل میں کروٹ لینے والی مسرتوں کے پھول ایک دم مرجھا گئے ہیں۔ وہ بھول گئی تھیں یہ دن کتنی منتوں مرادوں اور دعاؤں کے بعد آیا تھا یہ لمحے کتنی آرزوؤں کے بعد آئے تھے شنید کی صورت دیکھ کر انہیں انابیل

کے آنسو یاد آگئے اس کی آنکھیں جل تھل ہو رہی تھیں اس شخص نے ان کی لاڈلی ـــــ اور معصوم بیٹی کو کتنے غم دیے تھے۔ اسے دنیا کے سب سے بڑے صدمے سے دوچار کیا تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں جیسے آنے والے راستے پر رکھ دی تھیں۔ پانچ سال کہنے کو صرف دو لفظ تھے۔ مگر ان دو لفظوں نے ان کی بیٹی کو زندہ لاش بنا دیا تھا۔ ان پانچ سالوں نے قطرہ قطرہ اس کی زندگی کا رس نچوڑ لیا تھا اور درختوں کی شاخوں پر لٹکے ہوئے اوس کے قطرے کی طرح جو گرتے ہی مٹی میں جذب ہو جاتے ہیں یہ پانچ سال اس نے انگاروں پر لوٹ کر گزارے تھے اس کا وجود آبلہ آبلہ تھا اور جب اس میں شنید کے بغیر جینے کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا اس نے دل کے دروازے بند کر لیے تھے۔ صبر کرنا سیکھ لیا تھا تو وہ لوٹ آیا تھا۔ رات کے اندھیرے کو جیسے سحر اپنے اندر سمو لیتی ہے اور اجالا کائنات کو روشن کر دیتا ہے۔

"آؤ شنید آؤ۔"
"السلام علیکم امی۔"
"جیتے رہو۔ کیسے ہو بیٹا؟"
"اچھا ہوں ممی۔ آپ کیسی ہیں؟" وہ سامنے بیٹھتا ہوا بولا۔ یاسمین نے دیکھا وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ ان پانچ سالوں میں رتی بھر فرق نہیں آیا تھا۔ ان گزرے پانچ سالوں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا انہیں یوں لگا جیسے گزرا وقت ایک گلہری ہے جو سامنے بیٹھ کر دھوپ سینکتی ہے۔ ہوئی شے کو کترتی ہوئی لیکن جیسے ہی ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی کوشش کرو وہ بھاگ جاتی ہے۔ اس گلہری کی طرح شنید کو بھی وقت نے اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا۔ وہ اسی طرح گلاب کی طرح مہکتا ہوا تروتازہ تھا۔

یاسمین کو اپنی بے گناہ بیٹی کا مرجھایا ہوا چہرہ یاد آگیا ان پانچ سالوں میں تو وہ ختم ہو گئی تھی۔ سورج طلوع ہوتا ہے تو لگتا ہے ڈوبے گا ہی نہیں۔ رات ہوتی ہے تو لگتا ہے گزرے گی ہی نہیں۔ لیکن سورج بھی ڈوبا رات بھی گزری مگر بہت اذیتوں کے ساتھ۔ ان کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"کیا حال ہے شنید؟"
"جی ٹھیک ہے ممی۔"

یاسمین نے دوسری بار اس کا حال پوچھا تھا شاید ان کے پاس کچھ اور تھا ہی نہیں کہنے کو۔ وہ کچھ نادم تھا۔ وہ ان سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر رہا تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ یاسمین کو اس کے چہرے پر پھیلی ندامت دیکھ کر عجیب طرح کی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اطمینان مل رہا تھا۔ تب ہی فہد آگیا۔ وہ ٹھٹک کر دروازے میں ہی کھڑا رہ گیا تھا۔

یہ کیا۔ آج اتنے سالوں بعد معجزہ ہو گیا تھا۔ پانچ سال تک انہوں نے اس کے لوٹ آنے کا انتظار کیا تھا اور وقت کچھوے کی چال چل رہا تھا آہستہ رینگتا ہوا۔ پانچ سالوں بعد۔ آج پھر وہ اس گھر میں آیا ان کے گھر بیٹھا تھا۔ یوں لگا جیسے گزرا ہوا موسم لوٹ آیا تھا۔ دل ایک دم ہی خوشی سے بھر گیا تھا۔

انابیل کہاں تھی؟ کیا وہ شنید کی آمد سے بے خبر تھی؟ یا وہ ان کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی تھی؟ اس کے ذہن میں بے شمار سوال ابھر رہے تھے مگر ابھی تک کسی سوال کا جواب نہیں مل سکا تھا اسے۔

"آؤ فہد آؤ۔ دیکھو کون آیا ہے؟" یاسمین نے خوش ہو کر اسے پکارا۔ ان کی آواز خوشی اور حیرت سے لرز رہی تھی۔ جیسے خزاں کے موسم میں کسی شاخ پر آخری پتا لرزتا ہے۔ فہد نے شنید سے ہاتھ ملایا اور اس کے قریب اسی خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بات کرے؟

"آج آپ اس گھر کا راستہ کیسے بھول گئے شنید بھائی؟"
"میں انابیل کو لینے آیا ہوں۔"
"آہ۔" یاسمین کے لبوں سے نکلا اس فقرے کو تو سننے کے لیے ان کے کان ترس گئے تھے اور وہ آج اچانک چلا آیا تھا۔ ان کا دل چاہا اس سے پوچھیں آج پانچ سال بعد انابیل کو لینے کا خیال کیسے آگیا یوں اچانک ہی کہ وہ ورطہ حیرت میں ہی ڈوب گئیں۔ پھر ان کا دل چاہا وہ اٹھیں وضو کریں اور خدا کی بارگاہ میں سر بسجود ہو کر اس کا شکر ادا کریں۔

تب ملازمہ حنیفہ ناشتے کی ٹرالی لے کر آگئی۔ یاسمین نے اس سے کہا۔
"حنیفہ انابیل کو بھی یہیں بھیج دو۔"
"اچھا بی بی۔"
مگر انابیل نہیں آئی۔ حنیفہ جب ان کا پیغام لے کر اس کے کمرے میں گئی تو وہ بے حس و حرکت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔
"انابیل بی بی۔" وہ لیٹی رہی اس کی پوزیشن میں ذرا سی بھی جنبش نہ ہوئی۔
"تمہیں ناشتا کریں۔"
"ہاں۔" وہ چونک گئی۔ "کیا ہے حنیفہ؟"
"ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے بی بی۔" مگر ناشتے میں وہ ایک چیز بھی نہ لے سکی۔
اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا تو اس کے ہاتھ

لرز رہے تھے۔ اس کا پورا وجود ٹھنڈا ہو رہا تھا جیسے برف کی سل ہو۔ حنیفہ ناشتا رکھ کر چلی گئی تھی۔ اسے چائے کا ایک کپ ہی بنا دیتی مگر آج جیسے حنیفہ کے پاس بھی اس لیے وقت نہیں تھا آج وہ انابیل کو اصرار کرکے ناشتا نہیں کھلا رہی تھی۔ آج تو شنید صاحب گھر آئے تھے وہ اس کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی آج وہ اس کے مہمان تھے اور وہ اس کی میزبان وہ شنید کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی آج اس نے ناشتے پر بے پناہ اہتمام کر رکھا تھا۔ مختلف چیزوں سے میز بھری ہوئی تھی مگر شنید کچھ نہیں لے رہا تھا۔ بار بار نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ بے قراری سے پہلو بدل رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کن سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ آخر یاسمین نے اس کی مشکل آسان کردی۔

"شنید تم اپنے کمرے میں جاکر آرام کرو۔" اور وہ یوں کھڑا ہو گیا جیسے یاسمین کی اجازت کا ہی منتظر تھا۔

فہد خدا حافظ کہہ کر آفس چلا گیا تھا اور تب یاسمین نے دیکھا وہ بھی کچھ کھا کر نہیں گیا تھا سب کچھ یوں ہی پڑا تھا۔ وہ صرف دودھ کا ایک گلاس پی کر چلا گیا تھا آج تو کسی کا بھی کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ انہوں نے بھی صرف چائے کا ایک کپ ہی پیا تھا۔

شنید اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور وہ گہری سوچوں میں ڈوب گئیں وہ بہت خوش تھیں کہ شنید آگیا ہے وہ انابیل کو لینے آیا ہے۔ اب انابیل اپنے گھر چلی جائے گی مگر وہ اس کی دوسری بیوی کہاں تھی۔ اس کا کیا بنے گا؟ شنید کو آج اچانک انابیل کا خیال کیسے آگیا تھا۔

ان کا دل اندیشوں میں ڈوب گیا کہیں پھر۔ دوبارہ انابیل کے ساتھ وہی کھیل نہ کھیلا جائے۔

اتنے میں حنیفہ نے ان کو فیصل صاحب کے آنے کی خبر دی وہ چند دنوں کے لیے لندن سے بزنس ٹور پر آئے ہوئے تھے۔

"ارے فیصل بھیا آبھی گئے۔ ابھی تو فون کیا تھا ان کو میں نے۔" وہ خوشی سے دیوانی ہوتی جارہی تھیں۔

انہیں شنید کے آنے کی خوشی میں کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلیں۔ فیصل یاسمین کو دیکھ کر چونک گئے خوشی کے رنگوں سے ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔

آج ان کی آنکھوں میں کیسی چمک تھی وہ چپ تھیں مگر ان کا سارا وجود بول رہا تھا کہ وہ بے پناہ خوش ہیں۔

"کیا بات ہے یاسمین آج تم اتنی دیوانی کیوں ہوئی جارہی ہو خوشی سے۔" انہوں نے فون پر جلدی آنے کے لیے کہا تھا۔ شنید کا نہیں بتایا تھا۔ وہ اچانک شنید کے آنے کی خوش خبری سنانا چاہتی تھیں۔

"وہ آج شنید آیا ہے نا۔"

"شنید؟ کون؟ اپنی انابیل کا شوہر؟"

"ہاں۔"

"واقعی۔۔۔؟"

"ہاں بھیا وہ اسے لینے آیا ہے۔"

"اچھا واقعی یہ تو تم نے بہت اچھی خبر سنائی۔"

"کہاں ہے شنید۔۔۔؟"

"اپنے کمرے میں ہے۔"

"انابیل تو بہت خوش ہوگی۔"

"معلوم نہیں۔ میں نے تو صبح سے اسے دیکھا ہی نہیں۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"وہ پہلے میں شنید کے پاس بیٹھی رہی وہ گیا تو آپ کا انتظار کرنے لگی اور ویسے بھی میں اسے ریلیکس ہونے کے لیے وقت دینا چاہتی ہوں۔"

"اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں معلوم۔" یاسمین نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حقیقت میں انہیں کچھ معلوم بھی نہیں تھا۔

شنید کے آنے کی خوشی میں یاسمین اپنی جگہ سے اٹھ ہی نہ سکیں ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور پھر جیسے آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی۔

"یہ کیا کررہی ہو تم یاسمین۔" فیصل نے انہیں

ڈانٹا۔ وہ دھیرے سے ہنسیں۔ آنسوؤں پر جیسے ان کا اختیار نہ رہا۔

"یہ کون سا موقع ہے رونے کا یاسمین۔۔۔؟"

"میں رو نہیں رہی بھیا۔ یہ تو وہ سمندر ہے جو پانچ سالوں سے اپنے سینے میں چھپا رکھا تھا اسے بہہ جانے دیجیے۔"

"تو خوشی کے آنسو ہوتے ہیں دریا نہیں یاسمین سمجھیں اور تم دریا بہانے پر تلی تھیں۔" انہوں نے یاسمین کے سر پہ چپت لگاتے ہوئے کہا۔

دونوں بہن بھائیوں میں بہت پیار تھا۔ ہر دم ایک دوسرے کے لیے جان دینے پر تیار رہتے تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یاسمین بہت چھوٹی تھی جب والدہ کا انتقال ہوا۔ تقریباً" فیصل نے ہی پالا تھا یاسمین کو وہ یاسمین سے دس سال بڑے تھے وہ ہی بہن بھائی تھے' والد صاحب کی آنکھوں کا تارا اور دل کا چین۔ وہ ہی روایتی کہانی دہرائی جا رہی تھی مگر ہاشم نے دوسری شادی سے انکار کر دیا جانے دوسری عورت کیسی ہو' بچے بھی دور ہو جائیں ان سے۔ ہاشم صاحب بہت بڑے بزنس میں تھے۔ ملازموں سے گھر بھرا پڑا تھا لیکن بچوں کے لیے انہوں نے ایک بہت اچھی تعلیم یافتہ ہمدرد خاتون کو رکھ لیا جو بیوہ تھی اور اس کے سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ انہوں نے اخبار میں اشتہار دیا تھا اسے دیکھ کر وہ آئی تھی۔ گلشن کی گود خالی تھی' مگر دل ممتا کے جذبے سے تڑپ رہا تھا۔ ان دونوں کو اپنی آغوش میں لیا تو اپنے ہی بچے لگے۔ دونوں تھے بھی بہت کیوٹ سے۔ گلشن نے [illegible] کے سارے جذبے دونوں پر نچھاور کر دیے۔ بہت اچھے انداز میں ان کی تربیت و پرورش کی۔

☼ ☼ ☼
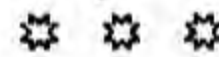
شنید اس کے قریب بیٹھا چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوسوں دور چلی گئی ہو۔ گزرے پانچ سالوں نے ان کے درمیان ناقابل عبور فاصلے پیدا کر دیے تھے۔ لگتا تھا۔ ایک ہی چھت تلے دو اجنبی بیٹھے تھے۔

شنید نہیں جانتا تھا کہ یہ دن جب آئے گا تو اسے اذیت سے گزرنا پڑے گا۔ وہ تو سمجھتا تھا جب چاہے گا جا کر اپنی انابیل کو منا لے گا۔ اسے پا لے گا' مگر اس وقت' اس لمحے اس سے بات کرنا بھی کتنا مشکل لگ رہا تھا۔ وہ بلک رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی اور شنید بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ زندگی کے فریم میں نظر آنے والا چہرہ شنید کا تھا۔

انابیل کے آنسوؤں نے اس پر احساس و آگہی کے سارے در وا کر دیے تھے۔ اس دن اسے پتا چلا کہ ان پانچ سالوں میں اس پر کیا گزری تھی؟ بہت ساری اداسی اس کے اندر خالی ہوا کی طرح بھرنے لگی۔ ایسی ہوا جس میں کالا اندھیرا بھرا ہوا تھا۔ آج وہ یہ جان گیا تھا کہ یہ پانچ سال اس نے کس آتشکدے میں گزارے تھے؟ اور ان آنسوؤں نے تو اور آگ بھڑکائی تھی اور پھر آنسو شنید کی آنکھوں سے بھی رواں ہو گئے تھے وہ اس کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھے رو رہا تھا۔ خاموشی ان کے بیچ ٹھہری ہوئی' بے حس و بوجھل' بے بس خاموشی۔

اور انابیل سوچ رہی تھی' کیا یہ لمحے رونے کے لیے تھے؟ آنسوؤں میں بہہ جانے کے لیے تھے وہ رو رہی تھی' مگر اس کے اندر جیسے گھٹن کم ہو رہی تھی جیسے اندر سکون اتر رہا تھا۔ قطرہ قطرہ خوشی سے اس کا دل بھر رہا تھا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ کمرے اندھیرے جیسے کونے کھدروں میں کہیں بکل مار کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ کچھ سوچ سمجھ نہیں رہی تھی۔ صرف شنید کے آنے کا احساس باقی رہ گیا تھا۔ وہ اس کے جذبوں کی شدت کے سامنے اس کی محبتوں میں ڈوب گئی تھی' مگر جب شنید نے حدیں توڑنا چاہیں تو وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔

"نہیں شنید نہیں۔" اور پھر وہ زار و قطار رو دی۔

گلاب کی پتیوں کی طرح بکھر گئی کہ شنید پریشان ہو گیا لمحے خاموشی کے ساتھ بیت رہے تھے وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔ خاموش لمحہ ان کے بیچ رکے ہوئے سانس کی طرح کھڑا تھا۔

"لتا..." اس کے لہجے میں جذبوں کی شدت تھی۔ اس نے بھیگی آواز میں پکارا۔

"لتا کیوں رو رہی ہو۔ میں جانتا ہوں میں نے تمہیں بہت دکھ دیے ہیں۔ صدمہ پہنچایا ہے۔ مگر میں مجبور ہو گیا تھا۔ مجھے معاف کردو۔ خدا کے لیے۔ اس کی رضا کے واسطے۔" تنہائی میں گونجتی ہوئی آواز درودیوار سے ٹکرائی۔ اس کی آواز جذبوں کی شدت کا احساس دلا رہی تھی، لیکن خاموشی لتا کے لبوں پر بیٹھی راج کررہی تھی اناہیل نے سوچا۔

"شنید جب مرد مجبور ہو جائے تو عورت اس کی مجبوریوں کے ساتھ ہمیشہ سمجھوتہ کرلیتی ہے اور اسے معاف بھی کردیتی ہے۔ میں بھی تمہیں معاف کردوں گی۔ کیونکہ میں آج بھی اتنی ہی شدتوں سے چاہتی ہوں۔ سوا یہ دن اس میں کمی نہیں اضافہ ہی ہوا ہے کہ اس کے بغیر چارہ بھی تو نہیں شنید۔ مگر شنید تم پہلے ان پانچ سالوں کی بے شمار راتوں کی داستان بھی تو سن لو۔ ان رتجگوں میں تمہیں آنسوؤں کے چراغ ہر طرف جلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس چراغ میں تم میرے دل کے زخم دیکھ لو۔ ان چراغوں میں تیل نہیں میرے دل کا لہو جل رہا ہے شنید اور آنسوؤں کی اس دیوالی میں تمہارا عکس ہر طرف جھلملا رہا ہے۔ اپنا عکس تو دیکھ لو۔ آج تم ان چراغوں کو بجھانے آئے ہو۔ تو سمجھتے ہو کہ سارے چراغ ایک دم بجھ جائیں گے۔ کانٹے چننے کے لیے تو ایک عمر درکار ہوتی ہے میری جان اور تم پھولوں سے اتنی جلدی دامن بھر لینا چاہتے ہو۔ بہت جلدی میں ہو شنید۔ بہت نادان ہو۔

دو عورتوں کے مالک ہو اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ عورت اپنا آپ خوشی سے مرد کے حوالے کب کرتی ہے؟ دل میں بال برابر بھی خراش آجائے تو عورت ایک سرد خانہ بن جاتی ہے۔ محبت کی چنگاری اسی وقت شعلہ سی ہے جب اس کا دل آئینے کی طرح صاف ہو اور تم... تم میرا دل چکنا چور کرکے سمجھ رہے ہو میرے تن کی سرد انگیٹھی اتنی جلدی دہکا لوگے بے وقوف۔ کیا ٹوٹے ہوئے دل اتنی جلدی جڑ جاتے ہیں کبھی شیشے کو جڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیا سرد لاش میں اتنی جلدی زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں؟"

اور ان لمحوں میں گزری ساعتوں کا موسم جیسے ٹھہر گیا تھا۔ خزاؤں پر اتنی جلدی بہار کیسے آسکتی تھی؟ اور آنسوؤں کی برسات میں شنید کا تن من بھیگ گیا تھا۔ جانے کون سے پہر سے بادل چھائے تھے کہ اب رم جھم برسات ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

فہد ماں کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی ماں نے اس غم کو تو بڑے حوصلے سے برداشت کرلیا تھا مگر اس خوشی کو ان کا کمزور دل سہار نہیں سکے گا اور وہ ہی ہوا۔

یاسمین بستر پر پڑی تھیں۔ اس درخت کی مانند جو آندھیوں اور طوفانوں میں اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑا رہتا ہے مگر بھری بہار میں ایک صبح اچانک گر جاتا ہے کیونکہ اس کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

اس نے ماں کو تسلی دی۔ بلڈ پریشر چیک کیا جو خطرناک حد تک شوٹ کر چکا تھا۔ اس نے دوا دی اور انہیں سونے کی ہدایت کرتا ہوا ان کے کمرے سے آگیا تب اسے معلوم ہوا کہ شنید آج ہی اناہیل کو اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہا ہے۔

"نہیں۔" وہ بے قرار ہو گیا۔

"آج اسے مت لے جاؤ۔ آج ممی کو ڈسٹرب نہ کرو۔ آج انہیں آرام کرنے دو۔ آج وہ آرام کرلیں گی تو کل بہت خوش خوش اپنی بیٹی کو رخصت کریں گی۔" فہد اناہیل کو دیکھ کر چونک گیا۔ یہ عورتیں بھی کیا چیز ہوتی ہیں؟ نہ غم انہیں راس آتے ہیں اور نہ خوشیاں ایک خوشی ملتی ہے تو دس غم جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ جانتا تھا۔ اس کی بہن خوش نہیں تھی۔ وہ خوش رہ بھی نہیں سکتی تھی۔ دوسری عورت کی موجودگی میں وہ کس طرح خوش رہ سکتی ہے؟

وہ جو شنید کی بلا شرکت غیرے مالک تھی۔ آج وہ کس طرح برداشت کرسکے گی کہ شنید کسی اور کا بھی ہو عورت سب کچھ برداشت کرسکتی ہے مگر محبت میں

تقسیم برداشت نہیں کر سکتی۔ اب وہ شنید وہ شنید نہیں تھا۔ وہ بٹ چکا تھا۔ ایک دوسری عورت بھی اس کی حصے دار تھی اور وہ عورت انابیل کی سوتن تھی اور سوتن کو برداشت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے اور وہ جانتا تھا اس صورت حال سے سمجھوتہ کرنے کے لیے ابھی بہت وقت لگے گا وہ جانتا تھا کہ یہ تو ساری عمر کا روگ تھا۔ ساری عمر کا کڑھنا تھا۔

وہ عورت ننگی تلوار بن کر انابیل کے سر پر لٹک رہی تھی اور اسے اپنی پیاری بہن پر بڑا ترس آرہا تھا یہ تقدیر اسے کس موڑ پر لے آئی تھی؟

اور جب اسے پتا چلا کہ انابیل بھی آج ہی جانا چاہتی ہے تو اسے اپنی بہن بہت بلند، بہت اونچی نظر آئی۔ اتنی اونچی کہ اس کے سامنے سب کا وجود چھوٹا ہوگیا۔ فہد کو گہری سوچوں میں دیکھ کر انابیل نے کہا۔

"تم نہیں جانتے میرے بھائی۔ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟ ممی کو اب اور دکھ نہیں دے سکتی میں اپنی انا کے شیشے سے انہیں مزید زخمی نہیں کر سکتی۔ اپنی خودداریوں کو بالائے طاق رکھ کر میں جارہی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں عورت کا گھر اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے اور ممی مجھے وہیں پر دیکھنا چاہتی ہیں کہ میرا اصلی مقام بھی وہی ہے اور تمہیں کیا معلوم کہ بعض اوقات اپنے مقام تک پہنچتے پہنچتے پاؤں لہو لہان ہوجاتے ہیں۔ دل چھلنی ہوجاتے ہیں اور میری روح بھی زخم زخم ہے۔ مجھے جانے دو بھائی مجھے مت روکو۔"

اور وہ ماں کے کمرے میں آگئی۔ وہ جاگ رہی تھیں۔ اندیشے بھلا کہاں سونے دیتے۔ وہ جانتی تھیں ان کی پیاری اور دکھی بیٹی اس گھر میں چند گھڑیوں کی مہمان تھی۔ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔ شنید بھی وہیں آگیا تھا اور پھر فہد بھی ماں کے کمرے میں چلا آیا۔ فہد نے شنید سے ہاتھ ملایا۔ وہ نادم نادم سا تھا۔ وہ بھی خوش نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر گزری رات کی ندامتیں اور ملامتیں تھیں۔

فہد کا جی چاہا وہ اس سے کہے بڑے سالوں کے بعد انابیل کا خیال کیسے آگیا؟ مگر اس نے بالکل ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔

"اب آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"کوئی نہیں۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

"کیا مطلب؟" سب ہی چونک کر رہ گئے۔ یہ تو کسی کو خیال ہی نہیں آیا تھا۔

"کیا دوسری بیوی سے بھی اس کا کوئی بچہ نہیں ہوا تھا؟" یاسمین نے سوچا۔

"سوچ لیجئے شنید بھائی۔" فہد طنز کے ساتھ بولا۔ "کبھی آپ کو تیسری شادی کی ضرورت پیش آئی تو انابیل کو پھر گھر سے بے گھر نہ ہونا پڑے۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" وہ اضطراب میں کھڑا ہوگیا۔ "اب ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔"

"آپ انابیل کو لینے تو آگئے ہیں مگر کبھی آپ نے سوچا کہ دو عورتیں کس طرح رہیں گی؟ اگر انابیل اس عورت کے ساتھ گزارہ نہ کر سکی تو۔۔۔؟"

"انابیل کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ بے فکر رہیے۔" اس کے لہجے میں برف جیسی پگھلی ہوئی منت تھی۔ یاسمین نے سوچا۔

"مرد کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا کہ عورت کے لیے اس کے شوہر کی دوسری بیوی کتنی تکلیف دہ حقیقت ہے۔ تم کبھی بھی نہ جان سکو گے کہ تمہارے گھر میں اب اسے کتنی تکلیف ہوگی۔ وہ اب چین سے کبھی بھی نہ رہ سکے گی۔ فقط سکون تو اس کے صفحہ حیات سے نوچ کر پھینک دیا گیا ہے۔"

انابیل کھڑی ہوگئی۔ شاید اسے بھائی کی صاف کھری اور دوٹوک باتیں اچھی نہیں لگی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی شنید کے ساتھ کوئی سخت لہجے میں بات کرے۔

"انابیل الگ گھر میں رہے گی۔ بالکل اسی طرح۔" اس نے کہا۔

"اور آپ دو گھروں میں کس طرح رہیں گے؟" انابیل نے سوچا۔

"مرد تو یقیناً" بہت خوش ہوتا ہوگا۔ دل بہلانے

کے لیے دو عورتیں موجود ہوں۔ تو مرد کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔" اس کی سوچیں گہری ہوتی جا رہی تھیں اس کا دل چاہا شنید کے ساتھ جانے سے انکار کر دے۔ مگر وہ ماں کے قریب آ گئی۔

"اچھا ممی اب اجازت دیجیے۔ اب ہم چلتے ہیں۔ خدا حافظ۔"

"اچھا بیٹی جاؤ۔ فی امان اللہ۔"

انابیل کو رخصت کر کے وہ بہت روئیں۔ کاش حالات پہلے جیسے ہوتے تو آج وہ انابیل کو رخصت کر کے کتنی خوش ہوتیں، مگر اس صورت حال کے لیے پہلے سے تیار نہیں تھیں وہ۔ اس کے لیے تو انہیں پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہونا چاہیے تھا۔ قبائلی سرداروں، جاگیرداروں اور نوابزادوں کی تو کئی کئی بیویاں ہو سکتی ہیں۔ یہ لوگ تو کئی کئی شادیاں رچا سکتے ہیں کاش اس نوابزادے کی بیوی یاسمین کی بیٹی نہ ہوتی تو شاید آج یہ دکھ وہ نہ دیکھتیں۔ کاش وہ کسی غریب، مگر غیرت مند اور بہت محبت کرنے والے کسی قدردان شخص کے ساتھ انابیل کو بیاہ سکتیں۔ تو آج وہ کتنی خوش ہوتیں اور وہ خود کتنی سکھی ہوتی۔

کسی نے کتنا سچ کہا ہے۔ جس کی بیٹی خوش ہو اس کی ایک نسل خوش ہوتی ہے۔ مگر دل کو ایک اطمینان سا تھا کہ وہ اپنے گھر چلی گئی تھی اور پھر وہ شنید سے محبت کرتی تھی اور محبت کرنے والوں کے مقدر میں تو دکھ اٹھانا لکھا ہے اور زندگی میں اندھیرے خرگوش کی طرح چھلانگ مار کر خود بخود آ جاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

میٹرک کا امتحان دے کر جب وہ فارغ ہوئی تو زندگی میں پہلی مرتبہ اسے پتا چلا کہ پاپا اور ممی میں انڈر اسٹینڈنگ قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔

اسے بے حد دکھ ہوا۔ کتنی عجیب بات تھی نا کہ اسے آج تک پتا ہی نہیں چلا تھا کہ ایک چھت تلے رہتے ہوئے بھی ان کے درمیان میلوں کا فاصلہ تھا۔

ان کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا ان کی مصروفیات، پسند ناپسند حتیٰ کہ دوست بھی الگ الگ تھے۔ ایسا کیوں تھا اور کب سے تھا؟ وہ جان ہی نہ سکی۔ اپنی پڑھائی میں کھو کر اسے کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ گھر میں جو ایک سرد سی اجنبیت سناٹا بن کر چھائی رہتی تھی۔ وہ پاپا اور ممی کی وجہ سے تھی۔ کوئی مہمان آ جاتا تو یہ جمود ٹوٹ جاتا۔ گھر کا ماحول ایک دم بدل جاتا۔ پاپا بے حد خوش نظر آتے اور ممی بھی خوش اخلاقی کا لبادہ اوڑھ لیتیں ورنہ تو اکثر انہیں غصہ ہی چڑھا رہتا یا پھر وہ خاموش رہتیں۔

فہد کی پاپا کے ساتھ کافی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ وہ اکثر پاپا کے ساتھ ضد کر کے چلا جاتا۔ بچوں کے لیے تو ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ اگر ان دونوں بہن بھائیوں کو پڑھنے کا شوق نہ ہوتا تو نالائق طالب علموں کی فہرست میں ان کا نام ٹاپ پر ہوتا اگرچہ دونوں کو بہت زیادہ نظر انداز کیا گیا تھا، مگر پاپا جب گھر پر ہوتے تو سارا وقت ان دونوں کو دیتے اور ممی بھی کبھار کچن میں مصروف دکھائی دیتیں۔ ورنہ تو سب کچھ ملازم ہی کرتے تھے۔

انابیل بڑی تھی اور فہد چھوٹا تھا۔ میٹرک میں اس کے فرسٹ کلاس فرسٹ نمبر تھے اور اسے ایف ایس سی میں داخلہ مل گیا تھا۔ اور یہ انکشاف انابیل پر پہلی مرتبہ ہی ہوا تھا کہ ممی اور اس کے بیچ بے حد اختلافات ہیں اس کی ہر بات پر انہیں اعتراض ہوتا۔ اس کے ڈریسز، اس کے طریقہ زندگی، اس کے ہیر اسٹائل پر، اس کے چشمہ لگانے پر۔ یہ اس کا قصور تو نہیں تھا کہ میٹرک کے بعد اسے عینک لگ گئی تھی وہ بچپن سے کتابی کیڑا تھی اور میٹرک کے بعد زندگی میں پہلی مرتبہ اسے فراغت ملی تھی۔ پاپا کی کتابوں کی بے حد اچھی کولیکشن تھی اور اس طرح پاپا کے ساتھ اس کی دوستی کا آغاز ہوا جس پر ممی کو سخت اعتراض تھا اور اس نے محسوس کیا پاپا کے قریب آ کر وہ ممی سے اور بھی دور ہو گئی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا۔ اکثر ممی سب کے سامنے ہی اسے ڈانٹ دیتیں۔

"یہ کیا سر جھاڑ منہ پہاڑ چلی آرہی ہو کبھی کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہن لیا کرو۔"

"اتنے کس کے بال بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ کبھی انہیں کھلا بھی چھوڑ دیا کرو۔"

"ہر وقت عینک کیوں لگائے رکھتی ہو؟" اب وہ کیا کرتی کہ ہر وقت اسے پڑھنے کی عادت تھی۔ اس لیے عینک لگانی پڑتی تھی ورنہ اس کی دور کی نظر تو ٹھیک تھی۔

شوخ رنگوں سے اسے سخت چڑ تھی اور ممی کو اس کے ہلکے رنگوں کے ڈریسز پر بے حد اعتراض تھا۔ اوٹ پٹانگ فیشن اسے پسند نہیں تھے۔ جیولری وہ بالکل استعمال نہیں کرتی تھی۔ کانوں میں بالیاں تک نہیں پہنتی تھی۔ بقول ان کے کانوں کے سوراخ بند ہوجائیں گے اور وہ کبھی ان سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کانوں کے سوراخ بند ہوجانے سے قیامت تو نہیں آجائے گی۔

وہ انہیں خوش تو کبھی بھی نہیں کرسکتی تھی اس لیے انہیں ناراض بھی نہیں کرسکتی تھی۔ پاپا جو دیکھنے میں بے حد نرم مزاج نظر آتے تھے۔ ممی سے بات کرتے وقت ان کا انداز اور لہجہ بدل جاتا تھا۔ ممی اگر خاموش رہتیں تو عافیت سے وقت گزر جاتا ورنہ گھر کا ماحول بے حد ٹینس ہوجاتا۔ وہ حیران ہوکر سوچتی۔

پتا نہیں اتنے سال انہوں نے اکٹھے کس طرح گزار لیے تھے؟ آخر سترہ سال کم عرصہ تو نہیں ہوتا۔ شاید وہ زندگی میں کبھی کسی معمولی نقطے پر بھی متفق نہیں ہوئے تھے اور ستم یہ کہ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ ایک مثالی جوڑا ہے۔ شاید اس لیے پاپا بے حد ہینڈسم تھے اور ممی بے پناہ حسین، اسمارٹ اور خوش لباس۔ اور دونوں بچے ان کا خوب صورت امتزاج تھے۔

☼ ☼ ☼

شہر سے دور ایک بہت خوب صورت ٹاؤن بنا تھا جس میں آرمی، پولیس اور بزنس لوگوں کے بنگلے تھے وہ لوگ بھی اس علاقے میں شفٹ ہوگئے۔ وہ نئے بنگلے میں شفٹ ہوئے تو ساتھ والے بنگلے میں ریٹائرڈ کرنل بابر رہتے تھے جس دن وہ لوگ آئے تھے آتے ہی انہوں نے بہت اچھی چائے بجوائی تھی اور وہ لوگ پہلے ہی دن ان کے خلوص کے قائل ہوگئے تھے۔ پھر شام کو آنٹی طاہرہ خود ملنے آئیں۔

"رات کا کھانا آپ ہمارے ہاں کھائیں گے۔"

انابیل کو وہ بے حد پسند آئیں۔ بے حد سادہ اور پروقار سی خاتون۔ پرنٹڈ کریپ کے سوٹ میں ڈھیلا سا بالوں کا جوڑا بنائے۔ وہ کتنی اچھی لگ رہی تھیں میک اپ جیولری سے بے نیاز چہرہ کتنا تروتازہ، پروقار اور خوب صورت لگ رہا تھا۔

ممی ان سے بہت اخلاق سے ملیں۔ رات کے کھانے کی دعوت آنٹی طاہرہ دے گئی تھیں۔ یہ بھی راہ رسم بڑھانے ملاقات کا بہانہ ہوتا ہے۔

رات کو وہ لوگ ان کے گھر گئے تو انابیل کو ان کا گھر بھی بہت اچھا لگا۔ سادہ اور بے حد صاف ستھرا۔ ان کا ذوق ہر چیز سے نمایاں ہو رہا تھا۔ بہت ہی خوب صورت ڈرائنگ روم تھا ان کا۔ عام لوگوں کے مقابلے میں سادہ اور مختصر۔ انکل بابر بھی بہت اچھے اور محبت کرنے والے مخلص انسان تھے۔ مگر یہ جان کر اسے دکھ ہوا کہ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ صرف دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا شنید علی جو انجینئرنگ کالج میں سیکنڈ ایئر میں تھا اور چھوٹا بیٹا شہروز علی اولیول کر رہا تھا۔

شنید تقریباً" چھ فٹ تھا خوب صورت ہیئر اسٹائل اور کلین شیو لائٹ پرپل شرٹ اور بلیک پینٹ میں بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ شہروز، فیروزی شلوار قمیص میں سیاہ واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ دونوں بھائی تقریباً" ہم شکل اور دراز قد بھی تھے۔ پاپا اور ممی دونوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

پڑھائی کی وجہ سے شنید ہوسٹل میں رہتا تھا اور ویک اینڈ پر گھر آتا تھا۔ صورت ہی سے لائق فائق لگ رہا تھا۔ انابیل سر جھکائے کسی میگزین کی ورق گردانی کررہی تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا اگر اپنی عینک لے آتی تو کچھ پڑھ لیتی۔ اب تو صرف ہیڈنگز ہی پڑھ سکتی

تھی۔ ممی نے عینک رکھنے ہی نہیں دی تھی۔ آنٹی طاہرہ نے کھانا بہت مزے کا بنایا تھا۔ کھانے کے دوران مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں۔ شنید معذرت کر کے اٹھ گیا تھا کیونکہ اسے کل کے ٹیسٹ کی تیاری کرنا تھی۔ اس کے جانے کے بعد اناتبیل نے سوچا کیا شاندار شخصیت ہے اس لڑکے کی ابھی سے اور پھر اس کی آواز۔ بار بار سوچ اس کے ذہن سے لپٹ رہی تھی۔

"اس کی آواز میں کیا بات تھی؟ بہت بھاری' بوجھل آواز۔ ایسی آواز جو دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دے۔"

ایسی آواز آج تک اس نے نہیں سنی تھی۔ وہ چلا گیا اور اس کا وجود اس کی آواز کے خوب صورت سحر میں ابھی تک گرفتار تھا۔ شہوز سے باتیں کر رہی تھی اور سوچ اس کے بارے میں رہی تھی اور پھر وہ ساری رات بھی جیسے اسی سحر میں جکڑی رہی۔ اس کے بارے میں سوچنا اچھا لگ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی سے اس طرح متاثر ہوئی تھی۔ آج تک وہ کتنے لوگوں سے ملی تھی؟ اپنے بے شمار کزنز سے' کلاس فیلوز سے' پاپا اور ممی کے دوستوں کے بیٹوں سے' مگر بالکل پہلی بار کوئی اسے اس طرح اچھا لگا تھا۔ اس نے حیران ہو کر سوچا۔

"ایسا کیوں تھا؟ کہیں اسے شنید سے محبت تو نہیں ہو گئی تھی؟"

"اوہ۔ نہیں خدایا۔"

ایسی فضول باتوں کی گنجائش کہاں تھی اور پھر وہ ان باتوں کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی اور ابھی اس کی عمر کیا تھی؟ صرف سولہ سال' سولہ سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ کچی عمر۔ خواب بننے کی عمر اور اس عمر میں ہر چمکتی چیز اچھی لگتی ہے۔

ابھی تو اس کے سامنے بہت طویل' ساری زندگی پڑی تھی۔ اس کے مقاصد' پڑھائی' کچھ بننے کا خواب۔ اس طرح کتنا وقت ضائع ہو گا' مگر وہ کیا کرتی؟ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا وجیہہ سراپا آ جاتا اس نے بہت ہینڈسم لڑکے بھی دیکھے تھے۔ خاندان کے بعض لڑکے بھی اسے پسند تھے' مگر آج کیا ہوا تھا اس طرح۔ یوں تو کوئی بھی اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ اس سے تین چار سال ہی بڑا لگا' مگر کتنا میچور لگ رہا تھا اس کی شخصیت میں کوئی بات تو ضرور تھی جو اسے بہت ڈسٹرب کر رہی تھی۔ اس نے شکر ادا کیا کہ وہ ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اگر گھر پر رہتا ہوتا تو کیا ہوتا؟ ہر روز ٹاکرا ہوتا اور ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ کیا کرتی؟

اب بھی وہ ویک اینڈ پر چھٹیوں میں گھر تو آتا ہی ہو گا اور پھر اس نے بڑا ہی عجیب و غریب فیصلہ کیا کہ وہ ان کے گھر کبھی نہیں جائے گی۔ یوں بھی ان کے گھر کوئی لڑکی نہیں تھی جواز بھی کیا تھا؟ مگر یہ تو صرف اس کی سوچ تھی اور یک طرفہ فیصلہ۔

آنٹی طاہرہ کو وہ بہت اچھی لگی تھی اس لیے وہ اسے بہت پیار کرتیں۔ وہ جب بھی ان کے گھر آتی' اکثر کہتیں۔

"اناتبیل بیٹے تم ہمارے گھر کیوں نہیں آتیں؟ تم آیا کرو نا۔ تمہیں ذرا خیال نہیں آتا کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ مجھے لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ کیا تھا اگر اللہ بھی مجھے ایک بیٹی کی نعمت سے نواز دیتا۔"

تب ممی بہت پیار سے کہتیں۔ "طاہرہ یہ بھی تو آپ کی بیٹی ہے۔"

مگر اسے ممی کا جواب کبھی پسند نہ آتا۔ وہ انہیں کہنا چاہتی تھی۔

"آنٹی' میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔" مگر وہ خاموش رہتی۔ اس کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں اور وہ بے حد مصروف ہو گئی تھی۔ سارا وقت کتابوں کی نذر ہو جاتا' مگر شام کو اسے پارک میں جانا بے حد اچھا لگتا۔ کھلی ہوا میں سانس لینے کے لیے ذرا سا فریش ہونے کے لیے وہ کبھی کبھی پارک ضرور جاتی۔

پارک بے حد خوب صورت اور بہت شان دار تھا۔ اس کے وسیع لان' سرسبز اور شاداب تھے۔ پھولوں اور پودوں کی جتنی اقسام اس نے یہاں دیکھی تھیں' کہیں بھی آج تک نہیں دیکھی تھیں۔ وسیع روش پر اکیلے

ٹہلنا بے حد اچھا لگتا' کبھی کبھی فہد اس کا ساتھ دیتا یا پاپا پارک میں بیٹھ کر شام کے ملگجے اندھیرے میں جگمگاتی روشنیاں بھلی لگتیں ------- پھولوں اور پودوں پر جگنو یوں چمکتے جیسے ہزاروں دیے جگمگ جگمگ کررہے ہوں۔ اس لحاظ سے اسے یہ پارک بہت پسند آیا تھا۔

ممی کلب کی کرتا دھرتا تھیں اس قدر مصروف رہتیں کہ بس آئے دن کوئی نہ کوئی فنکشن ہوتا۔ کوئی اچھا فنکشن ہوتا تو انابیل بھی ان کے ساتھ شامل ہوجاتی۔ کالج میں اس کی بہت اچھی دوستیں تھیں۔ مائرہ اور نادیہ۔ جو اس کی طرح پڑھاکو تھیں اور پھر ان کے گروپ میں ایک لڑکی اور شامل ہوگئی۔ عالیہ' جسے سب عالی کہنے لگے۔ وہ بے حد اسٹائلش لڑکی تھی۔ وہ ہمیشہ اس طرح تیار ہو کر کالج آتی تھی کہ گمان ہوتا' شاید وہ کسی تقریب میں آئی ہے۔ اس کے آنے سے ماحول ذرا سا رنگین ہوگیا تھا۔ وہ اکثر کتابوں سے باہر نکل کر انہیں زندگی کی مختلف خوب صورتیاں دکھانے کی کوشش کرتی۔

وہ آئی جی کی بیٹی تھی بڑے ٹھاٹ سے کالج آتی۔ جی چاہتا تو کلاس اٹینڈ کرتی ورنہ گول کر جاتی۔ پتا نہیں اسے انابیل' مائرہ اور نادیہ کی کیا بات پسند آئی تھی کہ ان کے گروپ میں شامل ہوگئی۔ کوئی بات بھی تو ان میں مشترک نہیں تھی۔

وہ زیادہ تر ملبوسات' جیولری' پرفیومز' موویز' رسالوں اور لڑکوں کی باتیں کرتی تھی۔ انابیل اس دن چونکی' جب اس نے کہا۔

"یار یہاں ایک لڑکا ہے انجینئرنگ کالج میں پڑھتا ہے۔ ایسا ڈیشنگ اگر تم اس کی آواز سن لونا تو پاگل ہوجاؤ۔ ساری لڑکیاں اس کی آواز پر مرتی ہیں۔"

پتا نہیں کیوں انابیل کے ذہن میں یک دم ہی شنید کا خیال آیا مگر وہ خاموش رہی۔ نادیہ اسے ڈانٹ رہی تھی۔

"عالی مجھے ایک بات بتاؤ۔ تم ایف ایس سی کرنا بھی چاہتی ہو کہ نہیں۔۔۔؟ مجھے تو ذرا بھی سیریس نہیں لگتیں۔"

"ہائے اس طرح تو نہ کہو۔ یہ تو میری زندگی کا خواب ہے کہ میں اس کے ساتھ پڑھ سکوں۔"

اور انابیل کا جی چاہا وہ اس سے پوچھے کیا وہ ریٹائرڈ کرنل انکل بابر کا بیٹا ہے؟ مگر وہ چپ رہی۔

اور اس دن جب وہ گھر آئی تو اس نے دیکھا وہ اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اندر چلا گیا۔ اس دن وہ سارا دن کھوئی کھوئی سی رہی۔ آج اسے کتنے دنوں بعد دیکھا تھا اور وہ اس کی صرف ایک ذرا سی جھلک ہی دیکھ پائی تھی کہ وہ اندر چلا گیا جبکہ وہ اسے "ہیلو ہائے" تو کر سکتا تھا۔ شہوز سے اکثر اس کی گپ شپ رہتی تھی وہ اکثر میتھس کا کوئی سوال سمجھنے کے لیے ان کے گھر آجایا کرتا تھا۔

اگلے دن عالی نے اسے بتایا۔ "کل میں نے اسے کال کی۔ ہائے کیا آواز ہے ظالم کی۔ اگر تم سن لونا۔۔۔ تو ہوش و حواس کھو بیٹھو۔"

انابیل بے حد حیران ہوئی۔ وہ کتنی بولڈ لڑکی تھی۔ جھجک یا شرم نام کی کوئی چیز اس میں نہیں تھی۔

"فون پر تو اس کی آواز اتنی اچھی لگتی ہے اتنی اچھی لگتی ہے۔"

"اچھا بس بھی کرو۔" مائرہ نے اکتا کر کہا۔ "بس تمہیں تو کریز ہوگیا ہے اس کا۔"

"صرف مجھے نہیں۔ کالج کی آدھی لڑکیاں اس پر مرتی ہیں۔"

"اس پر یا اس کی آواز پر۔" انابیل نے پوچھا۔

"ایک ہی بات ہے جتنی اچھی اس کی آواز ہے۔ اس سے زیادہ وہ ہینڈسم ہے۔"

"کیا تم اس سے ملی ہو؟"

"ہاں کئی بار وہ میرے بھائی کا کلاس فیلو ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے' لیکن عالی۔" نادیہ شرارت سے بولی۔ "اگر تمہارا یہی حال رہا تو تم ایف ایس سی میں کبھی پاس نہیں ہوسکتیں اس لیے اس کے ساتھ پڑھنے کا خواب تمہارا ادھورا ہی رہے گا۔"

"خدا نہ کرے تمہارے منہ میں خاک۔"

ویسے وہ تھی لائق لڑکی۔ چاہے جتنا وقت ضائع کرتی' ٹیسٹوں میں ہمیشہ اچھے نمبر لاتی۔ انابیل کا جی چاہتا وہ اس کے بارے میں تفصیلات پوچھے مثلاً "اس کا نام کیا ہے۔ وہ انجینئرنگ کے کس سال میں ہے؟" مگر جانے کیوں ہمت ہی نہ پڑتی مائرہ اور نادیہ کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس سے۔ پھر ایک دن اس نے خود ہی انہیں بتایا کہ آج میری علی سے بات ہوئی تھی۔

"کون علی؟" مائرہ نے پوچھا۔

"ارے وہی ہمارا ہیرو۔"

"اور تمہارا...؟" نادیہ نے شرارت سے کہا۔

"بات مکمل کرو نا۔"

"میرا ہونے والا..."

"بے شرم ویسے ایک بات بتاؤ۔ کیا تم کبھی اس سے ملی ہو؟"

"ہاں ایک دو مرتبہ فنکشنز میں اپنے بھائی کے ساتھ۔"

"تو پھر بات کہاں تک پہنچی ہے؟"

"ابھی تو شروع ہی نہیں ہوئی۔ وہ ذرا پراؤڈ سا لڑکا ہے اور شاید سوچتا ہے کہ میں آئی جی کی بیٹی ہوں۔ اس لیے وہ لفٹ نہیں کراتا۔"

"اچھا پھر تو شریف لڑکا ہے۔" مائرہ ہنسی۔

"ایسا کرتے ہیں۔ میں تم تینوں کو اس کا نمبر دیتی ہوں۔ تم ذرا ٹرائی کرو۔ پتا چل جائے گا۔ وہ کتنے پانی میں ہے اور پھر تم اس کی آواز سن کر مجھے بتانا کہ زندگی میں اتنی خوب صورت آواز تم لوگوں نے کبھی سنی ہے؟"

"خوب صورت کیا مطلب؟" نادیہ بولی۔

"میرا مطلب ہے مردانہ بھاری آواز۔"

"اچھا۔" مائرہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

جانے کیوں انابیل کو مایوسی سی ہوئی۔ وہ تو سوچ رہی تھی۔ وہ شنید ہی ہوگا۔ اس کی آواز نے ہی تو اسے متاثر کیا تھا۔ کیا تھا اس کی آواز میں؟ ایک عجیب سا سوز' ایک انوکھا سا احساس' ایک بالکل نیا خیال۔

جسے سن کر اسے احساس ہوا تھا۔ وہ لڑکی ہے اور وہ مرد' ایک بھرپور مردانہ آواز اور اپنے اس احساس پر اسے کتنی شرم آئی تھی۔

اور رات کو جب پڑھنے بیٹھی تو نوٹ بک پر سامنے اس کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

کیا اتفاق تھا کہ آج ہفتہ تھا اس کا مطلب ہے شنید آج گھر آیا ہوگا۔ دل بار بار کہہ رہا تھا "ایک بار ٹرائی تو کرو۔ بات کرنے میں حرج کیا ہے؟"

لیکن اس کا موبائل آف جا رہا تھا' لیکن لینڈ لائن نمبر بھی تو تھا۔ اس نے نمبر ڈائل کیا تو کسی خاتون نے اٹھایا' لیکن آواز جانی پہچانی نہیں تھی۔

"ہیلو۔" اس نے آواز سن کر فون رکھ دیا۔ تو پھر اس نے تھوڑی دیر بعد دوبارہ نمبر ملایا تو وہ چونک گئی۔ وہی آواز بالکل وہ ہی آواز تھی۔ مردانہ بھاری بوجھل آواز۔

"ہیلو' ہیلو۔"

اس نے کال ڈراپ کر دی۔ پتا نہیں کیوں' اسے یقین ہو گیا یہ آواز شنید ہی کی تھی۔ اسے آج تک پتا نہیں تھا کہ بابر انکل کا نمبر کیا ہے؟ تیسری مرتبہ جب اس نے وہی نمبر ڈائل کیا تو ایک بھاری بھرکم آواز آئی۔

"بابر اسپیکنگ۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے۔

"یہ' یہ تو انکل بابر کا نمبر تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ ان کا بیٹا ہے' مگر ان کے تو دو ہی بیٹے تھے' شنید اور شہروز۔ یہ علی کون ہے؟" ہو سکتا ہے اس کا پورا نام علی شنید ہو۔

اس کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر فون کرے مگر اب اسے ڈر لگ رہا تھا کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے اور دو قدم پر ہی تو ان کا گھر ہے اور آنٹی طاہرہ تو اس کی آواز پہچانتی ہیں۔ شکر ہے وہ خاموش رہی تھی۔

مگر اس دن کے بعد سے اس پر ایک عجیب سی

کیفیت طاری تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح سے پڑھتے پڑھتے وہ تھک چکی تھی۔ وہ سیر کے لیے نکل آئی۔ ابھی وہ گھر سے نکلی ہی تھی کہ اس نے شنید اور شہوز کو دیکھا جو روش پر گھوم رہے تھے اسے دیکھ کر وہ رک گئے۔

"السلام علیکم انابیل اپیا۔"

"وعلیکم السلام شہوز کیسے ہو؟"

"بالکل ٹھیک۔ آپ بھائی جان سے ملیں؟"

"نہیں۔" بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔

"بھائی یہ انابیل ہیں۔ سوانیال صاحب کی بیٹی۔"

"ان سے تو ہم مل چکے ہیں نا۔" ایک خوب صورت مسکراہٹ اس کے چہرے پر جھلکی۔

"آپ اس رات ہمارے گھر آئی تھیں نا؟ اپنے پیرنٹس کے ساتھ۔"

"جی۔" انابیل کو خوشی ہوئی تو اسے یاد تھا۔

"کیسی چل رہی ہے آپ کی پڑھائی؟" وہ مسکرایا۔

"بہت اچھی۔"

"بھائی آپ کو نہیں معلوم" انا اپیا بے حد لائق ذہین و فطین اسٹوڈنٹ ہیں۔ میں حساب میں ان سے مدد لیتا ہوں کبھی کبھی۔"

"گڈ۔" وہ بزرگوں کے انداز میں مسکرایا۔ "آپ اکیلی کہاں جارہی ہیں؟"

"میں اکیلی ہی سیر کے لیے نکلتی ہوں۔"

"فہد کہاں ہے؟"

"وہ بابا کے ساتھ باہر نکلا تھا۔"

"اکیلے سیر کرنا کیسا لگتا ہے؟"

"بہت اچھا۔" وہ مسکرائی۔ "مجھے دراصل فطرت کے حسین مناظر سے بہت دلچسپی ہے۔"

وہ ہنسا تو انابیل کو بھی ہنسی آگئی وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ آئی حالانکہ جی چاہ رہا تھا ان کے قریب کھڑی رہے تمام عمر یوں ہی وہ سامنے کھڑا باتیں کرتا رہے اور وہ اس کی باتوں پر دل کھول کر ہنستی رہے' پھر اس نے سوچا کتنے اچھے مزاج کا لڑکا ہے۔ کتنی اچھی باتیں کرتا ہے' مگر امپریشن کتنا غلط پڑتا ہے جیسے نہایت مغرور ہو وہ کتنا ہینڈسم ہے اور لب و لہجہ کتنا دل موہ لینے والا ہے۔

☼ ☼ ☼

شام اور گہری ہو چکی تھی' تاریکی نے چاروں اور اپنے پر بچھا لیے تھے' چاند دور افق سے ذرا سا اونچا تھا۔ اسی لیے ستارے بہت نیچے اور قریب دکھائی دے رہے تھے جیسے ایک چھلانگ لگا کر۔ پھولوں کی طرح توڑ کر جھولی میں بھرا جاسکتا ہو۔ بہت نیچے بہت چمکدار بہت شفاف۔

کبھی رات اتنی حسین نہیں لگی تھی۔ یہ شنید کے وجود کا سحر تھا۔ جو اسے اپنی گرفت میں لے رہا تھا اور اس سحر انگیز خوب صورتی کو صرف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ جذبے جیسے دھیرے دھیرے برف کی طرح پگھل رہے تھے یہ پوری خوشی بھی نہیں تھی۔ خوشی سے پہلے کا پل تھا جب سانس گلے ہی میں اٹک جاتا ہے۔

چاند دھیرے دھیرے نیچے ہوتا جارہا تھا۔ جوں جوں نیچے جارہا تھا۔ آسمان میں اس کی تھرکتی ہوئی روشنی اکٹھی ہو کر ایک سیدھی قطار کی طرح ایک لمبی لکیر میں سمٹتی جارہی تھیں۔ لکیر بھی نہیں' بالشت بھر چوڑی روشنی کی ایک سڑک یہاں سے وہاں تک آسمان کے پرلے کنارے تک پھیلی ہوئی۔

"شنید"

"ہوں۔"

"وہ دیکھو۔"

"کیا۔؟"

"روشنی کی سڑک۔"

"آؤ اس پر ہاتھ پکڑ کر دوڑیں۔"

اس نے بچوں کی طرح انابیل کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے شنید کی طرف دیکھا اسے لگا وہ روشنی' شنید کی آنکھوں سے چھلک کر اس کی روح کے اندر اترتی جارہی تھی۔

"چلو ابھی۔" اس کی آنکھوں کی تمام روشنی کو جیسے

وہ اپنے اندر اتار گئی ہو۔ شنید کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"نہیں ابھی نہیں' ابھی میں تمہارا ہاتھ تھامے یوں ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر رہنا چاہتی ہوں شنید۔ تمہیں دیکھا' تم سے ملی تو دل ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ تم ان ٹکڑوں کو ایک جگہ جمع کر دو پلیز۔ میں بھکارن بن کر تمہارے سامنے آکھڑی ہوئی ہوں' ایک زندگی کا سوال لے کر' چاند کو گواہ بنا کر جو افق سے ذرا اوپر تھا۔ اس کی چاندنی کی لہریہ دار سڑک بن رہی تھی اور وہ شنید کے ساتھ اس پر دوڑنا چاہتی تھی۔

ہوا کے تیز جھونکے پر اس کی آنکھیں کھل گئیں اور سپنا ٹوٹ گیا۔ چند لمحوں کے لیے تو اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا زمین کی سطح بالشت بھر اوپر اٹھ گئی ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ بالکل خاموش وہ پل پل چاند کو نیچے آتے ہوئے دیکھتی رہی۔ روشنی کی سڑک بادلوں کے کالے غبار میں غائب ہو گئی۔

"جب ہم ساتھ ہوں گے' میں تمہیں اتنا پیار کروں گا اتنا کہ۔۔۔"

شنید کے لہجے سے پھر خیالوں کو جھٹکا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے اور ہاتھ ضبط کرنے کی کوشش میں لرز رہے تھے۔

چاند چلتا ہوا کبوتر کی طرح بادلوں کے دامن میں جا بیٹھا۔ ستاروں کی پلکیں جھکیں اور ساتھ سر جھک گیا۔

"آئی لو یو شنید' آئی لو یو۔" اس نے بے حد سنجیدہ مگر شدتوں سے چور لہجے میں کہا۔

اس رات اس نے بغیر سوچے سمجھے نمبر ڈائل کیا رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ یقیناً" سارا گھر سو گیا تھا کیونکہ فون اسی نے اٹھایا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔ علی بول رہا ہوں۔"

انابیل نے گھبرا کر کال ڈراپ کر دی۔ تو واقعی ہی اس کا نام علی شنید تھا۔ اور گھر والے شنید کے نام سے ہی پکارتے تھے۔ دوبارہ پھر اس نے ان کا نمبر ملایا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بہت غلط حرکت کر رہی تھی اور ہو سکتا ہے وہ اس کی آواز پہچان لے کیونکہ ابھی شام کو تو اس سے بات ہوئی تھی اور پھر اگر گھر میں کسی کو پتا چل گیا تو پاپا ممی کیا سوچیں گے انکل بابر اور آنٹی وہ کیا کہیں گی؟

مگر جانے کیوں اس کا دل مچل مچل کر ضد کر رہا تھا۔ اس سے بات کرنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ پہرے بٹھا لیے خود پر۔ ضبط کے پہرے اتنے مضبوط تھے کہ وہ دوبارہ نمبر ڈائل نہ کر سکی۔

لیکن وہ زیادہ دن تک خود پر ضبط کے پہرے نہ لگا سکی۔ وہ تین بار اس نے شنید کے سیل پر ٹرائی کی۔ نمبر بزی ہی ملا ویک اینڈ پہ وہ گھر آیا تو ایک بار پھر سے انابیل نے سیل پر ٹرائی کی بیل بجتی رہی۔ تنگ آکر اس نے گھر کے نمبر پر کال کی تو اسی نے فون اٹھایا اس نے جب بھی کال کی اپنے موبائل سے کی تھی۔ گھر کے نمبر سے کبھی نہیں کی تھی۔

"ہیلو۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ہیلو کون؟"

اس کا دل چاہا کہہ دے آپ کی آواز کی ایک دیوانی' مگر وہ بے حد سیریس لہجے میں بولی۔

"لوگ آپ کی آواز کی بہت تعریف کرتے ہیں۔"

"اچھا۔" وہ شاید مسکرایا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے لوگ جھوٹ نہیں کہتے۔"

"میرا خیال ہے آپ کی آواز بھی بہت خوب صورت ہے۔" اس نے شریر سے لہجے میں کہا۔

"اچھا۔" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ "مجھے تو آج تک کسی نے نہیں کہا۔"

"اب تو کہہ دیا نا۔ معلوم ہو گیا؟"

"کیا آواز کی خوب صورتی سے انسان کی شخصیت پر اثر پڑتا ہے۔" انابیل نے پوچھا۔

"آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں۔" اس نے الٹا

سوال کردیا۔
"میرا خیال ہے سو فیصد۔"
"اچھا۔" وہ ہنسا اس ہنسی کی جھنکار دل میں گھر کر جانے والی تھی۔
"تو ہمارا شمار "خاص شخصیت" میں ہو سکتا ہے۔"
"خاص نہیں خاص الخاص۔" وہ بے اختیار بولی۔
"ایک بات پوچھوں؟"
"جی پوچھیے۔"
"کون ہیں آپ؟"
"لڑکی۔"
"آپ کا نام؟"
"میری آواز سن کر کوئی نام آتا ہے آپ کے ذہن میں؟"
"ہاں۔"
"کیا۔۔۔؟"
"اچھی سی پیاری لڑکی۔"
"مگر اچھی لڑکیاں تو لڑکوں کو فون نہیں کرتیں۔" وہ مایوسی کے ساتھ بولی۔
"میں جانتا ہوں آپ اچھی لڑکی ہیں اور آپ ہمیشہ مجھ سے بات کرتی رہیں گی۔"
"کیا آپ ہمیشہ اسی طرح لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں طنز تھا۔
"جب لڑکیاں یہی چاہتی ہیں تو میں کیا کروں؟"
"اس کا مطلب ہے بہت لمبی فہرست ہے لڑکیوں کی!"
"ہاں۔ مگر میں آپ کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے آج پہلی مرتبہ کسی لڑکے کو فون کیا ہے۔"
"اچھا۔ مگر آپ کو کیسے پتا چلا؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔
"آپ کے لہجے' آپ کے انداز و آواز سے۔"
"فون سے کیسے پتا چل سکتا ہے؟"
"میں جانتا ہوں۔"
"اور کیا کیا جانتے ہیں؟"
"آپ بہت قریب سے بول رہی ہیں جیسے۔"
وہ ایک دم گھبرا گئی۔ "یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔"
"آپ کی آواز سے۔۔۔؟"
"میری آواز کے ساتھ قریب کے سگنل آرہے ہیں کیا؟"
"ہاں آپ کی آواز بے حد صاف اور قریب سے آرہی ہے جیسے ساتھ والے گھر سے بول رہی ہیں۔"
اس کے تو گویا چھکے چھوٹ گئے' مگر خود پر کنٹرول رکھتے ہوئے اس نے کہا۔
"مگر میں تو کراچی سے بول رہی ہوں۔"
"اچھا۔ مگر میرا نمبر کہاں سے ملا۔"
"رانگ نمبر لگ گیا۔" وہ جھوٹ نہیں نبھا سکی۔
"اچھا کراچی کے لوگ بھی جانتے ہیں مجھے۔"
"جی آپ کی' آواز کی شہرت بہت دور دور تک ہے' سنا ہے آپ کے کالج کی لڑکیاں آپ کی آواز پر مرتی ہیں۔"
"اور آپ۔۔۔؟" لہجے میں گہری دلچسپی تھی۔
جی چاہا کہہ دے۔ "میں تو پہلے دن ہی مر گئی تھی۔" "لیکن مگر بولی تو یہ" بس تصدیق کرنا چاہتی تھی۔"
"پھر ہو گئی تصدیق۔"
"جی ہاں۔"
"کیا ہوئی؟"
"سب پتا چل گیا۔ اب میں فون بند کرتی ہوں۔"
"کیوں۔۔۔؟"
"نیند آرہی ہے۔"
"ہماری نیند اڑا کر آپ کو نیند آجائے گی؟"
"کیا آپ سب ہی لڑکیوں سے اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔"
"ویسے تصدیق کے ساتھ جاسوسی بھی کر رہی ہیں آپ؟"
"خدا حافظ۔" وہ اس کا سوال گول کر گئی۔
"سنیے محترمہ۔۔۔؟"
"جی۔" وہ خدا حافظ کرنے کے بعد بھی سیل کان

سے لگائے ہوئے تھی۔
"کوئی فرمائش...؟"
"کوئی نہیں۔"
"کیوں...؟"
"یوں ہی۔"
"چلیے میں ایک غزل سناتا ہوں۔ لڑکیاں فرمائش کرکے نظمیں' غزلیں سنتی ہیں۔"
پھر وہ غزل سنانے لگا۔ اناہیل اس کی آواز کے سحر میں کھو سی گئی اور نجانے کیوں آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اس نے خدا حافظ کیے بنا فون بند کردیا۔

بول ہوا اس پار زمانے کیسے ہیں؟
دور شہر میں دوست پرانے کیسے ہیں؟

چاند اترتا ہے اب کس کس آنگنیں میں
کرنوں سے محروم گھرانے کیسے ہیں؟

لب بستہ دیوانوں پر کیا بیت گئی؟
گلیوں سے منسوب زمانے کیسے ہیں؟

جن کے جھرمٹ میں شامیں دم توڑ گئیں
وہ پیارے' پاگل پروانے کیسے ہیں؟

محسن ہم تو خیر خبر سے بھی گزرے
اپنے معروف دوست نہ جانے کیسے ہیں؟

☆ ☆ ☆

اس کا ضمیر ہتھوڑے کی طرح دل پر چوٹ لگا رہا تھا۔ اس نے کوئی اچھی حرکت نہیں کی تھی۔ بھلا فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس میں عالیہ اور عالی جیسی ہزاروں لڑکیوں میں کیا فرق رہ گیا تھا...؟
اگر پاپا اور ممی کو پتا چل گیا۔ تو وہ کیا سوچیں گے کیا وہ ایسی لڑکی تھی؟ اناہیل کے ذہن میں بار بار شنید کی باتیں آرہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی لڑکیاں ان لڑکوں کو لفٹ کراتی ہیں تو انھیں اس قسم کی باتیں کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ ورنہ شنید کی کیا جرات تھی کہ وہ اس سے بات کرسکتا۔
مگر اس نے ایسی کوئی غلط بات تو نہیں کی تھی۔ اس نے ذہن میں اپنی ساری باتیں دہرائیں۔ سوائے اس کے کہ اس نے اس کی آواز کی تعریف کی تھی اور یہ بالکل سچ بھی تھا اور سچ بولنا گناہ ہے کیا؟
تو پھر اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ اس کا ضمیر بار بار ملامت کررہا تھا اسے یہ درست نہیں تھا دنیا میں جانے کتنے لوگوں کی آواز اچھی ہوگی اور وہ ہینڈسم ہوں گے۔ تو وہ ان سب کو فون کرکے انھیں بتائے گی؟
وہ اپنی نگاہوں میں خود ہی گر گئی تھی۔ اس کا فعل اچھا نہیں تھا۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے اپنے اس گناہ کی معافی مانگی اور توبہ کی کہ آئندہ اسے ہرگز کال نہیں کرے گی۔ اسی کشمکش میں فجر کی اذانیں ہونے لگیں تو وہ اٹھی اس نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ نماز کے دوران اس کا دل بھر آیا اور وہ رو پڑی اور رو رو کر اپنے اللہ سے معافی مانگی۔
مگر وہ اس دل کا کیا کرتی جو بار بار اس کے لیے مچل رہا تھا۔ اس سے بات کرنے کے لیے ضد کررہا تھا۔ وہ اسے اچھا لگتا تھا بہت اچھا۔ وہ اس کی کمی محسوس کرنے لگی تھی اور جب دل و دماغ پر کسی طرح اختیار نہ رہے تو وہ کوئی کیا کرسکتا ہے۔
لیکن اس نے خود کو سختی سے روکا کچھ بھی ہو۔ وہ اس کے لیے گھل گھل کر مرہی کیوں نہ جائے مگر وہ دل کی بات نہیں مانے گی۔ وہ ان لڑکیوں کی فہرست میں خود کو شامل نہیں کرسکتی جن کے لیے لوگ برے لفظ استعمال کرتے ہیں اور کسی طور اچھی لڑکیاں نہیں سمجھتے۔ بار بار ندامت اس کے دل سے اٹھتی کہ رات شنید سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی اور جب بھی شنید گھر آتا وہ ان کے گھر نہ جاتی۔
جو بھی ہو وہ اس کا سپنا تھا اس کو پانے کے لیے وہ دعائیں مانگتی۔ اس نے سوچ لیا تھا اگر شنید کو پانے کا کبھی بھی زندگی میں چانس ملا تو وہ ضائع نہیں کرے گی۔ دن ہفتے' مہینے یکے بعد دیگرے گزرتے وقت کا ناآشنا چہرہ' دھندلے' نیالے سرمئی دن۔ وہ ہر ویک

اینڈیر گھر آتا لیکن وہ اس کی موجودگی میں طاہرہ آنٹی کے پاس بھی جانا چھوڑ دیتی۔ اپنے کام سے کام رکھتی۔ وہ شہوز کے ساتھ گزرے دنوں کو یاد کرتی اور مسکرا دیتی۔

وہ اس کے خیالوں میں بھٹکتی ہی نہیں تھی۔ عشق کرنے لگی تھی شنید سے۔ اس کا گھر ہونا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے پاس ہو۔ دل کو عجیب سا سکون اور اطمینان رہتا اور اس کے جانے کے بعد وہ خود کو تنہا محسوس کرتی۔ خالی پن لگتا۔ راتوں کو نیند نہ آئی۔ تو وہ خود پہ ہنسنے لگتی۔ اس کی نگاہوں میں پیاس سی رہنے لگی۔ اس کا دل دھڑکتا رہتا۔ اکثر وہ جھنجلا جاتی۔

اس کو محسوس ہوتا جیسے موت کے کنویں میں چل رہی ہے۔ یا رسی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کے اوپر ننگے پاؤں چل رہی ہے۔ بازیگروں کی طرح۔ اس کے جانے کے بعد سے آنے والے دنوں کو گنتی — جیسے اس کے دونوں سروں کو پکڑ کر ہوا میں کھڑی ہو۔

☼ ☼ ☼

طاہرہ آنٹی اور اس کے درمیان بے حد دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئی تھیں۔ وہ ہر بات میں اس سے مشورہ لیتیں۔ ملبوسات سے لے کر کھانا پکانے تک اور گھر کی سجاوٹ سے لے کر اپنے ذاتی مسائل تک۔ وہ سب کچھ اس سے ڈسکس کرتیں۔ اسے بہت اچھا لگتا۔ ممی نے اس طرح کبھی اسے کسی معاملے میں سراہا ہی نہیں تھا۔ کبھی اسے اس قابل سمجھا ہی نہیں تھا۔ کہ کسی بھی سلسلے میں اس سے مشورہ کریں۔ انہوں نے اسے کبھی اس قابل جانا ہی نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ اسے بے وقوف اور بدذوق سمجھتی تھیں۔ انہیں تو اس کی کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن طاہرہ آنٹی سے مل کر اسے ایک عجیب سا اعتماد ملا تھا۔ زندگی میں پہلی بار یہ احساس اچھا لگا کہ وہ بھی کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی شخصیت بھی کسی کے لیے اہم ہو سکتی ہے؟ اس کی بات بھی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ بھی کسی کو مشورہ دے سکتی ہے۔ اب وہ جب چاہے ان کے گھر چلی جاتی اور گھر میں داخل ہوتے ہی انہیں آوازیں دیتیں۔

”آنٹی.... آنٹی.... کہاں ہیں آپ؟“

اور وہ اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھتیں۔ وہ فارغ وقت میں ان کے کئی کام کر دیتی۔ وہ اس کی بے حد ممنون ہوتیں۔ وہ اکثر ان کے ساتھ شاپنگ کے لیے جاتی۔ اس نے ایک دم ہی بہت خوش رہنا شروع کر دیا تھا۔

وہ آنٹی سے مشورہ کر کے اپنے ڈریسز کے رنگوں کا انتخاب کرتی۔ وہ بھی اسے مفید مشوروں سے نوازتیں۔ اکثر اس کا دل مچلتا وہ ان سے شنید کی کوئی بات کرے۔ مگر کر نہ سکتی۔ جن دنوں وہ گھر پر ہوتا وہ اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتی۔

اس روز وہ ان کے ساتھ بیٹھی گپ شپ میں مصروف تھی کہ وہ یکدم ہی بولیں۔

”میں بہت ہی پریشان ہوں انابیل۔“

”کیوں....؟“ اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”شنید کی وجہ سے....؟“

چند لمحوں کے لیے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ اور جب بولنے کے قابل ہوئی تو پوچھا۔

”کیوں کیا ہوا ان کو؟“ اس نے اپنی آواز کی لرزش محسوس کی۔

آنٹی نے اپنی پریشانی کی وجہ سے اس کے لہجے پر غور نہیں کیا۔

”میں حیران ہوں انابیل آج کل کی لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کس قدر گر چکی ہیں۔ اپنی عزت کا کوئی خیال ہی نہیں رہا۔ ہمارے زمانے میں بھی فون، موبائل ہوتے تھے اور ہم بھی کو ایجوکیشن میں پڑھتے تھے۔ لیکن ہم نے اخلاق سے گری ہوئی کوئی حرکت نہیں کی کبھی۔ جس سے ماں باپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ہو۔ لیکن آج کل کے والدین اپنی اولاد کی طرف سے

اس قدر بے پروا کیوں ہیں؟ مائیں بیٹیوں سے اس قدر بے خبر ہیں کہ انہیں نہیں معلوم ان کی بیٹیوں کا چلن کیا ہے کس کے ساتھ کہاں جاتی ہیں اور کسے فون کرتی ہیں۔ کتنی کتنی دیر فون اور موبائل مصروف کیوں رہتے ہیں؟"

وہ پلکیں جھکائے خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ بھی تو اس لائن میں کھڑی تھی۔ اس سے بھی تو دوبار یہ غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ اس کے بعد کتنی مشکل سے خود کو باز رکھا تھا وہ ہی جانتی تھی۔

"شنید سب سے انوکھا لڑکا تو نہیں ہے۔ اس سے بھی کہیں زیادہ ہینڈسم لڑکے ہوتے ہیں۔ مگر لڑکیوں نے اسے ہی کیوں پریشان کر رکھا ہے۔ وہ جب گھر آتا ہے تو اپنا سیل آف کر دیتا ہے۔ لیکن پھر پی ٹی سی ایل پہ فون کالز کی لائن لگ جاتی ہے۔ بے حیائی کی انتہا ہے نا۔ ہر لڑکی اس کی آواز کی دیوانی ہے۔ اس کی آواز میں ایسا کون سا سحر ہے جیسے دیکھو وہ ہی پاگل ہے بے غیرتی کی حد ہوتی ہے کوئی۔ جب میں فون اٹھاتی ہوں تو کہہ دیتی ہیں۔ آنٹی پلیز علی کو بلا دیجیے۔ اگر کچھ پوچھوں تو صاف کہہ دیتی ہیں کہ وہ ہمیں اچھا لگتا ہے۔ اس کی آواز نے انہیں دیوانہ بنا رکھا ہے۔ اور وہ بے چارہ بھی تنگ آچکا ہے۔"

وہ کیا کہتی وہ تو خود ان لڑکیوں کی فہرست میں شامل تھی۔

"یہ لڑکیاں کون ہیں آنٹی؟"

اسے خود اپنی آواز اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ذلت کی دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔

"مجھے کیا معلوم۔ اور وہ اپنا نام کیا صحیح بتائیں گی۔ کوئی کرن نائمہ تو کوئی عالیہ۔"

اور وہ چونک گئی۔ اچھا تو عالیہ نے اپنا نام چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی وہ کیا کہتی۔ خاموشی سے سنتی رہی۔ مگر اسے اپنے وجود پہ شرم آرہی تھی۔ آنٹی کس قدر پریشان تھیں۔

"میں حیران ہوں ان لڑکیوں کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آجاتے ہیں کہ اتنے قیمتی تحائف بھیجتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں انہیں اپنی عزت اور پیسے ضائع کرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ والدین کی خون پسینے کی کمائی پانی میں بہا رہی ہیں۔

"مجھے دکھ ہوتا ہے اناتبل یہ نئی نسل کس طرف چل پڑی ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہ سب والدین کا قصور ہے۔ آج کل والدین اور اولاد کے درمیان کوئی کمیونیکیشن نہیں ہے۔ خاص طور سے موبائلز، انٹرنیٹ، کیبل نے نئی نسل کو تباہ کر دیا ہے۔ رہی سہی کسر انگلش موویز نے پوری کر دی ہے۔ میں تو پریشان ہوں۔ شکر ہے میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ مگر یہ لڑکیاں بھی تو کسی کی بیٹیاں، کسی کی بہنیں ہیں۔ میں اکثر سوچتی ہوں ایک تم بھی تو ہو اناتبل۔ آج کل کی لڑکیوں والی کوئی بات ہی نہیں تم میں۔"

اور اناتبل کو یوں لگا ہو جیسے آنٹی نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ لے کیسا آئینہ دکھایا تھا انہوں نے۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ وہ ان سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ سارا قصور ماؤں کا ہوتا ہے۔ ممی نے اسے کبھی نہیں جتایا تھا کہ لڑکوں کو فون کرنا بری بات ہے۔ بلکہ وہ ایک ہی شکایت کیا کرتی تھیں۔ کہ وہ آج کل کے زمانے کی طرح فیشن کیوں نہیں کرتی؟ اور دوسری لڑکیوں کی طرح تیز طرار کیوں نہیں ہے؟

وہ جانتی تھیں وہ راتوں کو اٹھ کر پڑھتی ہے۔ مگر انہوں نے کبھی اٹھ کر نہیں دیکھا تھا کہ وہ کیا پڑھتی ہے کیا کرتی ہے؟ اس نے کتنی مرتبہ انکل بابر کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ کتنی مرتبہ شنید سے بات کی تھی۔ ممی اور پاپا کو بالکل خبر تک نہ ہوئی تھی۔ پتا نہیں یہ ان کا اندھا اعتماد تھا یا پھر لاتعلقی؟

وہ ان کی اس بے خبری کو کوئی نام نہ دے سکی۔ لیکن طاہرہ آنٹی کو وہ یہ نہ کہہ سکی کہ سارا قصور ان لڑکیوں کا تو نہیں ہے۔ ظاہر ہے شنید ان سے فون پر

بات کرتا ہے، ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تو وہ فون کرتی ہیں۔

اور اس رات اس نے کتنی لگاوٹ اور محبت سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ آپ اچھی لڑکی ہیں ہمیشہ مجھ سے بات کرتی رہیں گی۔ اس دن کے بعد سے اس نے شنید کو فون نہیں کیا تھا۔ اسے احساس ہوا وہ بھی ان کی نظروں میں اچھی لڑکی نہیں ہے یوں ہی تو اسے نہیں سنا رہی تھیں۔ مگر یہ انہوں نے کب کہا تھا۔ اس کے اپنے دل میں چور تھا تو اسے لگا وہ اسے ہی سنا رہی تھیں انہوں نے تو اس کی تعریف کی تھی اور کہا تھا ایک تم بھی تو ہو آج کل کی لڑکیوں سے کس قدر مختلف۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ ان سے جا کر کہے "اپنا غلطی کا اعتراف کرے۔

"یہ غلطی مجھ سے بھی سرزد ہو چکی ہے۔ مجھے ان سے مختلف نہ سمجھیں۔" مگر دل کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اسے اچھا لگتا تھا۔ شاید اسی طرح وہ سب کو اچھا لگتا ہو گا۔ سب کے دلوں کا ارمان ہو گا، عالیہ ٹھیک کہتی تھی شہر کی آدھی لڑکیاں اس پر مرتی ہیں۔ اور وہ بھی تو اس پر مرمٹی تھی۔ ظاہر پر باطن کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جب لڑکیاں کچی عمر کی ہوتی ہیں اور اس دور میں دماغ سے نہیں دل سے کام لیتی ہیں۔ اور ہر چمکتی چیز سونا لگتی ہے۔ یہی عمر بگڑنے اور سنورنے کی ہوتی ہے اس عمر میں بہت خیال بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدموں کی ذرا سی لڑکھڑاہٹ بہت بڑی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

اناتیل کے والدین عمرے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اور ان دنوں انہوں نے اس کا بہت خیال رکھا۔ وہ ہر روز کچھ نہ کچھ اسے بھجتیں۔ وہ بہت ہی مزے دار کھانے بناتی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک انوکھا ہی ذائقہ تھا۔ فہد بھی خوش ہو کر کھاتا۔ مچھلی تو وہ غضب کی بناتی تھیں۔ وہ اکثر تعریف کے لیے الفاظ ڈھونڈتی ہی رہ جاتی۔ ان پندرہ دنوں میں انہوں نے اس کا بہت خیال رکھا اور اس دوران ان دونوں کے بیچ افہام و تفہیم کا ایک — رشتہ قائم ہو چکا تھا۔

وہ اس کی خوب تعریف کرتیں۔ ویسے بھی وہ اس کو بہت پسند کرتی تھیں۔ وہ گلابی سی رنگت والی لڑکی انہیں بہت اچھی لگتی تھی یوں لگتا اس کے گالوں پر انار پھوٹ رہے ہوں۔ ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی۔

شہوز کی سالگرہ تھی۔ جب وہ تیار ہو کر ان کے گھر گئی طاہرہ آنٹی نے اسے ستائش بھری نظروں سے دیکھا۔ ہمیشہ سادہ رہنے والی لڑکی ذرا سا سنورنے سے کس قدر حسین لگ رہی تھی۔ بلیو اور فیروزی کومبی نیشن میں وہ بے حد کھلی ہوئی تھی۔ وہ دراز قد تھی اور فیروزی پنسل ہیل میں وہ اور بھی شاندار لگ رہی تھی۔ وہ اور فہد جب ان کے گھر پہنچے تو سامنے ہی شنید کھڑا تھا۔ بلیو پینٹ اور فیروزی شرٹ کے ساتھ اور فیروزی اور بلیو پرنٹ کی زبردست ٹائی میں۔ وہ خواہ مخواہ ہی جھینپ گئی۔ کیا اتفاق تھا۔ دونوں نے ایک ہی رنگ پہن رکھا تھا۔

شنید نے اسے بے حد حیرت سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"کیا تیار ہو کر کوئی اس طرح بھی اچھا لگ سکتا ہے؟"

کیک کاٹنے کے بعد زبردست ڈنر کیا گیا۔ طاہرہ آنٹی نے اپنے ہاتھوں سے لذیذ کھانا بنایا تھا۔ سب مل کر بیٹھے تو شہوز نے کہا۔

"یار آج تو بہت غضب ڈھا رہی ہو۔"

"تھینک یو۔" وہ مسکرائی۔ شنید نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

یوں ہی گپ شپ میں وقت گزر گیا۔ رات گئے وہ دونوں گھر پہنچے اس کا نیند کے مارے برا حال تھا۔

وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا اور ان گزرتے لمحوں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ پور پور اس کے عشق میں دھنس چکی تھی — وہ تو سوچا کرتی تھی۔ یہ سب پاگل پن کی باتیں ہیں۔ کم عمری کی حماقتیں ہیں۔ اور ان سب لڑکیوں کی ان فضول حرکتوں پر حیران ہوا

کرتی تھی۔ یہ ساری باتیں اسے کتنی چیپ لگا کرتی تھیں۔ وہ سوچا کرتی تھی۔

"کوئی اس طرح کسی کے لیے اپنی عزت نفس وقار اور صلاحیتوں کو کس طرح داؤ پر لگا سکتا ہے؟" اس کا خیال تھا یہ سب وقت کا زیاں تھا اور یہ سب کتابوں میں لکھے قصے کہانیوں میں ہوتا ہے۔ مگر وہ سب کچھ خود اس کے اپنے ساتھ ہو چکا تھا۔ اور اسے وہ ساری باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ کچھ بھی غلط نہیں لگتا تھا۔

کوئی جب اپنے آپ اس طرح اتنا اچھا لگنے لگے تو اسے چاہنے میں حرج کیا تھا؟

انسان کو کم از کم اپنے ساتھ تو ایماندار ہونا چاہیے۔ اپنے جذبوں کو تو جھٹلانا نہیں چاہیے۔ شنید اسے اچھا لگتا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اس کی یہ چاہت یکطرفہ تھی۔

وہ انابیل کے جذبوں سے بے خبر تھا کہ وہ اس طرح خاموشی سے اسے چاہ رہی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چپ چاپ سی۔ اتنی تھیس، پڑھاکو اور سادہ سی لڑکی اس کے لیے اسی طرح پاگل ہو رہی ہے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح واقف تھا کہ وہ لڑکیوں کا پسندیدہ ترین لڑکا تھا۔ اسے احساس تھا۔ ہر لڑکی اس کے لیے پاگل تھی۔ اور کتنی حیرت کی بات تھی کہ وہ کبھی کسی لڑکی سے جیلس نہیں ہوئی تھی۔ شنید کے تعلقات اور دوستیوں پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

طاہرہ آنٹی ہمیشہ اس کے لیے پریشان رہتیں۔ انہیں یہی فکر لگی رہتی کہ کہیں وہ "اٹوالو" نہ ہو جائے کسی جگہ سنجیدہ نہ ہو جائے۔ اپنے بیٹے سے زیادہ انہیں ان لڑکیوں پر غصہ آتا تھا جو اس کا وقت اس طرح برباد کرتی تھیں۔ کال کرتیں تحائف بھجوائی تھیں۔ وہ اکثر انابیل کو دکھاتیں بند پیکٹ اس کی وارڈ روب میں پڑے رہتے۔ انابیل کو بے حد دکھ ہوتا۔

لڑکیاں اس حد تک گر بھی سکتی ہیں؟

وہ بھی اسے پسند کرتی تھی۔ بہت چاہتی تھی مگر کیسی ان دیکھی، ان چھوئی۔ خاموش محبت تھی اس کی۔ وہ کتنی مرتبہ شنید سے ملی تھی مگر وہ جان نہیں پایا تھا۔ شاید وہ اس سے اس قسم کی توقع کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ کیسا معصوم تعلق تھا کہ کبھی کبھار اسے دیکھ کر، اور کبھی کبھار اس سے بات کر کے مہینوں سرشار رہتی۔ اور جب بھی ملاقات ہوتی طاہرہ آنٹی کے سامنے ہی ہوتی۔ وہ اپنے آپ میں خوش اور مگن رہنے لگی۔

انابیل اور شہروز کی بہت دوستی تھی۔ اگر طاہرہ آنٹی مصروف ہوتیں تو اکثر دونوں سیر کے لیے نکل جاتے۔ وہ اس سے ایک سال چھوٹا تھا مگر وہ اس کے سامنے بالکل چھوٹی سی لگتی۔ وہ بہت خوش ہوتا، خوب سینہ تان تان کر اس کے برابر کھڑا ہو جاتا۔

"انا اپیا دیکھیے میں آپ سے کتنا بڑا لگتا ہوں۔ اور وہ ہنسنے لگتی۔" ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں میں وقت گزرتا رہا۔ اور پھر وقت جیسے پر لگا کر اڑنے لگا۔ شنید جاب کرنے لگا۔ اور اب آنٹی چاہتی تھیں وہ اس کی شادی کر دیں اس کے لیے وہ لڑکیاں دیکھنا چاہتی تھیں۔ اور اس کام کے لیے وہ انابیل کو اپنے ساتھ لے کر جاتیں۔

☼ ☼ ☼

اس نے بہت دنوں بعد شنید کو دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ وہ کس قدر اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے مونچھیں رکھ لی تھیں اور پہلے کے مقابلے میں اس کی شخصیت بے حد مکمل اور سحر انگیز ہو گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں انابیل کو اپنا آپ بہت حقیر سا لگا۔ کیونکہ وہ روشن اور چمکتے چاند کی مانند تھا اور وہ اس کے سامنے ڈوبے ہوئے چاند کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اس دن سارا وقت وہ بے حد ڈسٹرب رہی۔ وہ کس قدر ہینڈسم، بے حد فریش اور توانا تھا اس رات اس نے بھیگی پلکوں کے ساتھ دعا مانگی۔

"کاش وہ میرا مقدر بن جائے۔"

دل مچل مچل کر اس کے ساتھ کا تمنائی تھا۔ اتنا بھرپور اور وجیہہ نوجوان۔ جانے وہ کون خوش نصیب لڑکی ہوگی جسے دیکھنے کے لیے آنٹی جانا چاہتی تھیں۔

اس روز جب وہ سو کر اٹھی تو طاہرہ آنٹی آئی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اسے لپٹا کر پیار کیا۔ وہ شام کو انابیل کے ساتھ کسی لڑکی کو دیکھنے جانا چاہ رہی تھیں۔

اور آج اس نے پہلی بار ان سے پوچھا۔

"آنٹی آپ نے شنید سے پوچھا؟ ہو سکتا ہے اس کی اپنی کوئی پسند ہو؟"

"ہاں میں نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ میں آپ کی پسند کی لڑکی سے شادی کروں گا۔"

"تو آپ کے خاندان میں کوئی لڑکی نہیں ہے؟"

"نہیں اس کی ہم عمر کوئی لڑکی نہیں۔ ساری بہت چھوٹی ہیں۔"

"تو آپ نے اس کی پسند تو پوچھی ہو گی کیسی لڑکی چاہتا ہے وہ؟"

"وہ کہتا ہے کہ لڑکی شریف اور ذہین ہو۔"

اور انابیل کو ہنسی آ گئی۔ "آنٹی شرافت اور ذہانت ناپنے کا کوئی پیمانہ تو ہے نہیں۔ اس کا اندازہ آپ ایک نظر میں تو لگا نہیں سکتیں۔ جب تک کہ آپ کسی کو اچھی طرح جانتی نہ ہوں تو کیا پتا چلتا ہے؟"

"واقعی ___ تم ٹھیک کہتی ہو۔ دراصل آج کی لڑکیوں سے وہ اس قدر بدظن اور الرجک ہے کہ کہتا ہے کوئی لڑکی شریف نہیں ہے۔"

"خیر آنٹی یہ بات بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ساری لڑکیاں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔"

"وہ کہتا ہے مجھے آج تک کوئی شریف لڑکی نہیں ملی۔ جو لڑکی ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کسی لڑکے کو فون کرے اور رات گئے تک باتیں کرے' اس کے ساتھ سیر و تفریح کرے' راتوں کو بھی ملنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس میں شرافت کہاں رہ جاتی ہے؟ وہ تو کہتا ہے' اچھے خاندان کی' پڑھے لکھے والدین کی لڑکیاں بھی کردار کی انتہائی پستیوں میں گر چکی ہیں۔"

"آنٹی اس کے ذمہ دار تنہا لڑکیاں ہی نہیں لڑکے بھی تو ہیں؟"

"بھئی جب لڑکیاں خود ہی اپنا آپ پیش کر دیں تو لڑکے بے چارے کیا کر سکتے ہیں۔ ویسے میں تو شنید کو ہی قصوروار ٹھہراتی رہتی ہوں مگر ان لڑکیوں سے بھی خدا بچائے۔"

جب وہ تیار ہو کر ان کے ساتھ جا رہی تھی تو طاہرہ آنٹی نے اسے بہت غور سے دیکھا وہ پنک جارجٹ کے سوٹ میں دوپٹے کو کندھوں پر پھیلائے کتنی سادہ اور دل میں اتر جانے کی حد تک اچھی لگ رہی تھی۔ لمبے گھنے بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی بنائے۔ وہ آج کل کی لڑکیوں سے کتنی مختلف دکھائی دے رہی تھی۔ بالکل سادہ اور پروقار۔

☼ ☼ ☼

طاہرہ آنٹی جس لڑکی کو دیکھنے گئیں۔ ان کو وہ لڑکی تو اچھی لگی تھی مگر بہت بچپنا تھا اس میں جبکہ شنید میچور لڑکی چاہتا تھا۔ واپسی پر وہ اسے اپنے ساتھ ہی گھر لے آئیں۔ اس دن انہوں نے بڑی تفصیل سے اس معاملے پر گفتگو کی۔

"سچی بات تو یہ ہے انابیل۔ یہ لڑکیوں کو دیکھنے دکھانے کا سلسلہ بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ اللہ نے مجھے بیٹی نہیں دی لیکن مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ میں گھر گھر جا کر دوسروں کی بیٹیاں تنقیدی نظروں سے دیکھوں' اپنی خاطر تواضع کرواؤں اور پھر ریجیکٹ کر کے اپنے گھر آ جاؤں۔ سچ پوچھو تو یہ بہت تکلیف دہ عمل ہے۔ لڑکی والوں کو کتنا دکھ ہوتا ہے جب ایک بار جا کر دوبارہ کوئی جواب نہ دو۔ میں تو سمجھتی ہوں کسی فنکشن وغیرہ یا کہیں بھی بغیر بتائے کسی کو دیکھ لو تو وہ پھر بھی صحیح ہے' لیکن اسپیشل جا کر دیکھنا اور پھر ریجیکٹ کرنا ___ مجھے بہت برا لگتا ہے۔"

"جی آنٹی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"تم ہی کچھ بتاؤ مجھے مشورہ دو۔ کیا کرنا چاہیے مجھے؟"

"میں کیا بتاؤں آنٹی" وہ مسکرائی۔ "مجھے تو ایسا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ابھی فہد کی شادی بھی نہیں کرنی اس لیے کبھی اس قسم کی بات سوچی بھی نہیں۔"

"لڑکی تلاش کرنا بڑا مشکل مسئلہ ہے۔" وہ بولیں۔ "خدا کرے مجھے ایک اچھی سی بہو ملے۔ بزرگ کہتے ہیں آنے والی لڑکی پوری ایک نسل کی امین ہوتی ہے۔"

"جی آنٹی یہ تو ہے۔"

"تمہارے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں کیسی ہیں؟" انہوں نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔

"بہت اچھی آنٹی۔ میری ایک دو فرینڈز بھی بہت پیاری ہیں۔ اچھے خاندان کی لڑکیاں ہیں۔ لیکن آنٹی رشتہ شنید سے پوچھ کر کریں گی آپ؟"

"ہاں 'انتخاب میرا اور پسند اس کی ہوگی۔"

"آنٹی آئی جی اقبال صاحب کی بیٹی عالیہ۔ میری کلاس فیلو۔ وہ شنید کو پسند بھی بہت کرتی تھی۔"

"ارے ہاں 'ذہن سے نکل گیا۔ شنید کے لیے اس کا رشتہ آچکا ہے۔ ویسے بھی ان لوگوں کی بیٹیاں ہمارے گھروں میں کہاں رہ سکتی ہیں۔ ہمارے اور ان کے اسٹینڈرڈ میں بہت فرق ہے۔ ہم لوگ متوسط طبقے کے لوگ ہیں اور پھر شنید کے لیے اتنے بے شمار رشتے آئے ہیں کہ میں اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔"

"کیوں آنٹی! عالیہ اقبال تو بہت پیاری لڑکی ہے۔"

"پیاری تو ہے گڑیا 'مگر شرم و حیا بھی تو کوئی چیز ہے۔ آج کل تو طور طریقے سارے اصول ہی بدل گئے ہیں۔ پہلے زمانے میں لڑکے والے رشتے لے کر جاتے تھے مگر اب کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ اب لڑکی والے رشتے لے کر آتے ہیں۔ مجھے تو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھائی۔ عزت نفس بھی کوئی چیز ہے 'ہر کام وقار اور طریقے سے کرنا چاہیے۔ مجھے تو یہ سب پسند نہیں۔"

"آنٹی حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں کہ والدین بھی مجبور ہیں اور پھر اچھے رشتے ملتے کہاں ہیں۔ بس جو اچھا اور مناسب لگے۔ والدین انتظار کیے بنا خود لڑکے کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔"

"بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے۔"

"آنٹی اس بارے میں شنید کا کیا خیال ہے؟"

"وہ کہتا ہے میں نے اتنی فضول لڑکیاں دیکھی ہیں کہ میرا تو ان لڑکیوں سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کوئی لڑکی شریف ہو ہی نہیں ہو سکتی۔"

"آپ ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے آنٹی کچھ لڑکیوں نے باقی ساری لڑکیوں کو بدنام کر دیا ہے۔ کہتے ہیں نا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندا کر دیتی ہے تو یہی بات ہوئی ہے۔"

"ہاں انابیل بیٹا میں نے اسے کہا تھا۔ اپنی انابیل بھی تو ہے علی صاحب کی بیٹی۔ وہ آج کل کی لڑکیوں سے کتنی مختلف ہے۔ تم نے کبھی کسی لڑکے کو فون کیا ہے انابیل؟"

"نہیں آنٹی' لیکن بہت پہلے کی بات ہے جب لڑکیاں شنید کی آواز کے لیے پاگل ہو رہی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ مجھے عالیہ نے نمبر دیا تھا اور میں نے بھی اسے فون کیا تھا۔ صرف اس کی آواز سننے کے لیے۔" پتا نہیں کیوں وہ طاہرہ آنٹی سے جھوٹ نہیں بول سکی۔ "مگر شنید کو نہیں معلوم کہ میں نے بھی اسے فون کیا کیونکہ ان دنوں بہت سی لڑکیاں اسے فون کرتی تھیں یہ سب عالیہ نے بتایا تھا مجھے اور آدھے سے زیادہ لڑکیوں کو شنید کا نمبر بھی اسی نے دیا تھا۔"

"شنید نے تمہارے ساتھ کوئی غلط بات تو نہیں کی تھی؟" طاہرہ آنٹی جانے کیوں پریشان ہو گئی تھیں۔

"نہیں آنٹی بالکل نہیں۔ میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا' مگر اس نے بہت اچھے انداز اور نرم لہجے میں بات کی تھی' مگر یہ تو بہت بری بات ہے کہ میں دوستوں کی باتوں میں آگئی۔ لیکن آنٹی یقین کریں میں نے صرف دو بار بات کی تھی۔ اس کے بعد میں نے کبھی فون نہیں کیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا تھا اور میرے ضمیر نے بہت ملامت کیا اور میں نے اللہ سے رو رو کر اپنی غلطی کی معافی مانگی۔" اس نے نادم سے لہجے میں کہا۔ وہ واقعی ہی بہت شرمندہ تھی۔

"چلو کوئی بات نہیں اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔"

"طاہرہ آنٹی میں آپ کے ساتھ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔" وہ اپنے اس سچ پر بہت شرمندہ تھی۔ بالکل غیر ارادی طور پر وہ انہیں سب کچھ بتا بیٹھی تھی' لیکن اب پچھتانے سے کیا حاصل تھا؟ گھر آ کر وہ پریشان رہی بار بار یہی ایک خیال اسے ستا رہا تھا کہ طاہرہ آنٹی اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوں گی۔ وہ جو اس کے بارے میں اتنی اچھی سوچ رکھتی تھیں۔ انہیں اس کی اصلیت جان کر بہت صدمہ ہوا ہوگا مگر طاہرہ آنٹی کے ساتھ اس کی دوستی ہی ایسی تھی بے حد پر خلوص پر اعتماد۔ وہ انہیں کسی معاملے میں بے خبر نہیں رکھ سکتی تھی۔

آج کل بے قراریاں عروج پر تھیں۔ ایک اضطراب تھا جو سارے وجود میں رچ بس گیا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ پڑھائی میں بھی وہ مشکل سے دل لگاتی تھی طاہرہ آنٹی سے ملتی تو ایک عجیب سا سوز دل میں جاگ اٹھتا۔ وہ ان کے ساتھ باتیں کرتی۔ شنید کی شادی کے پروگرام سنتی اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے بھیگے رہتے اور لبوں پر سے ہنستی رہتی۔

طاہرہ آنٹی نے اس کی تبدیلی کو محسوس کیا۔ وہ بہت حیران ہوئیں۔ وہ پہلے تو اس طرح کبھی نہیں ہنستی تھی وہ اس سے بے تکلف تھیں ہر موضوع پر گفتگو کرلیتی تھیں۔ ہر بات پوچھ لیا کرتی تھیں اور وہ بھی اس کو ہر بات بتا دیا کرتی تھیں مگر وہ اس سے پوچھ ہی نہ سکیں۔ اس کے چہرے پر بکھرا ہوا سوز بھیگی بھیگی آنکھیں اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ۔ اس کی شخصیت ایک دم ہی بہت نئی' انوکھی اور بہت حسین لگنے لگی تھی انہوں نے سوچا۔

"یہ پیاری لڑکی اکیلے ہی اکیلے جانے کون سے صدمے سے گزر رہی ہے؟" وہ ضرور اس سے پوچھیں گی وہ جانتی تھیں' ایک دن بالکل اچانک وہ لمحہ خود بخود آجائے گا جب وہ پوچھیں گی اور وہ سچ سچ انہیں سب کچھ بتا دے گی۔ انہیں شک سا ہوا شاید آج کل وہ محبت کے صدمے سے گزر رہی ہے۔ کتنی شکستہ اور ٹوٹی پھوٹی ہوئی لگ رہی تھی وہ کون ہے؟

☼ ☼ ☼

اس دن جیسے اپنے آپ وہ فیصلہ ہو گیا یا شاید یہ تقدیر کا فیصلہ تھا۔ وہ بہت خوش ہوئیں بے حد مطمئن آج سے پہلے کبھی یہ خیال انہیں کتنی مرتبہ آیا تھا مگر وہ سوچ کے مراحل سے نکل کر کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی تھیں۔

انہوں نے سوچا شنید آجائے تو وہ اس سے بات کریں' مگر ابھی تو وہ پڑھ رہی تھی۔ تو کیا ہوا وہ اب فورتھ ایئر میں تھی۔ منگنی تو ہو ہی سکتی تھی۔ ایک سال گزرتے کتنی دیر لگتی ہے؟ ان کی خواہش تھی کہ وہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔ اناہیل سے زیادہ انہیں کوئی عزیز نہیں تھا اور پھر دونوں ایک پروفیشن میں ہیں۔ وہ بھی مزید پڑھ لے گی کچھ کرلے گی۔

اس رات انہوں نے شوہر سے بات کی تو وہ کھل اٹھے۔

"شکر ہے بیگم تمہارے ذہن میں یہ خیال تو آیا۔ میں تو کب سے اس انتظار میں تھا کہ تم کب یہ بات کرو گی۔ وہ لڑکی مجھے شروع سے پسند ہے اور میں نے تو پہلے ہی دن سوچ لیا تھا کہ یہ لڑکی ہماری بہو بنے گی۔"

"اچھا۔ تو آپ نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"میں نے سوچا تم ادھر ادھر گھوم لو' لڑکیاں دیکھ لو حالانکہ یہ لڑکیوں کو دیکھنے دکھانے کا سلسلہ مجھے بہت ہتک آمیز لگتا ہے۔ اسی لیے تو میں تمہارے ساتھ کبھی کسی کے گھر میں نہیں گیا اور تم اسی بے چاری کو ہر جگہ گھسیٹ کرلے جاتی تھیں۔"

"میرا خیال ہے وہ شنید کو پسند کرتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے' مگر شنید سے بھی پوچھنا پڑے گا۔"

"ظاہر ہے شادی تو اسی کی پسند سے ہوگی۔ زندگی تو اسی کو گزارنی ہے' میں زبردستی کا تو بالکل قائل نہیں ہوں' مگر شنید نے کبھی اناہیل کے بارے میں کسی رائے کا اظہار تو نہیں کیا۔

تم اب پوچھ لینا۔" طاہرہ کو آج شدت سے اس کا انتظار تھا مگر پتا چلا اس کا آج کوئی سیمینار تھا۔ وہ لیٹ گھر آئے گا۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ فون پر ہی اس

سے بات کریں۔ سخت بے چینی تھی نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ انہوں نے شہوز سے بات کی تو وہ خوشی سے ماں سے لپٹ گیا۔

"ونڈر فل آئیڈیا مما۔ انابیل اپیا سے اچھی لڑکی آپ کو مل ہی نہیں سکتی۔ اس روئے زمین پر ان سے زیادہ پیاری لڑکی تو ہو ہی نہیں سکتی۔"

"مگر ابھی تم کسی سے بات مت کرنا میں شنید سے پوچھ لوں۔"

"بھائی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے وہ اگر نہ مانے تو..." وہ شرارت سے ہنسا۔

"تو کیا ہو گا؟" وہ واقعی ہی پریشان ہو گئیں یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"تو اس لڑکی کو مس مت کیجیے گا مما! آپ کا یہ بیٹا حاضر ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ تم اس سے چھوٹے ہو۔" وہ ہنسنے لگیں۔

"مما صرف ایک سال چھوٹا۔ میڈیکل کالج کا سب سے ذہین طالب علم ہوں۔ ایک سال بعد ڈاکٹر بن جاؤں گا۔"

"کیا تم سنجیدہ ہو؟" وہ پریشان ہو گئیں۔

"نہیں مما۔ میں تو مذاق کر رہا ہوں۔ انابیل اپیا تو مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہیں۔ دراصل میں خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں۔ اس لیے منہ سے الٹا سیدھا نکل رہا ہے۔ اس سے اچھی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اس گھر میں آجائیں گی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں مما میں کس قدر خوش ہوں۔" وہ اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا تھا وہ اپنے کمرے میں آگئیں۔ اگلے دن انہوں نے شنید سے بات کی۔

"شنید۔"

"جی مما۔"

"میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہارے لیے لڑکی دیکھ دیکھ کر تھک گئی ہوں۔ پتا نہیں تمہارے نصیب کی لڑکی کہاں چھپی ہے۔"

"مما وہ شاید ابھی پیدا نہیں ہوئی۔" وہ مذاق میں بولا۔

"پیدا تو ہو چکی ہے مگر آج تک میں اسے ڈھونڈ نہ سکی۔"

"مما پھر کب تک مجھے کنوارہ رکھنے کا ارادہ ہے؟" وہ شرارت سے ہنسا۔

"تم خود ہی اپنی پسند بتا دو تو میرے لیے کتنی آسانی ہو جائے؟"

"مما میں نے آپ کو بتایا ہے نا آج کل کی لڑکیوں نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ ان لڑکیوں کے ساتھ دوستی تو کی جا سکتی ہے۔ تفریح بھی کی جا سکتی ہے فلرٹ بھی کیا جا سکتا ہے۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔ ماں سے کافی بے تکلف تھا ہر بات کر لیا تھا۔ "مگر مما ان سے شادی نہیں کی جا سکتی۔ شادی تو ایک شریف لڑکی کے ساتھ ہی کی جا سکتی ہے نا۔"

اور بیٹے کے خیالات جان کر طاہرہ کو بے حد خوشی ہوئی۔

"شنید تمہارا انابیل کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"انابیل... ہوں۔" وہ متوجہ ہوا ان کی طرف اور سر کھجانے لگا۔

"انابیل واقعی ہی مختلف ہے۔ اس کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔"

"تو پھر تم سوچ لو۔ مجھے تو وہ بہت پسند ہے۔ تمہارے پاپا کو اور شہوز کو بھی۔"

"مگر مما وہ تو ابھی پڑھ رہی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا اس کے آج کل دو تین رشتے آئے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہو اس کے والدین کوئی فیصلہ کرلیں۔ اس کی منگنی وغیرہ نہ کر دیں۔"

"تو پھر مما آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"میں چاہتی ہوں تمہارے نام کی انگوٹھی اسے پہنا دوں تاکہ اس کے سارے حقوق تمہارے لیے محفوظ ہو جائیں۔"

"چلیں ٹھیک ہے، مگر پہلے آپ اس سے تو معلوم

کرلیں۔ سارے فیصلے آپ نے خود ہی کرلیے۔"

"اب یہ کام خود کرو گے۔ کل اس سے مل کر اس کے خیالات معلوم کرلینا۔"

"ارے نہیں مما۔" وہ گھبرا گیا۔ "وہ ایک شریف لڑکی ہے۔ میں جانتا ہوں اس کی ریپوٹیشن بہت ہی اچھی ہے اس کے پروفیسر اور تمام لڑکے اس کی بہت عزت کرتے ہیں کسی میں اتنی جرات ہی نہیں کہ اس سے کوئی بات کرسکے۔"

"مگر تمہاری تو دوسری بات ہے تم اس کے پروفیسر ہو نہ کلاس فیلو۔ اور میرا خیال ہے وہ تمہیں پسند بھی کرتی ہے۔"

"ارے میری خوش فہم مما مجھے آج تک اس نے ایسا کوئی امپریشن نہیں دیا۔"

"اس لیے کہ وہ ایک شریف لڑکی ہے۔" وہ بڑے فخر سے مسکرائیں۔ "میرا انتخاب تمہاری پسند ہے نا؟"

"پتا نہیں میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔" وہ خاموش ہو گیا۔

مما نے اسے ڈسٹرب کرکے رکھ دیا تھا۔ بے شک اس نے اس طرح کبھی سوچا نہیں تھا مگر لاشعوری طور پر دل کی گہرائیوں میں کہیں اس کے لیے پسندیدگی اور احترام کے جذبات موجود تھے اور اس کے دل میں ایک دم ہی ایک خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ کمال ہے اس نے آج سے پہلے اس طرح کیوں نہیں سوچا تھا؟ اس کے ذہن میں اناہیل کا خیال کیوں نہیں آیا تھا؟ شریک حیات کے لیے اس کے ذہن نے جس لڑکی کا سراپا تراشا تھا وہ اس سے بہت قریب تر تھی اور آج اس کا دل اس کے نام پر ایک نئے انداز سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے تصور میں اس اس کا خوب صورت اور پروقار خاموشی اور سادہ وجود خوشیوں کے دھنک رنگ کی طرح ابھر رہا تھا۔ جانے کیوں آج بہت دنوں بعد اسے اس لڑکی کا خیال آرہا تھا جو اس کے اتنی قریب تھی اور وہ اس سے غافل رہا۔

وہ سارا وقت پریشان رہا وہ اس کو کیا کہے گا۔ یہ مما نے کتنا مشکل کام اس کے ذمے لگا دیا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے مما کو کہا تھا کہ وہ خود ہی معلوم کریں وہ اناہیل سے ایسی بات نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اس طرح کی لڑکی ___ نہیں ہے اور اس کی ہمت نہیں ہو رہی اناہیل سے کچھ پوچھنے کی۔ یہ ذمے داری ان کے کندھوں پر ڈال دی۔

☼ ☼ ☼

وہ کالج سے لوٹی ہی تھی کہ وہ گھر پہنچ گئیں۔

وہ سادہ سے حلیے میں بے حد سادہ اور پروقار لگ رہی تھی۔ سادہ سا جوڑا پہنے میک اپ سے بے نیاز معصوم۔ تروتازہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا چہرہ۔

"بیٹا میں نے شنید کے لیے لڑکی پسند کرلی ہے۔ میرے ساتھ شاپنگ کے لیے بازار چلنا ہے' منگنی ہو رہی ہے نا شنید کی۔"

"کیا۔۔۔؟" اس کے گلاب چہرے پر سیاہ بدلی سی چھا گئی اور وہ ساکت کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ کتنی خوش دکھائی دے رہی تھیں اور اس کا دل غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ آنسوؤں کا ساگر آنکھوں میں مچلنے لگا تھا۔ اس نے پلکیں جھکالیں۔

طاہرہ آنٹی نے دیکھا وہ بے چینی سے انگلیاں موڑ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے وہ کتنی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

"کس کے ساتھ ہو رہی ہے منگنی؟" اس کی آواز میں بھی آنسوؤں کی لرزش تھی۔ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کررہی تھی۔

"بس اچانک ہی ایک لڑکی پسند آگئی ہے۔"

"اچھا۔" اس کے لہجے میں ہزاروں سالوں کی تھکن اور دکھ تھا۔

"کتنی دیر میں بازار چلو گی؟"

"کیا بہت جلدی ہے آنٹی؟"

"ہاں انگوٹھی خریدنی ہے۔ لڑکی کو بھی ساتھ لے کر جانا ہے۔ میں اس کی پسند کی انگوٹھی خریدنا چاہتی

ہوں۔"

"تو پھر میری کیا ضرورت ہے۔" وہ دکھ سے بولی۔ "آپ اسے لے جایئے نا۔ منگنی اس کی' انگوٹھی اس کی' پسند اس کی۔"

وہ بہت محظوظ ہوئیں اور بولیں۔

"دراصل مجھے تمہاری عادت سی پڑ گئی ہے تمہارے بغیر مزا ہی نہیں آتا۔"

انابیل کا دل چاہا صاف انکار کردے' مگر وہ ان کے سامنے کسی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی' لیکن جو وہ معلوم کرنا چاہتی تھیں کر چکی تھیں۔ وہ سوال جو انہوں نے ابھی تک نہیں کیا تھا اور جواب بھی مل گیا تھا۔

پھر وہ اسے کہتی ہوئی چلی گئیں۔ "تم تھکی ہوئی لگ رہی ہو شام کو چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے آنٹی۔" وہ مان گئی۔

بستر پر گر کر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہزاروں میلوں کی مسافت کے بعد وہ اتنا زیادہ تھک چکی ہے کہ اب وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکے گی۔ وہ رو رہی تھی آنسو اپنے آپ گر رہے تھے اور اس کا تکیہ بھیگتا جا رہا تھا کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے جیسے اس کے ساتھ ہوا۔ اسے طاہرہ آنٹی کے رویے پر بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ کیسی منافقت کی تھی انہوں نے اسے اتنا پیار' خلوص اور محبت دے کر ایک دوسری لڑکی کو اپنی بہو منتخب کر لیا تھا' مگر اس میں طاہرہ آنٹی کا کیا قصور۔ شنید نے اسے کبھی پسند ہی نہیں کیا تھا اور آنٹی بھی ہمیشہ اسے اپنی بیٹی کہا کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ کہتیں۔

"کاش انابیل تم میری بیٹی ہوتیں۔"

اور وہ اکثر سوچتی "آنٹی بیٹی' بہو بھی تو بن سکتی ہے۔"

مگر یہ تو اس کی اپنی سوچ تھی نا۔ انہوں نے تو کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔ ایسا نہیں چاہا تھا اور انابیل کے جذبات اور خیالات کا انہیں کیا علم؟ وہ روتے روتے سو گئی۔ جانے کب اس کی آنکھ لگی تھی۔

اگلے دن ایک اہم ٹیسٹ تھا مگر وہ ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکی۔ شام کو وہ اپنے کمرے سے نہ نکلی۔ طاہرہ آنٹی ان کی طرف آئیں وہ ان سے ملنے کے لیے باہر آئی۔ انہوں نے اسے دیکھا تو وہ چونک گئیں۔ وہ کتنی بکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ روتے رہنے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں' لمبے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے معصوم چہرے پر جانے کیا تھا کہ انہیں اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوش ہو کر احترام سے ملی تھی۔

طاہرہ آنٹی نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ انہوں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں سمندر اترے ہوئے تھے۔

انابیل نے معذرت کرلی۔ "آنٹی آج میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ کل چلوں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ لڑکی تمہیں بھی بہت پسند آئے گی۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ شنید بھی بہت خوش ہے۔" اس نے ان کو مبارک باد دی۔

وہ اس کے ضبط اور حوصلے پر حیران تھیں۔ انکل نے بھی اس کے کمرے میں آکر پیار کیا اس کی طبیعت پوچھی اور اس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھتے رہے وہ سرشار سی ہو گئی' مگر اس کے جذبات میں تلخی کی ایک لہر سی ابھری۔ اگر یہ لوگ اسے اس حد تک چاہتے تھے اور پسند کرتے تھے تو پھر۔ وہ خود میں ابھی اپنے کمرے سے باہر نہ نکل سکی اور اسے پتا بھی نہیں چلا باہر اس کی تقدیر کا فیصلہ بھی ہو گیا۔

پاپا اور ممی کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ دونوں کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انابیل کا مقدر اتنا زبردست بھی ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں دل سے شنید کو پسند کرتے تھے اور منگنی کے بجائے — نکاح کی تاریخ رکھ لی۔ تین بعد دونوں کا نکاح تھا اور ان تین دنوں میں کسی نے اس کو خبر نہ ہونے دی کہ کیا ہو رہا ہے اور وہ اپنے ہی دکھ پر تین دن میں برسوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ وہ کالج سے لوٹی تو اسے معلوم ہوا گھر میں کوئی فنکشن ہے وہ کندھے اچکاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اتنے میں انکل' آنٹی شنید اور شہزاد اس کے کمرے میں چلے

آئے اور انکل نے تو اسے اپنے سینے سے لگالیا اور پھر جو خبر اسے سننے کو ملی۔ اس کے تو ہوش اڑ گئے۔ اسے ایک دم ہی رونا آگیا تھا۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ طاہرہ آنٹی نے اس کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اسے پیار کیا۔

"یہ ساری شرارت شنید کی تھی۔ اسی کی پلاننگ تھی کہ تمہیں سرپرائز دیا جائے اور مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ میں اچھی طرح اس روز کی باتوں سے اندازہ لگا چکی تھی تم شنید کو پسند کرتی ہو اور میں نے سب شنید کو بتایا تو اس نے پلاننگ کرلی اور یوں تمہیں سرپرائز دینے کے چکر میں پریشان رکھا۔"

باہر بے حد ہنگامہ تھا۔ مہمان آچکے تھے اور کچھ آرہے تھے وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

طاہرہ آنٹی نے ساری چیزیں اس کے کمرے میں پہنچادی تھیں۔ اتنے سالوں سے وہ اسے جانتی تھیں۔ اس کی پسند ناپسند سے واقف تھیں ہر چیز عین اس کی پسند کے مطابق تھی اور اگر نہ بھی ہوتی تو کیا فرق پڑتا؟ شنید تو اس کی اولین پسند تھا اور اس کا تھا۔ واقعی جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔

وہ آسمان سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اس طرح تیار ہوئی تھی۔ نکاح کے بعد اسے شنید کے پہلو میں لاکر بٹھادیا گیا تھا۔ طاہرہ آنٹی نے اسے دیکھا تو اس کی پیشانی چوم لی۔

وہ اتنی حسین اور رنگین شام تھی کہ ہر چیز پہ خواب کا سا گمان ہورہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا شنید اس کے قریب بیٹھا ہے اور متاع جسم و جاں بن چکا تھا۔ آج صبح تک اس کا دل کس طرح مرجھایا ہوا تھا اور اب۔

لیکن اسے یوں اس روپ میں دیکھ کر وہ بے قرار ہوگیا اور اس نے ضد کی کہ رخصتی بھی آج ہی ہوگی اور سب اس کی ضد کے سامنے ہار گئے اور رخصتی کردی گئی۔ اس نے اناہیل کا ہاتھ تھام لیا اور جھک کر اس کی سماعتوں میں رس انڈیلنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنی تقدیر پہ نازاں تھی کہ اسے اتنا اچھا ہینڈسم، خوب صورت اور محبت کرنے والا شوہر ملا تھا۔ ہنی مون کے لیے شمالی علاقہ جات کی سیر کا پروگرام بنایا تھا۔ اس نے خوشی خوشی تیاریاں مکمل کرلیں اور سب گھر والوں نے انہیں دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ اناہیل بہت خوش تھی۔

دونوں نے خوب ہوٹلنگ کی۔ چیرلفٹ اور کیبل کار میں بیٹھ کر فضاؤں اور خلاؤں میں اپنے لیے نئے افق تلاش کرتے رہے۔ پہاڑوں اور سیاروں کے اسرار میں گم ہو کر نئی زندگی کے لمحے لمحے سے خوشیاں کشید کیں۔ لیکن اناہیل کے لیے یہ دنیا اور شادی کے بعد یہ خوابناک شب و روز بالکل نئے، حیران کن اور مسرتوں سے لبریز تھے وہ سب کچھ بھول کر سنہرے بادلوں اور کہساروں میں اڑتی پھری یہ خوب صورت لمحے، یہ عرصہ اسے شنید کے بہت بے حد قریب لے آیا تھا۔

دو ماہ کے بعد وہ تحائف سے لدے پھندے واپس آگئے اور اسے لگا جیسے وہ اچانک کسی خواب سے بے دار ہوئی ہو۔

خوشیوں کے ہنگامے وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی، مگر اس کا نشہ احساس میں خوشبو کی طرح دوڑ رہا تھا۔ شنید نے ان تاریخی اور خوب صورت لمحوں کو کیمرے میں قید کرلیا۔ تاکہ ان خوش گوار لمحوں کو دیکھ کر خوش ہولیا کریں گے یہی تو یادگاریں ہوتی ہیں جو سدا قائم رہتی ہیں۔

اناہیل بڑے کھلے دل کی لڑکی تھی۔ اس نے اپنے ذہن سے ہر اس سوچ کو جھٹک دیا جس سے اس کی خوش گوار زندگی متاثر ہوتی تھی اور نہ ہی شنید کو یہ احساس ہونے دیتی تھی کہ وہ اس کی کسی بات پر ناراض ہے یا کوئی بات بری لگی ہے اسے۔ وہ معمول کے مطابق ہنستی کھلکھلاتی رہتی اور شنید کا موڈ بھی باغ و بہار ہوجاتا۔ اپنی امی کے گھر جاتی تو دو چار گھنٹے رہ کر پھر سسرال آجاتی۔ شنید اسے چھوڑتا ہی نہیں تھا اور گھر

بھی کون سا کوسوں دور تھا دو قدم کے فاصلے پر تو تھا۔

آج کل ان کا بنگلہ تعمیر ہو رہا تھا۔ اس نے دور سے ہی دیکھا تھا۔ وہ بڑے شوق اور دلچسپی سے زیر تعمیر اپنا بنگلہ دیکھنے جانا چاہ رہی تھی جو اب تقریباً" مکمل ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے شنید سے کہا۔

"شنید چلیے آج بنگلہ دیکھنے چلیں۔ میں اپنا کمرہ دیکھنا چاہتی ہوں اور اس میں کچھ خصوصی ترمیم کے ساتھ رنگ و روغن کا انتخاب کروں گی اور لان میں آپ نے گل مہر' چمپا' نار' سنگھار اور سکھ چین کے درخت لگوائے اگر نہیں تو میں خود مالی کو سمجھادوں گی کہ وہ کیسے پودے اور درخت لگائے۔" اور وہ سر جھکائے فائل میں مصروف ہوں ہاں کرتا رہا۔ انابیل نے آہستگی سے فائل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شنید پلیز' فائل پھر دیکھ لیجیے گا پہلے میری بات سن لیجیے۔"

"اوہ' اچھا اچھا' تم کچھ کہہ رہی تھیں انا جی۔" وہ دھیمی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور وہ پاس صوفے پر دھم سے گر پڑی۔

"یا اللہ میں اتنی دیر سے جھک مار رہی تھی کیا؟"

"نہیں بالکل نہیں میں نے سب سن لیا۔ کہو تو دہرا دوں۔" وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔

"اچھا بتائیے میں نے کیا کہا تھا؟"

"تم نے کہا تھا کہ مالی کو بلوا کر ہدایت کروں کہ لان میں ایک نیم کا' ایک پیپل' ایک برگد' ایک جامن کا درخت لگادے تاکہ ساون میں جھولا جھولنے کی آسانی ہو۔"

"شنید پلیز۔" وہ صدمے سے چیخ پڑی۔

"ارے میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟" وہ نہایت معصومیت سے بولا۔

"بالکل آپ کوئی بات غلط کر ہی نہیں سکتے۔ اچھا آگے بتائیے۔" انابیل نے اپنی مسکراہٹ کو روکتے ہوئے کہا۔

"اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ لان کے مشرقی کنارے دیوار پر چند کابک۔ کبوتر' چڑیوں اور مرغی کے بچوں کے لیے بنوادوں۔ تمہیں کبوتر اچھے لگتے ہیں نا غٹر غوں غٹر غوں کرتے ہوئے؟"

اور اب اسے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ بجائے غصے کے وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آپ لان بنوا رہے ہیں یا چڑیا گھر؟"

وہ بھی مسکرا دیا۔ "شوری انا میں کل مالی کو خود لے کر آجاؤں گا ابھی وہاں بڑا رش ہے کام کرنے والوں کا۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر ایک بات بتا دیجیے میرے کمرے کی کھڑکی لان میں کھلتی ہے نا تاکہ پھولوں کی خوشبو سے میرا کمرہ مہکتا رہے اور میں صبح صبح باغ کا نظارہ کرسکوں۔ مجھے پھول بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ مجھے ایک بار تو لے چلیں نا وہاں۔" اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیا۔

"افوہ یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے۔" وہ ہنس پڑا۔

"ضرور لے چلوں گا جانو دو چار دن اور ٹھہر جاؤ۔"

"چلیں ٹھیک ہے' اگلے ہفتے تک ضرور جاؤں گی۔" وہ بہل گئی۔

اور اس نے دوسرے دن مالی کو بھیج دیا۔ انابیل لان میں بیٹھی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔

"سلام بیگم صاحبہ۔" وہ چونک پڑی۔ اتنے میں شنید آگیا۔

"انا مالی آگیا اب تم خود ہی اس سے بات کرلو۔ میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔" انا نے اس کا پورا انٹرویو لیا پھر ہدایات دینے لگی کہ اسے وہاں کس قسم کے پھول پودے اور درخت لگانے ہیں اور وہ سر جھکائے اقرار میں گردن ہلاتا رہا۔

"جی بیگم صاحبہ جیسے آپ کا حکم کریں گے۔" اور پھر وہ چلا گیا۔

اور بہت جلد وہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ شہوز اسپیشلائزیشن کے لیے باہر چلا گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

شنید کے سنگ۔ بہت جلد اس کی روٹین لائف شروع ہوگئی۔ اس نے اپنا آپ شنید کے لیے وقف کردیا۔ اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی۔

"جانو بہت کاہل بنادیا ہے تم نے مجھے۔" وہ اکثر شکوہ کرتا۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں جب میکا چھوٹتا ہے تو ہر لڑکی کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ میکے جائے اس نے ان دنوں میں ایک بار بھی پھر شنید سے اصرار نہیں کیا تھا کوئی ضد نہیں کی وہ حیران ہوجاتا۔

"یار کہیں تم پتھر کی تو نہیں بنی ہوئی ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمہیں کبھی کوئی یاد نہیں آتا۔ پاپا' ممی منہد۔"

"ایمان سے آپ نے سب بھلادیا ہے شنید۔"

اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اس سے ایک پل دور ہونے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ دل ہر وقت اس کے قریب اور اس کی چاہت' پیار کا تمنائی ہوتا۔ شنید علی کا دل زور سے سینے میں دھڑکا اس پر ٹوٹ کر پیار آیا اس لڑکی کے چہرے پر کتنا بھول پن اور انداز میں کیسی معصومیت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے یہ بولتی رہے اور میں سنتا رہوں۔

"انا یار کوئی اچھا سا گیت سناؤ۔"

"ریکارڈ آن کروں؟"

"نہیں تم۔" اس نے فوراً ہی مان لیا۔

"کیا سناؤں؟"

"کوئی ایسی چیز جو اس سچویشن کے عین مطابق ہو۔"

"آپ خود ہی بتادیں۔" کچھ دیر بعد وہ سوچ کر بولی۔

"نہیں تم خود ہی سناؤ۔"

"اچھا۔" اس نے ایک بہت ہی خوب صورت گیت سنایا۔ گیت سن کر شنید مدہوش سا ہوگیا۔ اس کے بالوں میں چہرہ چھپا کر گنگنا اٹھا۔

☼ ☼ ☼

آج کل شنید اتنا مصروف ہوگیا کہ راتوں کو دیر سے آتا اور صبح ہی نکل جاتا۔ اناتیل اس سے بات ہی نہ کرپاتی۔ وہ انتظار ہی کرتی رہتی اور وہ چادر تان کر سوجاتا۔ صبح وہ ابھی سوئی ہوئی ہوتی کہ وہ چلا جاتا۔ وہ سخت الجھن میں پڑگئی کہ آخر ایسی کیا مصروفیت تھی۔ آخر ایک دن اس نے مما سے پوچھا۔

"مما آج کل شنید گھر دیر سے کیوں آرہے ہیں اور صبح بھی جلدی ہی چلے جاتے ہیں؟" طاہرہ نے اسے گلے لگالیا اور پیار سے بولیں۔

"فکر کیوں کرتی ہو آج کل آفس کے کسی کام میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ اس وجہ سے مصروف ہے جیسے ہی فارغ ہوگا تمہیں سب بتادے گا۔"

مما کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز اور گہری مسکراہٹ تھی۔ اور وہ سر اثبات میں ہلاتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ آخر ایسی کون سی مصروفیت ہے جو شنید اس سے چھپا رہا تھا۔ ایسی کون سی انوکھی بات تھی جو اس سے کہی نہیں جاسکتی تھی۔ آخر کو اس کی رفیق زندگی نصف بہتر اور اس کے دکھ سکھ کی ساتھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور سینے پر کوئی ان جانا بوجھ آگرا۔

وہ سخت کشمکش میں شنید کا انتظار کررہی تھی۔ آج وہ اس سے پوچھے بغیر نہیں رہے گی رات کو وہ جلدی آگیا بہت خوش تھا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے مٹھائی کا ڈبا میز پر رکھ کر اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔

"میں جانتا ہوں۔ تم ناراض ہو' شاکی ہو مگر میری پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ تم سے کچھ وضاحت کرسکوں۔"

وہ خاموش ہوا تو وہ اس کے سینے سے لگ کر آنسو بہانے لگی۔ اور وہ ہنس ہنس کر اس کے آنسو پونچھتا رہا۔ پھر اسے بیڈ پر بٹھا کر بولا۔

"یہ لو زبردست خوش خبری کے ساتھ منہ میٹھا کرو۔" اس نے رس ملائی اٹھا کر اس کے منہ میں زبردستی ٹھونس دی۔ اس نے جیسے تیسے رس ملائی

حلق سے اتاری اور بولی۔
"مٹھائی تو آپ نے کھلادی۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ یہ کس سلسلے میں آئی ہے۔"
"ہاں یہ ہوئی نا بات۔ شادی سے پہلے میں کمپنی کی طرف سے باہر جانا چاہتا تھا جس کے لیے میں نے اپلائی کیا ہوا تھا۔ اب لندن کی فرم سے میری کال آگئی تو میں۔۔۔"
"کیا آپ لندن جارہے ہیں مجھے تنہا چھوڑ کر۔" وہ اٹھی اور رخ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔
"یہ کس نے کہا۔؟" اس نے اٹھ کر دونوں شانوں سے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔
"آپ نے ابھی۔"
"تم نے میری بات پوری نہیں سنی۔ میں اس چکر میں تھا کہ ساتھ میں تمہارا ویزا بھی مل جائے لیکن نہیں مل سکا تو میں نے جانے کا پروگرام کینسل کردیا۔ کیونکہ اب میں بھی تم بن تنہا نہیں رہ سکتا۔" وہ اس کا گال تھپتھپا کر بولا۔
"تو آپ نے اتنے دنوں مجھے ستایا ہے میں پل پل کا حساب لوں گی آپ سے۔" وہ پیار سے اٹھلائی۔
"بندہ حاضر خدمت ہے محترمہ۔ جب چاہیں اپنی اداؤں کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر زخمی کردیں۔" اس نے سر خم کرتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑی۔
"اگلے بندے کو زیر کرنے کے سارے حربے آتے ہیں جناب کو۔"
"اس کھیل کا بڑا پرانا کھلاڑی ہوں محترمہ۔" اس نے انابیل کے گال پر رقص کرتی زلف انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرادی۔ اور یہی خبر سنانے کے لیے وہ انابیل کے گھر اس کی ممی سے ملنے کے لیے آئے۔
"بیٹا تم نے بہت اچھا کیا۔ ابھی شادی کو چھ ماہ بھی نہیں ہوئے اور تم باہر چلے جاتے اور ضرورت بھی کیا ہے۔ ابھی تو ہم لوگوں کو ساتھ رہنا چاہیے۔ یہ ہی دن تو ہوتے ہیں زندگی انجوائے کرنے کے پھر تو زندگی کی الجھنیں مسئلے مسائل ہی اتنے ہوجاتے ہیں کہ دو گھڑی مل کر پیار سے بات کرنے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔" ان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
"ممّا کا بھی یہی کہنا تھا کہ مجھے ابھی نہیں جانا چاہیے اور جاؤں تو انا کو ساتھ لے کر جاؤں مگر انا کا ویزا نہیں مل سکا تو میں نے جانے کا پروگرام کینسل کردیا۔"
"ہاں تو اور کیا بیٹا ابھی تک تو تمہاری دعوتیں باقی ہیں۔ وہ تو کھالو۔"
"بیٹا بیگم کی بات مان لو۔ یہ کم ہی کسی پر مہربان ہوتی ہیں۔ آج تک ہم اس فرصت کے انتظار میں ہیں جب ہم سے دو گھڑی پیار سے بات کرسکیں۔" پاپا نے کہا تو شنید بھی ہنس دیا۔
"پاپا یہ آپ سب کی قدر افزائی ہے۔ اس ضمن میں مجھے اپنی خوش قسمتی پر رشک ہے کہ آپ سب لوگ بہت محبت کرنے والے ملے۔ لیکن ایسے چانس کم ہی ملتے ہیں۔ مگر میں نے ایک لمحے کے لیے یہ نہیں سوچا کہ پھر کبھی زندگی میں ایسا چانس ملتا ہے کہ نہیں۔ بس آفر ریجیکٹ کردی۔ آپ ابھی سے دعوتوں کا اہتمام شروع کردیں۔ روز ایک دعوت اور یہاں نہیں فائیو اسٹار ہوٹل میں۔" وہ زور سے ہنسا تو ماحول میں ایک خوش گوار احساس پیدا ہوگیا۔ اور سب کے چہروں پر ہنسی دوڑ گئی۔
"آپ جہاں کہیں گے وہیں دعوتوں کا اہتمام ہوگا۔ بس آنے کا وقت بتادیجیے۔" ممّا نے پیار سے شنید کو کہا۔ انابیل کے حوالے سے وہ سب کو ہی بہت عزیز ہوگیا تھا۔
"شکریہ آپ سب کی محبتوں کا۔"
پھر میز پر کھانا لگادیا گیا۔ اور کھانا کھا کر کافی کا دور چلا اور پھر وہ دونوں چلے گئے۔ اور یہ لوگ شنید اور انابیل کی خوش گوار زندگی کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور ساتھ میں دعا بھی کہ انہیں نظر بد سے بچائے۔

✿ ✿ ✿

"ہم اب ساتھ نہیں چل سکتے انابیل۔"
وہ آج پورے پانچ سال بعد کہہ رہا تھا۔

"کیوں اب کیا ہو گیا اور کیا برائی نظر آنے لگی مجھ میں؟" انابیل نے اسی دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"تمہارے پیار میں وہ شدت نہیں رہی جو پانچ سال پہلے تھی۔ میں نے لاکھوں روپیہ برباد کر دیا مگر تمہاری گود سونی کی سونی ہی رہی۔ اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اس کمی کو سینے سے لگا کر رکھوں مجھے بھی اولاد کی ضرورت ہے۔ اور اس حق سے مجھے دنیا کا کوئی فرد محروم نہیں کر سکتا۔ بچوں سے تو زندگی میں بہاریں آتی ہیں مگر خزاں میرا مقدر بن گئی ہے۔" زندگی میں پہلی بار وہ شنید کو غصے میں دیکھ رہی تھی۔ وہ چیخ رہا تھا۔

"ایک بانجھ عورت کے ساتھ زندگی گزارنا خود کو تباہ کرنا ہے۔ ایک لاش کے پاس جتنے بھی تازہ پھول رکھ دو۔ مرجھا جاتے ہیں۔ محرومیاں چہرے پر لکھی ہوئی ہیں میرے۔" وہ ساکت وصامت بیٹھی تھی۔

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم عجیب ہو رہی ہو۔ میں تمہیں شوپیس کی طرح سجائے تو نہیں رکھنا چاہتا۔ تم یوں مجھے ٹکر ٹکر خاموشی سے دیکھتی رہو۔ جو میں کہوں وہ مان لینا۔ کوئی ضد کوئی فرمائش کوئی بات ہے تم میں بیویوں والی۔ تمہیں شاپنگ کا شوق نہیں ہے۔ نہ ہی تم پارٹیز میں جاتی ہو۔ اور یہ سب مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"یہ جانتے ہیں آپ ایسا کیوں ہوا؟ میرا کوئی کام، میری کوئی بات، میرا کوئی لباس، کوئی رنگ، کہیں باہر جانا پسند ہے آپ کو؟ ہر چیز میں نقص نکالتے ہیں۔ ہر بات میں روک ٹوک کرتے ہیں۔ اور بات بات میں بانجھ پن کے طعنے دیتے ہیں۔ کیا اولاد کا نہ ہونا میرا قصور ہے؟ کون سی عورت نہیں چاہے گی کہ اس کی گود ہری ہو۔ اس کے آنگن میں پھول کھلیں۔ دعا اور دوا کے بعد بھی اولاد سے محرومی ہے تو یہ اس کی رضا ہے۔ اس کی بہتری ہے۔ اس کی کوئی مصلحت ہے جب ہم دونوں پرفیکٹ ہیں تو اولاد کا نہ ہونا ہمارا قصور نہیں۔ یہ سب اس کی حکمتیں ہیں جب جس کو چاہے اپنی رحمت سے نواز دے اور جس کو چاہے محروم رکھے۔ پھر ہم کون ہوتے ہیں۔ اس کے کام میں دخل اندازی کرنے والے۔ کیوں بھول گئے ہیں یہ ساری باتیں آپ مجھے ہی کیوں قصوروار سمجھتے ہیں؟ اس لیے نا کہ یہ دنیا مردوں کی ہے۔"

انابیل آج بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ اس کے اندر گھٹن اتنی بڑھ گئی تھی کہ سانس لینا بھی اس سے دشوار ہو گیا تھا۔ آج وہ پھٹ پڑی۔

شنید نے چابیاں اٹھائیں اور باہر نکل گیا۔ وہ اسے روک بھی نہ سکی۔ "یہ کیسی بے حسی ہے خدایا" ایسی بے حسی تو اس وقت چھایا کرتی ہے جب کچھ ہونے والا ہو۔ خدایا رحم۔ اب کیا ہونے والا ہے۔" وہ سسک اٹھی۔

✲ ✲ ✲

پوری رات بیت گئی۔ وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ اذانیں ہوئیں تو وہ حواس باختہ مما کے کمرے کی طرف دوڑی۔ مما بیدار ہو چکی تھیں۔

"مما شنید کہاں ہیں، رات بھر گھر نہیں آئے۔"

"وہ تم سے خفا ہے بیٹی میرے کمرے میں سو رہا ہے۔" مما نے اسے پیار کر کے تسلی دی اور خود باہر نکل گئیں۔ وہ بے قراری سے اس پر جھک آئی۔

"شنید کیوں خفا ہوتے ہیں مجھ سے۔ مر جاؤں گی کسی دن۔" وہ بری طرح سسک پڑی۔

شنید نے آنکھیں کھول دیں۔ سویا تو وہ بھی نہیں تھا۔ ساری رات۔ اب ذرا آنکھ لگی تھی تو انابیل نے آکر جگا دیا تھا۔ انابیل کی آنکھوں کے رتجگوں سے لگ رہا تھا رات بھر سو نہیں پائی ہے۔ رات کی کہانی اس کی آنکھوں میں تحریر تھی۔

"شانی کبھی مجھ سے خفا نہ ہونا۔" وہ ایک ہی بات کیے جا رہی تھی۔ وہ مسکراتا رہا۔ "اپنے کمرے میں چلو اب۔"

"چلو۔"

وہ فوراً ہی اٹھ بیٹھا صلح تو ہو گئی تھی۔ لیکن شنید کے دل میں گرہ سی پڑ گئی۔ جس بات پر اس نے اتنا عرصہ دھیان نہیں دیا تھا۔ اب بطور خاص نوٹ کرنے لگا

تھا۔ عام بیویوں والی ضد' نخرے' ادائیں اس میں نہیں تھیں۔ شاپنگ کی بھی شوقین نہیں تھی۔ ٹی وی عیث کسی چیز کی بھی تو وہ شوقین نہیں تھی۔ عجیب بوڑھی روح سمائی ہوئی تھی اس میں۔ وہ بہت زیادہ نوٹ کرنے لگا تھا۔ اور جب دوسروں کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کو نظر انداز کردینے کا حوصلہ باقی نہ رہے تو حالات اکثر دگرگوں ہوجایا کرتے ہیں۔ شنید کو اناہیل سے محبت تھی۔ لیکن اب وہ اس کی عادتوں اور سادگی سے گھبرانے لگا تھا۔ حالانکہ وہ اچھی بیوی اور اچھی بہو ثابت ہورہی تھی اس کے باوجود یہاں تک کہ ایک دن شنید نے یہ مسئلہ اپنی مما کے سامنے رکھ دیا۔

"مما انا نے کبھی میکے جانے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ یوں جیسے وہ جانا نہ چاہتی ہو' خفا ہو ان سے مجھے یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے۔"

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے بیٹا جب اپنے گھر میں سکھ سکون ہو تو لڑکیاں اسی طرح میکا بھلا دیا کرتی ہیں۔ یہ تو دنیا کی بڑی پرانی ریت ہے۔" مما نے اسے معقول جواب دے کر مطمئن کردیا تھا مگر وہ نہیں بہلا۔ جبکہ حقیقت یہی تھی جو مما نے کہی تھی۔

"مما پچھلے سال فہد نے ضلع میں ٹاپ کیا تھا۔ اس خوشی میں اس نے سلیپ بیٹ کیا اور فہد نے اسے رکنے کے لیے کتنا مجبور کیا لیکن اس کے باوجود وہ وہاں نہیں رکی۔" شنید کی پچھلی بات کا حوالہ دینے لگا تو مما ہنس پڑیں۔

"بے کار کی سوچوں میں خود کو نہ الجھاؤ بیٹا۔ اناہیل بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں اس کے ماضی کے ایک ایک لمحے سے واقف ہوں۔ تمہارے ذہن میں شک آگیا ہے بہتر ہے اس کو دور کرلو' ذہن سے جھٹک دو ورنہ بہت بڑا نقصان ہوجائے گا جس کی کوئی تلافی نہیں ہوگی۔ اناہیل انتہائی سادہ' مخلص' اور پیار کرنے والی لڑکی ہے۔ اس میں آج کل کی لڑکیوں والی تیز طراری نہیں ہے۔ وہ پہلے بھی بہت اچھی لاکھوں میں ایک تھی اور اب بہو بن کر بھی بے حد اچھی اور کروڑوں میں ایک ہے۔ ہوسکے تو اپنی منفی سوچوں کو ذہن سے نکال دو۔"

انہی دنوں پاپا بیمار ہوگئے۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور تن من سے پاپا کے علاج اور تیمارداری میں مصروف ہوگیا۔ لیکن بابر صاحب کی زندگی نے وفا نہ کی۔ وہ روتے بلکتے شنید' شہزور اور مما کو چھوڑ کر چلے گئے۔ شہوز تو باہر تھا آنہ سکا لیکن ان کے ساتھ غم میں برابر کا شریک رہا۔

مما کی حالت تو اس اچانک صدمے سے بہت خراب ہوگئی۔ گھر بھر کا سارا انتظام اناہیل کے ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ بڑی دل جمعی اور خیر و خوبی سے نبھا رہی تھی۔ مما نے اسے یوں اپنے گھر میں شاداں اور مطمئن دیکھا تو کھل اٹھیں۔ ان ساڑھے چار سالوں میں کتنا کچھ بدل گیا تھا۔ وہ خود کتنا بدل گئی تھی مما' شنید اور گھر میں کھو کر اس نے تو اپنا آپ بھلا دیا تھا۔ مما انکل کی ناگہانی موت سے بہت ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ وہ مما کا بے حد خیال رکھ رہی تھی۔ مما نے بہت چاہا کہ وہ شنید کا خیال رکھے زیادہ سے زیادہ وقت دے۔ تاکہ اس کے دل میں پچھلی بدگمانیاں دور ہوجائیں۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ دل کی بات مائیں بیٹیوں سے اور بیٹیاں ماؤں سے کرتی ہیں۔ اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ ان کے دکھ بانٹنے کی کوشش کرتی۔ اور شنید اس سے ان حالات میں اور بھی دور ہوتا چلا گیا۔

"مما شنید آج کل بہت بدلے بدلے لگ رہے ہیں۔" وہ رو دی۔

"میں بھی دیکھ رہی ہوں اناہیل اس کے اطوار کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔"

"آپ ان سے بات تو کرکے دیکھیں۔"

"آج رات آئے گا تو میں اس سے پوچھوں گی۔"

رات کو وہ آیا تو مما نے اچھی خاصی سرزنش کرڈالی۔ جواباً" وہ شرمندہ ہوا نہ معذرت کی۔ بلکہ کسی بچے کی مانند مچل گیا۔

"مما اناہیل سے میری شادی آپ نے اپنی مرضی سے کی تھی۔"

"ہاں بیٹا لیکن تمہاری مرضی بھی شامل تھی بھول

گئے۔"

"جی بالکل، سب یاد ہے مجھے، جو ہوا سو ہوا، لیکن اب میں دوسری شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہو شنید۔" مما کا کمزور سا وجود کانپ اٹھا۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں مما۔ اناہیل میرے معیار پر پوری نہیں اتری۔"

"اور یہ احساس تمہیں آج پانچ سال گزر جانے کے بعد ہوا ہے۔"

"یہی سمجھ لیں مما۔ میں اب تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں۔"

"میری نظروں سے دور ہو جاؤ شنید۔ ایسے منحوس ارادے لے کر دوبارہ میرے سامنے نہیں آنا۔" وہ جلال میں آگئیں۔

"میری بات ٹھنڈے دل سے سنیں اور غور کریں مما میں نے دوسری شادی کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میں اولاد چاہتا ہوں۔ اور اناہیل کے وجود سے میرے آنگن میں کوئی پھول کھلنے والا نہیں۔ مجھے مرجھایا ہوا درخت نہیں چاہیے جو گھنی چھاؤں اور ٹھنڈی ہوا بھی نہ دے۔"

"بکواس بند کرو شنید میں اس ضمن میں مزید ایک لفظ نہیں سننا چاہتی۔ تم بنا بنایا گھر کیوں برباد کرنے پر تل گئے ہو؟ اور اولاد تو خدا کی دین ہے۔ مقدر میں ہوتی تو اناہیل سے ہو جائے گی اور نہیں ہے تو کسی اور سے بھی نہ ہوگی۔"

"کچھ بھی ہو۔ میں بینا کو ہر حال میں اپنانے کا عزم کر چکا ہوں۔ مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"

"عائلی قوانین کے مطابق اناہیل کی رضامندی بے حد ضروری ہے شنید۔ وہ تمہیں یقیناً" اجازت نہیں دے گی۔ اس امر کی۔"

"میں اناہیل کو چھوڑ دوں گا مما۔ ورنہ وہ اجازت دے دے۔"

"نئی عورت اتنی طاقتور ہوتی ہے۔ شنید کہ برسوں کے بندھن بھی تڑوا دیتی ہے۔ پچھتاؤ گے ایک دن۔"

"مجھے اپنے فیصلے پر فخر ہے۔ میں کبھی نہیں پچھتاؤں گا۔" شنید کی ڈھٹائی اور دلیری پر مما ساکت اور حیرت زدہ سی ہو گئیں۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا اٹھ کر اوپر چلا گیا۔

بینا اس کی کولیگ تھی۔ وہ ایک تیز طرار قسم کی لڑکی تھی۔ اسے مردوں کو لبھانے کے ڈھنگ بھی آتے تھے۔ رفتہ رفتہ فطرتاً" شوخی پسند شنید اس کی زلفوں کا اسیر ہوتا چلا گیا۔ جو بہت سے ہتھیاروں سے لیس ہو کر دفتر آیا کرتی تھی۔ بات بے بات اونچی آواز میں قہقہے لگاتی۔ وہ خاصی بے باک تھی اور شنید کو ایسے ہی لوگ پسند تھے جو زندگی کے چمن میں کھلے ہوئے ہر پھول سے شہد نچوڑنا چاہتے ہوں، جانتے ہوں اور بینا میں یہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اب اسے اناہیل میں سو نقص نظر آئے۔ اس کی لپ اسٹک کے شیڈ تک پہ اعتراض ہوتا۔ دوسری وجہ اناہیل کی سونی گود کا بہانہ مل گیا تھا۔

"پہلے تو تمہیں کبھی محسوس نہیں ہوا تھا شنید! اب کیا ہونے لگا ہے؟"

وہ حیرت سے پوچھتی جواباً" وہ مسکرا دیتا۔ اس کے کپڑوں کے رنگوں پر تنقید کرتا۔ وہ اپنے آپ کو مسلسل بدلنے کی کوشش میں تھی۔ جتنا وہ خود کو اس کی خواہشات کے مطابق ڈھالتی، وہ اتنا ہی نقص نکالتا۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو شنید۔"

"کچھ نہیں۔" وہ مکاری سے مسکراتا، بینا کا شوخ و شنگ چیختا چلاتا سراپا کچھ اس طرح نظر میں سمایا تھا کہ اناہیل کچھ بھی کرلیتی۔ اسے بھاتی ہی نہ تھی۔ پہلے وہ اس کی سادگی اور پاکیزگی پر مرتا تھا۔ اب بے زار ہو گیا تھا۔

"سیاہ آنکھوں اور شوخ لہجے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ ساتھی اچھا اور خوب صورت ہو تو زندگی کا سفر زیادہ آسانی سے کٹ جاتا

ہے۔"

"کوئی سیاہ آنکھوں والی شوخ و چنچل لبجھوالی دیکھ لی ہے کیا؟" وہ حیرانی سے پوچھتی۔

"فی الحال تو نہیں۔" وہ گول مول جواب دیتا۔ وہ اپنی جگہ مطمئن تھی پر اعتماد تھی' اس کی ازدواجی زندگی کو پورے پانچ سال گزر چکے تھے۔ اس لیے پرسکون تھی کہ شنید بھٹک نہیں سکتا۔ لیکن رفتہ رفتہ شنید بدلتا گیا تو وہ تڑپ اٹھی۔

"آخر آپ کو ہوا کیا ہے شنید؟" ایک دن اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"کیا ہوا ہے مجھے؟" جواباً" وہ اسی سے پوچھنے لگا۔

"آپ مجھ سے اتنا بھاگنے کیوں لگے ہیں؟"

"میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ خود پر غور کرو۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

اور وہ خود پر غور کرتی رہی۔ لیکن کہیں بھی کسی جگہ بھی وہ غیر مطمئن نظر نہیں آئی۔ ہر طرح سے شنید کا خیال رکھتی اور پہلے سے کہیں زیادہ اس سے محبت کرنے لگی تھی' مگر وہ کیوں بدلا اور بدلتا چلا گیا۔ وہ سمجھ نہیں پائی۔

☆ ☆ ☆

گھر کا سارا انتظام اناہیل کے ہاتھ میں تھا۔ مما نے تو خدا سے لو لگالی تھی۔ وقت دوڑ رہا تھا۔ شنید اس خاموش اور لگی بندھی روٹین کی زندگی سے اکتا گیا تھا۔ وہ ہنگامہ چاہتا تھا۔ رونق چاہتا تھا اور اولاد اور یہ ساری خوبیاں اسے بینا میں نظر آئیں۔ شادی سے پہلے اناہیل کی ساری خوبیاں اب برائی بن کر نظر آنے لگی تھیں اس کو اور اس نے بینا کو اپنانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی اپنے لیے عذاب سمجھی۔

وہ اس بندھن کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں ایسا نہ کرسکا۔ شاید مما اس امر کی اجازت کبھی نہ دیتیں اسے۔ جبکہ بینا کی پہلی شرط یہ ہی تھی کہ اناہیل کو طلاق دے دے اور اس نے بینا سے وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن اب اپنے وعدے کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا اور اس نے بینا کو اس بات کے لیے راضی کرلیا تھا کہ اناہیل ان کی زندگی میں نہیں رہے گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے گھر چلی جائے گی۔ یہ اس کی ذمے داری ہے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے اناہیل کو ہمیشہ کے لیے میکے روانہ کردیا۔

☆ ☆ ☆

"اناہیل تم سمجھ دار ہو۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں گھر سے نکالوں تم خود ہی چلی جاؤ۔ کیونکہ بینا کی تو یہ خواہش ہے کہ میں تمہیں طلاق دوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کررہا۔ بس تم ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی جاؤ اور پلٹ کر نہ دیکھنا۔"

اناہیل اتنی اچانک افتاد پر گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے کتنی آسانی سے اپنی زندگی سے اسے الگ کردیا تھا۔ نکال دیا تھا۔ اپنی زندگی کے پانچ سال کی دن رات کی ساتھی سے رفاقت کا بندھن توڑ لیا تھا اور جدائی کی اذیت اس کے حصے میں ڈال دی تھی اور یہ بھی احسان کیا کم تھا اس کا کہ طلاق جیسے کلنک کے ٹیکے سے دور رکھا تھا اسے جانے کیوں؟

وہ اس کے قدموں میں گر کر رونے لگی کہ اس نے طلاق نہیں دی تھی۔ اس کو ورنہ وہ زندہ درگور ہوجاتی۔

قدرت نے مرد کے اختیارات میں کتنی وسعت رکھی ہے۔ کتنی گنجائش رکھی ہے۔ وہ شنید کو بدلا ہوا تو کئی دن سے محسوس کررہی تھی' لیکن اس حد تک تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"اتنا بڑا ظلم' میری ایسی بربادی کیوں شنید کیوں؟" وہ چیخ تھی۔

"تمہاری بھلائی کے لیے تین جملے نہیں بولے میں نے۔ ورنہ کون روک سکتا تھا مجھے۔"

شنید نے رخ پھیر کر کہا تو وہ روتی چلاتی مما کے کمرے میں بھاگ گئی۔

"مما... مما دیکھیے تو سہی شنید نے مجھ پر کیسا قہر توڑا ہے۔ ظلم ڈھایا ہے۔"

"کیا ہوا اناہیل بیٹا۔" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دوا کھا کر آرام کی غرض سے لیٹی تھیں۔

"گھر سے نکل جانے کے لیے کہا ہے۔ اگر میں نہ گئی تو وہ خود نکال باہر کریں گے مجھے۔ میں اپنا گھر کیسے چھوڑ دوں مما کیسے چلی جاؤں، دوسری عورت کے حوالے کرکے سب کچھ بتائیں مما۔" وہ روتے روتے بے ہوش ہوگئی۔

شنید اس حد تک آگے بڑھ جائے گا۔ مما کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ دکھ اور حیرت کی شدت سے پاگل سی ہوگئیں۔

ہوش میں آتے ہی اس نے کہا۔

"مما میں یہاں ایک پل نہیں رہ سکتی۔ میں جارہی ہوں ممی کے گھر۔ اگر ایک لمحہ بھی یہاں رکی اور شنید نے ابھی یہاں دیکھ لیا تو وہ مجھے تین جملے بولنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ مجھے جانے دیں مما۔" وہ رودی۔

"حوصلہ کرو اناہیل حوصلہ۔ میں خود تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ شنید کی زیادتی پر تمہارے پاپا اور ممی کے پاؤں میں گر کے بھی معافی مانگ لوں گی۔ ساری زندگی شنید کی صورت نہیں دیکھوں گی میں۔"

"نہیں مما آپ میرے ساتھ مت جائیے۔ جن حالات میں جارہی ہوں۔ وہ لوگ اس حالت میں دیکھ کر آپ کو کچھ برا بھلا نہ کہہ دیں اور مما میں یہ برداشت نہیں کروں گی کہ میری ماں کو کوئی کچھ کہے۔ جبکہ میری ماں کا کوئی قصور بھی نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے بیٹا جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن اپنے زیورات لے کر جانا۔ ورنہ وہ عورت قبضہ کرلے گی۔" وہ اسے گلے لگا کر رو پڑیں۔ اتنے میں شنید ان کے کمرے میں آگیا۔

"اناہیل یہاں سے ایک تنکا بھی نہیں لے کر جاسکتی۔ سب میرے قبضے میں ہے۔ اگر اس نے کچھ لے کر جانے کی کوشش کی تو میں طلاق دے دوں گا اسے۔" وہ سفاکی سے بولا۔ اور اناہیل کا وجود کانپ اٹھا۔

"خدا کے غضب سے ڈرو شنید، اس کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ اب اس مظلوم پر مزید ظلم نہ کرو۔" مما چیخ پڑیں۔

"یہ سب بینا کے حسن کی زینت بنے گا۔ میں کسی صورت اناہیل کو نہیں دوں گا۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

انسوں نے اناہیل کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

"مما مجھے ٹیکسی منگوا دیجیے۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"خاندان کا نام ہی ڈبو دیا اس بے غیرت نے۔ دیکھ لینا چار دن عیش کرکے، سب سمیٹ کر وہ اسے چھوڑ جائے گی۔ ایسی عورتیں کسی کی نہیں ہوتیں۔ ان کا دین، ایمان، دولت، پیسہ ہوتا ہے اور بس۔۔۔ گھربار، شوہر، بچے ان کی ضرورت نہیں، بلکہ تو یہ ان عورتوں کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ ایسی شادیاں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ ماں، باپ کا دل دکھانے والے کبھی خوش نہیں رہتے۔ اس نے کسی کا بنا بنایا گھر اجاڑ دیا اور شنید کو جانے کیا گھول کر پلا دیا ہے۔ اس نے، جو وہ بالکل پاگل ہوگیا ہے۔ ابھی تو جذبات کی نئی نئی آندھی چڑھی ہے، جب اترے گی تو ہوش آئے گا، پھر نہ گھر کا رہے گا نہ گھاٹ کا۔"

طاہرہ نے اپنے خاص ملازم کو ٹیکسی کا حکم دیا اور اس کی ہمراہی میں اسے بھیج دیا۔ عین چلتے وقت مما کا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اجڑی ہوئی بربادی کی مکمل تصویر لگ رہی تھی۔

"او میرے خدا آج شنید سے سارے رشتے ٹوٹ گئے۔ وہ کسی اور عورت کا ہو رہا تھا۔ عورت سب کچھ برداشت کرسکتی ہے۔ مگر شراکت نہیں۔"

کتنا اچانک، کتنا انوکھا، کتنا غیر متوقع اختتام۔ جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا وہ ہوگیا۔

"پاپا جتنی جلدی آپ نے اپنی بیٹی کو گھر سے نکالا تھا اتنی ہی جلدی شنید نے بھی نکال دیا ہے۔ آپ مجھے گھر سے نکال کر سرخرو ہوگئے تھے۔ مگر قدرت مجھے پھر وہیں لے آئی ہے پاپا۔"

وہ روتی رہی اور گاڑی منزل مقصود کی طرف بڑھتی رہی اور جب گاڑی گھر کے قریب رکی تو وہ ڈگمگاتے

قدموں سے نیم وا گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ اس کی اجڑی ہوئی صورت اور مسلے ہوئے کپڑے، بکھرے بالوں نے ممی کو بہت کچھ سمجھا دیا۔

"مجھے شنید نے گھر سے نکال دیا ممی۔۔۔ میں برباد ہو گئی۔" وہ ماں کے گلے لگ کر سسک کر روئی اور روتے ہوئے سب بتا دیا۔

"میں اس ناہنجار کو۔۔۔"

"اب آپ کچھ نہیں کر سکتے، ورنہ آزادی کا پروانہ گھر آ جائے گا۔ صبر کریں اناہیل کے نصیب میں یہی لکھا تھا۔"

ممی نے ایک آہ بھر کے اناہیل کو اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ پاپا کی کمر ٹوٹ گئی۔

"کاش آج پاپا زندہ ہوتا تو میں اس ظلم کا سبب اس سے دریافت کرتا۔ اب کس کا گریبان پکڑوں؟ کس سے پوچھوں؟"

پاپا بھی رو دیے، فہد اور اس کی بیوی بھی دل گرفتہ ہو رہے تھے۔ وہ تڑپ تڑپ کر بے حال ہو گئی تھی۔

پاپا اپنی لاڈلی، پیاری بیٹی کا صدمہ نہ سہار سکے۔ دل کے دورے میں اسے روتا بلکتا چھوڑ گئے۔ وہ چار دن بیٹی کا دکھ بھی نہ بانٹ سکے۔ ممی دہرے صدمے سے دوچار تھیں۔ خود کو سنبھالتیں یا بیٹی کو۔ وہ گھر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ بیٹی گھر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ چپ چاپ روئے جا رہی تھیں۔ دن رات شنید کی جدائی اور گھر اجڑنے کے غم میں ڈوبی رہتی۔ وہ ہر فون کی بیل اور کال بیل پر چونک کر کہیں کوئی ہارن بجتا تو ایک نظر گیٹ کی جانب ضرور دیکھتی۔ شاید ممّا شنید کو ساتھ لے کر چلی آئی ہوں۔ لیکن وہ دن طلوع نہیں ہوا۔ جس کی آس میں وہ لمحے لمحے کی موت مر رہی تھی' جی رہی تھی۔

ایک ایک کر کے کتنے ہی دن گزر گئے۔ وہ انیس سال کی عمر میں شنید کے سنگ نکاح کے بندھن میں بندھی تھی اور اب صرف پانچ سال بعد چوبیس سال کی عمر میں واپس لوٹ آئی تھی۔ کتنی جلدی اس کا انجام ہوا تھا۔ وہ سسک کر سوچتی۔ شنید نے پینا سے شادی کر لی تھی۔ طاہو کی ہر کوشش بے کار گئی۔ نہیں مانا اور وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور شہود کے پاس جانے کی تیاری کرنے لگیں' لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا اور وہ شہود کے پاس جانے کے بجائے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ وہ اس گھر میں کیسے رہ سکتی تھیں' جس گھر میں ان کی بیٹی نہ رہی تھی۔

اس ہنستے بستے گھر کو جانے کس کی نظر لگ گئی تھی کہ وہ بکھر گیا۔ برباد ہو گیا۔ تباہ ہو گیا۔ شنید کی شادی اور ممّا کی ڈیتھ یہ دونوں صدمے اناہیل کو پاگل کر دینے والے تھے۔ ہر وقت کی سوچوں نے اسے بیمار کر دیا۔ وہ چارپائی سے لگ گئی۔ ممی نے اس کی پٹی سے لگ کر اس تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا۔ وہ شرمندہ ہو ہو جاتی' بس سیاہ آنکھیں آنسوؤں کے خزانے لٹائے جاتیں۔ ممی ہر بار اس کے اشک اپنے دامن میں سمیٹ لیتیں۔

"نہ رو اناہیل' میری بچی نہ رو۔"

ممی بھی اب تو کتنی بوڑھی لگنے لگی تھیں۔ اس کے دکھ نے ان کو ادھ موا کر دیا تھا۔ اناہیل کو یقین نہ آیا کہ شنید اسے چھوڑ بھی سکتا ہے۔ اس کے بنا رہ بھی سکتا ہے۔ وہ اپنی محبت کے گہرے سمندر میں کھوئی رہی اور یہ بھی نہ جان سکی شنید اس سے تنگ آ چکا ہے اور اس کا انداز رسیاں تڑوانے والا ہے۔ بہرحال گھر میں ہر شخص خاموش تھا۔ کوئی بھی شنید کے کیے پر تبصرہ نہیں کر رہا تھا۔ اناہیل کچھ سوچنا چاہتی تھی گزرے ہوئے ان پانچ سالوں کے لمحے لمحے کے متعلق' کچھ سمجھنا چاہتی تھی' شنید کی ان غیر جذباتی باتوں کو جو پہلے نہیں سمجھ سکی تھی۔ اس کی قربت مانع تھی کہ وہ اپنے عزیز شوہر پر شک کرے۔ اس کی راتیں بے خواب ہو گئی تھیں۔ ایک ایک لمحہ گھڑیوں میں اور گھڑیاں گھنٹوں' دنوں' مہینوں' میں تیزی سے منتقل ہو رہی تھیں۔ لیکن شنید کا کوئی فون کوئی اطلاع نہیں آئی۔ اس کشمکش میں ایک سال اور بیت گیا' لیکن وہ ابھی بھی آس و امید کا دامن تھامے ہوئے تھی۔

اناہیل ایک دم بجھ کر رہ گئی تھی۔ ماں کو چپ لگ گئی تھی۔ ماں کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر

روتی تھی کہ کوئی اس کے آنسو نہ دیکھ لے۔

"میری جان تجھے کسی کی نظر لگ گئی۔ وہ شخص کتنا بدنصیب اور ظالم نکلا جس نے میرے چمن کے خوب صورت اور شگفتہ پھول کو شاخ سے الگ کردیا۔ بے خطا' بے قصور۔"

وہ اناہیل کو پیار کرتی رہیں۔ اس کے آنسو پونچھتی رہیں۔ خود بھی روتی' کڑھتی رہتیں اور اسے بھی سمجھاتی رہتیں۔

"بھول جاؤ اسے' جس نے تمہاری قدر نہ کی۔" وہ روتی رہی۔ اسے وہ لمحے یاد آنے لگے جو شنید کے ساتھ گزارے۔

آج بھی وہ اپنے اطراف اس کی نرم نرم سرگوشیاں محسوس کرتی' پاگل ہونے لگتی۔ ممی اور بھابھی کہتیں اس بے وفا کو بھول جاؤ۔ اس سے نفرت کرو۔ لیکن وہ کس طرح اس سے نفرت کرتی۔ وہ اسے چاہتی تھی۔ عشق کرتی تھی۔ دیوانوں کی طرح محبت کرتی تھی۔ وہ تو ہر لمحہ' ہر گھڑی اس کے ساتھ رہتا تھا' کیسے بھول جاتی۔

"انا اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ وہ کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو' مگر اس کا کردار اس کی نفی کرے گا۔ وہ معصوم نہیں تھا۔ انتہائی شاطر تھا۔ اس کے کئی روپ تھے۔ اوپر سے گداز اور اندر سے پتھریلا۔ اس کے کئی چہرے تھے۔ اس کے غیر انسانی بہروپ نے ہی تو برے لوگوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ وہ اب اس کا مستحق نہیں کہ اسے اچھے الفاظ سے یاد کیا جائے۔ اب اپنی زبان سے نام بھی نہ لینا اس کا۔" بھابھی نے اسے سمجھایا تو کچھ دیر بعد اناہیل نے سوچا۔

"بھابھی ٹھیک کہتی ہیں۔ اس کو یاد کرنے سے سوائے دکھوں اور تکلیف کے کچھ حاصل نہیں تھا۔"

فہد نے اناہیل کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے شنید سے بات کی تھی۔ جو شنید نے کہا۔ وہ سن کر ششدر رہ گیا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہا۔

"میری طرف سے اناہیل آزاد ہے۔ جب آپ چاہیں میں طلاق کے کاغذات تیار کروا کر بھیج دیتا ہوں۔"

اور فہد خاموش رہ گیا۔ اس نے اناہیل کی طلاق کی بات نہیں کی تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اناہیل کو لے جائے۔ دونوں کو ساتھ رکھ لے۔ لیکن یہ ان کی بھول تھی کہ وہ دوسری بیوی کے ساتھ اناہیل کو ساتھ رکھے گا۔ ایک سال گزر جانے کے بعد بھی شنید ذرا نہیں بدلا تھا۔

وہ لوگ چاہتے تھے شنید سے فیصلہ لے کر اس کی شادی کہیں اور کردیں۔ اس طرح باقی زندگی تو نہیں گزر سکتی تھی۔ زندگی کا ساتھی' زندگی کا سارا کچھ بھی تو پاس نہیں تھا۔ یوں اکیلے تنہا زندگی کیسے گزر سکتی تھی اور فہد نے ماں کو یہ بات بتائی تو ایک بار پھر اس گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اناہیل ماں سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگی۔ سارا گھر اس کے ساتھ آنسوؤں کے تلاطم میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔

"ہر چند کہ طلاق مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک ناپسندیدہ عمل ہے' مگر بہت سی صورتوں میں یہ جائز اور ضروری بھی ہے۔ میرا خیال ہے تم اس شخص سے آزادی حاصل کرلو۔ سب بھول کر ایک نئی زندگی شروع کرو۔ تمہارا دکھ سارے گھر کا دکھ ہے۔ تمہاری خوشی سارے گھر کی خوشی ہے اور زندگی کی خوشیوں پر تمہارا بھی حق ہے۔ زندگی کے یہ سال بھول جاؤ۔ کبھی تمہاری زندگی میں آئے بھی تھے۔ اپنے ذہن سے کھرچ کے پھینک دو' جیسے وہ کبھی تمہاری زندگی میں آیا ہی نہ تھا۔"

اناہیل چپ چاپ بھاوج کی باتیں سن کر گھونٹ گھونٹ نیچے اتارتی رہی۔

"خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ بڑا رحیم و کریم ہے۔ ایک در بند ہوتا ہے تو دوسرا کھول دیتا ہے۔ تم اس سے نجات حاصل کرلو تو تمہارا گھر دوبارہ بسانے کا سوچیں۔ ایک سے ایک رشتہ مل جائے گا۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔" بھابھی نے ہر ممکن کوشش کی کہ اسے سمجھا سکیں' لیکن وہ ماننے کو تیار ہی نہ تھی۔ فوراً" گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں بھابھی' میں نہ اب تجربوں کی

بھٹی میں جل سکتی ہوں، نہ میں دوسرا فریب کھا سکتی ہوں۔ فہد اور ممی کو منع کردیں۔ خدارا میرے زخموں کو نہ ادھیڑیں۔ بے شک شنید مجھے نہ لے کر جائے، لیکن میں طلاق یافتہ کہلانے سے بہتر اس کے نام پہ بیٹھی رہنا پسند کرتی ہوں۔ اس کا نام میرے نام سے الگ مت کریں۔ ہو سکتا ہے کبھی اسے احساس ہوجائے، وہ پلٹ آئے۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

اس نے اس معاملے میں کسی کی نہ چلنے دی۔ اپنی من مرضی کی۔ وہ اذیت کی ننگی تلوار پر لٹکی رہی، لیکن دل میں آس کا سرا پکڑے ہوئے وہ اب بھی پرامید نظر آرہی تھی اور اسی کشمکش میں پورے پانچ سال گزر گئے۔ جدائی کی جن تکلیفوں سے وہ گزری تھی۔ یہ وہ ہی جانتی تھی۔ اس دوران میں اس نے پلٹ کر خبر نہ لی اور اب پورے پانچ سال بعد وہ اچانک بنا اطلاع دیے لوٹ آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بیٹھی ہوئی گزرے ہوئے وقت پر غور کر رہی تھی۔ پانچ سال پہلے بھی وہ اس کے جذبات سے کھیلا تھا اور آج پانچ سال بعد بھی اس کے جذبات سے کھیلنے آیا تھا۔ کیا تقسیم شدہ مرد مخلص رہ سکتا ہے؟ اور کیا مرد دونوں بیویوں کا حق برابر ادا کر سکا ہے۔ آج تک سنا تو نہیں اور منقسم مرد کسی عورت کی امانت نہیں ہوتا۔

لیکن اب وہ یہاں نہیں رہے گی۔ اب وہ اس عمر میں اپنی ماں کو اور دکھ نہیں دے گی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ آج بھی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی راستے تھے۔ مگر واپسی کا سفر آسان نہیں ہوتا۔ خصوصاً" اس صورت میں جبکہ مسافر بہت آگے جا چکا ہے۔ بہرحال زندگی کا ایک باب ختم ہو چکا تھا۔ آنسو اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔

"انابیل میں اس بات کا حق تو نہیں رکھتا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے، تم سے ہر بات کہہ دوں۔" وہ کہنے لگا۔

"تمہیں گھر سے نکالنے کے بعد سکون سے نہیں رہا۔ یہ پانچ سال اذیت میں گزارے ہیں۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے۔

انا پلیز مجھے معاف کردو۔"

وہ خاموش رہی۔ پانچ سال اذیت سہی تھی اس نے اور وہ چاہتا تھا، پانچ لمحوں میں معاف کردے۔

"ٹھیک ہے۔ اگر ابھی تم خود میں معافی کا حوصلہ نہیں پاتی، ہو تو پھر بھی میرے ساتھ چلو۔ یاد رکھنا میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

انابیل بھیگی بھیگی نظروں سے ایک لمحے تک اسے تکتی رہی۔ اس وقت جو وہ کہنا چاہتی تھی کہہ نہیں پائی۔ زندگی نے اسے اتنا تنہا کردیا تھا کہ اب اپنائیت کی کوئی سی بات آنکھوں میں آنسو بن کر اتر آتی تھی۔

وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اس کے احساسات پتھر کے ہوگئے ہیں اب شنید آئے یا نہ آئے اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر آج اس کے دل نے اسے دھوکا دے دیا تھا۔ وہ تو آج بھی اس کے لیے دھڑکتا تھا۔

یہ سفر اس کی زندگی کا اہم ترین سفر تھا جو اسے گھر تک لے جارہا تھا۔ جہاں کے راستوں سے وہ ناآشنا نہیں تھی۔ واپسی کے سفر میں وہ دونوں بالکل خاموش رہے۔ گھر پہنچ کر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی۔ کچھ بھی تو ویسا نہیں تھا۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ پانچ سالوں کے سفر نے اسے تھکا دیا تھا۔ اس وقت اسے کسی ہمدرد، دوست کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور وہ تھی طاہرہ مما کی۔ مگر وہ اسے چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ اگر آج وہ زندہ ہوتیں تو اسے اپنے گھر میں دوبارہ دیکھ کر کتنا خوش ہوتیں۔

وہ بستر پر گر پڑی۔ سوچتے ہوئے نہ جانے کس وقت اسے نیند آگئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو چاروں جانب اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور کچھ صاف نظر کیوں نہیں آرہا ہے۔ وہ چند لمحے لیٹی رہی۔ پھر پردہ ہٹا کر دیکھنے لگی۔ اسے یاد آیا شنید اسے اپنے گھر واپس لے آیا ہے آج۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔ مما کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا دل شدت سے کانپا۔ مما کی یاد

آنسو بن کر بہنے لگی۔ تو وہ ان کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے لائٹ آن کی۔

ان کے کمرے کی حالت دیکھ کر وہ بلک پڑی۔ ہر چیز الٹ پلٹ اور گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ وہ ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی اور بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر اوندھی پڑی تصویر اٹھا کر دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔ جس میں وہ طاہو مما کے گلے میں بانہیں ڈالے مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ ان کے تکیے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ تب ہی ایک آواز نے اس کے آنسو روک دیے۔

"اناہیل بیٹا تم اچانک کیسے آ گئیں' بغیر اطلاع کے۔" وہ اس کو پیار کرتے ہوئے بولیں'اور تم رو کیوں رہی ہو۔ اب تو آ گئی ہو نا' کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"کچھ نہیں مما... میں بالکل ٹھیک ہوں اور اپنے گھر تو انسان بغیر اطلاع کے آسکتا ہے نا' بس اس لیے۔" وہ ان کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولی۔

"بیٹا شنید کا بہت خیال رکھنا۔ وہ تم سے الگ ہو کر ایک پل خوش نہیں رہ سکا۔ اپنی ماں کی خاطر اسے معاف کر دینا اور اب تم آرام کرو۔ اس کے بعد باتیں کریں گے۔" انہوں نے اناہیل کی پیشانی چومی اور انا کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں بھینی بھینی سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ مگر طاہو مما کہیں بھی نہیں تھیں۔ ہاں ان کے وجود کی خوشبو اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔

وہ ایک بار پھر سے بلک پڑی۔

"مما مجھے آپ کی ضرورت ہے اس گھر میں۔ مما میں آپ کے بنا اکیلی ہوں۔ مما مجھے چھوڑ کر مت جائیں' مما اپنی بیٹی کو۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور کوئی اندر داخل ہو گیا اور پھر بٹن کی آواز کے ساتھ کمرہ روشنی میں نہا گیا۔

"انا... انا... تم یہاں اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو۔" شنید کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر بیٹھی۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اناہیل کے چہرے کو دیکھا' جو آنسوؤں سے تر تھا۔

"اب نہیں روؤ پلیز انا۔ مما کو تکلیف ہوگی۔ اب تو تم اپنے گھر میں آ گئی ہو۔ ان کی روح بہت خوش ہوگی' بہت زیادہ۔ اب نہیں رونا پلیز۔"

اس نے انا کے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

ایک بار شنید نے کہا تھا۔ "مجھے رونے والی عورتیں اچھی نہیں لگتیں۔ بات' بات پر روتی ہیں۔ بھئی آنسو تو کبھی کبھار کرنے والی چیز ہے۔ مزا ہی تب ہے کہ کبھی کبھار کرے اور جب بھی کرے' جو تمہیں پیار کرتا ہو اس کی جان نکل جائے۔"

اور آج ایسا ہوا تھا اناہیل کے آنسو اسے تکلیف پہنچا رہے تھے۔ اس کے دل پر گر رہے تھے اور اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ شادی کے دس سال بعد آج پہلی بار وہ اس کے آنسوؤں پر تڑپا تھا۔

"انا پلیز..." مگر اس کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

شنید نے اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیا اور اپنے کمرے کی میں آ گیا۔ یوں ہی اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"بینا سے شادی میرا احمقانہ فیصلہ تھا جس نے مجھے تم سے' مما اور شہوز سے دور کر دیا' تم تو دوبارہ مل گئی ہو مجھے' لیکن وہ دونوں۔"

اس کی آواز بہت ہلکی تھی۔ جیسے اندھیروں نے نگل لی ہو۔

"شہوز... کیا ہوا شہوز کو؟"

"شہوز نے مجھ سے رابطہ ختم کر لیا تھا۔ اسی وقت جب میں نے تمہیں گھر سے نکال کر بینا سے شادی کی۔ مما نے' شہوز نے مجھے بہت سمجھایا۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ میرے حواسوں' دل و دماغ پر تو بینا چھائی تھی۔ جذبات کی ندی عروج پر تھی' تو پھر اس کے بہاؤ میں کمی یا ٹھہراؤ کیسے آتا۔ مما' شہوز کے پاس جانے کی تیاری میں تھیں' لیکن اللہ نے اپنے پاس بلا لیا اور جب شہوز کو ان کے انتقال کی اطلاع ملی تو اس نے ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ لیا مجھ سے۔ یہاں تک

کہ اپنا نمبر بھی بدل لیا۔ وہ دونوں تمہیں اتنا چاہتے تھے کہ اپنی چاہت اور تمہاری محبت کا قرض ادا کر دیا۔ مما نے تمہیں اپنی بہو نہیں بیٹی جانا اور شہوز نے بھابھی نہیں، بہن ہی سمجھا اور وہ ہی درجہ دیا اور ثابت بھی کر دیا۔"

سسکیوں کی وجہ سے اس کا وجود تھر تھرا رہا تھا۔ "کوئی نہیں جانتا میں بینا سے شادی کر کے ایک لمحے کے لیے خوش نہیں رہا۔ یہ پانچ سال میں نے خود کو اذیت دیتے ہوئے گزارے۔ غلطی کی تھی، سزا تو بھگتنی تھی۔ اگر میرے آنگن میں کوئی پھول کھل جاتا تو شاید میں کچھ بہل جاتا۔ مگر شاید قدرت کو بھی یہ منظور نہ تھا۔ بینا کی گود بھی سونی رہی۔

وقت بھی عجیب چیز ہے۔ کبھی کوئی اس میں سے خاموشی سے گزر جاتا ہے۔ کبھی طوفانوں میں گھری ہوئی تنہا کشتی کی طرح اس میں گھر جاتا ہے۔ کبھی یہ وقت سینے پر پیر رکھتا ہوا گزرتا ہے اور کبھی سینے پر سوار ہو جاتا ہے گزرتا ہی نہیں۔

وہ پانچ سال نہیں پانچ صدیاں تھیں جو گزر ہی نہیں رہی تھیں۔ پل پل اذیت سے گزار رہا ہوں میں۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ شنید نے آنسو صاف کیے اور بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا اور اناہیل کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا، کچھ تھا جس کے وجود کا احساس تھا۔ جو گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔

"میرے سامنے تو ایک گہرا گڑھا تھا۔ پھیلا ہوا پانی سے بھرا ہوا اس کی گہرائی کا مجھے علم نہیں تھا، نہ چوڑائی کا۔ میں اس کے کنارے پر کھڑا رہ سکتا تھا، نہ پھلانگ کر اس کے پار جا سکتا تھا اور میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔"

جس طرح کوئی طویل و تاریک سرنگ میں داخل ہو جائے۔ اس کے پیروں کی آہٹ جب دیواروں کے درمیان گونجتی ہے تو لگتا ہے بہت سارے لوگ پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ اس کے تعاقب میں۔ وہ ایک لمحے کے لیے رک سکتا ہے تو لگتا ہے وہ لوگ بھی رک گئے ہیں۔ اس کے پیچھے پیچھے۔ وہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ایک خوف بل کھاتے ہوئے سانپ کی طرح اس کی پیٹھ پر رینگتا ہے۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

"اسے بھی پتا ہے؟"

"کس کو؟"

"آپ کی بیوی کو؟"

"ہاں۔" اس کے سینے میں رکا ہوا سانس آزاد ہوا۔ وہ ناراض ہو کر اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔

اناہیل نے اس کے الفاظ میں چبھن محسوس کی، جیسے کانچ کے ٹکڑوں اس کے اردگرد بکھرے پڑے ہیں۔ چمکدار اور نوکدار۔

اناہیل کا سر اس کی گود میں تھا اور آنکھیں چھت کی جانب لگی تھیں۔

"وہ تو چاہتی تھی تم نہ آؤ۔ لیکن اس بار اس کی چل نہیں سکی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا۔ وہ سامنے ہوتی لیکن اس کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی جگہ ایک اور چہرہ آجاتا تھا۔"

"کس کا؟" اناہیل نے پوچھا۔

"تمہارا چہرہ اناہیل تمہارا چہرہ۔" اس نے اناہیل پر جھکتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں بہت دکھ دیے ہیں، اتنا بہت۔ لیکن اب تم بھول جاؤ۔ میں تمہیں اتنا پیار دوں گا کہ تمہیں گزری زندگی کا ایک لمحہ یاد نہیں آئے گا۔ اب ہم نئی زندگی شروع کریں گے۔" اس نے اناہیل کے ہاتھوں کو اپنے لبوں سے لگا لیا۔

"اب شاید تم مجھ سے نفرت کرو گی۔ لیکن اب تم پھر سے ملی ہو تو محسوس ہوتا ہے۔ تمہاری محبت تو آج بھی میرے دل میں کنڈل مارے بیٹھی ہے اور رینگتی ہوئی پھر سے جاگ اٹھی ہے اور اب ایسا لگتا ہے زندگی کی رنگینیاں تو ابھی بھی باقی ہیں۔ تم میرا ساتھ دو تو ہم زندگی کی ان رنگینوں سے دل کو منور کر لیں۔"

"میں جانتا ہوں تم آج بھی بہت چاہتی ہو مجھے۔ محبت کرتی ہو۔ تم بھی پیاسی ندی کی طرح تڑپ رہی ہو۔

مجھے اپنے قرب سے سرشار ہونے دو۔ مجھے گزرے ہوئے پانچ سال بھولنے دو مجھے۔ میں تمہارے قابل تو نہیں تم مجھے پھر سے اپنے قابل بنالو انا، پلیز انا۔"

انا نے اس کی پیشانی پہ اپنے لب رکھ دیے۔

اس کی پلکوں کی لرزش بہت کچھ کہہ رہی تھی اور پلکوں کی اس لرزش کے ٹوٹنے کے لیے وہ پورے پانچ سال تڑپے تھے۔

☼ ☼ ☼

نرم آواز کی سرگوشیاں بے حد مدھم اور اوس کے قطرے کی طرح تھیں۔ اس کی آواز آج اتنی ہی خوب صورت تھی جیسے آرکسٹرا کی دھن۔

رمضان المبارک کا چاند نظر آگیا تھا۔ رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ۔ انابیل نہایت خشوع اور خضوع کے ساتھ عبادت میں مصروف رہتی اور ساتھ میں گھر کی ابتر حالت کو بھی سنوارنے میں لگی رہتی۔ دونوں بہت خوش اور مطمئن تھے۔ ایک عجیب سا اطمینان اور سکون ان کے دلوں میں اتر گیا تھا۔ ایک انوکھا سا احساس نشہ بن کر چھایا رہتا۔

انابیل نے یتیم خانے کے بچوں کی افطاری کا پروگرام بنایا تھا۔ اس نے شنید سے ذکر کیا تو وہ کھل اٹھا۔

"بہت اچھا خیال ہے، مجھے لسٹ بنادو میں بازار سے لے آؤں گا۔"

"نہیں میں خود تیار کروں گی سب چیزیں۔ بس آپ اتنا کرنا یہ چیزیں مجھے لا دیجیے گا۔" اس نے فہرست اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"انا یہ سب چیزیں تم اکیلی گھر پر تیار کرلو گی؟"

"ہاں۔ کچھ چیزیں ایک دن پہلے اور باقی چیزیں اسی دن تیار کرلوں گی، آپ کو شک ہے؟"

"نہیں یار تھک جاؤ گی۔ کوئی ضرورت نہیں ہے گھر پر تیار کرنے کی۔ جب سب کچھ بازار میں مل جاتا ہے تو۔"

"مجھے کبھی ریڈی میڈ افطاری پسند نہیں رہی۔ پھر کروانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے بہتر ہے، چپ چاپ اماؤنٹ دے دیں ان کو۔"

"ہاں یہ کام ٹھیک ہے۔ چلو چلتے ہیں۔" وہ گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے بولا۔

"کہاں۔" وہ بے خیالی سے بولی۔

"یتیم خانے اماؤنٹ دینے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا میں نے سوچا ہے، ویسا ہی ہوگا۔ دیکھیے گھر میں کتنی رونق ہوگی اس روز اور شنید بچوں کے لیے سوٹ بھی لے کر آنا۔ ممی کے نام کے دودوں کی اور ان کی فاتحہ بھی کروانی ہے اور ہاں ذرا مالی کو بھی بلا لاؤ، لان کی بھی حالت بگڑی پڑی ہے۔ ذرا کاٹ چھانٹ ہوجائے اور میں سوچ رہی ہوں گھر میں بھی رنگ و روغن کروالیں۔ اسی دن سے لگی ہوں مگر کچھ بھی تو ٹھیک نظر نہیں آرہا۔ وحشت ہورہی ہے مجھے گھر دیکھ کر۔ میں نے تو ایسا گھر کبھی رکھا ہی نہیں۔"

اپنی بات مکمل کرکے اس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ وہ خاموش کیوں ہیں۔

وہ آنکھیں بند کیے جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ انابیل کو ایک دم ہی غصہ آگیا۔ وہ کب سے مشورے کیے جارہی تھی اور شنید نے سنا ہی نہیں تھا۔

"شنید۔"

"ہوں۔"

"آپ نے سنا تھا جو کہہ رہی تھی میں۔"

"ہاں۔"

"کیا کہا تھا میں نے۔"

"یہی کہ افطاری کا سب سامان تیار ہے اور عید کی ساری تیاری بھی ہوگئی ہے یہاں تک کہ گھر میں رنگ و روغن بھی ہوگیا ہے اور اب گھر بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔"

اس سے برداشت کرنا مشکل ہوگیا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"شنید... کہاں تھے آپ؟"
"یہیں تمہارے پاس۔"
"پھر وہ کیوں نہیں سنا جو میں نے کہا؟"
"وہی تو بتایا ہے جو تم نے کہا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا تم نے؟"
"ایک بار آنکھیں تو کھولیں۔"
"بند رہنے دو۔ ورنہ تم ان آنکھوں کی گہرائی میں جو چھپا ہے دیکھ نہیں پاؤ گی۔"
"یہ تو بعد کی بات ہے۔ آنکھیں کھولیں ایک بار پلیز۔"
"لو اب خوش..." اس نے آنکھیں انابیل کے چہرے پر گاڑ دیں۔
شنید کی آنکھوں میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر' جذبوں کی حدت تھی۔ وہ پل بھر سے زیادہ ان آنکھوں میں دیکھ نہ پائی اور سر جھکا لیا۔
ان کے دل ہولے ہولے دھڑک رہے تھے۔ ایک دھڑکن کے ساتھ بنا کسی کوشش کے بہت نرمی کے ساتھ۔ جیسے پرسکون جھیل میں پانی کی ہموار سطح پر آہستہ آہستہ پھسلتی ہوئی کوئی کشتی چپوؤں کے بغیر۔
اسے لگا وہ یوں ہی تمام عمر اس کی محبت کے سامنے سر جھکائے گزار دے گی۔ وہ بھول گئی کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ شنید کے دل کی مہارانی تھی۔ شنید کی محبت ایک جزیرہ تھی چھوٹا سا۔ ارد گرد بے کنار سمندر تھا۔ کوئی دوجا آس پاس نہیں تھا۔ وہ... شنید اور ان کی محبت اور وہ جزیرہ ہی بس کل کائنات تھی۔ وہ کائنات جو ابھی ابھی پھر سے نئی نکور اس کے لیے تعمیر ہوئی تھی۔ ہلکی ہوا کے ساتھ درختوں' پودوں کے پتے آپس میں تالیاں بجاتے ہوئے۔ معصوم ترنگ میں دھیرے دھیرے گنگناتی ہوئی شاخیں ہلکی ٹھنڈی کومل چنچل ہوا۔ نشے میں دھت صندلی فضائیں۔ انہیں بے خود کر رہی تھیں۔ وہ پلکیں جھپکنے سے بھی ڈر رہی تھی' کہیں وہ لمحہ پھر سے گم نہ ہو جائے۔
"آئی لو یو..." یہ شنید کی روح کی آواز تھی۔ اس کی سماعتوں کے پاس اور اسے وہ اپنے اندر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ ٹھنڈے بلوری پانی کی طرح۔
"آئی لو یو انا۔"
وہ لمحہ بارش کا قطرہ تھا۔ تار کے ساتھ لٹکتا ہوا' وقت کے بے کنار فاصلے کے ایک چھوٹے سے لمحے میں اس بارش کی ایک بوند میں قوس و قزح کے سات رنگ گھل کر ان کے چہرے پر جگمگا رہے تھے۔
بینا اس کی زندگی میں جیسے آئی ویسے ہی نکل گئی۔ ایسی لڑکیاں جب کسی کی ہنستی بستی زندگی میں داخل ہوتی ہیں تو بہت سے گھر ٹوٹ جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ جان سے چلے جاتے ہیں اور اس شخص سے وابستہ لوگ ایک ایک لمحہ اذیت میں گزارتے ہیں۔ لیکن ایسی عورتیں کسی کے ارمانوں کا خون کرکے اپنا تاج محل کچھ وقت کے لیے تو بنا لیتی ہیں مگر مستقل طور پر نہیں۔ جب یہ عورتیں کسی شادی شدہ مرد کی زندگی میں داخل ہوتی ہیں تو سب کچھ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لیکن جب واپسی کے لیے قدم اٹھاتی ہیں تو لوگ شکر ادا کرتے ہیں۔ خوشیاں مناتے ہیں کہ نجات مل گئی۔ ان کی وجہ سے جانے والے تو واپس نہیں آتے ہاں... مگر پیچھے رہ جانے والوں کو پوری خوشیاں مل جاتی ہیں۔ بینا اس کی زندگی سے نکل گئی تھی ہمیشہ کے لیے۔ جیسے ریت میں سے چل کر گزرنے کے بعد قدموں کے نشان پل بھر کے لیے بہت واضح نظر آتے ہیں۔ کسی شاہکار کی طرح ابھرے ہوئے' اگلے پل وہاں کچھ باقی نہیں بچتا اور لگتا ہے شاید نظر کا دھوکہ ہی تھا۔

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	جیا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا

☼ ☼ ☼

اچانک ہی شنید آگیا۔ ساتھ میں مٹھائیوں کے ٹوکرے بھی لایا تھا۔یاسمین دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"کیا بات ہے شنید بیٹا اور اناہیل کہاں ہے؟ تم اکیلے کیوں آئے ہو؟"

"بس وہ ابھی نہیں آسکتی۔ڈاکٹر نے منع کیا ہے؟"

"کیا۔ سفر سے منع کیا ہے 'مگر کیوں؟" ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"ممی وہ۔" شنید خوشی سے بولا۔وہ فہد سے لپٹ گیا۔ حالانکہ وہ اس سے اتنا بے تکلف ہرگز نہیں تھا۔

"بات کیا ہے شنید بھائی؟"

"بہت خوش ہو بیٹے۔"

"آپ کو معلوم ہوگا تو آپ بھی خوشی سے جھوم اٹھیں گی۔" یاسمین نے سوچا۔

"ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟ کیا اس نے اپنی دوسری بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ مگر اس میں شنید کے اتنا خوش ہونے کی کیا بات تھی 'پھر۔"

"جلدی بتاؤ شنید 'اناہیل کیوں نہیں آئی۔"

"ممی وہ ماں بننے والی ہے۔"

"کیا۔ اناہیل ماں بننے والی ہے؟"

"جی ممی۔"

"کسی ڈاکٹر نے کنفرم کیا ہے یا یہ تمہارا خیال ہے؟"

"جی بالکل ڈاکٹر نے بتایا ہے ممی۔۔ کچھ دنوں سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور وہ خود سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"اچھا۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔تو کتنا رحیم ہے۔۔ تیرا کرم ہے 'تیرا کرم ہے باری تعالیٰ 'تیرا شکر کس طرح ادا کروں۔ تو نے مجھے اتنی بڑی خوشی سے نوازا۔ مولا میرے پاس وہ زبان نہیں ہے جو اس معجزے کے لیے شکر ادا کروں۔"

ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ شکرانے کے نفل ادا کرنے چل پڑیں۔

☼ ☼ ☼

عید کا چاند نظر آگیا تھا۔ آسمان سے زمین تک خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ "اناہیل تم پر جو بھی گزر گیا 'میں اب محسوس کرتا ہوں جیسے وہ سب مجھ پر گزرا ہو۔پانچ سال جو تمہاری زندگی میں ہلچل مچا کر چلے گئے وہ 'نہ تمہارے تھے اور نہ میرے۔ اس لیے کبھی اس کے متعلق نہ سوچنا۔ سمجھ لینا وہ سال تمہاری زندگی میں آئے ہی نہیں تھے۔ یہ یاد رکھنا کہ کل بھی تم میری تھیں اور آج بھی میری اور میں ہمیشہ سے تمہارا۔" شنید نے مسکرا کر اس کے ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

"آئی لو یو انا۔" شنید کی آواز آج بھی بہت نرم شہد آگیں اور گداز تھی۔ کسی اباہیل کے سینے کے پروں کی طرح۔اس نے اناہیل کے گرد بازو لپیٹ لیے۔

"آئی لو یو ٹو شنید۔" اس کے سینے میں بہت دیر سے رکا ہوا سانس پھڑپھڑا کر آزاد ہو گیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے شنید کی بانہوں میں سکون محسوس کرنے لگی۔

وہ پانچ سال 'وہ لمحے تار پر لٹکی ہوئی بارش کی بوند کی طرح تھا 'ابھی گرا کہ ابھی گرا اور وہ ان کے بیچ سے بنا شور کیے ہوئے گزر گیا۔ اس بار یہ عید دو چاند لے کر آئی تھی۔ ایک چاند آسمان پر چمک رہا تھا اور دوسرا چاند زمین کا چاند 'جو اناہیل کی گود میں تھا۔

وہ فجر کی نماز کے لیے اٹھی۔ اس نے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ صبح کی مہین ہوا نے اس کے گالوں کو چوم لیا۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ صرف تپلی پی پچی کسی جیسی روشنی آس پاس کی فضا میں گھلی ہوئی تھی۔ اس نے سوئے ہوئے شنید پر ایک نظر ڈالی اور وضو کرنے کے لیے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

عید کی صبح بہت صاف 'شفاف اور چمک دار تھی۔ چشمے کے بلوریں پانیوں جیسی۔

☼ ☼

SCANNED BY DIGEST.PK
مکمل ناول
عتیقہ ملک
دلِ اک شہرِ ملال
۲
دوسری قسط
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

"چلیں دیکھتے ہیں پروگرام بنا تو میں آپ کو انفارم کروں گا۔" اس نے مزید ایک دو باتیں کر کے فون بند کر دیا اور دوبارہ سے کھانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

"تم کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر قدرے چونک کر پوچھ رہا تھا۔ وہ یونہی سر جھکائے لرزتے ہاتھوں میں پکڑی پلیٹ کو دیکھتی رہی۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ساحر خاصی بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر پرسوچ انداز میں ٹیبل سے موبائل اٹھا کر نمبر ڈائل کیے تھے۔

"سلامت صاحب دراصل حمرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے سو آج کے لیے تو معذرت۔" کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا تھا۔

"جی کل تو ہمارا واپسی کا پروگرام ہے۔ انشاءاللہ پھر کبھی آئیں گے تو آپ کی طرف چکر لگے گا۔" دوسری طرف کی گئی بات کے جواب میں کہہ کر مزید ایک دو باتیں کیں اور فون بند کر دیا تھا۔

"کھانا ٹھیک طرح سے کھاؤ۔" قدرے سخت اور وارننگ دینے والے انداز میں کہہ کر وہ خود جا کر بیڈ پر لیٹ گیا تو حمرہ کو دل ہی دل میں افسوس سا ہونے لگا مگر اب اتنی جلدی کھانا چھوڑ کر اٹھنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ خاصی دیر بعد ویٹر برتن لے کر چلا گیا مگر وہ یونہی صوفے پر ٹکی رہی تھی۔

"ادھر آؤ۔" ساحر کے کہنے پر وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

"میں اتنا گیا گزرا لگتا ہوں کہ تم ایسی سوچ میرے بارے میں رکھتی ہو۔" وہ چند لمحے اضطراب سے اس کی بات کو سوچتی رہی۔

"ایم سوری۔" اس کے سوا بھلا کیا کہتی۔

"اچھا میں تمہارے لیے کچھ شاپنگ کر کے لایا ہوں دیکھو تو مجھے خواتین کے لیے خریداری کا بالکل تجربہ نہیں ہے۔" وہ ڈاکٹر ایاز کو چھوڑنے گیا تھا تو واپسی پر حمرہ نے جو شاپر اس کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ وہ سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔

چند لوشنز' پرفیومز اور کاسمیٹکس کی دوسری اشیاء کے ساتھ چار ریڈی میڈ سوٹ۔

"اچھے ہیں۔" اس نے بے دلی سے دیکھ کر خوش دلی سے تعریف کی تھی۔

"کل خود بازار چلنا میرے ساتھ اور اپنی مرضی سے شاپنگ کر لینا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ آج کون سا سوٹ پہنو گی۔"

"آج تو نہیں کل۔۔۔" اس نے کسلمندی سے کہنا چاہا تھا۔

"میں کہہ رہا ہوں نا آج۔" ساحر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ چونک گئی تھی۔

"آج کیوں؟ آپ نے ملک سلامت کو کہا تو ہے۔۔۔"

"حمرہ!" یک دم وہ اس قدر زور سے دھاڑا کہ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ دم توڑ گئے تھے۔

"مجھے کراہیت آنے لگی ہے خود سے' میری شکل پر لکھا ہوا ہے کہ میں حد درجہ کرپٹ انسان ہوں؟ میں نے نکاح کیا ہے تم سے' ایک مقدس رشتہ جوڑا ہے' تمہارا شوہر ہوں ملک سلامت کے ہاں نہ بھی جانا ہو تو تمہیں سجنے سنورنے کا کہہ سکتا ہوں۔ بلکہ حکم دے سکتا ہوں۔" تھوڑی دیر خاموش رہ کر وہ اپنے آپ کو کول ڈاؤن کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"میں نے تمہیں کسی مقصد کے لیے پسند نہیں کیا' تمہاری بے اختیار محبت میں دیوانہ ہو کر یہاں منہ اٹھائے بھاگا چلا آیا ہوں۔ تمہیں اپنی زندگی جان کر۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کا صرف اور صرف ایک ریزن ہے۔ مائی لو' یو آر مائی لائف' میں نے بہت مشکل سے لیکن بہت محبت سے تمہیں اپنایا ہے۔ تمہیں مجھ پر یقین کیوں نہیں ہے۔ میری خوشی کو اس قدر منفی سوچ سے ملیامیٹ کیوں کر رہی ہو؟ یہ سوٹ تم نے چار دن سے پہن رکھا ہے۔ اگر کہیں جانا نہیں ہو گا تو کیا تم چینج نہیں کرو گی؟" ساحر کے حدت بھرے جذبوں سے پر الفاظ اس کے سر کے اوپر سے گزر گئے تھے۔ اس کا اندازہ اس کا چہرہ دیکھ کر بخوبی ہو رہا تھا۔ وہ پتھرائی ہوئی پرسوچ نظروں سے فرش کو دیکھ رہی تھی۔

"جہاں تک تمہارے بھائی کی بات ہے تو کہتے ہیں

کہ جواری کسی نہ کسی روز بہن اور بیوی کو ضرور ہارتا ہے۔ مگر میرے بارے میں ایسا کیا ہے تمہارے ذہن میں جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ آفس میں بھی تم اتنا عرصہ آتی رہیں۔ کیا تم نے مجھے اس حد تک گرا ہوا انسان سمجھا؟" وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر کچھ سوچنے لگا تھا۔

"تمہیں آفس میں تو کسی نے ایسی کوئی بات نہیں کہی جو تم میرے بارے میں اس قدر بدگمان ہو؟" نہ جانے اس کے دل میں کیا بات آئی تھی۔ جو رک کر پوچھنے لگا تھا۔

"میرے بارے میں تمہارا سورس آف انفارمیشن تو وہیں سے جڑا ہوگا۔" حمرہ نے ذرا سا چور نظر سے دیکھا اور پھر سوچنے لگی تھی۔

"دیکھو تم چاہو یا نہ چاہو تمہیں رہنا تو میرے ساتھ ہی ہے۔ یوں دل میں کنفیوژن پال کر تم خود کو پریشان کر رہی ہو۔ جو بھی بات ہے مجھے بتادو۔ شاید میں کلیئر کر سکوں۔" اس کی چور نگاہ سے وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ مگر اب اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔

"مجھے عیشا نے... میرا مطلب ہے کہ..." وہ اٹک گئی تھی۔

"مطلب کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ عیشا نے تمہیں کیا بتایا تھا؟" اور چند لمحے پھر سے سوچ کر اس نے ساری بات اگل دی تھی اور ساحر کو مارے حیرت کے گویا سکتہ ہی ہو گیا تھا۔ آفس کی لڑکیوں کو لفٹ کے بہانے بے ہوش کر کے سعد کے فلیٹ پر لے جانا' ان کی آبرو ریزی کر کے ہمیشہ کے لیے غلط زندگی گزارنے پہ مجبور کرنا یہ سب انکشافات جو وہ اس کی زبان سے سن رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے وہ مجھے مجھ سے بھی پہلے جان چکی تھی۔" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔ "چلو شکر ہے یہ قصہ تو سمجھ میں آیا۔" تھوڑی سی دیر کے غور کے بعد ایزی ہو کر کراؤن سے ٹیک لگائی اور سائیڈ سے اپنا موبائل اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا تھا۔ آفس کا ہی نمبر تھا۔ تبھی اسپیکر آن ہونے کے باعث اسے عیشا کی آواز سنائی دی تھی۔

"ساحر اسپیکنگ!"

"یس سر!" "مس عیشا میرے بارے میں کہا گیا ہے کہ میں آفس کی لیڈیز ورکر کو کڈنیپ وغیرہ کروانے کا کام کرتا ہوں اور سعد بھی انوالو ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟"

"جی... جی سر بہت... بہت غلط کہا ہے کسی نے۔" اسے عیشا کے الفاظ بوکھلاتے محسوس ہوئے تھے۔

"آپ تو اتنے عرصے سے میرے ساتھ کام کر رہی ہیں' آفٹر آل آپ کو میرے بارے میں صحیح پتا ہوگا۔ ذرا مس حمرہ سے میرا تعارف کروا دیں۔ لیں ان سے بات کریں۔" ساحر کا انداز ایسا تھا گویا وہ موبائل اسے دے رہا ہے مگر صرف بولنے کا اشارہ کیا تھا۔

"ہیلو عیشا میں حمرہ بات کر رہی..."

"حمرہ کی بچی' خود تو دفع ہو گئی ہو اب مجھے کیوں نکلوانے کا ارادہ ہے۔ سر ساحر تو اتنے سوبر اور ڈیسنٹ انسان ہیں۔ وہ تو میں نے مذاق کیا تھا تم سے تم اتنی ہونق ہو کر مجھے سن رہی تھیں کہ میں گپیں ہانکتی چلی گئی۔"

"ویسے تم کہاں ہو' میرا مطلب ہے سر تمہیں کہاں مل گئے۔ تم تو گاؤں چلی گئی تھیں۔" بات کرتے کرتے یک دم ہی وہ ٹھٹک کر پوچھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی ساحر نے کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔

"بس اتنی سی بات تھی۔ پہلے بتاتیں تو تبھی کلیئر ہو جاتا۔" ساحر نے اس کی آنکھوں میں مسکرا کر جھانکا تھا۔

"ایم سوری اس وقت تو اس نے مجھے اتنے ہنڈرڈ پرسنٹ ایفکٹ..."

"اٹس او کے۔" ساحر نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"اب تو میری بات مانو گی؟"

"کون سی بات؟" حمرہ کے ذہن سے نکل چکا تھا کہ

بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔
"یہی کہ میری خاطر تھوڑا سا اپنا حلیہ بدل لو۔ اتنے دن سے مجھے تنگ کر رکھا ہے اب تمہاری تھوڑی سی خیریت پوچھنا تو میرا حق بنتا ہے نا۔" اس کے معنی خیز انداز پر یکدم ہی وہ نگاہ بدل کر سفید بیڈ شیٹ کے نادیدہ پرنٹ کو حفظ کرنے لگی تھی۔
"میں دو تین گھنٹے کے لیے سوؤں گا۔ اور جب اٹھوں تو مجھے یہ روتی بسورتی' بدحال' مس فکر ٹائپ کمرے میں نظر نہ آئے بلکہ بجی سنوری بیوی۔۔۔"
"میرا ہاتھ چھوڑیں پلیز۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ تیزی سے کہہ کر اٹھ گئی اور سر جھکا کر صوفے پر جا بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼
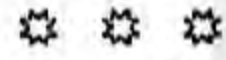
ساحر کے سونے کے بعد اس نے نہا کر کپڑے بدلے اور بالوں کو سلجھانے کے بعد کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی جہاں سے کلر کہار پہاڑیاں' درخت اور سبزہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر یونہی خالی خالی نظروں سے اس منظر کو دیکھنے کے بعد واپس صوفے پر جا بیٹھی تھی۔
"کیا پتا علیشا جاب چھوٹنے کے ڈر سے مکر گئی ہو۔" جتنی دیر مصروف رہی ذہن خالی رہا مگر فرصت پاتے ہی وہم نے پھر سے دل و دماغ پر دستک دی تو تھوڑی دیر پہلے کا دل میں اترنے والا سکون تباہ ہونے لگا تھا۔
اس کی نظر بھٹک کر بہت ہی پرسکون انداز میں سوئے ہوئے ساحر پر جا پڑی تھی "کتنے سکون سے سو رہا ہے یہ۔" اس نے بے حد حسرت سے سوچا تھا۔ باپ کے ساتھ گزرا ہوا وقت نظروں کے سامنے پھرنے لگا تھا۔ وہ بہت ہی مطمئن انداز میں گزاری ہوئی اپنی اسٹوڈنٹ لائف کو یاد کرنے لگی جس باپ کی شفقت کا سایہ اس کے سر پر تھا اور کوئی بھی پریشانی اس کے لیے معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس نے بابا کی بے تحاشا خوشی کو یاد کیا جب اس نے میٹرک میں بورڈ میں تھرڈ پوزیشن لی تھی۔ اور جب ایف ایس سی میں اپنے سیشن میں سیکنڈ پوزیشن پر وہ مغموم ہوئی تھی تو انہوں نے کس طرح خوش ہوتے ہوئے اس کی ہمت بندھائی تھی۔ اس کے بابا اسے لیکچرر بنانا چاہتے تھے اس کی منزل زیادہ دور بھی نہیں تھی مگر پھر کیسے ان کے سب خواب بکھر گئے تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں ان کی آنکھوں میں بسی حسرت کو یاد کر کے ایک بار پھر آنسو رواں ہو گئے تھے۔ ماں باپ کے دل اولاد کی طرف سے بہت روشن ہوتے ہیں۔ ان کا دل انہیں اولاد کے ساتھ پیش آنے والے حادثات کی کچھ نہ کچھ خبر پہلے ہی دے دیتا ہے مگر یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا جو اس کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے ایک دھندلائی ہوئی نظر سوئے ہوئے ساحر پر ڈالی۔
باپ کی مہربان آغوش سے محروم' بھائی کے جبر کو سہنے والی وہ لڑکی دنیا میں سب سے زیادہ جس سے بدگمان تھی' تقدیر نے اسے اس کا ہی کر ڈالا اور وہ بے بس آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میرے بابا اتنی جلدی کیوں چلے گئے' اس کے دل میں ہوک اٹھ رہی تھی۔ اذان کی آواز گونجی تو اسے خیال آیا وہ جو کبھی فرض نماز کی ادائیگی میں تاخیر نہیں کرتی تھی۔ وہ جو کبھی دست دعا کی طلب کو فراموش نہیں کرتی تھی۔ چار دن اس ہستی کے حضور جھکنا بھول چکی تھی جس کے پاس اس کا سکون تھا۔ اور جو مانگنے والوں کو عطا کرتا ہے۔ جس کے دائرہ اختیار میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔
یہ جو وقت ہے میرے شہر میں کئی موسموں سے رکا ہوا

اسے اذن دے کہ سفر کرے
اسے حکم دے کہ یہ چل پڑے
میرے آسمان سے دور ہو
کوئی چاند چہرا کشا کرے
کوئی آفتاب ظہور ہو
کہ نوائے چشم خیال میں وہ جو خواب تھے
وہ دھواں ہوئے
وہ جو آگ تھی وہ نہیں رہی جو یقین تھے وہ گماں

ہوئے

کوئی دھند ہے جسے دیکھتے میری آنکھ برف سی ہو گئی
وہ عبارت سرِ لوحِ دل کسی ربط سے نہیں آشنا
کہ جو روشنی تھی کتاب میں وہی حرف سی ہو گئی

میری آنکھوں میں یہ جو رات ہے میری عمر سے اسے ٹال دے
میرے دشتِ ریگِ ملال کو کسی خوش خبر کا غزال دے

یہ فلک پہ جتنے نجوم ہیں تیرے حکم کے ہیں منتظر
وہ جو صبحِ نو کا نقیب ہے میری سمت اس کو اچھال دے

☼ ☼ ☼

"گڈ ایوننگ سویٹ گرل۔" بھرپور نیند لینے کے بعد وہ نہا کر باتھ روم سے برآمد ہوا اور تولیے سے سر کو رگڑتے ہوئے مسکرا کر اسے بغور دیکھا تھا۔

اس کے لائے ہوئے ڈارک بلو کلر کے سوٹ میں حمرہ کی سفید رنگت چمک رہی تھی۔ سوٹ کی کڑھائی سے میچنگ کندھے پر پڑا ہوا سفید دوپٹا ڈھیلی ڈھالی چوٹی کی شکل میں بندھے سلکی بال اور موٹی موٹی سیاہ آنکھوں کی رنگت خوب صورتی کو مزید نکھار رہی تھی۔ قدرے اداس سا انداز اس کے چہرے کی پاکیزگی کو اور ہی حسن بخش رہا تھا۔ وہ جو صوفے پر نیم دراز تھی اس کی گہری نظروں کے ارتکاز سے سمٹ گئی تو وہ رخ بدل کر تیار ہونے لگا تھا۔

"آج ذرا گھومنے پھرنے چلتے ہیں۔ ڈنر بھی اوپن ایئر میں کریں گے۔" پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے اس نے اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دیتے ہوئے کہا تھا۔ اور بیڈ کی سائیڈ پاکٹ سے مخملیں کیس نکال کر صوفے پر اس کے قریب آن بیٹھا تھا۔ گولڈن چین اور اس میں سجا چھوٹا سا لاکٹ وہ آج ہی صبح اس کے لیے خرید کر لایا تھا۔ چین کا ہک کھول کر اس نے کچھ کہے بغیر اس کی گردن میں پہنا دی تھی۔ چھوٹی چھوٹی گولڈن بالیاں حمرہ نے پہلے ہی پہن رکھی تھی۔ اس کے سنگھار میں کوئی کمی تھی تو وہ اب پوری ہو گئی تھی۔

"چلو باہر چلتے ہیں۔" حمرہ کے کنفیوز سے انداز کو شدت سے محسوس کر کے وہ اس کا ہاتھ تھپتھپا کر اٹھا مگر پھر خود ہی چونک گیا تھا۔

"تمہیں تو ٹمپریچر ہو رہا ہے؟"

"مجھے بہت تھکن ہو رہی ہے میں سو جاؤں؟" وہ بمشکل کہہ پائی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے تم ریسٹ کرو میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں۔" نرمی سے کہتے ہوئے اس نے "فوراً" ہی پروگرام بدل دیا تھا۔

"پلیز ڈاکٹر کو مت بلائیں میں سونا چاہتی ہوں۔" وہ بیڈ پر جا کر لیٹ گئی تھی۔ اس کے منع کرنے کے باوجود وہ ایاز سے کوئی میڈیسن پوچھنے کے لیے فون اٹھا کر باہر آ گیا تھا۔

دو گھنٹے تک سوتی جاگتی کیفیت میں رہنے کے بعد وہ پانی پینے کے لیے اٹھی تو ساحر نے کھانے کی بابت پوچھا تھا۔ مگر اس نے بھوک نہ ہونے کا کہہ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ کافی دیر تک سونے کی کوشش میں عیشا کی کہی ہوئی باتیں اور پھر اس کی طرف سے ہونے والی تردید کو سوچتی رہی پھر ذرا سا آنکھیں کمبل سے باہر نکال کر اس نے بیڈ کے دوسری طرف نیم دراز ساحر کو دیکھا جو وائیم کا گلا گھونٹ کرٹی وی پر چلتی پھرتی تصویریں دیکھ رہا تھا۔

چار دن سے یہ کسی مستعد نرس کی طرح میرا خیال رکھ رہا ہے۔ حالانکہ میں کوئی بیمار تو نہیں ہوں۔ ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے ساحر کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔ جب یہ میری طرف دیکھتا ہے تو مجھے اس کی آنکھوں میں انوکھا سا احساس دکھائی دیتا ہے مگر اپنی طرف اس کا دیکھنا برا نہیں لگتا حمرہ اب ہوش و حواس میں رہ کر سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی "اس کی آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں بالکل سیاہ اور شفاف جیسے وہ بہت اچھا انسان ہو۔" کمبل کے کنارے پر تھمی وہ

آنکھیں خود پر مرکوز محسوس کر کے ساحر کی مسکراہٹ گہری ہو چلی تھی۔

"کوئی بات ہے کیا؟" یک دم وہ ٹی وی آف کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"نہیں۔" وہ کچھ گڑبڑا گئی تھی۔

"اگر تمہارے بابا تمہاری شادی مجھ سے کر دیتے تو تب بھی تم ایسا ہی ری ایکٹ کرتیں۔" اس کے انکار پر وہ خود ہی پوچھنے لگا تھا۔

"میرے بابا ایسا بالکل نہ کرتے۔" اس کے چہرے پر کسی کسک کی اذیت ابھری تھی۔

"کیوں؟" وہ کچھ حیران ہوا تھا۔

"میں انہیں سب بتا دیتی۔"

"کیا؟" ساحر کے چہرے پر دھواں پھیل گیا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تم اپنے بابا کو کیا سب بتا دیتیں۔" اس کا انداز پہلے کی طرح ہلکا پھلکا نہیں تھا۔ کافی دیر کے لیے ان کے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔

"آپ کا گھر ہے نا......"

"نہیں میں تو سڑک کے کنارے چارپائی ڈال کر سوتا ہوں۔" اس کی ادھوری بات کاٹ کر ساحر نے تیکھا سا جواب دیا تھا۔ عیشا کی تردید کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوئی یہ جان کر اسے غصہ آنے لگا تھا۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کا جو گھر ہے وہاں آپ کی فیملی کے اور لوگ بھی رہتے ہوں گے؟"

"نہیں گھر میں گھر والوں کا کیا کام جس چور 'ڈاکو' لٹیرے کا دل چاہے ہمارے گھر آ کر رہنے لگتا ہے۔" اس نے ایک بار پھر سابقہ انداز میں جواب دیا تھا۔

"یہ سی آئی اے کی ایجنٹ بن کر انویسٹی گیشن کرنے کی ضرورت نہیں تم اپنے حواس درست کرو پھر گھر چلتے ہیں خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔" حمرہ کے خاموش ہونے پر قدرے ریلیکس انداز میں کہنے لگا تھا۔

"آپ اپنے لیے کھانا یہیں منگوا لیں نا۔" حمرہ اس کے ہرٹ ہونے پر کچھ شرمندہ ہو رہی تھی۔

"بھوک نہیں ہے۔" وہ بددلی سے کہہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے کس طرح ایکسائیٹڈ ہو کر اس نے پروگرام بنایا تھا مگر اب...... دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کرتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"باہر چلیں؟"

"تمہاری طبیعت؟" ساحر چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے متذبذب ہوا تھا۔

"اب بہتر ہے۔"

"چلو صرف ڈنر کر کے واپس آ جائیں گے۔" اس کے دوبارہ اصرار کرنے پر ریلیکس سے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"اب تمہیں کس بات کی ٹینشن ہے جو یوں ٹمپریچر بڑھا لیا ہے۔" ڈنر سے واپس آ کر وہ سونے کے لیے لیٹے تو ساحر نے اس کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپ ویسے تو نہیں ہیں نا جیسے عیشا نے کہا تھا؟" چند لمحے اس کا چہرہ دیکھنے کے بعد وہ پوچھ رہی تھی۔ "اوہ نہیں یار بالکل بھی نہیں......" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "آپ بہت اچھے ہیں" وہ اس کے سوال پر دل ہی دل میں مسکرایا تھا۔

"اچھا ہوں تبھی تو اللہ نے اتنی اچھی لڑکی میرے مقدر میں لکھ دی ہے۔" ساحر نے اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دے کر کہا تو اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچا اور سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔

"تمہیں اس رشتے کو قبول کرنے کے لیے وقت چاہیے نا؟" وہ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے سارے گر آزما رہا تھا۔

"ہاں" اس نے لبوں کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ تکیے پر رکھے سر کو زور سے اثبات میں ہلایا اور پھر اگلے ہی لمحے آنکھیں موند لی تھیں۔ تھوڑی دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ لائٹ آف کر کے سونے کے لیے لیٹ گیا

☼ ☼ ☼

"چلو آج بوٹنگ کرتے ہیں۔" وہ روشنیوں اور

شور و غل سے ذرا پرے جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھے تھے۔

"نہیں پلیز..." ہر بار کی طرح حمرہ نے انکار کر دیا تھا۔

"آخر کیوں؟" کتنے دن سے اس بات کے جواب میں وہ اس کا انکار سن رہا تھا۔

"مجھے پانی میں جانے سے ڈر لگتا ہے۔" اصل میں اسے کالج میں ایک لڑکی نے کہا تھا کہ تمہارے ہاتھ میں پانی میں ڈوبنے کی لکیر ہے۔ مگر اب یہ بات وہ ساحر کو بتانے سے ہچکچا رہی تھی۔ سو اپنے انکار پر ڈٹی رہی۔

"کچھ نہیں ہو گا بھئی اور یوں بھی مجھے تیرنا آتا ہے۔" اس نے تسلی دی تھی۔

"مجھے تو صرف ڈوبنا ہی آتا ہے۔" اس نے بھی کمال سادگی سے کہا تو ساحر ہنس پڑا تھا۔

"میں تمہیں ڈوبنے نہیں دوں گا۔ ایسا کرتے ہیں کہ دو کشتیاں لے لیتے ہیں۔ ایک ڈوبنے والی ہو گی تو جلدی سے دوسری میں بیٹھ جائیں گے۔"

"بڑی مہربانی دو کشتیوں کے سوار کے مقدر میں ڈوبنا ہی ہوتا ہے۔"

"اچھا آپ میری ایک بات مانیں پھر چلتے ہیں۔" کچھ سوچ کر اس نے خود ہی آفر کی تھی۔

"ہاں بولو۔" وہ سگریٹ نکال کر اسے شعلہ دکھا رہا تھا۔

"آپ اس کو پانی میں پھینک دیں۔"

"کس کو؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگا تو حمرہ نے خاموشی سے سگریٹ اور لائٹر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"او گاڈ اس کو بھی پھینکوں۔" اس نے جلتے سگریٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"چلیں یہ پی لیں کیا یاد کریں گے۔" اس نے قدرے سخاوت اور شرارت سے کہا تھا۔

"ان کو پھینک دوں مگر کیسے؟" سگریٹ اور لائٹر کو ہاتھ میں پکڑ کر وہ معصومیت سے دریافت کر رہا تھا۔

"ایسے۔" حمرہ نے اس کے ہاتھ سے لائٹر اور سگریٹ کی ڈبیا لے کر جھیل میں پھینکی اور ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میرے سر میں بہت درد ہو گا۔" وہ مسکین سے انداز میں اسے خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں میں آپ کا سر دبا دوں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے اطمینان سے تسلی دی تھی۔

"تم کوئی ڈاکٹر ہو جو تمہارے دبانے سے ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ بظاہر چڑ کر کہہ رہا تھا مگر اندر سے اسے حمرہ کا یوں حق جتانے کا انداز شانت کر گیا تھا۔ وہ اس کے یوں چڑنے پر ہنسی تو ساحر نے اس کے برابر چلتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا اور اسے ایک ہی خیال آیا کہ قوس قزح کا گلابی رنگ اس کے گالوں پر بکھر گیا ہو۔ مگر اب اس کے چہرے پر ایک اور رنگ بھی نظر آتا ہے۔ "ساحر کی محبت اور یقین کا رنگ" حالانکہ اسے اس کی زندگی میں شامل ہوئے گیارہواں دن تھا اور کل ان کا واپسی کا پروگرام تھا جو ساحر نے اس کی بے حد اصرار پر بنایا تھا۔

اب بھی وہ کسی کسی وقت پریشان اور نڈھال ہو کر ساکت آنکھوں سے خلا میں دیکھنے لگتی تھی۔ اس لیے کہ اسے اپنے ساتھ بھائی کے کیے سلوک کا دکھ تھا۔ ایسے میں وہ اداس ہوتی تو ساحر کی مہربان قربت اسے اداسی کے خول سے نکالا کرتی تھی۔ وہ حتی الامکان کوشش کرتا کہ حمرہ کو کبھی زیادہ دیر کے لیے اکیلا نہ چھوڑے۔ مبادا کہ وہ کچھ سوچ کر پریشان ہو یہاں تک کہ سوتے میں جب وہ کروٹ بھی بدلتی تو وہ چونک کر آنکھیں کھول دیتا۔ اس کے یہ محبت بھرے انداز ہی تھے کہ حمرہ کو آنے والی زندگی سے کوئی خدشہ نہیں تھا۔ آج سے گیارہ روز پہلے کا وہ دن بھولی نہیں تھی تو یاد بھی نہ رکھا تھا۔

"حمرہ! میں ادھر سے... سگریٹ کا ایک پیکٹ لے لوں۔" تھوڑی دیر چلنے کے بعد وہ ایک اسٹور کے سامنے سے گزرے تو ساحر نے اٹک اٹک کر گویا ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

"لے لیں۔" حمرہ نے چند سیکنڈ اسے گھورا اور پھر مسکرا کر اجازت دے دی تھی، جانتی تھی کہ یہ عادت اچانک سے چھوٹنے والی نہیں ہے۔

"پیسوں گا نہیں میں دل کی تسلی کے لیے اپنے پاس رکھوں گا۔" وہ جس طرح صفائی دینے والے انداز میں کہہ رہا تھا اسے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"زرینہ دیکھو ذرا باہر کون ہے؟" گیٹ کھلنے اور گاڑی اندر آنے کی آواز پر انہوں نے آواز دی تھی۔

"بیگم صاحبہ، صاحب جی آگئے ہیں۔" زرینہ نے لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور مڑ کر اطلاع دی تھی۔

"اس لڑکے کی سرپرائز دینے کی عادت نہ گئی۔ شام کو ہی تو بات ہوئی تھی۔ بتا دیتا تو میں ڈنر پر کچھ اہتمام کروا لیتی۔" سنبل کا شوہر زبیر سا ہیوال اپنے ماں باپ کے بلاوے پر گیا ہوا تھا۔ سو وہ ادھر آگئی کہ جانتی تھی۔ زبیر کو کیوں بلوایا گیا ہے۔

"اچھا ہے ماما میں بھی آج بھائی سے بات کر لوں گی۔"

تبھی مرکزی دروازے سے ساحر اندر داخل ہوا تو اس کا آنا واقعی سرپرائز ثابت ہوا بلکہ وہ تو گرینڈ سرپرائز کا ہاتھ تھامے چلا آرہا تھا۔ سنبل اور مسز شاہ دونوں ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔ ساحر کی اکیڈمک کیریئر کے دوران بھی کسی لڑکی سے اتنی فرینڈ شپ نہیں رہی تھی کہ یوں ہاتھ پکڑ کر گھر لے آتا۔ اپنی فیملی اور سرکل کی لڑکیوں سے مختصر ہیلو ہائے کر لیا کرتا تھا اور بس۔ نہ ہی اس کے ساتھ آنے والی لڑکی اپنے انداز و اطوار سے ایسی لگ رہی تھی کہ کسی کو بوائے فرینڈ بنا کر اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ پکڑا دیتی۔ ان دونوں کے ذہن میں کم و بیش ایک جیسے خیالات آئے تھے اور دونوں کے دل ایک ہی خدشے سے دھڑک اٹھے تھے۔

"السلام علیکم!" حیران پریشان وہ دونوں ساحر کے سلام کا جواب بھی نہ دے پائیں۔ صرف مسز شاہ نے سر ہلایا تھا۔

"کیا ہوا بھئی؟ کیا ہوا ماما؟ اپنی بہو سے نہیں ملیں گی۔" وہ خوش باش سا آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" مسز شاہ کے ساکت لبوں میں جنبش ہوئی تھی۔

"مطلب یہ کہ میں نے شادی کر لی ہے۔" اس نے اطمینان سے یوں بتایا جیسے کوئی بے حد ہلکی پھلکی بات ہو۔ آفس سے جلدی گھر آگیا ہو یا ذرا دیر سے جانے کا پروگرام ہو۔

"کیا مذاق ہے یہ؟"

"ماما یہ مذاق نظر آرہا ہے آپ کو؟" اس نے انتہائی سنجیدہ ہو کر پاس کھڑی حمرہ کی طرف اشارہ کیا تو مسز شاہ نے چند لمحے سوچا تھا۔

"ادھر آؤ بیٹا۔" مسز شاہ نے خاموش کھڑی حمرہ کو پاس آنے کا اشارہ کیا تو وہ ان کے قریب چلی گئی تھی۔

"کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟" اس نے سر ہلایا تو چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد انہوں نے اسے خود سے لپٹا لیا تھا اور پھر خود سے ذرا سا الگ کر کے اس کا چہرہ بغور دیکھا تھا۔ مسکرا کر انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تو ساحر بھی مسکرا دیا تھا۔

"نیک محمد! نیک محمد بھئی بچوں کے پینے کے لیے تو کچھ لاؤ۔" مسز شاہ اونچا اونچا بولتیں کچن کی جانب بڑھ گئی تھیں۔

"کیا بات ہے آپی؟ آپ کو شاک لگا ہے؟"

"شاک مارو گے تو شاک ہی لگے گا۔" سنبل لب کاٹتی ہوئی استہزائیہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ نا تم بھی۔" حمرہ ابھی تک کھڑی تھی۔

"بلکہ ایسا کرو زرینہ حمرہ کو میرے کمرے میں چھوڑ آؤ۔" اسے کہتے کہتے وہ زرینہ سے مخاطب ہوا تھا۔

"آئیں بی بی جی۔" کہہ کر وہ آگے بڑھی تو حمرہ نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

"آپی ملنے ملانے کے مینرز بھی بھول گئی ہیں کیا" ان کے جانے کے بعد وہ پھر سے سنبل سے مخاطب ہوا تھا کہ اس کے روڈلی انداز کی وجہ سے ہی تو اس نے

حمرہ کو کمرے میں بھیجا تھا۔

اس سے پہلے کہ سنبل کچھ کہتی مسز شاہ نیک محمد سے بولتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں نیک محمد اس کے سامنے کولڈ ڈرنک رکھنے لگا تھا۔

"لڑکی تو ماشاء اللہ بہت اچھی ہے لیکن اگر تم نے ایسا کچھ کرنا ہی تھا تو مجھے بتاتے یہ کیا طریقہ ہے۔" مسز شاہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کچھ سنجیدگی اور کچھ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"ماما میں ابھی چینج کر کے آتا ہوں پھر ذرا تفصیل سے بات کرتے ہیں۔" ساحر نے ایک گھونٹ لے کر ٹرے سے دوسرا گلاس اٹھایا اور اٹھ کر اوپر چلا گیا تھا۔

"ماما آپ کو کیا ہوا ہے؟" سنبل حیرت سے دریافت کر رہی تھی۔

"مجھے نہیں تمہارے بھائی کو کچھ ہوا ہے۔ کیسے ایک انجان لڑکی کو سامنے کھڑا کر کے کہہ رہا ہے، بہو ہے میری جیسے میں اس کی ماں نہیں بیس گھر چھوڑ کر رہنے والی ہمسائی ہوں۔" مسز شاہ نے جواباً دانت پیس کر کہا تھا۔

"تو کیوں اتنا میٹھا اس سے بول رہی تھیں؟" وہ الجھ کر پوچھ رہی تھی۔

"بے وقوف ہو تم، جس لڑکی کو مجھ سے پوچھے بتائے بغیر یوں نکاح کر کے لے آیا ہے میرے اور تمہارے قبول نہ کرنے سے ہاتھ پکڑ کر باہر نہیں کرے گا۔ سوچ سمجھ کر چلنا ہو گا۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"کیا میری یاد آرہی ہے؟" اس نے جوس کا گلاس حمرہ کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔

"میں نے منع کیا تھا آپ کو سرپرائز دینے سے۔" وہ گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی تھی۔

"تمہیں آپی کا رویہ اچھا نہیں لگا؟" جواباً وہ خاموشی سے کچھ سوچتی رہی۔

"ساحر ویسا کچھ بھی نہیں ہے جیسا نظر آرہا ہے آئی مین آنٹی۔۔۔"

"واہ بھئی بڑی جینئس ہو گئی ہو۔" وہ جیسے انجوائے کرتے ہوئے بولا تھا۔ مگر اگلے پل سنجیدگی سے کہنے لگا تھا۔

"ماما نے تمہیں اوپری دل سے قبول کیا یہی بہت ہے۔ اگر وہ تمہیں ایکسپٹ نہ بھی کرتیں تو ہمارے ریلیشن شپ میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ انسان کو اپنے قریبی رشتوں کا مان ضرور رکھنا چاہیے مگر اس حد تک کہ وہ اس کی پرسنل لائف میں انٹرفیئر نہ ہوں۔ میں اپنی ماما کا بہت فرمانبردار بیٹا ہوں مگر اپنی زندگی کے اہم فیصلے خود ہی کرنے کا عادی ہوں۔ بندہ اگر لائف پارٹنر بھی اپنی مرضی سے پسند نہ کرے تو لائف کس کے ساتھ گزارے؟" جوتے اتارتے ہوئے وہ تفصیل سے اسے سمجھاتا چلا گیا تھا۔

"یوں بھی میں تو اس بات پر بلیو کرتا ہوں کہ جو دل کو اچھا لگتا ہو۔ اسے دل سے لگا کر رکھا جائے۔" آخر میں اس کا لہجہ شرارتی ہو گیا تھا۔

"آپ سے اتنی وضاحت کس نے مانگی ہے؟" وہ جوتے اٹھا کر ریک میں رکھنے کے بہانے سرخ ہو کر رخ موڑ چکی تھی۔

"سنو۔" وہ اس کے سلیپر اٹھا کر پاس رکھنے لگی تو ساحر نے انتہائی سنجیدگی سے پکارا تھا۔

"جی۔" وہ متوجہ ہوئی تھی۔

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ ویسا تو نہیں ہوں نا۔۔۔ جیسے، جیسے عیش۔۔۔ عیشا نے کہا تھا۔" اس نے ہو بہو حمرہ کے سابقہ لہجے کی نقل اتار کر باریک آواز میں ضرورت سے زیادہ اٹکتے ہوئے پوچھا تو بے ساختہ اس کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

"مجھے کیا پتا آپ جانیں اور عیشا جانے، مجھے تو بس یہ پتا ہے کہ اگلے پانچ منٹ تک مجھے کھانے کی کوئی چیز نہ ملی تو میں سونے لگی ہوں پھر مجھے کوئی نہ جگائے۔" بیڈ پر دوسری طرف بیٹھتے ہوئے گویا اعلان کیا تھا۔

"صرف پانچ منٹ اور اگر ایک منٹ اوپر ہو جائے تو؟"

"بالکل نہیں ہرگز نہیں۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی

توساحر مصنوعی سانس بھر کر باہر چلا گیا تھا۔

✿ ✿ ✿

سنبل کے رویے پر دل ہی دل میں ہرٹ تو ہوئی تھی۔ مگر اس کا سارا ملال ڈھل گیا جب سنبل نے اسے زبردستی ساتھ رکھ کر بہت ہی جوش و خروش سے ولیمے کی شاپنگ کی۔ اگرچہ اس قسم کی شاپنگ میں اس کی دلچسپی اور تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر ہر چیز میں زبردستی اس نے حمرہ کی رائے لی تھی۔ ایک ہفتے بعد ولیمہ کی تقریب بے حد شاندار طریقے سے منعقد ہوئی۔ بقول مسز شاہ کے انہوں نے اپنے سارے ارمان یہیں پورے کرنے تھے۔

"پلیز میک اپ بہت ہلکا کیجیے گا۔" پارلر میں آنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا پھر بے حد ہیوی میک اپ دیکھ کر ہی اسے الجھن ہوتی تھی۔ سو پچھلے پانچ منٹ میں ہی اس نے کوئی تیسری چوتھی مرتبہ کہا تھا۔

"اے لڑکی تم نے میلاد میں جانا ہے یا کسی قل میں شرکت کرنی ہے۔ خبردار جو تم نے کوئی بات کی تو۔" صوفیہ بھابھی نے اسے اچھا خاصا لتاڑ دیا تھا۔

"آپ پلیز اس کا بہت اچھا سا فریش میک اپ کریں۔ پتا تو چلے محترمہ دولہن بن کر کیسی لگتی ہیں۔" اس کی طرف سے فارغ ہو کر وہ بیوٹیشن سے مخاطب ہوئی تھیں۔ مجبوراً" اسے چپ ہونا پڑا تھا۔

"صوفیہ بھابھی یہ میں ہوں۔" تیار ہو کر خود کو آئینے میں دیکھ کر واقعی وہ دنگ رہ گئی تھی۔ روز کلر کے کامدار لہنگے اور بھاری زیورات کے ساتھ شاید زندگی میں پہلی مرتبہ وہ یوں تیار ہوئی تھی۔ سو خود کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔

"نہیں تمہارا بھوت ہے۔" صوفیہ بھابھی ہنستے ہوئے سنبل کو کال کرنے لگیں تو وہ پھر سے آئینے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

✿ ✿ ✿

زبیر بھائی، سنبل اور صوفیہ بھابھی کے ساتھ وہ میرج ہال پہنچی تھی صوفیہ بھابھی نے مہمانوں کے بیچ گھومتے ساحر کو بلایا تھا۔

"بتاؤ تو یہ کون ہے؟"

"پ... پ... پری۔" اتنی مشکل سے اس کے منہ سے الفاظ نکلے کہ سب کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

"اپنا والٹ خالی کرو تو اس پ... پری کا تمہارے ساتھ ولیمہ کرواؤں؟" صوفیہ بھابھی نے اس کی نقل کرتے ہوئے سودابازی کرنی چاہی۔

"مگر میں ایک بے وقوف اور پاگل سی لڑکی کے ساتھ شادی کر چکا ہوں۔" اس نے مصنوعی الجھن بیان کی تھی۔

"اچھا اب ایکٹنگ بند کرو اور بیٹھو۔ زبیر بھائی فوٹو گرافر اور مووی میکر سے کہیں کہ اب ادھر نظر کرم کریں۔" اسے کہہ کر وہ سنبل کے شوہر سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"ماشاء اللہ چشم بددور" مسز شاہ اپنی ہم جولیوں کا سواگت چھوڑ کر اسٹیج پر آئیں تو ستائشی انداز میں کہتے ہوئے پرس سے کچھ نوٹ نکال کر ان کے اوپر سے وارے اور نیک محمد کو پکڑا کر کسی مستحق تک پہنچانے کی ہدایت کی تھی۔

"ایاز بھائی ہمارے ساتھ مووی کیوں نہیں بنوا رہے؟" اس نے ساتھ بیٹھے ساحر کو مخاطب کیا تھا۔

"پتا نہیں۔"

"وہ مجھ سے ناراض ہوں گے؟"

"خود پوچھ لو۔" اس نے کندھے اچکا دیے تھے۔

اور یہی بات اس نے صوفیہ سے کی تو وہ جلدی سے جا کر ایاز کو بلا لائی تھی۔

"ایاز بھائی وہ..." وہ کچھ متذبذب سی ہو رہی تھی۔

"حمرہ کہہ رہی ہے آپ اس سے ناراض ہیں۔" صوفیہ نے اس کی ترجمانی کی تھی۔

(تیسرا حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

شعاع عمیر

ہر لقمے اور گھونٹ پر اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہوتا ہے جو ایک لقمہ کھائے (اور) اس پر اللہ تعالیٰ کی تعریف (بیان) کرے یا پانی کا ایک گھونٹ پیے (اور) اس پر اللہ تعالیٰ کی تعریف (بیان) کرے۔ 4019

(مشکوۃ شریف: کتاب الاطعمہ)

صغریٰ یاسین۔ کراچی

ایک حکایت ایک سبق

شیخ سعدی نے یہ حکایت بیان کی ہے کہ ایک بادشاہ کو ایک ایسا خوفناک مرض لاحق ہوگیا جس کا کوئی علاج دستیاب نہ تھا۔ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ بادشاہ موت کی آغوش میں چلا جارہا تھا۔ شاہی حکیموں نے سر توڑ کوشش کرکے دیکھ لی مگر افاقہ نہ ہوا۔ شومئی قسمت کہ یونانی حکیموں کا ایک گروہ بادشاہ کی مملکت کے دورے پر تھا جب اسے پتا چلا کہ بادشاہ سخت علیل ہے تو وہ شاہی دربار آئے اور بادشاہ کا معائنہ کیا اور اس امر پر متفق ہوئے کہ اس مرض کی کوئی دوا نہیں ہے' ہاں اگر کسی صحت مند اور سرخ و سپید نوجوان کا جگر بادشاہ کو کھلایا جائے تو بادشاہ سلامت صحت یاب ہوسکتے ہیں۔ بادشاہ نے ایسے صحت مند آدمی کی تلاش کا حکم صادر کیا۔ سپاہی ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک گاؤں سے دیہاتی لڑکے کو پکڑ لائے اور اس کے غریب ماں باپ کو بے شمار دولت دے کر بیٹے کی بھینٹ پر رضا مند کرلیا۔ قاضی شہر نے فیصلہ جاری کردیا کہ بادشاہ کی سلامتی کی خاطر رعایا میں سے ایک آدمی کا خون بہانا جائز ہے۔ جلاد نے قتل کا ارادہ کیا تو لڑکے نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور مسکرایا' بادشاہ کو اس کی اس حرکت پر بڑی حیرت ہوئی اور اس نے دریافت کیا نوجوان! یہ ہنسنے کا کون سا موقع ہے؟ موت سر پر کھڑی ہے اور تو ہنس رہا ہے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ اولاد کا دارومدار ماں باپ پر ہوتا ہے' مقدمہ قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور انصاف بادشاہ سے چاہتے ہیں۔ اب ماں باپ نے دنیا کی دولت کے سبب مجھے قتل کرنے کے لیے دے دیا۔ قاضی نے میرے قتل کا فیصلہ جاری کردیا اور بادشاہ اپنی جان بچانے کے لیے میرے قتل کو جائز سمجھتا ہے اب سوائے خدائے بزرگ و برتر کے کوئی مجھے نہیں بچا سکتا۔ نوجوان کی گفتگو یہ سن کر بادشاہ کا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور کہنے لگا ایسے بے قصور لڑکے کا خون بہانے سے میرا مرنا ہی بہتر ہے۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے اسے آزاد کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ بے شمار مال و اسباب بھی دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بادشاہ اسی ہفتے تندرست ہوگیا۔ اس حکایت سے یہ سبق ملتا ہے کہ اپنے فائدے کے لیے کسی کو ضرر پہنچانا اور کسی کو نقصان پہنچا کر اپنا بھلا کرنا خدائے رب العزت کو پسند نہیں۔

کہکشاں انجم۔۔۔ فیصل آباد

محل یا سرائے

حضرت ابراہیم ادھم بلخ کے بادشاہ تھے۔ ایک روز وہ اپنے دربار خاص میں بیٹھے تھے کہ وہاں ایک اجنبی دندناتا ہوا دربار میں آیا اور پوچھنے لگا۔

"کیا میں اس سرائے میں ایک روز ٹھہر سکتا

ہوں؟" ابراہیم ادھم نے غصے سے کہا۔
"یہ سرائے نہیں' شاہی محل ہے۔" اجنبی نے پوچھا۔ "تم سے پہلے اس محل میں کون رہتا تھا؟" ادھم نے جواب دیا "میرا باپ" اجنبی نے کہا "ان سے پہلے کون رہتا تھا؟" ادھم بولے "میرا دادا" اجنبی نے کہا "تمہارے دادا سے پہلے؟" ادھم نے کہا "میرا پردادا" اجنبی نے سوال کیا "اچھا! تمہارے بعد یہاں کون رہے گا؟"
ادھم نے کہا "میرا بیٹا" اجنبی نے کہا "خود سوچو جس جگہ اتنے آدمی آئے اور چلے گئے کیا اسے محل کہنا چاہیے؟"
اتنا کہہ کر اجنبی چلا گیا' ابراہیم ادھم تخت چھوڑ کر اجنبی کے پیچھے دوڑے اور پھر پلٹ کر نہیں آئے۔

ارم کمال۔۔۔ فیصل آباد

کچھ اقوال مغرب کے

☆ جب ہم یہ دنیا چھوڑیں تو یہ اس دنیا سے بہتر ہونی چاہیے جسے ہم نے پایا تھا۔
(والٹر ڈی لامیئر)

☆ معاشرے میں باغیوں کا وجود ضروری ہے ورنہ سب کا ایک جیسا ہو جانا کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔
(ڈی جے این رائٹ)

☆ خاموشی اور تنہائی چیزوں کو حسن بخشتی ہے۔
(ولیم ورڈز ورتھ)

☆ آواز ختم ہو جاتی ہے' مگر اس کے اثرات قائم رہتے ہیں۔
(ورڈز ورتھ)

☆ کامیاب زندگی کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں نصب العین کا تعین اور پھر اس کے لیے کام۔
(ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ)

☆ نفرت اور غصہ بپانے سے زیادہ طاقت ور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نفرت کا زہریلا درخت دشمن کو تو ختم کر دیتا ہے' مگر انسان کے کردار میں ایک مستقل خامی پیدا ہو جاتی ہے۔
(ولیم بلیک)

☆ گاؤں ہی کسی تہذیب کی بنیادی اکائی ہوتے ہیں گاؤں تباہ ہو جائیں تو تہذیبیں بھی زندہ نہیں رہتیں۔
(افلاطون)

☆ پاسپورٹ نہ ہو تو انسان زندہ تو ہوتا ہے' مگر بے شناخت ہوتا ہے۔
(ایس ٹی۔ کولرج)

☆ بے موقع گفتگو انسان کو لے ڈوبتی ہے۔
(ایڈورڈ لوبری)

☆ مقصد حاصل ہو یا نہ ہو۔ زندگی کو عظیم بنا دیتا ہے۔
(رابرٹ براؤننگ)

☆ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تو رہتے ہیں' مگر ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔
(اسٹیفن لیکاک)

☆ کچھ چیزیں جلد کھو جانے کے لیے ہی ہوتی ہیں اس لیے چیزوں کو کھونے کا فن سیکھ کر خوش رہنے کا ڈھنگ سیکھیں۔
(الزبتھ بشپ)

☆ موت اور زندگی دو مختلف چیزیں ہیں موت ہو تو زندگی نہیں ہوتی ہے۔ زندگی ہو تو موت نہیں ہوتی ہے۔ ہر چیز زندگی سے موت اور موت سے پھر زندگی کی طرف سفر کرتی ہے۔

ثریا شاہ۔ کھروڑ پکا

بڑے لوگ..... بڑی باتیں

☆ ایک شخص کی اس دنیا میں دلچسپی اس کے ذاتی مفاد تک ہی محدود ہے۔
(برنارڈ شا)

☆ انسانی زندگی میں قسمت کا بہت عمل دخل ہے۔ جو شخص خود کو حوادث زمانہ سے محفوظ سمجھتا ہے' وہ خوابوں کی دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے۔
(فاسڈک)

☆ کسی اہل قلم نے بھی حصول دولت کے علاوہ کسی اور مقصد کے پیش نظر کچھ نہیں لکھا۔

(سیموئل جانسن)

☆ جو شخص صرف عقل مند ہی ہے قابل رحم حالت میں زندگی بسر کرتا ہے۔

(والٹر)

☆ جو شخص کسی دوسرے شخص سے فائدہ اٹھاتے وقت اس کا شکریہ ادا کرتا ہے وہ قرضے کی پہلی قسط ادا کرتا ہے۔

(سینکا)

☆ زندگی میں میری کامیابی کا راز یہ ہے کہ میں پندرہ منٹ پہلے اپنے کام پر موجود ہو جاتا ہوں۔

(روزویلٹ)

☆ جو شخص مان لے وہ بعض اوقات اس شخص سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ جو نصیحت کرے۔

(دال نہل)

☆ جو شخص دوسروں کے واقعات سے نصیحت حاصل نہیں کرتا دوسرے اس کے واقعات سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

(حکیم بطلیموس)

☆ محبت خدا اور انسان سے محبت کے سوا کچھ نہیں۔

(ولیم پین)

☆ شریف کی پہچان یہ ہے کہ جب اس سے کوئی سختی کرے تو سختی سے پیش آئے اور جب اس سے کوئی نرمی کرے تو نرم ہو جائے اور کمینے کی شناخت یہ ہے کہ جب اس سے کوئی نرمی کرے تو سختی سے پیش آئے اور جب کوئی سختی کرے تو ڈھیلا ہو جائے۔

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کھوڑیکا

باتوں سے خوشبو آئے

○ جو چیز دسترس میں آجائے اس کا استعمال ممکن کے قریب تر ہے۔

○ زندگی چلتے پانی کی مانند ہے' جو ٹھہر جائے تو رنگ و بو بدل لیتا ہے۔

○ تنہائی میں انسان یا تو گناہوں میں کمی کرتا ہے یا پھر اضافہ۔

○ اک آنسو ہزار لفظوں سے زیادہ صورت حال واضح کر دیتا ہے۔

○ اگر خوشی چاہتے ہو تو خوشی کی تمنا چھوڑ دو۔

صائمہ۔۔۔ وگھ۔ جہلم

فرق

تم دوڑ رہے ہو
میں چل رہا ہوں
مجھے ٹھوکر لگ کر سنبھلنا آسان ہو گا
تم اوندھے منہ زمین پہ جا گرو گے

فوزیہ۔۔۔ گجرات

ناانصافی

وہ اپنے سارے فیصلے
مجھ سے کرواتا تھا
لیکن
میرے بارے میں فیصلہ
اس نے خود کیا

(نجم الثاقب)

گڑیا شاہ۔۔۔ کھوڑیکا

نیکیاں

"اپنی زندگی میں ہم جتنے دل راضی کریں گے اتنے ہی ہماری قبر میں چراغ جلیں گے' ہماری نیکیاں ہمارے مزار روشن کرتی ہیں۔ سخی کی سخاوت اس کی اپنی قبر کا دیا ہے ہماری اپنی صفات ہی ہمارے بعد کام آنے والے چراغ ہیں' جو زندگی میں ہی جلائے جاتے ہیں کوئی نیکی رائیگاں نہیں جاتی۔"

(واصف علی واصف)

سیدہ نسبت گیلانی۔۔۔ کھوڑیکا

☆ ☆

بشریٰ محمود

ثمرہ، اقراء، کی ڈائری میں تحریر
احمد فراز کی غزل

تیرے بعد

بحضور قائداعظم

پھول روتے ہیں کہ آئی نہ صدا تیرے بعد
غرقِ خوں ہے بہاروں کی ردا تیرے بعد

آندھیاں خاک اڑاتی ہیں سرِ صحنِ چمن
لالہ و گل ہوئے شاخوں سے جدا تیرے بعد

جاہ و منصب کے طلب گاروں نے یوں ہاتھ بڑھائے
کوئی دامن بھی سلامت نہ رہا تیرے بعد

جن کو انداز جنوں تو نے سکھائے تھے کبھی
وہی دیوانے ہیں زنجیر بپا تیرے بعد

کس سے آلامِ زمانہ کی شکایت کرتے
واقفِ حال کوئی بھی تو نہ تھا تیرے بعد

اب پکاریں تو کسے زخم دکھائیں تو کسے
ہم سے آشفتہ سرو شعلہ نوا تیرے بعد

پھر بھی مایوس نہیں آج تیرے دیوانے
گو ہر اک آنکھ سے محروم ضیا تیرے بعد

راستے سخت کٹھن منزلیں دشوار سہی
گامزن پھر بھی رہے آبلہ پا تیرے بعد

جب کبھی ظلمتِ حالات فضا پر برسی
مشعلِ راہ بنی تیری صدا تیرے بعد

ارم کمال کی ڈائری میں تحریر
عظیم راہی کی غزل

زخم کھانا تو اپنی عادت ہے
مسکرانا تو اپنی عادت ہے

روشنی ہو کہ گھپ اندھیرا ہو
دل جلانا تو اپنی عادت ہے

آپ کب تک سنبھالیے گا ہمیں
لڑکھڑانا تو اپنی عادت ہے

ہیں ستم گر خفا، تو ہونے دو
سر اٹھانا تو اپنی عادت ہے

راہ چلتی ہوئی مصیبت کو
گھر بلانا تو اپنی عادت ہے

بینش مدثر، کی ڈائری میں تحریر
جاذب قریشی کی نظم

'دھوپ اور پرندہ'
وہ جب مجھ سے تنہائی میں ملنے آئے

میں اس کو پہچان نہ پاؤں
وہ میرے آنگن میں
اک انجانا موسم دیکھے
آئینوں کے عکس
شکستہ دیواروں کی پیاس بڑھائیں
دو جسموں کی خوشبو
اک پرچھائیں لکھے
جذبوں کی وحشی آوازیں شور کریں
کالی آندھی جیسا جنگل
گھر میں اُترے
چمکیلے سورج کو آسیب بجھے
پنجرے کا خوش رنگ پرندہ
برگد کی چھاؤں سے اڑ کر
اپنے پروں پر دھوپ سجالے
واللہ
پگھل کر بے چہرہ ہو جائے

فوزیہ ثمریٹ، کی ڈائری میں تحریر
شہزاد احمد کی غزل

وہ میرے پاس ہے کیا پاس بلاؤں اس کو
دل میں رہتا ہے کہاں ڈھونڈنے جاؤں اس کو

آج پھر پہلی ملاقات سے آغاز کروں
آج پھر دور سے ہی دیکھ کے آؤں اس کو

قید کر لوں اسے آنکھوں کے نہاں خانوں میں
چاہتا ہوں کہ کسی سے نہ ملاؤں اس کو

اسے دنیا کی نگاہوں سے کروں میں محفوظ
وہ وہاں ہو کہ جہاں دیکھ نہ پاؤں اس کو

وہ مجھے اتنا سبک اتنا نک لگتا ہے
کبھی گر جائے تو پلکوں سے اٹھاؤں اس کو

چلنا چاہے تو رکھے پاؤں میرے سینے پر
بیٹھنا چاہے تو آنکھوں پر بٹھاؤں اس کو

یاد سے اس کی خالی نہیں کوئی بھی لمحہ
پھر ڈرتا ہوں کہیں بھول نہ جاؤں اس کو

صائمہ جیمی، کی ڈائری میں تحریر
نقاش کاظمی کی نظم

جب درد نہیں تھمتا،

جب درد نہیں تھمتا، جب نبض نہیں رکتی
پھر آنے سے کیا حاصل، کیوں یونہی تم آتے ہو
مت آؤ تو اچھا ہے، مت آؤ تو اچھا ہے

جب زخم مہکتے ہیں، تم کھل بھی نہیں سکتے
جب یاد ستاتی ہے، تم مل بھی نہیں سکتے
پھر آنے سے کیا حاصل، مت آؤ تو اچھا ہے
ہاں رات کی تاریکی، بل کھا کے چلتی ہے
ہاں دل کے دریچے میں، پروائی بھی چلتی ہے
پھر آنے سے کیا حاصل، مت آؤ تو اچھا ہے
زخموں سے بھرا سینہ، جب زہرا اگلتا ہے
اس وقت بھی خنجر سا، ہر لفظ کا چلتا ہے
پھر آنے سے کیا حاصل مت آؤ تو اچھا ہے
ماتھے پہ کوئی رکھ کر ہونٹوں کو جب پوچھے
آنکھوں سے کوئی چھو کر نبضوں کو جب نہ دیکھے
پھر آنے سے کیا حاصل مت آؤ تو اچھا ہے
دنیا کو دکھانے کو بس یونہی چلے آنا
لمحوں کی اداسی کو کچھ اور بڑھا جانا
پھر آنے سے کیا حاصل مت آؤ تو اچھا ہے
جب درد نہیں تھمتا جب نبض نہیں رکتی
پھر آنے سے کیا حاصل مت آؤ تو اچھا ہے

شگفتہ سلیمان

بشریٰ ——— لغر زون
اک دُنیا منتظر ہے اور تیری بزم میں
اس طرح بیٹھے ہیں ہم جیسے کہیں جانا ہے

ثروت ——— لاہور
بڑے خلوص سے دُنیا کرے گی یاد ہمیں
جہاں میں پیار کے کچھ بیج بو گئے ہم بھی

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ
جب یہ کہتا ہوں کہ بس دُنیا پہ اب تف بھیجیے
نفس کہتا ہے ابھی چندے توقف کیجیے

ثمرہ، اقراء ——— کراچی
دُنیا میں اعتبارِ عروج و زوال کیا!
دو دن میں چاند بڑھ گیا، دو دن میں گھٹ گیا

صائمہ جبیں ——— کراچی
واعظِ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں
اس دُنیا میں کیا رکھا ہے، اُس دُنیا میں کیا ہوگا

سعدیہ سلیم ——— شریف آباد
ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
دُنیا یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

نداء نغمہ ——— فیصل آباد
رہ کے دُنیا میں ہے یوں ترکِ ہوس کی کوشش
جس طرح اپنے ہی سائے سے گریزاں ہونا

کرن شفیق ——— کراچی
ضبط کہتا ہے خموشی سے بسر ہو جائے
درد کو ضد ہے کہ دُنیا کو خبر ہو جائے

صدف عمران ——— کے ڈی اے
اک وہم ہے یہ دُنیا اس میں
کچھ کھوؤ تو کیا اور پاؤ تو کیا
ہے یوں بھی زیاں اور یوں بھی زیاں
جی جاؤ تو کیا، مر جاؤ تو کیا

نسبت زہرا ——— کہروڑ پکا
تمہارے واسطے سے جی رہے ہیں
ہماری چاہتوں کا مان رکھنا

عظمیٰ ——— گوجرہ
تشخیص بجا ہے کہ مجھے عشق ہوا ہے
نسخے میں لکھو، ان سے ملاقات زیادہ

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات
اپنی یادیں اپنی باتیں لے کر بھول گیا
جانے والا جلدی میں تھا، مل کر جانا بھول گیا
وقتِ رخصت میری آنکھیں پونچھ رہا تھا ہاتھوں سے
اس کو غم تھا اتنا زیادہ، خود وہ رونا بھول گیا

نوشین اقبال نوشی ——— گاؤں بدو مرجان
کچھ لوگ یوں ہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی

سدرہ ناز ——— گوجرانوالہ
دیکھا نہ کسی آنکھ میں ہم نے کوئی آنسو
مایوس ہوئے درد کا افسانہ سنا کے

آمنہ ناز محمد ——— میر پور ساکرو
مری وحشت علاجِ غم ہوئی ہے
کہ رونے سے اذیت کم ہوئی ہے
ہنسی آتی ہے اپنے آنسوؤں پر
کہ یہ برسات بے موسم ہوئی ہے

مدیحہ یوسف ——— بھروکی
زندگی چاہیے محبت میں
گھڑی دو گھڑی کی بات نہیں
آپ سے کوئی بھی نہیں پہلے
آپ کے بعد کوئی ذات نہیں

خدیجہ سلیم ______ کبیر والا

بعد مرنے کے میرے تم جو کہانی لکھنا
کیسے برباد ہوئی میری جوانی لکھنا
یہ بھی لکھنا کہ میرے ہونٹ ہنسی کو ترسے
عمر بھر کیسے بہا آنکھ سے پانی لکھنا

تحریم ______ محراب پور

صبح کے تخت نشیں شام کے مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا

نوشین ______ کراچی

مقام عشق دُنیا نے سمجھا ہی نہیں ورنہ
جہاں تک تیرا غم ہوتا وہیں تک زندگی ہوتی

انیقہ انا ______ چکوال

یہ سچ ہے دُور نہیں منزلِ مراد مگر
ہمیں حیات کا کچھ اعتبار بھی تو نہیں
حیات و موت کے اسرار کوئی کیا سمجھے
کہ زندگی میں سکون و قرار بھی تو نہیں

ثمینہ کوثر عطاری ______ ڈوگہ گجرات

راتیں ہجر میں اب بھی نزع کے عالم میں کٹتی ہیں
دل میں دہشت ہے تن میں ابھی جان باقی ہے
دیے منڈیر پر رکھ آتے ہیں ہم ہر شام نجانے کیوں
شاید اس کے لوٹ آنے کا ابھی امکان باقی ہے

زبیدہ ریاض ______ کراچی

ہے یہ بھی سچ کہ تیرے سامنے مجھے برسوں
کوئی رفیق، کوئی کام بھی نہ یاد آیا
نہیں جھوٹ یہ بھی کہ کل جو تجھے میں نے دیکھا
تو کتنی دیر تیرا نام بھی نہ یاد آیا

فرحت ______ خیر پور

وہ ستارہ تھی شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں
رشتہ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

صائمہ سندھو ______ اسلام آباد

تو میرے پاس نہ تھا پھر بھی سحر ہونے تک
تیرا ہر سانس میرے جسم کو چھو کر گزرا
قطرہ قطرہ تیرے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تیری خوشبو سے معطر گزرا

طاہرہ اقبال ______ گوجر خان

اُڑ جائیے نہ کہیں یادوں کی نمی دھوپ کے ساتھ
آپ شبنم کی طرح ذہن پر اترا نہ کریں

امبر گل ______ حیدو (سندھ)

تم کہ سمٹا تو رگ و جاں کی حدوں میں سمٹا
میں کہ بکھرا تو سمٹا نہ گیا تیرے بعد
یہ الگ بات کہ افشا نہ ہوا تجھ پہ ورنہ
کتنا محسوس کیا میں نے تجھے تیرے بعد

عائشہ ______ گوجرہ

تم جب بھی ملو تو نظریں اٹھا کر ملا کرو
مجھے پسند ہے تمہاری آنکھوں میں اپنا آپ دیکھنا

مریم ______ لاہور

پلک جھپکتے ہی دُنیا اجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں

ثریا شاہ ______ کہروڑ پکا

ہوا ہے آپ کے ہاتھوں تو اس میں کیا برائی ہے
ہماری آرزوؤں کا کہیں تو خون ہونا تھا

صائمہ بیبی ______ کراچی

کہیں بکھری ہیں کتابیں کہیں میلے کپڑے
گھر کی حالت ہی عجب ہم نے بنا رکھی ہے
اپنے وحشت زدہ کمرے کی اک الماری میں
تیری تصویر عقیدت سے سجا رکھی ہے

علمیٰ غلام نبی ______ کراچی

ایک حرف تسلی کا، ایک لفظ محبت کا
خود اپنے لیے اس نے لکھا تو بہت رویا

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

بادام کی برفی

اشیا :

بادام	ڈھائی سو گرام
دودھ	ایک لیٹر
پانی	ایک کپ
چینی	آدھا کپ
کوکنگ آئل	ڈھائی سو گرام

ترکیب :

باداموں کو ایک رات قبل بھگودیں۔ چھلکا اتار کر انہیں دودھ کے ساتھ ملا کر بلینڈ کرلیں تاکہ گاڑھا پیسٹ بن جائے ' کسی بھاری تلے کے برتن میں چینی اور پانی ملا کر گھول لیں اور دس منٹ تک پکائیں تاکہ مقدار نصف رہ جائے۔ اب اس میں باداموں کا پیسٹ شامل کر کے مسلسل چمچہ چلاتے ہوئے آدھے گھنٹے تک پکائیں تاکہ گاڑھا پن پیدا ہو جائے۔ کسی دوسرے برتن میں آئل گرم کریں اور تھوڑا سا آئل باداموں کے پیسٹ میں ڈال کر تسلسل کے ساتھ چمچہ چلاتی رہیں تاکہ آئل جذب ہو جائے۔ مزید آئل ڈال کر چمچہ چلانے کا یہ عمل جاری رکھیں تاوقتیکہ آمیزہ چمکدار ہو جائے۔ اس آمیزے کو کیک بنانے والے کسی سانچے میں ڈال کر پھیلائیں اور ٹھنڈا ہونے دیں۔ جب جم جائے تو چوکور ٹکڑوں میں کاٹ کر فریج میں رکھ دیں۔

زعفرانی شاہی ٹکڑے

اشیا :
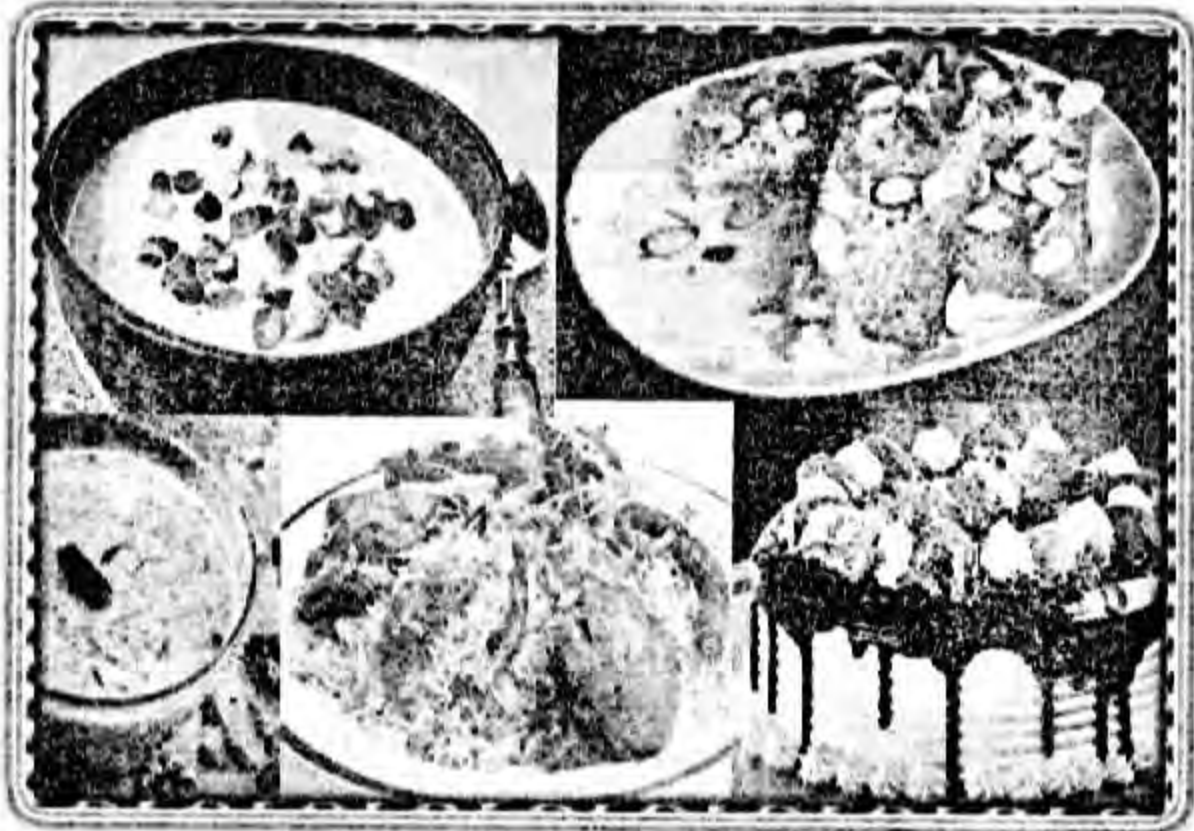
تازہ ڈبل روٹی کے سلائس	دس عدد
دودھ	ایک لیٹر
چینی	آدھا کپ
کھویا	ایک کپ
چھوٹی الائچی	5 عدد
پستہ و بادام (باریک کترا ہوا)	پاؤ کپ
زعفران	دو چٹکی
کوکنگ آئل	آدھا کپ (فرائی کرنے کے لیے)

ترکیب :

ڈبل روٹی کے سلائس سے کنارے کاٹ کر علیحدہ کردیں اور سلائس کے دو تکون ٹکڑے کرکے انہیں گرم کیے ہوئے گھی میں ہلکی آنچ پر گولڈن فرائی کرکے رکھتی جائیں۔ دودھ میں پسی ہوئی الائچی اور چینی ڈال کر ابال لیں اور دس منٹ تک ہلکی آنچ پر پکانے کے بعد کھویا اور دو چمچے دودھ میں زعفران گھول کر اس میں شامل کردیں اور اب دودھ کو گاڑھا ہونے تک پکنے دیں۔ کسی کم گہری ڈش میں فرائی کیے ہوئے سلائس دودھ میں ڈبو کر رکھتی جائیں اور آخر میں بچا ہوا دودھ بھی اوپر سے ڈال دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر کھویا کش کر کے ان شاہی ٹکڑوں پر پھیلائیں اور پستہ و بادام کی ہوائیاں چھڑک کر پیش کریں۔

ایپل کیک

اشیا :

سیب بڑے سائز کے	تین عدد
(چھیل کر بیج نکالے ہوئے، ٹکڑوں میں)	
میدہ	تین کپ
پسی ہوئی الائچی	دو چائے کے چمچے
پسا جائفل	آدھا چائے کا چمچہ
بیکنگ سوڈا	ایک چائے کا چمچ
نمک	چوتھائی چائے کا چمچہ
ادرک پسا ہوا	چوتھائی چائے کا چمچہ
لونگ کا پاؤڈر	ایک چٹکی
سفید مرچ پسی ہوئی	چوتھائی چائے کا چمچہ
چینی	پونے دو کپ
انڈے	تین عدد
ونیلا ایسنس	ایک کھانے کا چمچہ
کوکنگ آئل	ڈیڑھ کپ

ترکیب :

اوون کو 325 فارن ہائٹ پر پہلے ہی گرم کرلیں۔ ایک بڑے پیالے میں میدہ، الائچی، جائفل، بیکنگ سوڈا، ادرک، سفید مرچ، نمک اور لونگ کا پاؤڈر یکجا کر کے الگ رکھ دیں۔ مکسنگ باؤل میں آئل اور چینی ڈال کر الیکٹرک مکسر کی مدد سے درمیانی رفتار پر پھینٹ لیں اور اس میں ایک ایک کرکے انڈا بھی شامل کرتی رہیں۔ اور ہر بار اچھی طرح پھینٹیں۔ اب اس میں ونیلا ایسنس، میدے اور دیگر اجزاء پر مشتمل آمیزہ بھی شامل کرلیں۔ سیب کے ٹکڑے بھی ڈال کر اچھی طرح چلانے کے بعد بیکنگ پین میں منتقل کردیں۔ کم و بیش سوا گھنٹے یا اس وقت تک بیک کریں جب تک کیک کے پکنے کا اندازہ کرنے کے لیے اندر داخل کی جانے والی ٹوتھ پک صاف نہ نکل آئے۔ پیش کرنے سے قبل کیک کو ٹھنڈا کرلیں۔

چاکلیٹ پڈنگ

اشیا :

انڈے	دو عدد
مکھن	100 گرام
آٹا	100 گرام
براؤن شوگر	100 گرام
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
کوکو پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے

سوس

کوکو پاؤڈر 2 کھانے کے چمچے
براؤن شوگر 50 گرام
دودھ 1/3 کپ

ترکیب :

مکھن اور چینی کو پھینٹیں کہ یک جان کر دیں۔ ایک ایک کر کے انڈے ملا دیں اور پھینٹتی رہیں۔ اب چھنا ہوا آٹا مع بیکنگ پاؤڈر اور کوکو پاؤڈر ملا دیں اس آمیزے کو ایک گریس شدہ برتن میں جو 17 انچ گولائی میں ہو انڈیل دیں۔

سوس بنانے کے لیے کوکو پاؤڈر اور چینی ایک چھوٹے پیالے میں ڈال دیں اور دودھ کو ڈالتے میں ملاتی رہیں حتی کہ ملائم ہو جائے۔ اس اسفنج کو آمیزے کے اوپر ڈال دیں۔ پیالے کو مضبوطی سے ٹائٹ کر لیں تاکہ ہوا اندر یا نکل نہ جا سکے۔

میڈیم ہائی پر 10 منٹ مائیکرو ویو کریں۔ ڈھکنا ہٹائیں۔ چھری کو پڈنگ کے کناروں پر چلا دیں۔ پھر گہری فلیٹ پلیٹ سے ڈھانپ دیں 10 منٹ تک رہنے کے بعد پڈنگ کو سانچے سے نکال لیں اور سوس کو پلیٹ پر بہنے دیں۔ فوراً سرو کریں یہ فریزنگ کے لیے مناسب نہیں۔

بادام کی کھیر

اشیا :

بادام	250 گرام (موٹا موٹا کوٹ لیں)
چاول	1/2 کپ (بھگو کر پیس لیں)
دودھ	2 1/2 لیٹر
تازہ کریم	1 1/2 کپ
چینی	حسب پسند
سبز الائچی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
جائفل پاؤڈر	1/4 چائے کا چمچہ
کیوڑہ	2 کھانے کے چمچے
پستہ	4 کھانے کے چمچے
چاندی ورق	حسب پسند

ترکیب :

دودھ کو بھاری پیندے کی دیگچی میں ابال لیں۔ جب ابل جائے تو اس میں چاول شامل کر دیں۔ دس منٹ تک پکانے کے بعد کریم شامل کر دیں اور پکائیں جب گاڑھا ہونے لگے تو اس میں چینی اور بادام شامل کر دیں۔ مزید گاڑھا ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔ الائچی پاؤڈر جائفل پاؤڈر اور کیوڑہ ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر چاندی کے ورق اور پستے سجائیں۔

انڈوں کا پلاؤ

اشیا :

چاول	ایک کلو
آئل	ایک پاؤ
گرم مسالا	ایک چھٹانک
ٹماٹر	ایک پاؤ
ادرک لہسن	پسا ہوا ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	تین سے چار عدد
دہی	ایک پاؤ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

پیاز باریک کاٹ لیں اور آئل میں سرخ کر لیں۔ اب اس میں ادرک لہسن اور باقی مسالے ڈال کر بھونیں ٹماٹر بھی باریک کتر کر ڈال دیں ٹماٹر کے معمولی گلنے پر چاول سے دگنا پانی ڈال دیں جب پانی میں ابال آجائے تو چاول دھو کر ڈال دیں۔ انڈوں کو الگ ابال لیں اور چھلکے اتار کر چھری سے تمام انڈوں پر کچو کے لگا کر دہی میں ایک گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ یہ کام پہلے کر لیں۔ چاول پکنے کے قریب ہو جائیں تو تمام انڈے الگ آئل میں دہی سمیت تل لیں اور جب چاولوں کو دم دینے لگیں تو یہ انڈے ان میں ڈال دیں پھر دم پر لگا دیں۔ تقریباً پندرہ منٹ دم دے کر تمام انڈوں کو چاولوں کے ساتھ یکجا کر لیں اور گرم گرم پیش کریں۔

✲ ✲

حسن و صحت

ادارہ

میک اپ کرنا ایک آرٹ ہے کیا یہ آرٹ آپ کو آتا ہے؟

میک اپ کرنا ایک آرٹ ہے اور یہ ہر کسی کو نہیں آتا ہے۔ ذیل میں چھوٹے چھوٹے ٹپس دیے جا رہے ہیں۔۔۔ آپ ان کے ذریعے اس آرٹ میں بہتری پیدا کر سکتی ہیں۔

فاؤنڈیشن

فاؤنڈیشن لگانا اگرچہ سادہ سا عمل ہے مگر خواتین اس میں بھی کئی غلطیاں کر جاتی ہیں۔ ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ کس طرح سے فاؤنڈیشن لگایا جاتا ہے۔

☆ اگر اس کا شیڈ غلط ہے تو اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کاسمیٹکس کی دکان پر ٹیسٹر ہوتے ہیں ان کے ساتھ اپنی جلد کی رنگت میچ کر کے شیڈ کا انتخاب کریں۔

☆ پیشانی پر، گالوں پر، ٹھوڑی اور ناک پر۔۔۔ ڈاٹ کی شکل میں فاؤنڈیشن لگائیں۔ اگر آپ کو زیادہ ضرورت نہیں ہے تو خاص خاص جگھوں پر بھی لگا سکتی ہیں۔

☆ ایک اسفنج کو گیلا کریں اور اس کی مدد سے پورے چہرے پر فاؤنڈیشن کو یکساں طور پر پھیلا دیں۔

☆ جالائن اور ہیئر لائن کے پاس فاؤنڈیشن کو اچھی طرح بلینڈ کریں۔

☆ انگلیوں کی پوروں کو استعمال کرتے ہوئے پورے چہرے پر ہولے ہولے دباؤ ڈالیں۔ ان سے خارج ہونے والی حرارت سے بلینڈنگ کے عمل میں بہت مدد ملے گی۔ اس اسٹیپ کو نظر انداز نہ کریں۔

☆ قدرتی روشنی میں چہرے کا جائزہ لیں۔ اگر کوئی حصہ رہ گیا ہے تو اس پر کام کریں۔

☆ بلینڈ کا عمل بہت احتیاط سے اور مکمل طور پر کرنا چاہیے۔ ہیئر لائن اور جالائن پر خاص توجہ دیں۔ چہرے اور گردن کے شیڈ میں ہرگز فرق نہیں ہونا چاہیے۔

☆ فاؤنڈیشن کیلیے اسفنج کی مدد سے لگائیں۔۔۔ اسے اوپر نیچے اور دائیں بائیں حرکت دیں اور نوٹ کریں کہ کون سی ڈائریکشن درست ہے اور پھر اسی ڈائریکشن میں عمل کریں۔

بلش

گالوں پر رنگوں کو لگانے کے لیے کئی طریقے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

☆ سب سے پہلے ایسا بلش برش منتخب کریں جو آپ

کے لیے بالکل مناسب ہو اور جس کو استعمال کر کے آپ مطمئن ہو جاتی ہوں۔ پھولے پھولے بالوں والے برش کچھ زیادہ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔

☆ برش پر تھوڑا سا بلش لگائیں۔

☆ کسی سخت شے پر برش کو ہلکے سے ٹھوکیں تاکہ زائد بلش گر جائے۔

☆ گال کے ابھرے حصے کو نمایاں کریں۔

☆ دائرے کی شکل میں برش کو گال پر اس طرح استعمال کریں جیسے ڈسٹنگ کر رہی ہوں۔

☆ اسی برش کی مدد سے کناروں کو اچھی طرح ملا لیں۔

☆ بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر چھ ماہ کے بعد بلش برش کو تبدیل کر لیا جائے تاکہ بیکٹیریا سے محفوظ رہا جا سکے۔

☆ جس قدر ممکن ہو سکے ' برش کو صاف ستھرا رکھیں۔

☆ کیا آپ کے میک اپ کلیکشن میں بلش کے کئی شیڈز ہیں؟ مختلف شیڈز کو ملا کر ایک نیا شیڈ تخلیق کرنے کی کوشش کریں۔ آپ دیکھیں گی کہ کس قدر شیڈز آپ تخلیق کر سکیں گی۔

☆ بلش لگانے میں آپ کو زیادہ وقت نہیں لگتا ہے مگر یہ زیادہ دیر ٹھہرتا نہیں ہے۔۔۔۔ بلش لگانے سے قبل تھوڑا سا بلش کریم لگالیں پھر بلش پاؤڈر۔۔۔۔ اس طرح یہ دیر تک قائم رہے گا۔

آئی شیڈو

آئی شیڈو لگانا ذرا مشکل مرحلہ ہوتا ہے لیکن آپ ایک بار اس کی تکنیک سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں گی اور آپ کے لیے مسئلہ نہیں رہے گا اس کا لگانا۔

☆ گیلے برش سے پپوٹوں کو صاف کر لیں اور تھوڑا سا فیس پاؤڈر ان پر لگالیں۔ اس سے آپ کا لگایا ہوا شیڈز پھیلنے سے محفوظ رہے گا۔

☆ کسی تین شیڈز کا انتخاب کریں جو ایک ہی رنگ کی فیملی سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ ہلکے ' میڈیم اور ڈارک شیڈز میں ہوں۔

☆ اب لائٹ شیڈ کو پورے پپوٹے پر لگائیں یعنی بھنوؤں سے لے کر پلکوں تک۔

☆ میڈیم شیڈ آپ کی آنکھوں کی رنگت کو نمایاں کرے گا۔ اسے پلکوں کی لائن سے لگائیں اور پپوٹے پر بنی پہلی کریز پر ختم کر دیں۔

☆ ڈارک شیڈ کو پلکوں کی لائن کے پاس پاس لگائیں۔ برش کو گیلا کریں اور تھوڑا سا شیڈ لیں۔ برش کو پلکوں کی جڑ پر لگائیں۔

☆ اپنی آنکھوں کو مزید نمایاں کرنے کے لیے بروبون (بھنوؤں کے پاس کی ہڈی) پر گولڈ شیڈ لگائیں۔ آپ چاہیں تو اس شیڈ کا پاؤڈر یا فیمٹ پنسل بھی استعمال کر سکتی ہیں۔

☆ زیادہ عمر کی خواتین کے لیے اچھا ہو گا کہ وہ تیز رنگوں سے گریز کریں۔

☆ لطافت اور سوبر مینسی کو برقرار رکھیں۔

لپ اسٹک

کیا آپ چاہتی ہیں کہ جب آپ پارٹی میں آئیں تو ہر کسی کی گردن آپ کی طرف مڑ جائے؟ سرخ رنگ آپ کے لیے ایسا کر سکتا ہے مگر آپ کو اس حوالے سے ٹرک جاننے کی ضرورت ہے۔

☆ ہونٹوں پر فاؤنڈیشن کی ایک ہلکی سی تہ لگائیں۔ اسے چند سیکنڈ دیں خشک ہونے کے لیے۔

☆ پاؤڈر کی ایک تہ لگائیں۔

☆ لپ لائنر کی مدد سے آؤٹ لائن بنائیں۔ لپ پنسل کا شیڈ آپ کی لپ اسٹک کے شیڈ سے میچ ہونا چاہیے۔

☆ برش کی مدد سے کلر لگائیں اور ہونٹ کے بالکل درمیان میں۔ اس کے بعد برش کی مدد سے کلر کو پھیلا دیں پورے ہونٹ پر۔

☆ ٹیشو کی مدد سے ہونٹوں کو بلوٹ کر لیں۔

☆ لپ برش کی مدد سے لپ اسٹک کی دوہری تہ لگائیں۔ یہ دوسری تہ دیر تک برقرار رہے گی۔

☆ ☆

قابل دید

ٹھیکیدار کی عدم موجودگی میں مزدور سڑک تیار کرنے میں مصروف تھے کہ ڈھیلے کپڑے پہنے دراز قد کا ایک نوجوان وہاں آیا اور اس نے گرج دار آواز میں پوچھا۔ "کہاں ہے تمہارا ٹھیکیدار؟"

"نوجوان کی بات سن کر تمام مزدور سہم گئے اور بھاگ کر ٹھیکیدار کو بلا لائے کہ شاید سڑک کا میٹریل ناقص ہے اور یہ نیب کا کوئی ہے۔"

ٹھیکیدار نے آکر نہایت عاجزی سے پوچھا۔ "کیا ہوا جناب؟" نوجوان نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے بھی اپنے پاس مزدوری پر رکھ لیں۔"

رضوانہ۔۔۔ سانگھڑ

مہذب و شائستہ

ایک نہایت مہذب و شائستہ بزنس مین علی نے اپنے ایک پرانے قرض دار کو خط ارسال کیا۔ جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

"ارباز! میں یہ خط اپنی سیکرٹری سے لکھوا رہا ہوں۔ وہ چونکہ ایک معزز اور پڑھے لکھے خاندان کی فرد ہے۔ اس لیے میں اس کے سامنے وہ الفاظ ادا نہیں کرسکتا جو میں اس وقت آپ کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور چونکہ میں ایک مہذب اور شائستہ انسان ہوں۔ اس لیے فون پر بھی وہ الفاظ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ارباز چونکہ ان دونوں میں سے آپ کوئی نہیں ہیں۔ اس لیے آپ جان سکتے ہیں ارباز کہ میں اس وقت کیا کہنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر علی نے خط مکمل کروایا۔

ثریا شاہ۔۔۔ کہروڑپکا

ہمارے مسیحا

ڈاکٹر سبط نے کہا۔ "سنو میرے دوست! میں تمہیں وہی مشورہ دوں گا جو اپنے مریضوں کو دیتا ہوں۔ دنیا کا کوئی بھی فرد لاش بن کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ تمہیں تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔ جتنی زیادہ سے زیادہ ہوسکے چہل قدمی کیا کرو۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کرسی پر بیٹھنا چھوڑ دو اور کوشش کرو کہ کم سے کم پانچ میل چل لیا کرو اور اس سے بھی زیادہ چل سکو تو اور اچھا ہے۔"

مریض ذیشان بولا۔ "لیکن ڈاکٹر سبط۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر تم شفایاب ہونا چاہتے ہو تو تمہیں میری بات پر عمل کرنا پڑے گا۔ ایک بات سمجھ لو جتنا زیادہ چلو گے اتنا ہی تمہاری صحت کے لیے اچھا ہے۔" ڈاکٹر سبط نے کہا۔

مریض ذیشان بولا۔

"میں اتنا تو چلتا۔۔۔"

ڈاکٹر سبط نے کہا۔ "یقیناً" تم چلتے رہتے ہو۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ "لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت جتنا چلتے ہو اس میں کم سے کم بیس گنا اضافہ کرلو۔"

"لیکن ڈاکٹر سبط صاحب! میرا کاروبار۔۔۔" ڈاکٹر سبط پھر مریض ذیشان کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "گولی مارو ایسے کاروبار کو جو تمہیں چلنے سے روکتا ہے جان ہے تو جہان ہے۔"

مریض ذیشان لاچار ہو کر بولا۔ "ڈاکٹر سبط صاحب! میں صبح سے شام تک گلی گلی آئس کریم بیچتا ہوں۔ یقین کریں رات کے چھ گھنٹوں کے سوا مجھے کہیں سکون سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔"

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کہروڑپکا

نامعقول

لال دین لکڑہارا اپنے کم عمر بیٹے کے ساتھ جنگل میں گیا۔ لکڑیاں کاٹتے کاٹتے شام ہوگئی۔ تھکن سے برا حال تھا۔ واپسی میں راستہ بھول گئے۔ بہت تلاش کے بعد جب راستہ نہ ملا تو اپنے بیٹے کو مارنا شروع کردیا اور لال دین بولا۔ "نامعقول! میں تو راستہ بھول گیا ہوں تو... تو گھر جا تیری ماں تیرا انتظار کررہی ہوگی۔"

ارم۔ کراچی

اس سادگی پہ

گاؤں کا غریب مزارعہ رحیم بخش چوہدری جہانگیر سے اس کی بیٹی کا رشتہ لینے پہنچا۔ چوہدری جہانگیر نے غصے میں آگ بگولا ہوتے ہوئے اپنے نوکروں کو رحیم بخش کی خوب خاطر تواضع کا حکم دیا۔ جب چوہدری جہانگیر کے نوکر اسے مارتے مارتے تھک کر بے حال ہوگئے تو رحیم بخش کپڑے جھاڑ کر ایک کونے میں جا کھڑا ہوا اور چوہدری جہانگیر صاحب سے پوری سنجیدگی سے پوچھا۔

"چوہدری جہانگیر صاحب! پھر میں اسے آپ کا انکار سمجھوں۔"

مہک علی۔۔۔ راجن پور

ناراضی

ایک فرماں بردار بیٹے نے سردیوں میں ایک گرم کوٹ پانچ ہزار روپے میں خریدا اور اسے اپنے والد صاحب کو بھیجنے کا ارادہ کیا۔ لیکن یہ سوچ کر کہ زیادہ مہنگا خریدنے پر والد ناراض نہ ہوجائیں۔ اس نے کوٹ پر 500 کا لیبل لگا دیا اور والد کو بھیج دیا۔ چند روز بعد والد کا خط ملا۔ جس پر لکھا تھا۔ "کوٹ بہت گرم اور اچھا تھا۔" میں نے ساڑھے آٹھ سو روپے میں بیچ دیا۔ تم ایسے ہی پانچ کوٹ اور بھیج دو۔ اچھا منافع کا کام ہے۔

حرا قریشی۔۔۔ بلال کالونی ملتان

تین شرطیں

ایک فلمی اداکارہ کی بلی ایک چوہے پر جھپٹی۔ چوہے نے حسرت بھری آنکھوں سے اداکارہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اگر تم اس بلی سے میری جان چھڑادو تو میں تمہاری تین کوئی سی بھی شرطیں پوری کردوں گا۔"

"کیا واقعی؟" اداکارہ خوش سے چلائی۔

"سب سے پہلے میرے لیے ہیرے و جواہرات کا ڈھیر لگادو۔"

"یہ بھی لو" چوہے نے چھت کی طرف اشارہ کیا اور اشرفیاں اور ہیرے و جواہرات گرنے لگے۔

"میری دوسری خواہش یہ ہے کہ میری جوانی اور حسن ہمیشہ قائم رہے۔"

"تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہوئی" اور میری تیسری خواہش ہے کہ..." فلمی اداکارہ نے خوشی سے سرشار ہوتے ہوئے کہا۔ "تم ایک حسین شہزادے کے روپ میں آکر مجھ سے شادی کرلو۔" چوہا بلی کی طرف مڑا اور بولا۔ "تو آگے بڑھ کر مجھے کھاتی کیوں نہیں کم بخت کیا تو بھی یہ چاہتی ہے کہ میں تباہ و برباد ہوجاؤں۔"

ندا۔ کراچی

کیا مطلع صاف ہے

فون کی گھنٹی بجی۔ بوڑھا شوہر قریب بیٹھا تھا۔ نوجوان بیوی کے اٹھنے سے پہلے اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ دوسری طرف سے ایک سوال کیا گیا۔ بوڑھے شوہر نے تیوریوں پہ بل ڈال کے جواب دیا۔

"معاف کیجیے گا! یہ سوال آپ محکمہ موسمیات سے کریں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ بیوی نے پوچھا۔ "کون تھا؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "پتا نہیں کون بے وقوف تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ آج شام کو مطلع صاف رہے گا یا نہیں؟"

ارم کمال۔۔۔ فیصل آباد

قابل دید

ایک صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کا طرز

تحریر بڑا متاثر کن ہے۔ ایک دن ایک ان پڑھ بوڑھا ان کے پاس جا کر کہنے لگا۔

"صدر صاحب کے نام میری طرف سے خط لکھو اور انہیں میری بری حالت سے آگاہ کرو۔"

وہ شخص خط لکھ چکا تو بوڑھے نے کہا۔ "ذرا پڑھ کر سنائیے۔" اس نے پڑھ کر سنایا تو بوڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس شخص نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، تم رو کیوں رہے ہو؟"

بوڑھا بولا۔ "بیٹا! مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میرے حالات اتنے خراب ہیں۔"

صدف مختار۔۔۔ یوسال مصور

ثبوت

پولیس اہلکار نے ایک صاحب کو نشے کے الزام میں پکڑ کر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا تو مجسٹریٹ نے پوچھا۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ صاحب نشے میں تھے؟"

"سر! یہ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کرائے کے سلسلے میں جھگڑا کر رہے تھے۔" پولیس نے جواب دیا۔

"لیکن اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ یہ نشے میں تھے۔" مجسٹریٹ نے اعتراض کیا۔

"لیکن سر۔۔۔ وہاں نہ تو کوئی ٹیکسی تھی اور نہ ٹیکسی ڈرائیور۔" پولیس والے نے جواب دیا۔

صنم۔۔۔ کراچی

اطلاع

اطلاعی گھنٹی بجی۔ خادم نے دروازہ کھولا۔ غفار صاحب کے معیز الدین دوست تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "غفار کہاں ہے؟" خادم نے جواب دیا۔

"نہیں وہ گھر پر نہیں۔۔۔ وہ سفر پر گئے ہیں۔"

معیز الدین نے پوچھا۔ "اچھا کیا آرام اور تفریح کے لیے گئے ہیں؟"

خادم نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔ "میرے خیال میں نہیں کیونکہ بیگم صاحبہ ساتھ گئی ہیں۔"

فردوس فہیم۔۔۔ کراچی

سوتو نہیں رہے

انتخابات کے دنوں میں ایک امیدوار اپنی تقریر میں کہہ رہا تھا۔

"میں آپ کی بے پناہ محبت کی وجہ سے آج آپ کے شہر گوجر خان میں حاضر ہوا ہوں۔"

حاضرین چلائے۔ "یہ گوجر خان نہیں گوجرانوالہ ہے۔"

امیدوار اطمینان سے بولا۔ "میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں آپ سو تو نہیں گئے۔"

مونا خان۔۔۔ جام پور

کارکردگی

مینیجر نے لیڈی ٹائپسٹ سے کہا۔ "اگر تمہارے کام کی رفتار کا یہی حال رہا تو مجھے تمہاری رپورٹ میں لکھنا پڑے گا کہ تم وقت ضائع کرتی ہو۔"

ٹائپسٹ نے جواب دیا۔ "سر! مجھے اس آفس میں آئے ہوئے صرف ایک مہینہ ہوا ہے اور میں نے باس سے منگنی بھی کر لی ہے۔۔۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں وقت ضائع کرتی ہوں؟"

شاہین۔۔۔ صادق آباد

آزمائش

"رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے ایک نئی قسم کا ناشتا ایجاد کیا ہے۔ میں اس وقت آزمائشی طور پر اسے کھا کر دیکھ رہا تھا۔ جب میری آنکھ کھل گئی۔" طارق نے ایک روز ہادی کو بتایا "اچھا تو پھر کیا ہوا۔" ہادی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں نے دیکھا میرے فوم کے گدے کا ایک کونا غائب تھا۔" طارق نے ذرا مایوسی سے جواب دیا۔

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

ثمینہ اکرم..... بہار کالونی، لیاری، کراچی

خدا خدا کر کے 13 جولائی کو کرن کا دیدار نصیب ہوا۔ مگر ٹائٹل گرل دیکھ کر ساری کوفت اڑن چھو ہو گئی۔ پروقار اور سر پہ دوپٹا اوڑھے ماڈل کی شان ہی کچھ اور لگی مجھے جولائی کا ٹائٹل ازحد پسند آیا۔ یہ رمضان کے حوالے سے بہترین لگا' سادگی میں بھی وقار ہے۔

حمد اور نعت سے فیض یاب ہونے کے بعد انٹرویوز پر سرسری سی نگاہ ڈالی۔ البتہ حنا جبیبہ کی باتیں اچھی لگیں۔ "مقابل ہے آئینہ" میں سعدیہ عبدالعزیز سے ملاقات اچھی رہی۔

اس مرتبہ کافی عرصہ بعد کرن پر تبصرہ کا موقع ملا ہے۔

اب کچھ بات ہو جائے کہانیوں کی..... یہ میرا خط کڑی تنقید پر مشتمل ہے۔ جولائی کا ناول نمبر جس میں ایک ناولٹ اور تین افسانے ہیں۔ تینوں ناولز میں سب سے زیادہ بشریٰ احمد کا "اب محبت کرنی ہے" مجھے زیادہ پسند آیا۔ جبکہ "دل ایک شہر ملال" عتیقہ ملک کے ناول میں رانی عرف حمو کائیوں اوور ری ایکٹ کرنا بہت برا لگا۔ ساحر جیسے ایک ویل اسٹیبلش بندے کا ایک دیہاتی کڑی کے پیچھے خوار ہونا کچھ دل کو بھایا نہیں۔ جبکہ رانی کا ساحر میں انٹرسٹ بھی صفر تھا۔

"نامے میرے نام" کے تبصرے اس بار کچھ پھیکے پھیکے لگے۔ ایک ہماری قاری بہن جو کہ دس سال سے کرن پڑھ رہی ہیں' مگر انہیں کرن ڈائجسٹ گھر پہ منگوانے کا طریقہ کار معلوم نہیں؟ یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔

"کرن کرن خوشبو" میں حکایت سعدی سے انتخاب پسند آیا جبکہ "مسکراتی کرنیں" میں اکثر لطائف پرانے (پڑھے ہوئے) تھے۔

اس بار "کرن کا دسترخوان" کی تقریباً" سب ریسپیز ٹرائی کر چکی ہوں۔

"یادوں کے دریچے" سے بھی اس بار کوئی انتخاب من کو نہ بھایا۔

جبکہ سب افسانے ٹھیک ٹھاک لگے۔ نفیسہ سعید کا سلسلہ وار ناول "ساگر ہے زندگی" میں آگے چل کر قارئین کو زبردست کہانی پڑھنے کو ملے گی۔ دوسرے ناولز کی طرح یہ بھی نفیسہ سعید کا ایک یادگار شاندار ناول ہوگا۔ کرن میں "بن مانگی دعا" دیکھ کر مجھے شاک لگا' مگر پھر کہانی پڑھ کر ایک نئی شادی شدہ لڑکی اوانشی کی مشکلات کا اندازا ہوا کہ ایک ہی وقت میں سب کو خوش کرنا ناممکن ہے۔ مگر یہ نام اوانشی کچھ عجیب سا لگا اور اس کا مطلب بھی معلوم نہیں۔ آخر میں معاذ کی محبت کا یقین آیا۔ مگر کیا اس ناولٹ کا نام کہانی سے ناموافق نہیں ہے؟ اب آخر میں بات کرتی چلوں کرن کتاب "فضائل رمضان" کی۔ جو کہ میرا خط لکھنے کا اصل محرک بنا۔ جیسے جیسے میں نے کرن کتاب پڑھنی شروع کی۔ سبحان اللہ..... رمضان المبارک کے حوالے سے ایک بہترین کتابچہ لگا۔ اس میں فضائل رمضان کے ہر ہر پہلو پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے بہت خوب..... اللہ آپ کو جزائے خیر دے (آمین) ماہ رمضان کی فضیلت' وظائف' دعا کی اہمیت' عید منانے کے احکام ______ اور رمضان المبارک میں بننے والے انواع و اقسام کی کھانوں کی تراکیبیں..... یہ ہر قاری کو ضرور پڑھنی چاہیے اور ہر گھر میں یہ کتاب موجود ہونی چاہیے۔ میرے ذخیرہ کتب میں جولائی کی کرن کتاب سرفہرست (اول) جگہ پا گئی۔ کیونکہ یہ افادیت و اہمیت کے لحاظ سے ایک بہترین کتاب لگی اور مجھے بہت بہت پسند آئی۔ شکریہ کرن ڈائجسٹ اللہ کا شکر ہے کہ میرے ہیپاٹائٹس کے سب 72 انجکشن ویکسی نیشن پورے ہو گئے ہیں۔ اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے شفا کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین)

نوشابہ منظور..... بھریا روڈ

اس ماہ کا کرن 13 کی شام کو ملا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول پڑھنے کے بعد سب سے پہلے "درِ دل" پڑھا۔

نیا ناول ""ایک ساگر ہے زندگی"" بھی اچھا لگا سب سے زیادہ "دل اک شہر ملال" کی رانی کی بے وقوفیوں پہ بہت ہنسی آئی' مگر جب اگلے ماہ کے لفظ پڑھے تو۔ "تب محبت کرنی ہے" بھی اچھا تھا۔باقی ابھی پڑھا نہیں خط لکھنے کی جو جلدی تھی جانے اب میرا خط چھپتا بھی ہے کہ نہیں۔ اسماء خان۔۔۔ کے جی ایم

پہلی بار آپ کی بزم میں شرکت کر رہی ہوں۔ پلیز ردی کی ٹوکری کی نذر مت کر دیجیے گا۔ کرن کی تیرہ سال سے خاموش قاری ہوں جنون کی حد تک پسند ہے مجھے کرن۔ اس کے سارے سلسلے زبردست ہیں۔ ایک دن میں سارا کرن پڑھ لیتی ہوں۔ اگر شرکت کا موقع دیا تو آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

شمع مسکان۔۔۔ جان پور

رمضان المبارک کے دوسرے عشرے کے اختتام پہ کرن بیسویں روزے کے انعام (کے طور پر) میرے ہاتھوں میں جلوہ افروز ہوا۔

سرورق ماڈل سر پر سلیقے سے دوپٹا اوڑھے پاکیزگی و سادگی کا خوش گوار تاثر چھوڑ گئی۔ کمرشلز پر نظر دوڑاتے ہوئے سب سے پہلے حمد و نعت پڑھیں۔ عجب سرور کی سی کیفیت قلب و روح پر چھا گئی۔ حمد کا یہ شعر دل میں اتر گیا۔

رحیم اللہ وہ رحمٰن' یہ آغاز قرآں کا
یہی نکتہ ہے پیہم دل کے اطمینان کا

لوا ریہ پڑھا۔ مدیرہ جی اس مقدس مہینے کی فضیلت واضح کر رہی تھیں۔ اپنے رب کی قربت پانے کا میسج دے رہی تھیں۔

انٹرویوز میں حنا الطاف سے ملاقات بیسٹ رہی اور سوزین کے بارے میں پہلے بھی بہت بار پڑھا ہوا ہے۔ اس مرتبہ توجہ سے نہیں پڑھا۔ البتہ حنا حبیبہ بہت پیاری لگیں۔

"محبت اب کرنی ہے" سوتیلی ماں کا تاثر ہمارے معاشرے میں ظلم و جبر کا ہے۔ حالانکہ تمام عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ اچھائی برائی ہر جگہ ہوتی ہے۔ نورین بھی ایسی ہی ایک خوب صورت اچھائی تھی۔ جو اپنے شوہر کی بے اعتنائی کے باوجود عائزہ سے سوتیلی ماں والی نفرت نہ کر سکی۔ عثمان کے اوپر بہت غصہ آیا۔ بھئی عائزہ کی مما اس کا پاسٹ تھیں اور نورین پریذنٹ' پریذنٹ کو اگنور نہیں کرنا چاہیے تھا اور عائزہ کے ننھیال کی وہی ٹیپیکل اسٹوری تھی۔ خاندانی سازشیں' ہمایوں کا کردار بیس لگا۔

ناولٹ۔۔۔ "بن مانگی دعا" ونشی کی سوچ پر افسوس بالکل نہیں ہوا۔ ایسے ہم سفر کا خواب تو ہر لڑکی دیکھتی ہے۔ جو اس سے ٹوٹ کر محبت کرے۔ اسے سراہے۔ لڑکی اپنے شوہر کے لیے ہی تو سجتی سنورتی ہے۔ آپس کی بات ہے۔ ویسے مجھے بھی ایسے شوہر زہر لگتے ہیں۔ جو دلہن سے پہلی ملاقات میں ہی حال دل سے پہلے حال خاندان کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ تحریر بھی کھٹی میٹھی سی تھی۔

افسانے تینوں ہی اچھے تھے۔ مگر "یہ جو دل کی بات ہے نا" دل کو ہی لگ گئی۔ میں تو کہتی ہوں کہ کوئی دوست ہی نہ بنائیں۔ غریب ہی رہیں تو ٹھیک ہے۔ "رنگ بدلتی دوستی" ہونا چاہیے تھا افسانے کا نام۔ خلوص کی تو کوئی ویلیو ہی نہیں رہی آج کل دنیا کے بازار میں۔ باقی پڑھی نہیں ہیں۔ ان پر تبصرہ خاطر جمع رہا۔

"مقابل ہے آئینہ" میں سعدیہ عبدالعزیز' خلوص و سادگی کا پیکر لگیں۔ خود کو بہت خوب صورت الفاظ میں واضح کیا۔ ہمیشہ مسکراتی رہو۔ (آمین)

مستقل سلسلوں میں "یادوں کے دریچے سے" میں شفق راجپوت اور سونیا جبیں کا انتخاب پسند آیا۔ "تارے میرے نام" میں عائشہ خان کو فرسٹ میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ حرا قریشی بھی اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

جولائی کا شمارہ سولہ کو ملا۔ میرا انتظار تو مہینے کی بارہ

تاریخ سے شروع ہوجاتا ہے۔ پاکیزہ سی ماڈل بہت اچھی لگی۔ناک کی لونگ بھی اچھی تھی۔

حمد باری تعالیٰ نعت رسول مقبول ﷺ سے ذہن ودل کو منور کیا۔ اس بار انٹرویو میں تمام ہستیاں اچھی تھیں۔ اگر جان ریمبو اور صاحبہ کا انٹرویو کردیں۔۔۔ تو اچھا لگے گا۔

"مقابل ہے آئینہ" انیقہ انا کے بعد ان محترمہ سے مل کر خوشی ہوئی۔ جو اچھا لگتا ہے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے میرے خیال میں یہ اچھی بات نہیں۔ فہرست میں دیکھا مکمل ناول تین تھے۔ "میرے دل میرے مسافر" کو ہم نے آئندہ پہ ہی رکھا۔ "دل اک شہر ملال" عنیقہ ملک کا بہترین ناول' قسم سے مجھے بہت اچھی لگی یہ تحریر' مجھے ہیرو کا کردار اچھا لگا۔ مجھے لگتا ہے حمرہ اور ساحر کا آپس میں کوئی خونی رشتہ ہوگا۔ بہرکیف اس تحریر کا بے تابی سے انتظار رہے گا۔

بشریٰ احمد کا ناول "اب محبت کرنی ہے" تحریر کے دو کردار نانا' نانی اچھے لگے۔ اولاد کی پرورش بھی ایک امانت ہے' جس کو دیانت داری کے ساتھ پروان چڑھانا ہوتا ہے۔

"بن مانگی دعا" ناولٹ کچھ زیادہ متاثر نہ کرسکا۔ روایتی سی کہانی تھی۔ "سسرال کے رنگ نرالے" سسرال والے بھی اسی دنیا کے باسی ہوتے ہیں۔ پھر پتا نہیں کیوں مخلوق اتنی سفاک ہوتی ہے۔

"اک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید کی تحریر ہو اور اچھی نہ ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

افسانے تقریباً" سب ہی اچھے تھے۔ "سفر زیست" بلو کی موت آنکھیں بھگو گئی۔ کیا اولاد ایسی بھی ہوسکتی ہے۔

دومستقل سلسلے اس بار اچھے لگے۔ "دنیا ایک مسافر خانہ کوئی تو ہے" کو ڈائری میں نوٹ کیا۔

"یادوں کے دریچے سے" "اک گلاب باقی ہے۔ شفق راجپوت کی ڈائری اچھی تھی۔

"مجھے یہ شعر پسند ہے" میں' صائمہ ساہی' ثریا شاہ' شہربانو کا شعر اگرچہ پرانا تھا' پھر بھی پڑھ کر اچھا لگا۔

"کرن کا دسترخوان" میٹھے والی بڑے پسند آئے۔

"حسن وصحت" اس بار اچھا تھا۔

"نامے میرے نام" سب نے اچھا لکھا' کبھی میرا خط بھی فہرست میں شامل کرکے خوش ہونے کا موقع دیں نا۔

ایچ ایس۔۔۔ عمرکوٹ

میں تقریباً" پچھلے بارہ سالوں سے کرن' شعاع اور خواتین تینوں ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں' لیکن کبھی خط لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ایک دفعہ کوشش کی تھی' لیکن منہ کی کھانی پڑی' کیونکہ میرے بھائی نے صحیح پوسٹ نہیں کیا۔ اس لیے آپ تک نہیں پہنچ سکا۔ اب دوبارہ کوشش کررہی ہوں' ضرور شامل کیجیے گا' تاکہ مجھے پتا چلے کہ خط بہ خیروعافیت آپ تک پہنچ چکا ہے۔ ابھی کرن پڑھا نہیں ہے۔ اگر یہ خط آپ تک پہنچ گیا تو آئندہ بھی لکھتی رہوں گی۔ پلیز میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ اب آتی ہوں دوسری کہانیوں کی طرف' مکمل ناولوں میں عنیقہ ملک بازی لے گئیں' لیکن آئندہ ماہ دیکھ کر سکتہ طاری ہوگیا' دوسرے مکمل ناول بھی اچھے تھے۔

بنت حوا۔۔۔ جہلم

میں کرن کو چار سال سے پڑھ رہی ہوں' لیکن اس ڈر کی وجہ سے کبھی کچھ لکھا ہی نہیں کہ اگر شائع ہی نہ ہوا تو۔۔۔ پہلی دفعہ جو کہانی پڑھی تھی وہ "عشق آتش" تھی۔ پہلی دفعہ کوئی کہانی پڑھی وہ بھی اتنی اچھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پھر میں دوبارہ کرن کو پڑھنا چھوڑ ہی نہیں سکی۔

حمیرہ خان کا افسانہ "خطا ہوئی" پسند آیا اور صائمہ نصیر کا ناولٹ بھی اچھا لگا۔ باقی ابھی پڑھا نہیں۔ میرا یہ کسی بھی رسالے میں پہلا خط ہے۔ پلیز مایوس نہ کیجیے گا۔ پھر شاید زندگی میں کبھی کچھ لکھنے کی ہمت نہیں کرپاؤں۔ دعا ہے کرن یوں ہی ترقی کی طرف گامزن رہے۔ (آمین)

✡ ✡